علماءِ ہند کا شاندار ماضی

جلد اوّل

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ، آپ کے معاصرین کرام اور خلفاء عظام کے حالات و کمالات اور سیاسی کارنامے

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

مکتبہ محمودیہ - لاہور

علماءِ ہند کا شاندار ماضی

حصہ

حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ العزیز، آپ کے معاصرین کرام، خلفاءِ عظام اور خلفاءِ خلفاء نیز سلطنتِ مغلیہ کے عظیم الشان چار تاجداروں کے حالات، اِس دو صد و پنجاہ سالہ دور کے سیاسی و معاشی رجحانات و مقتضیات، علماءِ اُمت کی مجاہدانہ صلاحی سرگرمیاں اور اُن کے نتائج وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے:

○

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

○

مکتبہ محمودیہ
"بیت الحمد"، جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور

سالِ اشاعت ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء

ناشر : مکتبہ محمودیہ جامعہ مدنیہ لاہور

تعداد : ۱۰۰۰ قیمت جلد اوّل : ۴۰ روپے

قیمت (مجلد) ۴ جلدیں : ۱۱۵ روپے

مطبع : السعودی پریس لاہور

— ملنے کے پتے —

مکتبہ محمودیہ جامعہ مدنیہ لاہور

کتب خانہ شانِ اسلام راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

سبحانی اکیڈمی ۔ اردو بازار ۔ لاہور

مکتبہ رحمانیہ ۔ اردو بازار ۔ لاہور

نعمانی کتب خانہ ۔ اردو بازار ۔ لاہور

مکتبہ چراغ اسلام ۔ اردو بازار ۔ لاہور

نذر

ایک ناکارہ وسرگرداں نے دیدہ ریزی اور دل سوزی سے ہزارہا اوراق کو پلٹ کر ایک مجموعہ مرتّب کیا ہے۔ پُورے عجز وانکسار اور اعترافِ تقصیر کے ساتھ اس حقیر ہدیہ کو اُن اکابرِ ملّت کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جن کی سبق آموز اور مقدّس سوانح حیات کے چند ذرات سے یہ مجموعہ مرکّب ہے اور التجا ہے

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مقصد

ہم نے اپنے مقدس اکابر کو زُہد، تقشف، چلہ کشی، شب بیداری، سبحہ خوانی، سجدہ ریزی کے چشمہ سے دیکھا تو بہت جلیل القدر اور عظیم الشان نظر آئے۔ آیئے اب مکّہ کی مظلومیت، طائف کی مقہوریت، ہجرتِ وطن، ترکِ اقارب، غارِ ثور کی روپوشی، بدر کی نصرت، اُحد کی شہادت، فتحِ مکہ کی مسرت، حنین وثقیف کی سطوت، تبوک کی شوکت وغیرہ وغیرہ سُنَن جہاد وسیاست کے چلمن سے نظر ڈالیں کیسے نظر آتے ہیں

ہمارا حال ماضی کا ثمرہ اور مستقبل کا سنگِ بنیاد ہے — آیئے تاریخ ماضی سے اپنے مستقبل کے لیے کچھ سبق حاصل کریں

الدّاعی

محمد میاں عفی عنہ

۱۵ شوال ۱۳۵۸ھ

مآخذ

علماء ہند کا شاندار ماضی ــــ جلد اوّل

جن مضامین کے متعلق حدیث وتفسیر وکتبِ فقہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان کے حوالہ جات حاشیہ پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ جلد اوّل اور اس کے تتمہ کے مآخذ مندرجہ ذیل تصانیف ہیں :

۱۔ مکتوبات امام ربّانی مجدّد الف ثانی : حضرت مجدد صاحب الف ثانی قدس سرہٗ العزیز (مطبع نولکشور)

۲۔ آئینِ اکبری : شیخ ابوالفضل (مطبع نولکشور)

۳۔ اقبال نامہ جہانگیری : معتمد خاں بخشی جہانگیر بادشاہ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ھ)

۴۔ تزکِ جہانگیری : جہانگیر بادشاہ معتمد خاں و میرزا محمد ہادی (تصحیح کردہ سر سید احمد صاحب مطبوعہ نولکشور)

۵۔ ہدیہ مجدّدیہ : حضرت مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی سکندر آبادی (مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۲ھ)

۶۔ انوارِ احمدیہ : " " " " "

۷۔ الکلام المنجی : " " " " "

۸۔ انفاس العارفین : حضرت مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ العزیز (مطبع مجتبائی دہلی)

۹۔ اخبار الاخیار فی اسرار الابرار : حضرتِ مولانا شیخ عبد الحق محدث دہلوی (مطبع مجتبائی دہلی)

۱۰۔ سعد الاخبار و تذکرۃ الابرار : جناب ولایت علی صاحب اکبرآبادی (مطبع چشتی آگرہ ۱۳۱۶ھ)

۱۱۔ حالات مشائخ نقشبند : مولانا محمد حسن صاحب نقشبندی مجددی مظہری ساکن کوٹلہ کرت پور ضلع بجنور (مطبع مجتبائی ۱۳۲۲ھ)

۱۲۔ مقاماتِ امام ربّانی : مولوی عبد الاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی (مطبع مجتبائی ۱۳۲۲ھ)

۱۳۔ کلماتِ طیّبات : مرتبہ مولانا ابوالخیر صاحب گنج مراد آبادی (مطبع العلوم مراد آباد)

۱۴۔ سفینۃ الاولیاء : داراشکوہ پسر شاہ جہاں بادشاہ (مطبع مدرسہ آگرہ باہتمام مسٹر بیل ۱۸۵۳ء)

۱۵۔ خزینۃ الاصفیاء : مولانا غلام سرور صاحب چشتی (نول کشور ۱۲۹۰ھ)

۱۶۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : حسان الہند مولانا السید غلام علی صاحب آزاد بلگرامی
(طبع کردہ مرزا محمد حیدر آباد)

۱۷۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی : مولانا محمد بن یحییٰ الحسن التیمی ثم البکری ترہتی ثم پورنوی
(مطبع صدیقی)

۱۸۔ مکتوبات حضرت خواجہ معصومؒ : حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ (مطبع نظامی کانپور)

۱۹۔ عالمگیر نامہ : محمد کاظم بن محمد امین (قلمی) از کتبخانہ جناب قاضی تسلیم حسین صاحب مرادآباد

۲۰۔ وقائع عالمگیر : چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی (نیشنل پریس الہ آباد)

۲۱۔ رقعات عالمگیر : " " "

۲۲۔ بادشاہ نامہ عبد الحمید : ملا عبد الحمید صاحب لاہوری (کالج پریس کلکتہ)

۲۳۔ مآثر الکرام : حسان الہند مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی قدس اللہ سرہٗ
(شائع کردہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد مطبع مفید عام آگرہ

۲۴۔ مقدمہ رقعات عالمگیر : سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے (مطبع معارف اعظم گڑھ)

۲۵۔ رقعات عالمگیر : مرتبہ

۲۶۔ آثار الصنادید : سر سید احمد خاں صاحب مرحوم (نامی پریس لکھنؤ ۱۹۰۴ء)

۲۷۔ رسالہ تحقیق اراضی ہند : شیخ جلال الدین تھانیسری قدس سرہ (مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۳ھ)

۲۸۔ ملفوظات عزیزیہ : شائع کردہ مولانا بشیر الدین صاحب میرٹھی (مطبع مجتبائی میرٹھ)

۲۹۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ : محمد دین صاحب فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری
(گلزاری اسٹیم پریس ۱۳۳۸ھ)

۳۰۔ تذکرہ : مولانا ابو الکلام صاحب آزادؔ۔ مرتبہ : فضل الدین احمد مرزا بی۔ ایس سی۔ ای۔ ایم۔ ایف۔
جی۔ ایس (یو۔ کے) مطبع البلاغ پریس کلکتہ ۱۹۱۹ء

۳۱۔ دعوتِ اسلام ترجمہ (دی پریچنگ آف اسلام) : مصنّفہ ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔ بی۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور و محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ ترجمہ محمد عنایت اللہ صاحب ایم اے (مطبع مفید عام آگرہ)

۳۲۔ خطبۂ شوقیہ : حضرت مولانا عبدالشکور صاحب امام اہلسنت والجماعت (لکھنؤ) بضمن مجدد نمبر رسالہ الفرقان بریلی (لکھنؤ)

۳۳۔ دبستانِ مذاہب : مصنّف عہد شاہجہان کے کوئی بزرگ ہیں۔ نام معلوم نہیں۔ سرورق پر تحریر ہے۔" از جار آخشیج طبع دانا و فرزانہ کم باسم تسہم نامہ نگار اشعار رفتہ آہ (مطبع نول کشور لکھنؤ)

۳۴۔ سیاسی تاریخ ہند : میجر جنرل سر جان میلکم جی۔ سی۔ بی۔ کے۔ ایل۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس وغیرہ وغیرہ۔ ترجمہ مولوی ابن حسن صاحب۔ ایم۔ اے۔ مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ (دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن)

۳۵۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں : مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی۔ (مطبع معارف اعظم گڑھ)

۳۶۔ ہند عہدِ اورنگ زیب میں : نواب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب۔ مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدر آباد دکن

۳۷۔ ہندوستان کی صنعت و تجارت : مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی۔ خانقاہ رحمانی مونگیر (برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور (پٹنہ)

۳۸۔ تاریخ امریکہ : مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ۔ بی۔ اے وکیل۔ غازی آباد (الناظر پریس لکھنؤ)

۳۹۔ روئے زمین کے مسلمان سلاطین : مسٹر سٹینلی پول ترجمہ محبوب عالم صاحب

۴۰۔ تعلیمی ہند : مرتبہ اراکین مجلس قاسم المعارف دیوبند (محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

۴۱ - مالیاتِ عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب : جے۔سی۔کمان رپّا۔ایم اے۔بی ایس سی
مترجمہ قاضی محمد حسین صاحب (شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی)
۴۲ - تاریخ دستورِ حکومتِ ہند : ڈاکٹر یوسف حسین صاحب ڈی لٹ۔ پیرس
(شائع کردہ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی)

فہرست مضامین
علماء ہند کا شاندار ماضی جدید
جلد اوّل

مصنف رحمۃ اللہ کی چند دیگر تصانیف

۱۔ سیرۃ مبارکہ

۲۔ عہدِ زریں (۲ جلدیں)

۳۔ نور الاصباح شرح نور الایضاح (اردو)

۴۔ مشکوٰۃ الآثار و مصباح الابرار*

۵۔ اسلام اور انسان کی حفاظت و عزت

۶۔ دینِ کامل

۷۔ علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے (۲ جلد)

۸۔ تحریکِ شیخ الہندؒ

۹۔ حیاتِ شیخ الاسلامؒ

۱۰۔ اسیرانِ مالٹا

۱۱۔ جمعیۃ علماء ہند کیا ہے؟ (۲ جلد)

۱۲۔ مختصر تذکرہ خدماتِ جمعیۃ علماء ہند (۴ حصے)

۱۳۔ ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں

۱۴۔ سیاسی و اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات و اشارات

۱۵۔ صلح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت

۱۶۔ جمہوریت اپنے آئینے میں

۱۷۔ ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترکِ وطن کا شرعی حکم

۱۸۔ حیاتِ مسلم

۱۹۔ چاند تارے اور آسمان

۲۰۔ آنے والے انقلاب کی تصویر

۲۱۔ خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء ہند کا صراطِ مستقیم

۲۲۔ مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم (معلمین کیلئے)

—بچوں کے لیے—

۲۳۔ تاریخ الاسلام (۳ حصے)

۲۴۔ دینی تعلیم کے رسائل (۱۲ حصے)

۲۵۔ روزہ و زکوٰۃ

۲۶۔ ہمارے پیغمبرؐ

---

* یہ کتاب دار العلوم دیوبند میں داخلِ نصاب کی گئی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِمام ربّانی مجدّد الف ثانی

سیّدنا ابُو البرکات بدر الدّین حضرت مولانا شیخ احمد صاحب فاروقی سرہندی قدس اللہ سرّہٗ و برّد مضجعہٗ

وطن اور خاندان سرزمین پنجاب اب بھی موجود ہے[۱]، اور یہاں ایک قصبہ جس کا نام سرہند ہے، اب بھی آباد ہے۔ چند صدی پیچھے لوٹئے، دسویں صدی ہجری پر نظر ڈالئے، یہاں آپ کو فاروقی شیوخ کا ایک خاندان ملے گا جس کے مورث ایک عرصہ پہلے کابل سے چل کر یہاں پہنچے تھے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ جناب مولانا شیخ عبدالاحد صاحب قدس اللہ سرّہ العزیز تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات سے مزیّن، فیوض و برکات کا سرچشمہ، سیّدنا حضرت شیخ

---

[۱] یعنی انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد۔ اس انقلاب میں پنجاب کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا پاکستان میں شامل ہو گیا۔ مگر یہ ٹکڑا جس میں سرہند ہے، ہندیونین ہی میں رہا۔ لیکن اس کی اسلامی شان ختم ہو گئی۔ یہاں کے مسلمان پاکستان پہنچے اور پاکستان کے غیر مسلم پناہ گزیں اُن کی جگہ آباد ہو گئے۔ سرہند اور بسی جس کا تذکرہ اس کتاب میں بار بار آئے گا مسلمانوں سے خالی ہو گئے۔ البتہ حضرت مجدّد صاحب کا روضہ اور اُن کی خانقاہ خود حضرت مجدّد صاحب کی کرامت سے اور بظاہر اسباب افغانستان کے احتجاج پر محفوظ رہ گیا۔ اس میں کچھ مسلمان رہتے ہیں۔ جناب مقبول حسین صاحب یہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جملہ علماء ہند کے توجہ دلانے پر حکومتِ ہند اس خانقاہ کی ضروریات کا تکفّل کئے ہوئے ہے۔ حکومتِ پنجاب پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد خانقاہ کو دیتی ہے۔

عبد القدوس صاحب گنگوہی کے خلیفہ، سلسلۂ چشتیہ میں بہت بڑے صاحب نسبت، اور اور طریقۂ قادریہ میں بھی آپ کو اجازت حاصل تھی۔

جس طرح فیوضِ باطنی سے اربابِ طریقت مریدین بہرہ ور ہوتے رہتے تھے اسی طرح علومِ ظاہری "معقولات اور منقولات" کے طلبہ بھی اطراف و اکناف سے تشنہ لب حاضر ہوتے اور سیراب ہوکر دریا بداماں واپس جاتے۔

ایک مبارک شب میں آپ مصروفِ استراحت ہیں، قلب مبارک ملاءِ اعلیٰ کی طرف متوجّہ ہے، دفعۃً ایک خواب نظر آتا ہے:

تمام جہان میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ سوّر، بندر، ریچھ لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یکایک سینہ سے ایک نُور نکلتا ہے جس میں ایک تخت نمودار ہوتا ہے۔ تخت پر ایک شخص تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کے سامنے تمام ظالم، بے دین اور ملحد، بھیڑ بکری کی طرح ذبح کئے جا رہے ہیں، اور کوئی شخص بلند آواز سے کہہ رہا ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ　　حق آیا، باطل فنا ہوگیا۔ باطل اسی
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○　　لئے ہے کہ فنا ہو۔

حضرت شیخ بیدار ہوئے تو آپ کو مسرت آمیز حیرت تھی۔ مزید تشفّی اور اطمینان کے لئے آپ نے اس زمانہ کے مرشدِ کامل قطبِ دوراں حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ[1] سے تعبیر دریافت کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ "تمہارے ایک لڑکا پیدا ہوگا جس سے الحاد اور بدعت کی ظلمت دُور ہوگی"[2]۔

ولادتِ باسعادت

۱۴ شوال ۹۷۱ھ (نو سو اکہتر) روز جمعہ کی شب میں اس مبارک خواب کی تعبیر صادق ہوئی۔ صبح صادق سے پیشتر ہی افق جگمگا اُٹھا۔ مشرقِ سعادت

---

[1] حضرت شاہ کمال صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت مجدد صاحب سے منقول ہے کہ: "سلسلۂ قادریہ میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے بعد شاہ کمال کا مثل کم نظر آتا ہے۔ ۱۲

[2] الخطبۃ الشوقیہ فی ا/ المجددیہ مؤلفہ مولانا عبد الشکور صاحب بضمن مجدد نمبر صنّ ۶۔

کی پیشانی منوّر ہوئی کیونکہ تجدد اور تنوّر کا آفتاب طلوع ہوا۔ الفِ ثانی کی قسمت جاگی علم و عرفان کی اُجڑی ہوئی بستی پھر آباد ہونے لگی۔ رُشد و ہدیٰ کے خزاں زدہ گلشن نے فصلِ گل کی تیاری کی۔

اسمِ گرامی اور سلسلۂ نسب نام مبارک "احمد" تجویز ہوا۔ نسب شریف اٹھائیس ۲۸ واسطوں سے امیر المؤمنین فاروقِ اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اِس نسبِ اقدس پر خود آپ کو بھی ناز تھا۔ چنانچہ حمیت و غیرت کے موقعہ پر اپنے مکتوبات میں بھی تحریر فرمایا کرتے تھے[۱]:

"بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت آمد"

تحصیل علم حفظِ قرآن مجید کی فراغت کے بعد اکثر کُتبِ درسیہ والد ماجد سے اور کچھ سرہند کے دوسرے عُلماء سے پڑھیں۔ عام درسیات اور کُتبِ تصوّف مثلاً تعرف، عوارف المعارف اور فصوص الحکم وغیرہ والد بزرگوار سے، کُتبِ حدیث حضرت شیخ یعقوب صاحب کشمیری سے، اِمام واحدی کی تفسیر "بسیط" نیز تفسیر "وسیط" اور اسباب النزول، تفسیر بیضاوی، منہاج الوصول، الغایۃ القصویٰ، صحیح بخاری شریف، الادب المفرد، ثلاثیات، مشکوٰۃ شریف، شمائل، ترمذی شریف، قصیدۂ بردہ وغیرہ حضرت مولانا قاضی بہلول صاحب بدخشانی سے۔ معقولات کی کتابیں آپ نے مولانا کمال صاحب کشمیری سے پڑھیں، جو اُس زمانہ میں ماہرِ فن سمجھے جاتے تھے۔

تحصیلِ طریقت ابتداءً آپ نے طریقۂ چشتیہ میں والد بزرگوار سے بیعت کی اور اُس کا سُلوک تمام کیا۔ پھر طریقۂ قادریہ پر راہ روی شروع کی۔ اس کے رہنما اور مرشد بھی والد بزرگوار ہی تھے۔ مگر خرقۂ خلافت حضرت شاہ سکندر[۲] نبیرہ حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلیؒ سے حاصل ہوا۔

سترہ برس کی عمر میں جامع کمالات المختصر صرف سترہ[۱۷] سال کی عمر میں آپ ظاہری

---

[۱] مکتوب نمبر ۱۰۰ جلد اوّل ص ۱۳۱، مکتوب نمبر ۱۵ دفتر دوم ص ۲۹ ج ۲ وغیرہ ۱۲ ۔ [۲] آفتاب کو آدمی کسی طرح دیکھ بھی سکتا ہے مگر شاہ سکندرؒ کے منوّر اور مصفّٰی قلب پر نظر جمانا ناممکن (مقولہ مجدد صاحبؒ بحوالہ خطبہ شوقیہ)۔

اور باطنی کمالات کے جامع اور ہادی بن کر اپنے والد صاحب کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تلقین فرمانے لگے۔

طریقہ کبرویہ کی تحصیل اسی زمانہ میں سلسلۂ کبرویہ کے مشہور ولی اللہ حضرت مولانا یعقوب صاحب صرفی تھے۔ آپ سے مجدّد صاحب نے طریقہ کبرویہ بھی حاصل کیا۔

طریقۂ نقشبندیہ کا شوق اور بیعت چشتیہ، قادریہ اور کبرویہ طریقوں سے مراحلِ معرفت طے فرما چکے تھے، مگر طریقۂ نقشبندیہ کا شوق، اب بھی قلبِ اطہر میں باقی تھا جو بڑھتے بڑھتے عشق کی حد تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ ۱۰۰۷ھ میں جب کہ آپ کے والد بزرگوار نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی اور آپ بارادہ حج بیت اللہ اپنے وطن مبارک سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے تو مُلّا حسن کشمیری سے ملاقات ہوئی جن سے غالباً پہلے سے شناسائی تھی۔ اُنہوں نے بر سبیلِ تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی احراری رحمہ اللہ کا ذکر کیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب[1] اطرافِ کابل کے باشندے تھے اور غیبی اشارات کی بنا پر ہندوستان تشریف لائے تھے، تاکہ یہاں سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج فرمائیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

ایں تخمِ پاک را از سمرقند و بخارا	اس پاک تخم کو سمرقند و بخارا سے لائے
آوردیم و در زمینِ برکت آگین ہند	اور ہندوستان کی زمین برکت آگیں
کشتیم الحمد للہ کہ بعنایتِ الٰہی	میں بویا۔ الحمد للہ کہ خداوندِ عالم کی
شجرہ طیبہ "اصلہا ثابت و فرعہا	عنایت سے ایسا درخت بن گیا جس کی جڑ
فی السماء" ظاہر شد۔	زمین میں اور پھونگل آسمان میں۔

بہر حال مُلّا حسن کشمیری سے جیسے ہی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مرشد کامل کا تذکرہ

---

[1] آپ کی ولادت ۹۷۱ھ میں بمقام کابل ہوئی۔ یہی سال حضرت امام ربّانی مجدّد کی ولادت کا ہے۔ ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ بروز شنبہ بعمر اکتالیس سال بمقام دہلی وفات پائی۔ مزار مبارک دہلی میں واقع ہے۔ یہ پورا قبرستان "خواجہ باقی باللہ" کے نام سے مشہور ہے۔ مزار مبارک کے قریب ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جس کا فرش سنگِ مرمر کا اور ستون سنگِ بصری کے ہیں۔

سُنا۔ زیارت کا وہی اشتیاق قلب مبارک میں پیدا ہوا جو سالہا سال کے آرزومند اور مشتاق کو ہونا چاہیئے تھا۔ آپ جلد سے جلد حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

خدا کی دین کے موسےٰ سے پوچھیئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ خداوندی انعام تھا کہ حضرت خواجہ صاحبؒ بھی اپنی عام عادت کے برخلاف مجدّد صاحب سے بہت زیادہ ملاطفت اور بشاشت سے پیش آئے اور دو چار ہفتہ دہلی میں قیام کی ترغیب فرمائی۔ حضرت اِمام ربّانی نے ڈھائی ماہ دہلی میں قیام فرمایا۔ جو قلب ابتداء ہی سے صیقل پاچکا تھا وہ اس ڈھائی ماہ کی صحبت میں کندن بن گیا، اور نسبتِ نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد مجدّد صاحبؒ دو مرتبہ اور دہلی تشریف لائے اور خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

پہلی مرتبہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے خوش خبری سُنائی کہ آپ کو نسبتِ نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی۔ اب قربِ خداوندی میں روز افزوں ترقی کی اُمید ہے۔

دوسری حاضری میں خلعتِ خلافت عطا فرمائی گئی اور خاص اصحاب کو تعلیم کے لئے مجدّد صاحب کے سپرد کیا گیا۔

تیسری بار حضرت خواجہ صاحب نے چند قدم چل کر استقبال فرمایا اور بڑی بڑی بشارتیں سُنائیں اور بہت کچھ اعزاز و اکرام کیا۔

حضرت امام ربّانی جب تیسری بار حضرت خواجہ صاحب سے رخصت ہونے لگے تو حضرت خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جب میں نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تھا تو استخارہ کیا۔ مجھے استخارہ میں معلوم ہوا کہ ایک شیریں نغمہ خوبصورت طوطا میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا ہے میں اپنا لعابِ دہن اُس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وُہ اپنی چونچ سے میرے منہ میں شکر ڈال رہا ہے۔ میں نے اس استخارہ کو حضرت شیخ مرشد خواجہ امکنگیؒ[1] سے بیان کیا۔ فرمایا کہ:۔

---

[1] آپ کی ولادت ۹۱۸ھ میں ہوئی، وفات ۱۰۰۸ھ میں۔ نوے سال عمر پائی۔ اپنے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے ایک عالم منوّر ہو۔ اور تم کو بھی اس سے حصّہ ملے۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کی بہت سی بشارتیں حضرت مجدّد صاحبؒ کو سُنا کر رخصت کیا۔

حضرت مجدّد صاحبؒ کا حُلیہ شریف اور اوصاف و خصائل

حُلیہ قد مبارک متوسط، چہرۂ انور باوجاہت، رنگ گندمی مائل بہ سفیدی، پیشانی کشادہ، داڑھی گھنی، آنکھیں بڑی بڑی، صورتِ اقدس انوار ولایت سے تاباں، خوبصورتی اور ملاحت کے ساتھ آثار رعب وہیبت نمایاں۔ جو دیکھ لیتا بے اختیار یہی کہتا:

تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡنَ

اوصاف نہایت حلیم، کریم النفس، مدبّر، ذہین، ذکی، کلام نہایت شیریں اور شائستہ و شُستہ، طبیعت نہایت غیوّر اور خود دار، استغنا۔ کی یہ حالت کہ باوجودیکہ جہانگیر جیسا بادشاہ غلام بن گیا تھا، مگر کبھی کوئی مستقل ذریعہ آمدنی کا نہ پیدا ہوا، نہ پیدا کرنے کا خیال فرمایا۔

اِتّباعِ سُنّت مندرجہ ذیل چند واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اتباعِ سُنّت اور بدعات سے اجتناب واحتیاط کس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔

(الف) ایک مرتبہ کسی خادم سے فرمایا۔ فلاں جگہ کچھ لونگیں رکھی ہیں، جاؤ لے آؤ۔ وہ گیا اور چھ دانے لے آیا۔ آپ نے اس کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ جفت کے مقابلہ پر طاق کو بہتر قرار دیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) والد ماجد درویش محمد صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ اور درویش محمد صاحبؒ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت خواجہ امکنگی حضرت شاہ نقشبند کے قدم بقدم چلنے میں ضرب المثل تھے اور جماعتِ تہجّد وغیرہ کی کچھ بدعتیں جو اس زمانہ میں طریقہ میں رائج تھیں اُن سے اجتناب فرماتے تھے ۱۲ (خطبہ شوقیہ)

گیا ہے۔ اسی کی رعایت مسنون ہے۔ اَللّٰہُ وِترٌ وَیُحِبُّ الوِتر۔

مَیں تو منہ دھوتے وقت خیال رکھتا ہوں کہ پہلے داہنے رخسار پر پانی پڑے۔ کیونکہ "تیَامُن" یعنی داہنی جانب کو مقدّم رکھنا بھی مسنون ہے۔

(ب) مکتوب نمبر ۳۱۳ جلد اوّل ص۴۵۶ مولانا محمد ہاشم صاحب کو اس سوال کے جواب میں کہ کُرتے کا چاک گریبان سامنے سینہ پر ہونا مسنون ہے یا شانوں پر؟ لکھتے ہیں:

بداں کہ ماہم دریں باب تردّد داریم اہلِ عرب پیراہن پیش چاک می پوشند وآں را سُنّت می دانند واز بعضے کتب حنفیہ مفہوم می شود کہ پیراہن پیش چاک مرداں را نباید پوشید کہ لباسِ زناں است۔

واضح ہو کہ اس بارہ میں ہمیں بھی تردد ہے۔ عرب والے سامنے سینہ پر گریبان رکھتے ہیں اور اسی کو مسنون قرار دیتے ہیں اور حنفیہ کی کچھ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے کُرتے میں سینہ پر گریبان نہ ہونا چاہیئے، یہ عورتوں کی وضع ہے۔

اس کے بعد فقہ کی کتابوں کی عبارتیں نقل فرمائی ہیں اور اپنی تحقیق یہ بیان فرمائی ہے، کہ چاک گریبان کے لئے کوئی خاص ہیئت مسنون نہیں ہے البتہ احادیث میں عورتوں سے مشابہ لباس پہننے سے منع فرمایا گیا ہے، لہٰذا جن مقامات میں عورتوں کے کُرتوں میں چاک گریبان سامنے رہتا ہو، وہاں مردوں کو شانوں پر چاک رکھنا چاہیئے، جیسا کہ علماء ماوراء النہر اور علماء ہند کی وضع ہے[1] چنانچہ حضرت کے کرتہ کا چاک بھی دونوں شانوں پر رہتا تھا۔

مختصر یہ کہ لباس، وضع قطع، رفتار گفتار، خورد و نوش، آدابِ مجلس، نشست و برخاست، رنج و راحت غرض ہر شعبۂ زندگی کے معمولی سے معمولی جزو میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی تحقیق اور تفتیش پوری کاوش اور جِدّ و جُہد سے کرتے اور پھر اسی کی اتّباع کرتے۔

مکتوب نمبر ۵۴ جلد دوم ص۱۰۰ تا ص۱۰۴ میں اتّباعِ سُنّت کے سات درجے بیان

---

[1] ص۱۰۳ جلد دوم مطبوعہ نول کشور۔

فرماتے ہوئے چوتھے درجہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

یہ درجہ اس کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا کہ انسان بدعت کے نام سے بھی نفرت اور پرہیز کرے حتّٰی کہ جن چیزوں کو بدعتِ حسنہ کہا جاتا ہے ان سے بھی اجتناب کرے۔

عبادت جس کے لئے دنیا نے صرف مرشد یا قطبِ عالم کے خطاب پر قناعت نہ کی ہو بلکہ مجدّد کا خطاب دیا ہو اور پھر مجدّد بھی ایک صدی کا نہیں بلکہ پورے ہزارہ کا مجدّد تسلیم کیا ہو، اس کی عبادت میں کثرت ایک بدیہی چیز ہے۔

ہاں نوافل میں جن چیزوں کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا تھا ان کا بیان غیر موزون نہ ہوگا۔ ابتدا میں نفل نمازوں میں سورۂ یٰسین پڑھا کرتے تھے جس کی تعداد اسّی ۸۰ تک پہنچتی ہے۔ مگر آخر میں ختمِ قرآن معمول ہوگیا تھا۔ جو دعائیں خاص خاص اوقات کے لئے احادیث میں وارد ہوئی ہیں، ان دعاؤں کا التزام گویا فطری عمل ہوگیا تھا جو بلا قصد بھی صادر ہو جاتا تھا۔

رات دن کا نظام الاوقات نصف شب سے تہجد کے لئے اُٹھنے کا معمول تھا۔ اور ہر دو رکعت کے بعد توبہ، استغفار، درود شریف اور دعاؤں کے بعد مراقبہ فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ فجر تک قائم رہتا تھا۔ فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کے بعد اشراق تک اپنے متوسّلین کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھتے تھے۔ اشراق کے بعد دیگر مشاغل میں مصروف ہوتے۔ اکثر متوسّلین کا ہجوم رہتا۔ حتّٰی کہ چاشت کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ چاشت کے بعد کچھ غذا تناول فرماتے۔ جو فقرار حاضر خانقاہ ہوتے وہ بھی دسترخوان پر حاضر ہوتے، یا اُن کو کھانا تقسیم کر دیا جاتا۔ کھانے کے بعد قیلولہ فرماتے۔ پھر زوال کے بعد سُنّتیں اور اس کے بعد ظہر کی سُنّتیں اور فرض وغیرہ سے فراغت پاکر متوسّلین باریاب ہوتے اور فیوض و برکات سے استفادہ کرتے۔ یہ سلسلہ نمازِ عصر تک جاری رہتا۔ اذانِ عصر کے بعد تحیۃ الوضوٗ اور عصر کے نوافل پڑھتے۔ پھر جماعت سے فراغت پاکر تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ نمازِ مغرب کے بعد نوافل کا طویل سلسلہ عشار کے قریب تک جاری رہتا نمازِ عشار کے بعد

آرام فرمانے کا وقت تھا۔ رات دن کے نوافل میں ایک قرآن شریف ختم کر لیا جاتا۔ اسی اثناء میں تصانیف، مکاتیب اور درس و تدریس، وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ سفر میں بھی معمولات پر پابندی کی کوشش کی جاتی۔

مجالس مجالس میں ذکرِ خیر، احادیث اور قرآن پاک کی شرح و تفسیر کا سلسلہ اہم ترین مشغلہ تھا۔ بسا اوقات حفّاظ سے اور نو وارد قراء سے بھی قرآن شریف پڑھوا کر سُنا جاتا۔ قرآن پاک سے شغف اور محبت کے متعلق گویا آپ کا معمول جامی کا یہ شعر تھا ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آبِ حیات
ضَاعَفَ اللّٰهُ بِهٖ کُلَّ زَمَانٍ عَطَشِیْ

مہمان نوازی ہر روز تقریباً ایک سو علماء، اور صلحاء، اور حفّاظ آپ کے دستر خوان پر حاضر ہوتے تھے۔ رمضان المبارک میں یہ تعداد اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

حُقوقِ عباد حقوقِ عباد کی ادائیگی ولایت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک مجدّد حُقوقِ عباد کی ادائیگی میں کس قدر مستعد ہوگا، اس کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اولاد کی خبر گیری، اہل و عیال کی تعلیم و تربیت، عُلومِ شرعیہ کی زبانی اور کتابی تعلیم اور احکامِ ربّانی پر عمل کرانے کی جِدّ و جُہد وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ولی اللہ کی پاک زندگی میں کسی بیان کی محتاج نہیں۔

ماحول اور خدمات

عبادت، حُسنِ معاشرت، ذکر و شغل، حُسنِ اخلاق بے شک بیش بہا جواہر ہیں، انمول موتی ہیں۔ دین و دنیا کی سعادتِ عظمیٰ کا راس المال ہیں۔ مگر مجدّدیت کا اثبات ان چیزوں سے نہیں کیا جاتا۔

مجدّد کا مطلب یہ ہے کہ وُہ ان رخنوں اور کوتاہیوں کو دُور کرے جو اہلِ ملّت کی افراط و تفریط کے باعث مِلّت میں پیدا ہو گئے ہیں۔

جبکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر سلسلۂ نبوّت ختم کر دیا گیا تو اہم سوال یہ تھا کہ انسانی طبقات کی فطری کجروی و شیطانی وسیسہ کاری جو بسا اوقات غیر دین کو دین کا رنگ دے کر یا ارکانِ دین کو غیر ضروری مان کر دجل اور آویزش سے ایوانِ دین کو متزلزل کر دیا کرے گی، اُس کا تدارک کیا ہوگا؟ تو اس کے علاج کے لئے جیسا کہ بہت سی احادیث میں یہ مضمون ادا فرمایا گیا کہ:

"اُمّتِ [1] اسلامیہ کے پختہ کار ربّانی علماء ہر زمانہ میں موجود رہیں گے جو راہِ مستقیم پر جم کر متوسّلین کو بھی سیدھی راہ بتاتے رہیں گے"۔

اسی طرح یہ بھی ارشاد ہوا:

انّ اللہ یبعث لھذہ الامۃ	خداوند عالم اس اُمّت کے لئے ہر سَو
علیٰ راس کل مائۃ سنۃ	سال پر ایک ایسا شخص پیدا کرتا رہیگا
من یجدّد لھا دینھا۔	جو دین کو تازہ کرتا رہے گا۔

(ابو داؤد شریف۔ مستدرک حاکم۔ معجم اوسط طبرانی بیہقی وغیرہ)

یہاں اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسی خدمات ہیں جن کی بنا پر اُمّت نے آپ کو نہ صرف سو سال کا مجدّد تسلیم کیا بلکہ پورے ہزارہ کا مجدّد آپ کو تسلیم کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ تجدید اور مجدّدیت کا تعلّق صرف کثرتِ عبادت و ریاضت یا حُسنِ طریقت سے نہیں رہ جاتا۔ یہاں اس کے ماسوا کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خود حضرت مجدّد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"فرزندا! باوجود اس معاملہ کے جو میری پیدائش سے متعلق ہے ایک بڑا کارخانہ

---

[1] لا تزال طائفۃ من امّتی ظاھرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتّٰی یاتی امر اللہ۔ (صحاح)

[2] اے فرزندا باوجود ایں معاملہ کہ بخلقت من مربوط بودہ است کارخانۂ عظیم دیگر بمن حوالہ فرمودہ اند و برائے پیری و مریدی مرا نیاوردہ اند ومقصود از خلقتِ من تربیت وارشادِ خلق نیست۔ معاملہ دیگر ست وکارخانہ دیگر دریں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت والّا لا۔ معاملۂ تکمیل وارشاد (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

میرے حوالہ فرمایا گیا ہے۔ پیری مریدی کے لئے مجھ کو نہیں لایا گیا اور میری پیدائش سے سالکین کی تربیت اور ارشاد خلق بھی مقصود نہیں۔ ایک دوسرا معاملہ ہے اور ایک دوسرا کارخانہ۔ اس اثنا میں جو شخص مناسبت رکھے گا، فیض حاصل کرے گا ورنہ نہیں۔ میرے سپرد کردہ کارخانہ کے مقابلہ میں تکمیل وارشاد کا معاملہ تو ایک ایسا معاملہ ہے جیسے راستہ کی کوئی پڑی ہوئی چیز ہو"۔

کارخانہ سے اشارہ صباحت وملاحت وغیرہ کے اُن دقیق اور غامض اسرار کی جانب ہے جو مکتوب کے پہلے حصّہ میں بیان فرمائے گئے۔ مگر ہم جیسے کور باطن جو تاریخ کے اوراق کو سامنے رکھ کر واقعات کے اسباب اور دعووں کے دلائل تلاش کرنے کے عادی ہیں کسی رُوحانی کارخانہ کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم حقیقتِ آفتاب سے واقف نہیں ہم تو نُورِ آفتاب دیکھ کر ہی کہہ دیا کرتے ہیں آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ لہٰذا معیّن طور پر یہ دعویٰ تو یقیناً بے محل ہوگا کہ مجدّدیت کی جو دلیل ہم تاریخ کی روشنی میں پیش کریں گے صرف وہی ایک دلیل ہے۔ البتہ یہ یقیناً کہیں گے کہ تاریخ بھی اپنے اوراق کے دامنوں میں کچھ ایسے واقعات چھپائے ہوئے ہے جن کے انجام دینے والے کو لامحالہ مجدّد ہی کہنا چاہیئے۔ تاریخی حیثیت سے دلائل مجدّدیت پیش کرنے کی خاطر ہمیں سب سے پہلے اُس ماحول کا تعارف کرانا ضروری ہے جس میں حضرت مجدّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ظہور فرمایا اور اپنی مقدّس حیات کے ۶۳ سال گذارے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نسبت بالہ کارخانہ امرے ست ہیچو مطروح فی الطریق (مکتوب نمبر ۶ جلد دوم صـ۱۷)۔

فتنۂ اکبری

اکبری اور جہانگیری عہد ۹۶۳ھ سے لے کر ۱۰۱۴ھ تک پچاس سال سے بھی کچھ زائد جلال الدین اکبر ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ اُس کو آج بھی شہنشاہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پھر ۱۰۱۴ھ سے جہانگیری عہد شروع ہوتا ہے جو ۲۲ سال کے بعد حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ساتھ ساتھ ختم ہوا۔ حضرت مجدد صاحبؒ ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے جو عہدِ اکبری کا شباب تھا۔ سترہ ۱۷ سال تعلیم و تربیت کے ختم کر کے اس فریضہ کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے جس کا نتیجہ مجددیت کا خطاب تھا۔ یعنی ۹۸۸ھ سے جو کہ عہدِ اکبری کا پُر شوکت دور تھا آپ نے اصلاحی خدمات شروع کیں۔

کہہ سکتے ہو کہ ظہرِ اسلام سیاست ہے اور اسی لئے سیاسی خدمات کو اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ جب کوئی اس نظریہ کو لے کر اسلامی خدمات انجام دینا چاہے گا تو لامحالہ اس کا مقابلہ سب سے پہلے اُس زمانہ کی سیاست سے ہوگا۔ چونکہ شخصی حکومتوں میں بادشاہ کا طرز و طریق اور اس کے افعال و اطوار ہی سیاست ہوتے ہیں لہٰذا اکبر کی سیاست بیان کر دینا ہی حضرت مجدد صاحب کے سیاسی ماحول کا بیان ہوگا۔

مگر اکبری سیاست کی توضیح و تشریح سے پیشتر چند چیزیں پیش کرنی ضروری ہیں۔

آج جبکہ تاریخی موشگافیوں میں رگِ گُل پر بھی نشتر زنی سے نہیں چُوکا جاتا اور شوقِ تحقیق میں چیونٹی کی آنکھوں کے پردے گننے کی بھی ہمت کی جاتی ہے تو اس معمہ کے حل کرنے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہونی چاہیئے کہ:

(الف) جلال الدین اکبر کو "اکبر دی گریٹ" کیوں کہا جاتا ہے؟

(ب) بیربل اور اکبر کی کہانیاں کیوں آج تک ہندوستان کے گلی کوچوں میں برادرانِ وطن کے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، اور اس کے نورتن کا تذکرہ کیوں آجتک دلچسپ اور بنا ہوا ہے؟

(ج) غریب عالمگیر کا کونسا جرم ہے کہ مذہبی تعصب، مذہبی دیوانہ اور لفظ عالمگیر کو مرادف بنا لیا گیا ہے؟ حتیٰ کہ بقول مولانا[1] مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ:

کمپنی بہادر کے عہد میں سب سے پہلے جو ہندوستان کی تاریخ فارسی زبان میں مرتب ہوئی، وہ بہار جو بنگال کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے پہلا اجارائی محروسہ ہے، اسی بہار کے ایک طباطبائی سید صاحب کے قلم سے یہ فقرہ ان کی کتاب سیرالمتاخرین میں درج ہوا۔

"مذہب[2] الٰہی جس میں خلق اللہ کے لئے بے شمار فائدے تھے جہانگیر کے زمانہ تک اس کا چرچا اور رواج رہا اور پھر شاہ جہاں کے زمانہ سے تعصب شروع ہوا اور عالمگیر کے عہد میں اس نے شدت اختیار کر لی۔"

ہم یہاں ملا عبدالقادر صاحب بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" کے اقتباسات کو مذکورہ بالا سوالات کے حل کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

ملا صاحب موصوف عہدِ اکبری کے مؤرخ ہیں۔ درباری آدمی ہیں حلفیہ شہادت[3]

---

[1] ملاحظہ ہو "الفرقان" کا مجدد نمبر ص۱۰۷۔ [2] مذہب الٰہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دراں بود، تا عہدِ جہانگیری رواج داشت۔ باز از عہدِ شاہِ جہاں تعصب شروع شد و در عہدِ عالمگیر شدت پذیرفت ۱۲ (سیرالمتاخرین ص۱۴۴ جلد اوّل)۔ [3] ملا صاحب تحریر فرماتے ہیں: دلیری بر نوشتن آں قضایا کہ از وادی حزم و احتیاط بغایت دور بود کردم و خدائے عزّ و جل گواہ ست وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا کہ مقصود ازیں نوشتن غیر از دردِ دین و دل سوزی بر ملّتِ مرحومہ اسلام کہ عنقا دار روئے غربت کشیدہ و سایۂ بال ہمائے خود را از خاک نشینانِ گیتی باز گرفتہ چیزے دیگر نبود و از تعنت و حقد و حسد و تعصب بخدا پناہ می جویم (ص۲۶۴)

کے ساتھ تمام واقعات کو قلمبند کرتے ہیں اور اس موقع پر ہم شکر گذار ہیں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے کہ آپ کے مضمون[1] نے ہمیں ترتیب کی اُلجھن سے نجات دلادی۔ فللہ الحمد ولھم الشکو جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

اکبر بادشاہ کی سیاست

اکبر بادشاہ ۱۵۴۲ء / ۹۵۰ھ میں سندھ کے ریگستان میں "امرکوٹ" کے مقام پر اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کا باپ "ہمایوں" شیر شاہ افغانی کے ہاتھ سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ ہمایوں کی جب وفات ہوئی تو اس کی عمر ۱۳ سال ۴ ماہ تھی۔ تخت سلطنت پر اکبر کو بِٹھا دیا گیا۔ اور اس کے اتالیق "بیرم خاں" کے ہاتھ حکومت کی باگ ڈور دے دی گئی اِس وقت اس کو عادل شاہ اور سکندر سوری کی افغانی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کچھ دنوں اکبر بیرم خاں کی تربیت میں رہا، اور جب زمام حکومت مستقل طور پر اُس نے اپنے ہاتھ میں لی تو اسکی سیاست تین طاقتوں میں محصور تھی۔

(الف) افغان، جن سے اس کا باپ شکست کھا کر ہندوستان سے جلاوطن ہو چکا تھا اور پھر خود اکبر کو اُن کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔

(ب) شیعہ جن کا مرکز ایران تھا اور جن کی بدولت ہمایوں کو دوبارہ دہلی کا تخت نصیب ہوا تھا۔

(ج) ہندو جو اگرچہ ہندوستان میں ۹۵ فیصدی اکثریت میں تھے مگر شاہانِ گذشتہ کے رعب و شکوہ سے اس درجہ مقہور ہو چکے تھے کہ اب ان میں مقابلہ کی طاقت نہیں رہی تھی۔

---

[1] یہ مضمون مجدد نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں ہماری جماعت پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے جگہ جگہ نکتہ چینی کی ہے، لیکن کسی فاضل کی کسی بہتر خدمت کو نظر انداز کر دینا یا اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا ذکر نہ کرنا بدترین بخل اور قابلِ نفرت خیانت ہے۔ اعاذنا اللہ من الجبن والبخل والماثم والمغرم والحسد والبغضاء۔ ۱۲ منہ

اکبر اگر کسی ایک مذہب پر مستقل طور سے قائم رہتا تو اس کو دوسرے مذہبوں سے ٹکرانا پڑتا تھا۔ اور چونکہ افغان اس کے مقابل تھے، لہٰذا اکبر کے لئے شیعوں اور ہندوؤں کی دلداری کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے سیاست کو مذہب پر ترجیح دی اور سُنّیوں کے سوا ہر ایک کی دلداری میں مشغول ہو گیا۔ اپنے دربار میں ہر مذہب کے علماء کا اجتماع کرانا، مباحثے سُننا، یہ اس کی سیاست تھی تاکہ ہر ایک مذہب کی توقعات اس سے وابستہ ہوں۔ کاش وہ مذہب کا عالم ہوتا، تو اسی دلداری میں اسلامی حکومت کا نقشہ بھی قائم کر دیتا۔ ورنہ کم از کم بددینی نہ اختیار کرتا۔ مگر وہ دستخط کرنے بھی نہ جانتا تھا۔ اس نے اصلاح کے بجائے افساد کی طرف قدم بڑھایا، اور ایک نئے مذہب کی ترتیب شروع کر دی جس کا نام "دینِ الٰہی" تھا۔

منتخب التواریخ کے الفاظ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی ترتیب کے مطابق اس مذہب کی داستان ملاحظہ فرمائیے:

دینِ الٰہی کے عناصر "آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر اور آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا۔ اور ایک ہزار ایک آفتاب کے ہندی ناموں کو اپنا وظیفہ بنایا تھا۔ ٹھیک دوپہر کو آفتاب کی طرف متوجّہ ہو کر حضورِ قلب کے ساتھ ان ناموں کو پڑھا کرتا تھا اور اپنے دونوں کانوں کو پکڑ کر بادشاہ ایک چرخ کھاتا اور کانوں کی لو پر مُکّے لگاتا اور اسی قسم کی دوسری حرکات بھی بہت سی بادشاہ سے صادر ہوتی تھیں۔ وہ قشقہ بھی لگاتا تھا اور آدھی رات کو ایک دفعہ، پھر طلوعِ آفتاب کے وقت دوسری بار روزانہ نوبت اور نقارہ بھی مقرر تھا۔"

لے عبادتِ آفتاب را روزے چہار وقت کہ سحر و شام و نیم روز و نیم شب باشد لازم گرفتند و ہزار و یک نام ہندی آفتاب را وظیفہ ساختہ۔ نیم روز متوجّہ آں شدہ بحضورِ دل می خواندند و ہر دو گوش گرفتہ و چرخے زدہ مُشتہا بر بناگوش کوفتہ حرکاتے دیگر نیز ازیں قبیل بسیار بود و قشقہ کشیدند و نوبت و نقارہ یکے در نیم شب و یکے در وقتِ طلوع قرار یافت ۱۲ صفحہ ۳۲۲

یہ قاعدہ مقرر تھا کہ جب آفتاب کا ذکر کیا جائے تو (العیاذ باللہ) جَلَّت قُدْرَتُہٗ کہا جائے۔

"اسی[1] طرح آگ پانی درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیّٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ اور جینو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا، اور آفتاب کے مسخر کرنے کی دعا جس کی تعلیم ہندوؤں نے دی تھی "ورد" کے طور پر آدھی رات کو اور طلوعِ آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔"

اور صرف عبادت ہی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ "ربوبیت" میں بھی اس کو شریک ٹھیرایا جاتا تھا کہ:

"آفتاب[2] نیّرِ اعظم ہے اور سارے عالم کو وہ داد وہش کرتا ہے۔ بادشاہوں کا مُربّی اور سرپرست سورج ہی ہے، اور سلاطین اس کو رواج دینے والے۔"

کواکب پرستی میں غلو اس قدر بڑھ گیا تھا کہ:

"بادشاہ[3] اپنے لباس کا رنگ سات ستاروں کے رنگ کے موافق رکھتے تھے۔ چونکہ ہر دن کسی ستارہ کے ساتھ منسوب ہے، اس لئے ہر دن کے لباس کا رنگ جداگانہ ستارہ کے رنگ کے مطابق ہوتا تھا۔"

"خنزیر" کے متعلق بھی ہندوؤں نے باور کرایا تھا کہ:

"خوک از آں مظہر است کہ حق تعالیٰ دراں حلول کردہ"۔ (العیاذ باللہ)

مبدا، اور معاد پر مذاہب کی بنیاد قائم ہے۔ ان میں سے مبدا کے متعلق تو یہ عقیدہ قرار دیا گیا۔ رہا معاد یعنی "بعد مردن" اس کے متعلق جدید دین میں:

---

[1] ہمچنیں آتش و آب و سنگ و درخت و سائر مظاہر روزگار تا گاؤ و سرگیں آں و نیز قشقہ و زنار را جلوہ داد و دعا تسخیر آفتاب کہ ہندواں تعلیم دادہ بودند بطریق ورد در نیم شب و وقتِ طلوع خواندن گرفتہ ۱۲ صفحہ ۲۶۱۔

[2] آفتاب نیّرِ اعظم و عطیہ بخش تمام عالم و مربّی بادشاہاں و بادشاہاں مروّج او یند ۱۲ صفحہ ۲۶۱

[3] لباس راموافق رنگ یکے از سبع سیارہ کہ ہر روزے بکوکبے منسوب است ساختند ۱۲ صفحہ ۲۶۱

"تناسخ[1] کے عقیدہ میں بڑی پختگی پیدا ہو گئی تھی"۔

اعظم خان گورنر بنگال جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا:

"ہم[2] نے تناسخ کی صداقت پر قطعی دلائل حاصل کر لئے ہیں، شیخ ابوالفضل تمہارے ذہن نشین کرا دے گا"۔

اس مسئلہ کے متعلق خوش اعتقادی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ برہمنوں کے مشورہ سے بادشاہ صرف سر کے بیچ کے بال منڈوایا کرتے تھے اور چاروں طرف کناروں کے بال چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ چونکہ بادشاہ کی روح کامل مکمل ہو چکی ہے اور:

"کامل[3] مکمّل لوگوں کی رُوح کھوپڑی (تالو) کی راہ سے نکلا کرتی ہے جو (بدن کے سوراخوں میں سے) دسواں سُوراخ ہے۔ جس وقت کاملوں کی رُوح کھوپڑی سے نکلتی ہے، اُس وقت ایک کڑاکے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ آواز میّت کی سعادت و نجات کی دلیل ہوتی ہے اور یہ کہ مُردوں کو گناہوں سے نجات ہو گئی (جلنے کے وقت آخر میں جو مُردوں کی کھوپڑی پھٹتی ہے، اُس وقت ایک آواز قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے، شاید برہمنوں نے اسی کو نجات کی دلیل بنا لیا ہو گا) اور مذہب تناسخ کے بموجب اس بات کی علامت ہے کہ یہ رُوح کسی ذی شوکت، صاحبِ اقتدار اور مطلق العنان بادشاہ کے بدن میں جنم لے گی"۔

گویا اس طریقہ سے بادشاہ کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد پھر کسی دوسرے تخت پر اسی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ اگرچہ بعض برہمنوں نے تو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اکبری عہد (الف ثانی) سے چونکہ بجائے قمر کے زحل کا عمل و دخل شروع ہو گیا ہے اس لئے

---

[1] در مذہب تناسخیہ رسوخ قدم حاصل شد ۱۲ ص ۲۵۵۔ [2] ما دلائل قطعی بر حقیقتِ تناسخ یافتہ ایم شیخ ابوالفضل خاطر نشان شما خواہد کرد ۱۲ منتخب ۳۰۳ [3] روح کامل مکمّلان از راہِ ہامہ کہ منفد دہم است خروج کند و دراں وقت آوازے مثل صاعقہ بر آید و آں دلیلِ سعادت و نجات میّت است از گناہاں و علامت حلول روح است بمذہب تناسخ در بدن بادشاہے ذی شوکتے صاحب اقتدارے نافذ امرے ۱۲ ص ۳۲۵۔

عمر کی کمی جو دورۂ قمر کا نتیجہ تھی، اب نہ ہوگی۔ دورۂ زحل کے متعلق خیال تھا کہ "مجدّد و اطوار و ادوار و مورث طول اعمار است"۔

الغرض پہلے تو موت ہی کے وجود کو ایک دور دور از زمانہ تک ملتوی کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی یقین دلایا گیا کہ آئندہ بھی بادشاہ کی روح کسی ایسے بادشاہ کے جون میں حلول کرے گی جیسا کہ وہ خود تھا۔ ان باتوں نے تناسخ پر اس کے قدم کو راسخ کر دیا تھا۔

ملّا عبد القادر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مہابھارت کے ترجمہ میں بے ساختہ ایک قصہ کے ذکر میں میرے قلم سے یہ مصرعہ نکل گیا تھا کہ ع

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

بادشاہ نے جس وقت یہ مصرعہ سُنا، بگڑ گیا۔

"بادشاہ[1] نے منکر نکیر کے سوال، حشر و نشر، حساب و میزان وغیرہ پر اس مصرعہ کو محمول کر کے اس کو اپنے عقیدہ تناسخ کے مخالفت قرار دیا جس کے سوا وہ کسی چیز کا قائل نہیں تھا"۔

مُلّا بیچارے کی خیر نہیں تھی۔ بارے ترجمہ کے حیلے سے رہائی ملی۔

عقائد کے یہی دو اہم جزو تھے اور اکبر کا ان ہی میں یہ حال تھا۔ یہ تھے عقائد "اکبر دی گریٹ" کے۔ اور ستم ظریفی یہ تھی کہ بایں ہمہ شرک:

"توحیدِ الٰہی[2] کے نام سے اس مذہب کو موسوم کیا گیا تھا"۔

مریدوں سے باضابطہ اس دین میں داخل ہونے کے متعلق بیعت لی جاتی تھی۔ سب سے پہلے جو کلمہ پڑھایا جاتا تھا جیسا کہ مُلّا صاحب لکھتے ہیں:

"طے کر دیا[3] کہ مکلف کریں کہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے ساتھ اعلانیہ طور پر "اکبر خلیفۃ اللہ" بھی کہیں"۔

---

[1] ایں معنی را حمل بر سوال منکر نکیر و حشر و نشر و حساب و میزان وغیر آں نمودہ مخالف قرار داد خویش کہ بغیر تناسخ ہیچ چیز قائل نیستند ۱۲ صنے ۲ [2] بتوحید الٰہی موسوم ساختند ۱۲ ص ۳۱۵ – [3] قرار دادند کہ بکلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اکبر خلیفۃ اللہ علانیہ تکلیف نمایند ۱۲ ص ۲۷۳ –

بلکہ اس قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض مریدوں ہی تک یہ بات محدود نہ تھی بلکہ عام رعایا کو بھی اس کے کہنے پر قانونی حیثیت سے مجبور کیا جاتا تھا۔

بہر حال جو لوگ اس دین میں باضابطہ داخل ہوتے تھے، ان کو مذکورہ بالا کلمہ کے ساتھ حسبِ ذیل عہد نامہ کا اقرار کرنا پڑتا تھا۔ ملا صاحب نے اس عہد نامہ کو بجنسہٖ نقل کر دیا ہے۔

"[1] من کہ فلاں ابنِ فلاں ہوں۔ اپنی خواہش و رغبت اور دلی شوق کے ساتھ دین اسلام مجازی اور تقلیدی سے (جو باپ دادوں سے دیکھا اور سنا تھا) علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دینِ الٰہی میں داخل ہوتا ہوں۔ اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں یعنی ترکِ مال، ترکِ جان، ترک ناموس و عزّت، ترکِ دین کو قبول کرتا ہوں"۔

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے تھے اُن کو موافق اصطلاحِ جوگیاں :

"[2] جس جماعت کو مرید کرتے تھے، ان کا نام الٰہی رکھتے تھے"۔

ان لوگوں کے لئے یہ دستور ٹھیرایا گیا تھا کہ :

"[3] اپنے خطوط کے سرناموں میں اللہ اکبر لکھا کریں"۔

نیز بجائے سلام کے :

"مرید جب باہم ملتے جلتے تھے تو ان میں ایک "اللہ اکبر" اور دوسرا "جل جلالہ" کہتا[4]۔

مرید کرنے کا طریقہ یہ تھا :

"[5] بارہ بارہ آدمیوں کی ٹولیاں نوبت بنوبت بادشاہ سے مرید ہوتیں، اور مشرب

---

[1] منکہ فلاں ابنِ فلاں باشم بطوع و رغبت و شوقِ قلبی ازیں اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابراء و تبرا نمودم و در دینِ الٰہی اکبر شاہی درآمدم و مراتب چہار گانہ اخلاص کہ ترکِ مال و ترک جان و ناموس و دین باشد قبول کردم ۱۲ ص ۲۷۳۔ [2] جماعت را کہ مریدی گرفتند الٰہیان مشہور بودند ۱۲ ص ۲۹۹۔ [3] اللہ اکبر عنوان نامہ ہائے قرار یافت ص ۳۲۱۔ [4] مریدان چوں ہمدگر ملاقات بگیرند یکے اللہ اکبر و دیگرے جل جلالہ گوید ص ۳۵۶۔ [5] ہر دوازدہ نفر نوبت بنوبت و مثل بمثل مرید شدہ موافقت در مشرب و مذہب می نمودند ۱۲

مذہب میں یہ لوگ موافقت اختیار کرتے"۔

ان کو شجرہ بھی دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ شجرہ کیا ہوتا تھا۔" حامیانِ تجدّد" کے لئے باعثِ رشک ہے۔ ہائے ؎

حریفاں باد ہا خوردند و رفتند تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

"شجرہ[1] کی جگہ بادشاہ کی ایک تصویر مریدوں کو دی جاتی تھی۔ اس تصویر کو اخلاص کی علامت، پختگی و دولت واقبال کا مقدمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ایک مرصّع جواہر نگار غلاف میں اس تصویر کو رکھ کر یہ لوگ اپنی اپنی دستاروں پر لگاتے تھے"۔

علاوہ ان معبودوں کے جنہیں پیر پوجتا تھا، مریدوں کے لئے خود بادشاہ کی عبادت بھی "دین جدید" کے اہم ارکان میں شمار کی جاتی تھی۔ اس عبادت کا خاص طریقہ ملّا صاحب لکھتے ہیں:

"ہر صبح اس وقت جبکہ بادشاہ جھروکہ میں آفتاب کی پوجا کرتا تھا، ان مریدوں کی جبتک بادشاہ کے مبارک چہرہ پر نظر نہ پڑتی، دتون کرنا اور کھانا پانی ان پر حرام رہتا۔ ہر ایک حاجت اور ضرورت والے کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عورت ہو یا مرد، تندرست ہو یا بیمار غرض سب ہی طرح کے لوگوں کو اس جگہ آنے کی عام اجازت تھی۔ جس کا نتیجہ کہ ایک بڑا ہنگامہ، ایک بڑا میلہ روز لگ جاتا تھا۔ بادشاہ جونہی آفتاب کے ایک ہزار ایک نام کے وظیفہ سے فارغ ہو کر پردہ سے باہر آتا، سب کے سب ایک دفعہ سجدہ میں گر جاتے"[2]۔

الغرض بادشاہ تو ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر اُس چیز کا پجاری بن گیا تھا، جس میں

---

[1] بجائے شجرہ شبیہے دادہ آں را علامتِ اخلاص و مقدمہ رشد و دولت می دانستند و در غلافے مرصّع پیچیدہ بالائے دستار می گذاشتند ۱۲ صفحہ ۳۴۱

[2] ہر صباح بہ وقتِ عبادتِ شمس بجھروکہ تا طلعت مبارک نمی دیدند مسواک و طعام و آب بر ایشاں حرام بود و در ہر یکے صاحب حاجتے و نیاز مندے از ہندو و مسلم و انواع طوائف مرد و زن، صحیح و سقیم را آنجا بار عام بود و کار بارے طرفہ و ہنگامہ گرمے و از دحامے عظیمے دہمیں کہ از تسبیح ہزار و یک نام نیرّ اعظم فارغ شدہ از حجاب بر می آمدند ایں جماعت در سجود می افتاد ۱۲ صفحہ ۲۲۶

نفع وضرر کا پہلو کچھ بھی نمایاں ہوتا اور بادشاہ کے مرید علاوہ ان معبودوں کے خود اپنے پیر کو بھی پوجتے تھے۔ اسی سجدہ کا نام "زمین بوس" رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں تاج العارفین صاحب کا صوفیانہ اغوا بھی شریک تھا۔ یہ مولانا زکریا اجودھنی کے صاحبزادے تھے، اور نزہۃ الارواح جو تصوّف کی مشہور کتاب ہے، اس پر شرح بھی لکھی تھی، آپ ہی نے بادشاہ کو "عین واجب" لاأقل عکس واجب قرار دے کر:

"بادشاہ کے لئے[1] سجدہ کو واجب قرار دیا (اس کا نام زمین بوس رکھا) اور بادشاہ کے ادب کا خیال فرض عین قرار دے کر اُس کے چہرہ کو قبلۂ حاجات، اور کعبۂ مرادات بتایا۔۔۔ اور بعض کمزور روایتوں اور ہندوستان کے بعض صوفیوں کے طرزِ عمل سے اس دعوے کو ثابت کیا۔"

"زمین بوس" کا یہی طریقہ تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔ حضرت مجدّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل کا زخم اس مسئلہ کے منہ سے بالآخر پھُوٹ پڑا۔ جیسا کہ آئندہ ذکر آتا ہے۔ اکبری عہد میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص علماء بھی اس مشرکانہ فعل کے مرتکب ہوتے تھے۔ مُلّا صاحبؒ نے ایک عالم کی تصویر زمین بوس کے وقت کی کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ مولوی دربار میں جس وقت حاضر ہوا، تو:

"گردن[2] ٹیڑھی کر کے کورنش بجالایا اور دیر تک ہاتھ اور آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ دیر کے بعد جب اس کو بیٹھنے کا حکم ملا تو فوراً سجدہ میں چلا گیا اور بے کینڈے اُونٹ کی مانند بیٹھ گیا۔"

یہ حال عقائد و عبادات کا تھا۔ ان کے سوا اور جو باتیں اس "دین" کے رسوم و عادات میں تھیں۔ ان کا افسانہ طویل ہے تاہم خروارے سے ایک ہی "مُشت" پر کفایت کی جاتی ہے:

سُود اور جوئے کی حِلّت

مُلّا صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] سجدہ برائے او تجویز کردہ آں را زمین بوس نامیدند و رعایت ادبِ بادشاہ را فرض عین شمردہ روئے اورا کعبۂ مرادات و قبلۂ حاجات دانانیدند و بعضے روایاتِ مرجوحہ و عمل مریدان مشائخ ہند را دریں باب بتمسک آوردند ۲ ص ۲۵۹۔ [2] گردن کسر کورنش کردہ تا دیرے دست بستہ چشم پوشیدہ ایستادہ مانند بعد از مدّتے چوں حکم نشستن فرمودند سجدہ بجا آوردہ و مانند اشتر لوک نشست ۱۲ ص ۲۴۷۔

"سود[1] اور جُوا حلال کر دیا گیا تھا۔ اسی پر دوسری حرام چیزوں کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ ایک "جُواگھر" خاص دربار میں بنایا گیا تھا، اور جواریوں کو شاہی خزانہ سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔

شراب کی حِلّت فتویٰ دیا گیا کہ:

"شراب[2] اگر بدن کی اصلاح کے لئے طبّی طور پر استعمال کی جائے اور اس کے پینے سے کوئی فتنہ و فساد پیدا نہ ہو، اس طرح شراب پینا جائز ہے۔ البتہ حد سے گذرا ہوا نشہ اور اس کی وجہ سے لوگوں کا جمع ہو کر شور و غوغا مچانا، بادشاہ کو اگر اس کی خبر ہو جاتی تھی، تو سخت دار و گیر کرتے تھے۔"

اور جس طرح جوئے اور سود کی حِلّت کی عملی شکل اختیار کی گئی تھی، بادشاہ نے خود ہی:

"ایک دوکان شراب فروشی کی دربار ہی کے پاس دربان عورت جو شراب فروشوں کی نسل سے تھی، اس کے اہتمام میں قائم کی گئی تھی، اور اس کے نرخ بھی خود ہی مقرر کئے تھے۔"[3]

گویا محکمہ "آب کاری" کی ہندوستان میں یہ پہلی بنیاد تھی۔ شراب کے مسئلہ میں بادشاہ کو جس قدر غلو تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ:

"نوروز[4] کی مجلسوں میں اکثر علماء و صلحاء، بلکہ قاضی و مفتی تک شراب نوشی کے میدان میں اُتارے جاتے تھے۔"

"نشاط" کی اس مجلس میں مختلف لوگوں کے نام سے جام تجویز کئے جاتے تھے۔

ملّا صاحب لکھتے ہیں کہ:

---

[1] ربوٰ و قمار حلال شد و دیگر محرمات بریں قیاس باید کرد و قمار خانہ در دربار بنا کردہ، زرے بسود مقامران از خزانہ می دادند۔ [2] شراب اگر بحیثیت رفاہیت بدنی طریق اہلِ حکمت بخورند و فتنہ و فسادے ازاں نزاید مباح باشد بخلاف مستی مفرط و اجتماع و غوغا کہ اگر ایں چنیں یافتند سیاست بلیغ نمودند۔ ۱۲ - [3] دوکانِ شراب نوشی بر دربار باہتمام خاتون دربان کہ از نسلِ خمار است برپا کردہ، نرخے معین نہادند ۱۲ - [4] در مجالس نوروزی اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی را نیز در وادی قدح نوشی آوردند ۱۲ -

"ملک[1] الشعراء (فیضی) فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیالہ میں فقہاء کے "اندھاپن" کے نام سے پیتا ہوں"۔

ڈاڑھی کی دُرگت شراب کی حِلّت کے بعد "دینِ الٰہی" میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا تھا وہ ریش تراشی کا مسئلہ تھا۔ مُلّا صاحب کا بیان ہے کہ ابتداءً ڈاڑھی منڈانے کا خیال "دختران راجہائے عظیم" کی بدولت پیدا ہوا۔ پھر کیا تھا۔ اس خیال کی تائید میں عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل کا دریا بہا دیا گیا۔ عقلی دلائل میں دلچسپ دلیل تو یہ تھی کہ:

"ڈاڑھی[2] کے بال کی سیرابی چونکہ خصیتین سے ہوتی ہے، چنانچہ کسی خواجہ سرا کے ڈاڑھی نہیں ہوتی، اس کے رکھنے میں کیا ثواب ہو سکتا ہے"۔

اور نقلی دلائل جو اس سلسلہ میں پیش کئے گئے، ان میں بعض سُننے کے قابل ہیں۔ اُن ہی سے دوسری دلیلوں کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ فقہ کی کسی کتاب میں لکھا ہوا تھا کہ ڈاڑھی کو اس طرح نہیں ترشوانا چاہئے جس طرح عراق کے اوباش کرتے ہیں۔

اوباش کا ترجمہ عربی میں عُصاۃ سے کیا گیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی صورت کو واحد نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش میں ایک مولوی صاحب نے عین کو قاف بنا دیا اور شاہی دربار میں اُنہوں نے عبارت اس شکل میں پیش کی۔

کمایفعلہ قضاۃ العراق۔ جس طرح عراق کے قاضی منڈایا کرتے ہیں

دلیل یہ تھی کہ جب عراق کے قاضی ڈاڑھی منڈاتے تھے تو ہندوستان کے کیوں نہ منڈائیں۔ مُلّا ابوسعید پانی پتی جو مُلّا امان کے بھتیجے تھے، ان کے پُرانے مسوّدوں سے ایک حدیث[3] بھی بارگاہِ شاہی میں گذرانی گئی جس کا ترجمہ مُلّا صاحب نے یہ درج کیا ہے:

ایک[4] صحابی کے صاحبزادے ڈاڑھی منڈائے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے

---

[1] ملک الشعراء (فیضی) میگفتند کہ ایں پیالہ بکوریٔ فقہاء می خوریم ۱۲ [2] ریش از خصیتین آب می خورد لہٰذا ہیچ خواجہ سرائے ریش ندارد و درنگاہ داشتن او چہ ثواب ۱۲۔ [3] اس من گھڑت کو حدیث بھی اسی حیثیت سے کہا گیا ہے کہ بر عکس نہند نام زنگی کافور ۱۲ منہ۔ [4] پسرِ صحابی میترش در نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

گذرے حضورؐ نے فرمایا کہ بہشت والوں کی یہی صورت ہوگی"۔

آخر میں ریش تراشی کے معاملہ میں اکبر کا جنون اس حد کو بڑھ گیا تھا کہ "ریش تراشی بکلاش میکردند" بیچارے مُلّا صاحب نے اس کی تاریخ بھی لکھی۔

بگفتہ ریشہا برباد وادہ مفسدے چند

دربارِ اکبری کے بڑے بڑے فضلاء وعلماء روزمرہ اپنی اپنی ڈاڑھیاں بادشاہ کے قدموں پر نثار کرتے تھے۔

غسلِ جنابت ایک مسئلہ اس "دینِ جدید" کا یہ بھی تھا:

"ناپاکی کی وجہ سے[1] غسل کے فرض ہونے کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا۔ اس لئے کہ منی نیک لوگوں کی پیدائش کا تخم ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ پہلے آدمی غسل کرے بعد اس کے ہمبستر ہو"۔

قانونِ نکاح اور سارد ا ایکٹ نکاح کے متعلق چند جدید قوانین نافذ کئے گئے ایک تو یہ کہ دخترِ عم وخال را نکاح نکنند کہ میل کم شود۔ اور اسی کے ساتھ یہ قانون بھی بنا دیا گیا کہ:

"سولہ[2] سال سے پہلے لڑکوں کا اور چودہ سال سے پہلے لڑکیوں کا نکاح جائز نہ ہوگا اس لئے کہ بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں"۔

گویا سارد ا ایکٹ کا نفاذ بھی اسی زمانہ میں ہو گیا تھا۔ مُلّا صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کو عذر میں پیش کیا تھا۔ غنیمت ہے کہ اکبر نے صرف واقعہ کے انکار پر قناعت کی، جیسا کہ لکھتے ہیں:

آنحضرت[3] صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقہؓ کی رخصتی کے بالکل منکر تھے (یعنی عمر کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آمد فرمودند کہ اہلِ بہشت بایں ہیئت خواہند بود ۱۲ ص ۲۷۸

[1] فرضیتِ غسلِ جنابت مطلقاً ساقط شد کہ تخم آفرینش نیکاں است بلکہ مناسب آں ست کہ اوّل غسل کنند بعد ازیں جماع ۱۲۔ [2] پسر را پیشتر از شانزدہ سالگی و دختر را از چہاردہ سالگی نکاح روا نباشد کہ فرزند ضعیف می شود ۱۲۔ [3] قصہ زفاف صلی اللہ علیہ وسلم با صدیقہؓ را مطلق منکر بودند ۱۲۔

مشہور مُدّت غلط ہے)۔

نکاح ہی کے سلسلہ کا ایک قانون یہ بھی تھا کہ "بیشتر از یک زن نکاح نکنند"۔ گویا تعدّد ازدواج کا قصہ اسی وقت اُٹھ چکا تھا۔ دلیل میں کہا جاتا کہ "خدا یکے و زن یکے"۔

یہ بھی حکم تھا کہ آئسہ عورت جس کے ایّام بند ہوں، نکاح نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ایسی عورت جو مرد سے بارہ [۱۲] سال بڑی ہو، مرد اس کے ساتھ ہمبستری نہیں کر سکتا۔ ایک حکم یہ بھی تھا کہ جب تک لڑکا اور لڑکی کا کوتوالی میں معائنہ نہ کرا لیا جائے، اور عُمر کا صداقت نامہ حاصل نہ کر لیا جائے، ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، ظاہر ہے، بقول مُلّا صاحب:

"اس[۱] ذریعہ سے عہدہ داروں کو کمانے کا خوب موقع ملا۔ خصوصاً کوتوال اور خانوئے کلال کے آدمیوں اور ان کے دوسرے مددگاروں اور ماتحتوں کو جو عموماً کمینے ہوتے ہیں، ان کو اس قانون سے جو نفع پہنچا اس کا اندازہ حدِّ وہم و خیال سے باہر ہے"۔

پردہ مُلّا صاحب کی اس عبارت سے:

"جوان[۲] عورتیں جو کوچہ و بازار میں نکلتی ہیں، باہر نکلنے کے وقت چاہیئے کہ چہرہ یا کھُلا رکھیں یا چہرہ کو کھول دیا کریں"۔ (اگر برقعہ وغیرہ ہو)

معلوم ہوتا ہے کہ شاید قانوناً پردہ بھی اُٹھا دیا گیا تھا۔

زنا کی تنظیم نکاح کے قوانین میں ان ترمیموں کے سوا عہدِ اکبری میں بعض علماء نے فقہ حنفی کی رو سے "جوازِ متعہ" کا فتویٰ بھی صادر کیا تھا جس کا قصّہ طویل ہے بعضوں نے تو اکبر کے "الحاد" کا نقطہ آغاز اسی مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ بعض مولویوں نے بجائے چار کے اکبر کے کانوں تک یہ بھی پہنچا دیا کہ بعض مجتہدین (نو ۹) اور بعض اس سے بھی زیادہ بیویوں کے

---

[۱] بایں تقریب خیلے منافع و فوائد بعہدہ والان خصوصاً کسانِ کوتوال و خانوئے کلال و سائر اعوان ارذال بیرون از وہم و خیال عاید گردید ۱۲ ص ۳۹۱ - [۲] زنے جوانے کہ در کوچہ و بازارے گردیدہ باشد دراں حال یا رو بپوشد یا روئے کشادہ گرددد ۱۲۔

قائل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ باتیں اُس وقت کی ہیں جب تک ان مولویوں کو "فقیہ کور" کا خطاب ملتا تھا۔ "دینِ الٰہی" کی تدوین کے بعد تو آپ دیکھ چکے کہ ایک سے زائد تک کی حرمت کا قانون بن گیا تھا۔ البتہ بانجھ ہونے کی صورت میں دوسری بیوی کی اجازت تھی۔ ایک طرف تو یہ حال تھا، دوسری طرف بغیر نکاح و متعہ کے بھی اس فعل کی اجازت ہوگئی تھی۔ گویا قانوناً زنا حرام نہ تھا۔ صرف اس کو منظّم کرنے کے لئے ایک دستور بنا دیا گیا تھا۔

مُلّا صاحب لکھتے ہیں :

"شہر سے[1] باہر آبادی بنائی گئی اور اس کا نام "شیطان پورہ" رکھا گیا۔ وہاں باضابطہ محافظ، نگراں، داروغہ مقرر تھے۔ تاکہ جو ان سے .... یا گھر لے جانا چاہے، اپنا نام و نسب لکھوائے اور ان ملازموں کے اتفاق سے ...... جو چاہے کرے"۔

اس سے بھی زیادہ پُر لطف قانون کا یہ حصّہ تھا کہ :

"اگر کسے خواہد کہ بکارت آنہا برد اگر خواستگار از مقربان نامی است، داروغہ بعرض رسانیدہ رخصت از درگاہ بگیرد و الّا نہ"۔

بادشاہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ :

"پنہانی تحقیق می نمودند کہ بکارت آنہا کہ بردہ باشد"۔

بیربر کے متعلق اس سلسلہ میں بادشاہ تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ "از بنات ہم نمی گذشت" مگر شدّت محبّت سے بادشاہ نے اس کے قصور کو معاف کر دیا۔

رسمِ ختنہ حالانکہ "دینِ جدید" سے پہلے اکبر نے اپنے شاہزادوں کی خود ختنہ کرائی تھی۔ مُلّا صاحب نے اس کو بھی نقل کیا ہے۔ لیکن "ہندو مسلم" کے امتیازات کے اُٹھا دینے کا جب شوق

---

[1] از شہر بیروں آبادان ساختند و آں را شیطان پورا نامیدند و آنجا نیز محافظ و مشرفے و داروغہ نصب کردند تا ہر کہ باآں جماعت صحبت دارد یا بخانہ برد اوّل نام و نسب خود بنویساند آں گاہ باتفاق تمغاچیاں جماع ہر چہ خواہد کند ۱۲۔

پیدا ہوا تو اسلام کے ایسے اہم "شعار" کے متعلق یہ قانون نافذ کیا گیا کہ:

"بارہ[1] سال سے پیشتر لڑکوں کا ختنہ نہ کرایا جائے۔ بارہ سال کی عمر کے بعد لڑکے کو اختیار ہوگا، چاہے کرے چاہے نہ کرے"۔

ظاہر ہے کہ بارہ سال کی عمر کے بعد مشکل ہی سے کوئی اس اذیّت کے برداشت کرنے کیلئے آمادہ ہوسکتا ہے، خصوصاً جب سلطنت کی جانب سے اس کی ہمّت شکنی بھی ہوتی ہو۔ گویا یہ "قانون سُنّتِ ختنہ" کے مٹانے کی ایک مخفی تدبیر تھی۔

میّت دینِ الٰہی میں داخل ہونے والوں کے لئے مرنے کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ "خام[2] غلّہ اور پکّی اینٹیں مردہ کی گردن میں باندھ کر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے، اور جس جگہ پانی نہ ہو جلا دیا جائے، یا چینیوں کی طرح سے کسی درخت سے مُردہ کو باندھ دیا جائے"۔

شاید ڈبونے یا جلانے لٹکانے کا حکم بعد کو ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے جو حکم تھا اس میں دفن کی مخالفت نہیں کی گئی تھی، البتہ اتنی ترمیم اس میں بھی تھی کہ:

"مُردہ کا[3] سر مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب رکھ کر اس کو دفن کیا جائے"۔

سلطان خواجہ کہ مریدانِ خاص الخاص میں سے تھا، جب مرا ہے تو اکبر نے علاوہ سمت مذکورہ بالا کے ایک حرکت یہ بھی کی تھی کہ اس کی قبر میں آفتاب[4] کے رُخ پر ایک کھڑکی بنا دی تھی تاکہ اس کی روشنی جو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے ہر صبح اس کے چہرہ پر پڑتی رہے"۔

مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ:

"اُس[5] کے منہ پر آگ کا انگارہ بھی لگا دیا گیا تھا"۔

---

[1] ختنہ پیش از دوازدہ سالگی نہ کنند بعد ازاں اختیار دادہ خواہ کنند یا نکنند ۱۲ ص ۳۷۶ - [2] پارہ از غلّہ خام وخشت پختہ بر گردنش بستہ در آب سرد ہند و بجائے کہ آب نباشد بسوزند یا بطور خطائیاں بر درختے بر بندند ۱۲ - [3] سر مردہ بجانب مشرق و پائے آں بجانب مغرب دفن کنند ۱۲ ص ۳۵ - [4] مقابل نیّر اعظم گذاشتند تا فروغِ آں کہ پاک کنندہ گناہاں است ہر صباح بر روشش افتد ۱۲ [5] بہ دہانش زبانہ آتش نیز رسانیدہ بودند ۱۲ ص ۳۶۱

یہ تھا وہ دین جس میں ہندوستان کے باشندوں کا تعلق بیرونِ ہند سے توڑ لیا گیا تھا۔ اور ٹھیک جس سمت کعبہ ہے مُردہ کی ٹانگ اسی جانب رکھی جاتی تھی۔ ضد کی یہ حد تھی کہ: "اپنے[1] سونے کے لئے بھی یہی ہیئت مقرر کی تھی۔ (یعنی ٹھیک قبلہ کی طرف پیر کرکے)۔

مَردوں کے لئے سونا اور ریشم مُلّا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ علاوہ مذکورہ بالا چیزوں کے، سونے اور ریشم کو مَردوں کے لئے نہ صرف حلال، بلکہ قریب قریب وجوب کی حد تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عموماً اس زمانہ کے وہی علماء جنہوں نے اس "ہندی دین" کو قبول کر لیا تھا یا اس کے حامی تھے، وہ ریشمین کپڑے پہنتے تھے، اور خدا کے اس باغی کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ اسی طرح سؤر اور کتے کو پاک قرار دیا گیا تھا نہ صرف پاک:

خنزیر اور کتّوں کا احترام اسلام[2] کے برخلاف سؤر اور کتّے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا تھا، اور شاہی محل کے اندر اور باہر یہ دونوں ناپاک (جانور) رکھے جاتے تھے۔ صبح سویرے اس کے دیکھنے کو بادشاہ عبادت خیال کرتا تھا"۔

اس سلسلہ میں اکبری عہد کے ایک عالِم (فیضی) کا قصّہ تو مُلّا صاحب نے یہاں تک نقل کیا ہے:

"چند[3] کتّوں کو سفر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور ان ہی کتّوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بعض شاعر تو کتّوں کی زبان بھی اپنے منہ میں لے لیتے تھے"۔

شیوۂ اتمی کس قدر عجب ہے کہ اسلام اور اسلامی احکام کے سوا اور کسی

---

[1] خواب رفتن خود را نیز ہمیں ہیئات قرار دادند ۱۲ ص ۳۵۷ - [2] برغم اسلام خنزیر و کلب را از نجس بودن باز نمودند و عِنِ حرم و زیر قصر نگاہ داشتہ ہر صباح نظر براں عبادت می شمردند ۱۲ ۔ [3] چند سگ را در سفر ہمراہ گرفتہ طعام باتہامی خوردند و بعضے شعراء زبان سگان در دہان می گرفتند ۱۲ ۔

مذہب کے کسی جزو کو ان لوگوں کی عقل نہ رد کرتی تھی، نہ اس میں خرابی نظر آتی تھی۔ مثلاً یہی عقلی بادشاہ تھا جو شیوراتری میں رات رات بھر جوگیوں کے ساتھ جاگتا تھا کہ "سہ چہار بار از عمر طبعی زیادہ باشد"۔

رکھشا بندھن نیز[1] ۸ سنبلہ کو جو تیوہار پڑتا تھا، اہل ہند کی رسم کے مطابق بادشاہ قشقہ لگا کر برآمدے میں بیٹھتے تھے اور ایک گنگنا جس میں جواہرات پروئے ہوتے تھے اس کو برہمنوں کے ہاتھ سے لے کر بطور تبرک اپنے ہاتھ پر باندھتے تھے۔

لحمی غذا ایک طرف شیر اور بھیڑیئے کے گوشت کی حلت کا فتویٰ دیا جاتا تھا اور دوسری طرف حکم:

"گائے[2]، بھینس، گھوڑے، بھیڑ اور اونٹ کے گوشت کی حرمت کا تھا"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک قانون تھا کہ:

"جو آدمی[3] اس شخص کے ساتھ کھانا کھائے جس کا پیشہ ذبح کرنے کا ہے تو اُس کھانے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے حتیٰ[4] کہ اگر اس کی بیوی بھی اُس کے ساتھ کھائے تو کھانے کی انگلیاں اس کی بھی تراش لی جائیں"۔

کیا اس بائیکاٹ کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہندوستان سے "لحمی غذا" ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے؟

مسلمان ہونے سے ممانعت "دین جدید" کا ایک قانون یہ بھی تھا:

"کوئی ہندو عورت[5] اگر کسی مسلمان مرد پر فریفتہ ہو کر مسلمانوں کا مذہب

---

[1] در روز عید ہشتم سنبلہ بر رسم اہل ہند قشقہ کشیدہ بر در دولت خانہ برآمدند و ریسمانے جواہر دراں کشیدہ از دست براہمہ بہ تبرک گرفتہ بر دست بستند ۱۲۔ [2] تحریم گوشت گاؤ و گاؤمیش و اسپ و میش و شتر بود ۱۲۔ [3] [4] اگر کسے با شخصے کہ ذبح جانور پیشۂ او شدہ باشد طعام بخورد دستِ او برند و اگر اہلِ خانۂ او بود انگشت اکل قطع نمایند ۱۲ ص ۲۷۶ [5] زنے ہندو بر مسلمانے فریفتہ شدہ در دینِ مسلماناں در آید جبراً و قہراً گرفتہ باہل او سپارند ۱۲ ص ۲۹۲۔

اختیار کرے تو اس عورت کو جبراً و قہراً اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیا جائے"۔

خیر یہ تو مُلّا صاحب کی شہادت ہے لیکن کیا کوئی اس شہادت کو بھی جھٹلا سکتا ہے۔

"ہندو[1] بے تحاشہ مسجدوں کو ڈھاتے ہیں، اور ان کی جگہ اپنے مندر بناتے ہیں۔ اسی طرح ہنود علانیہ کفر کے رسوم انجام دیتے ہیں لیکن اکثر احکام اسلام بجالانے سے مجبور ہیں"۔

ہندوی عُلوم سے عقیدت مُلّا صاحب اکبر کی زبانی نقل فرماتے ہیں۔ ایک دن اُس نے مجمع کو مخاطب کر کے اپنی رائے ظاہر کی:

"ہندی[2] زبان کی کتابیں جو ہندوستان کے مرتاض و عابد دانشمندوں کی تصنیفات ہیں، چونکہ یہ سب صحیح اور بالکل یقینی علوم پر حاوی ہیں اور اس گروہ (ہندوؤں) کے اعتقادات و عبادات کا سارا دار و مدار انہی کتابوں پر ہے لہٰذا ہم کیوں نہ ان کتابوں کے ترجمے ہندی سے فارسی زبان میں اپنے نام سے کرائیں۔ یہ غیر مکرر اور تازہ ہوگا۔ ان سے دینی اور دنیوی سعادت اور شوکت و حشمت بے زوال کے نتائج حاصل ہوں گے، اور کثرتِ مال و اولاد کے لئے یہ ذریعہ ہوں گے"۔

اس کے بعد دفتر قائم کر دیا گیا۔ علماء مقرر ہوئے جو اِن کتابوں کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے فارسی زبان میں ان کو منتقل کر رہے تھے۔

---

[1] کفارِ ہند بے تحاشا ہدمِ مساجد می نمایند و آنجا تعمیر معبد ہائے خود می سازند و نیز کفار برملا مراسم کفر بجامی آرند و مسلمانان در اجرائے اکثر احکامِ اسلام عاجز اند ۱۲ (مکتوبات مجدد الف ثانی مکتوب ۹۲ صہ ۱۶۲ جلد ۲)۔ [2] اکنوں کتاب ہائے ہندی را کہ دانایان مُرتاض عابد نوشتہ اند و ہمہ صحیح و نصِّ قاطع است و مدار دین و اعتقادات و عبادات ایں طائفہ بر آنست ترجمہ از ہندی بزبانِ فارسی فرمودہ چرا بنام خود نہ سازیم کہ غیر مکرر و تازہ است و ہمہ ثمر سعادت دنیوی و دینی و منتج حشمت و شوکتِ بے زوال و مستوجب کثرتِ اموال و اولاد ست ۱۲ صہ ۳۲۰۔

عربی سے نفرت علم جس زبان میں بھی ہو، اس کی قدر افزائی قابلِ اعتراض نہیں۔ اعتراض اس بے اعتدالی اور کج روی پر ہے کہ عربی پڑھنا[1]، عربی جاننا عیب قرار دیا گیا۔ اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھیرائے گئے۔

ان علوم کی جگہ نجوم، حکمت، طب، حساب، شعر، تاریخ اور افسانہ رائج، گویا مذہبی علوم اور دینیات کی سرپرستی اُٹھالی گئی۔ لیکن یہ بھی چند دنوں کی بات تھی۔ آخر فرمان وہی تھا جس کی توقع اس کے بعد ہونی چاہئے۔

ملا صاحب لکھتے ہیں:

"اسی[2] سال فرمان صادر ہوا کہ ہر قوم علوم عربیہ کو چھوڑ کر علومِ نادرہ و غریبہ یعنی نجوم، طب، حساب اور فلسفہ کے سوائے اور کچھ نہ پڑھیں۔"

پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ ملا صاحب بے چارے اسلامی عُلوم کے اس قتل کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔

"مدرسے[3] اور مسجدیں سب ویران ہوئے۔ اکثر اہلِ علم جلاوطن ہو گئے ان کی اولاد ناقابل جو اس ملک میں رہ گئی ہے "پاجی گیری" میں نام پیدا کر رہی ہے۔"

آخر میں ان دو شعروں میں ان کا نوحہ ختم ہوتا ہے۔

مدارس[4] از علماء آں چناں بود خالی — کہ ماہ روزہ زمے خوارہ خانۂ خمار
برند تختۂ لوحِ ادیب از پئے نرد — کنند مصحف قاری گرو بوجہ قمار

---

[1] عربی خواندن و دانستن آں عیب شدہ و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آں مطعون و مردود۔ [2] دریں سال حکم شد کہ ہر قوم ترک علومِ عربیہ نمودہ غیر از علومِ غریبہ از نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند ص۳۶۳۔

[3] مساجد و مدارس مدروس علماء اکثرے جلاوطن شدند و اولاد نا قابل ایشاں کہ بماند امروز بہ پاجی گیری نام برآوردند ۱۲ ص۲۷۶۔ [4] ترجمہ: مدرسے علماء سے اس طرح خالی ہو گئے جیسے ماہ رمضان میں شراب خانہ شرابیوں سے خالی ہو جائے۔ جو تختی معلم کے پاس ادب کی تعلیم کے لئے مستعمل تھی اب وہ چوسر کا تختہ بن گئی، اور قاری کا مصحف یعنی قرآن جوئے کے سلسلہ میں گروی ہے ۱۲۔

عربی حُروف کی دُرگت مُلّا صاحب فرماتے ہیں :

"ایسے[1] حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو بول چال سے بادشاہ نے خارج کر دیا تھا۔

اور اس پر عمل کرنے کی یہ صورت نکالی گئی تھی کہ :

"عبداللہ[2] کو ابداللہ، احدی کو اہدی، اور ازیں قبیل الفاظ کو بگاڑ کر بولتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے"۔

عُلماءِ عربی کی جاگیریں ضبط اسلامی عُلوم کی بربادی کا ایک سامان تو یہ تھا اسی کے ساتھ آہستہ آہستہ اس دَور میں علماء و مشائخ، آئمہ و خطباء کے نام کی جو جاگیریں صدیوں سے چلی آتی تھیں اُن پر دست اندازی کی گئی۔ اور جیسا کہ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ :

"ہدایہ جیسی[3] انتہائی کتابوں کے پڑھانے والوں کے لئے کم و بیش سو بگھہ کی جاگیر آخری حد تھی"۔

قاضیوں کا تقرّر بند اور یہ تو ابتدائی زمانہ میں مُلّا عبدالنّبی کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ آخر میں تو جیسا کہ خود حضرت مجدّد صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے :

"اسلام[4] کے منجملہ دوسرے شعاروں کے اسلامی آبادیوں میں قاضیوں کا تقرر ہے جو قرنِ سابق (عہدِ اکبری) میں مٹا دیا گیا تھا"۔

اسلام کی بے چارگی واقعہ ہے کہ اس انقلاب کے بعد بقول حضرت مجدّد صاحبؒ :

"تقریباً ایک قرن سے اسلام کی بے چارگی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اہلِ کفر محض اس پر راضی نہیں ہیں کہ کفر کے احکام کا اعلانیہ اسلامی بلاد میں اجراء

---

[1] حروف خاصۂ زبانِ عرب مثل ثاء، حاء، عین، صاد، ضاد، طاء و ظاء راز تلفظ برطرف ساختند ۱۲ ص۳۰۷۔

[2] عبداللہ را ابداللہ، و احدی را اہدی و امثال آں دیگر می گفتند و خوش می داشتند ۱۲۔

[3] درس ہدایہ و کتب نہیانہ مثلاً نہایتش تا صد بگیہ کم و بیش بود ۱۲۔ [4] از جملہ شعائر اسلام تعین قضاۃ است در بلادِ اسلام کہ در قرنِ سابق محو شدہ بود ۱۲ (مکتوب ص۱۹۵ جلد اوّل)

ہو جائے، بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ مٹا دیئے جائیں۔ اور اسلام و مسلمانوں کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار کرتا ہے تو اُس کو قتل کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے“[1]

عُلماءِ سُوء کا فِتنہ

کیا اکبر ابتداء سے زندیق تھا نہایت افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ”غریب اکبر“ دراصل ابتداء میں ”دینِ الٰہی“ والا اکبر نہیں تھا۔ یہی مُلّا عبدالقادر جن کے حوالہ سے اس مضمون کو مرتّب کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”بادشاہ جو جوہرِ نفیس رکھتا تھا اور طالبِ حق تھا، مگر محض بلند خیال“[2] (ذاتی علم سے عاری)۔

اُس کی زندگی کے ابتدائی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شدّت کے ساتھ اسلامی عبادات کا پابند تھا۔ نماز تو بڑی چیز ہے۔ سفر و حضر میں جماعت بھی ترک نہیں ہوتی تھی۔ سات عالِم امامت کے لئے مقرر تھے۔ جن میں سے ایک ہمارے مُلّا عبدالقادر بدایونی ہیں ان کا بیان ہے کہ:

”پانچوں[3] وقت برسرِ دربار جماعت کے متعلق فرماتے تھے“۔

سفر میں ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا۔ جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز

---

[1] غربتِ اسلام نزدیک یک قرن بنہجے قرار یافتہ است کہ اہلِ کفر بمجرّد اجرائے احکامِ کفریہ برملا در بلادِ اسلام راضی نمی شوند۔ میخواہند کہ احکامِ اسلام بالکلیہ زائل گردند واثرے از مسلماناں و مسلمانی پیدا نہ شود، کار تا بآں سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانے از شعائر اسلام اظہار نماید بقتل می رسد ۱۲ (مکتوب ۸۲ ص۱۰۶ جلد اوّل)۔ [2] بادشاہ ہے کہ جوہرِ نفیس داشت و طالبِ حق لما عامی محض ۱۲ ص۲۵۵۔

[3] ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند ۱۲ ص۳۱۵۔

ادا کرتا تھا۔ علمِ دین اور علماء دین کا احترام جس حد تک کرتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شیخ عبد النبی جو اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں "صدر جہاں" تھے ان کے ساتھ:

"انتہائی[1] احترام و تعظیم کی وجہ سے بادشاہ کبھی کبھی "علمِ حدیث" سننے کے لئے ان کے گھر جاتا اور ایک دو دفعہ تو جوتیاں بھی (شیخ کے) آگے بادشاہ نے رکھیں"۔

علماء و صلحاء کی صحبت اس قدر مرغوب تھی کہ حضرت شیخ سلیم چشتی کے پڑوس میں رہنے ہی کی غرض سے اس نے فتح پور کو دار السلطنت بنالیا تھا۔ اور مدتوں پا پیادہ اجمیر شریف حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو جایا کرتا تھا۔ فتح پور میں اس نے "انوپ تلاؤ" کے نام سے تالاب بنوایا تھا اور اس کے اردگرد عمارتیں بنوائی گئیں جن کا نام "عبادت خانہ" رکھا گیا تھا۔ ملّا عبد القادر کا بیان ہے کہ جہاں پر یہ عمارت بنوائی گئی تھی، بادشاہ اپنی زندگی کے ابتدائی دَور میں اسی مقام پر ایک پرانے حجرہ کے پتھر پر بیٹھ کر:

"آبادی[2] سے دُور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے، اور وقتِ صبح کے فیض کو حاصل کرتے تھے"۔

نمازِ جمعہ کے بعد اسی عمارت میں علماء کا اجتماع ہوتا تھا۔ بعد کو یہ شوق اتنا بڑھا کہ جمعہ کی پوری رات ان ہی علماء و مشائخ کی صحبت میں گذرتی تھی۔ خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔

"اور[3] دینی مسائل خواہ اُصول سے متعلق ہوں یا فروع سے ہمیشہ ان ہی کی تحقیق سے سروکار تھا"۔

بادشاہ اس مجلس میں حسبِ استعداد ہر ایک کی معقول خدمت بھی کرتا تھا۔

---

[1] بادشاہ از غایت تعظیم و احترام گاہے بجہت استماع علمِ حدیث بخانۂ شیخ می رفتند و یک دو مرتبہ کفش پیش پائے او ہم می ماندند ۱۲ ص ۳۱۵ ۔ [2] از آبادی یکسو افتادہ نشستہ بمراقبہ مشغول می شدند و فیضِ سحر می ربودند ۱۲ ص ۳۱۵ ۔ [3] پیوستہ کار تحقیق مسائلِ دین بود چہ اصول چہ فروع ۱۲ ۔

اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وسائل تلاش کر کر، علماء و مشائخ کی ایک کافی جماعت یہاں اکٹھی ہونے لگی۔ ملّا صاحب کا اندازہ ہے کہ:

"بحث[1] و مباحثہ و مناظرہ کرنے والے علماء خواہ محقق ہوں یا مقلّد، ان کی تعداد سَو (۱۰۰) آدمیوں سے متجاوز تھی"

ظاہر ہے جہاں اغراض پرست مولویوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو جائے پھر کونسا فتنہ ہے جو وہاں رونما نہ ہوگا۔ اب فتنہ کی تدریجی رفتار ملاحظہ فرمایئے۔

شروع شروع میں پہلا جھگڑا نشستگاہ پر چلا۔ ہر ایک بادشاہ سے قریب ہونا چاہتا تھا۔ ملّا صاحب لکھتے ہیں کہ:

"بہت[2] کچھ بے ہودگیاں اس گروہ سے ظاہر ہوئیں"۔

اگرچہ اکبر نے اغماض سے کام لیا لیکن دل میں غیر شعوری طور پر ان کا وزن کم ہونے لگا۔ آخر ایک دن جب کہ "چشمِ بد دُور" دین کے ان ستونوں کا یہ حال تھا کہ:

"باہم[3] ایک دوسرے پر زبان کی تلواریں نکالے ایک دوسرے کی نفی، تردید اور مقابلہ میں مصروف تھے۔ ان کے اختلافات اس حد کو پہنچے کہ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگا، اور ایک دوسرے کو گمراہ کہنے لگا"۔

اور شاہی دربار میں:

"ان[4] مولویوں کی گردن کی رگیں پھول آئیں، اور شور ہونے لگا۔ سخت ہُلّڑ مچ گیا"۔

بادشاہ کے متأثر قلب پر ان کی حرکت ناگوار گذری۔ "بر خاطرِ اشرف گراں آمد"۔

---

[1] جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلِّد از صد نفر متجاوز بودند ۱۲ ا ۱۸۸ [2] بد نفسیہا ازیں جماعت ظاہر شدند۔ [3] کہ بایک دیگر تیغِ زبان کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہم دگر می نمودند ۱۲ ا [4] رگِ گردن علماء زمان برآمدہ و آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد۔

اس کے بعد مُلّا عبدالقادر کو حکم دیا گیا کہ:

"آئندہ سے جو اِن میں نامعقول ہوں، ان کو مجلس میں نہ آنے دینا"۔

یہ پہلی خفّت تھی جو اس جماعت کو نصیب ہوئی، اور گو ان کی آمدورفت باقی رہی، لیکن ایک ایسے بادشاہ کے دربار میں جو ان کی ہر گفتگو سے بجائے ایمانی قوت کے سُوء زنی میں روز بروز ترقی کر رہا تھا، یہ آمد کچھ خرابیاں ہی پیدا کرتی رہی آخر اس فتوے بازی نے کہ ایک چیز کو ایک حلال کہتا تھا دوسرا حرام، علمی سرمایہ سے بھی دامنِ بادشاہ کو خود دین کے متعلق "شک[1] میں ڈال دیا اور اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ تا ایں کہ جو مقصود تھا، وہی سامنے سے جاتا رہا"۔

درباری عُلماء کا تعارف

اکبر کے دربار میں کس قسم کے علماء جمع تھے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان میں ایک مُلّا عبداللہ سلطانپوری تھے جن کا عہدہ "مخدوم الملک" تھا محض اس لئے کہ حج نہ کرنا پڑے۔ فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ زکوٰۃ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ ششماہی تقسیم کرنے والے حیلہ سے کام لیا کرتے تھے۔ اور آخر میں جب ہزارہا ذلت و خواری کے بعد انتقال ہوا اور بادشاہی حکم سے ان کے مکان کا جو لاہور میں تھا، جائزہ لیا گیا۔ تو:

"اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ناممکن تھا منجملہ ان کے سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے گورخانہ سے برآمد ہوئے: جنہیں مُردوں کے بہانے سے اُس نے دفن کیا تھا"[2]۔

ادھر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولٰنا عبدالنبی تھے، جو

---

[1] در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میان رفت ۱۲۔ [2] چندیں خزائن و دفائن او پدید گشت کہ قفل آں را بکلید وہم نہ تواں کشاد و از انجملہ چند صندوق طلاء از گورخانۂ مخدوم الملک کہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود ظاہر شد ۱۲ ص ۳۱۱

عہدِ اکبری کے سب سے بڑے محدّث خیال کئے جاتے تھے۔ ان کی بادشاہ نے جوتیاں سیدھی کی تھیں، اور سارے ہندوستان کے ائمہ و خطباء وغیرہ کی جاگیروں کا اختیار ان کو دیا گیا تھا، لیکن علم کا یہ حال تھا کہ مشہور حدیث اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنّ کو آپ ہمیشہ بجائے زار معجمہ کے رار مہملہ سے تلفظ فرماتے تھے، اور جب صدارت کے اختیارات ملے تو اب کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ سارے ہندوستان کے مذہبی جاگیرداروں کو دوڑاتے رہتے۔ آخر میں یہ حالت ہوئی کہ:

"لوگ شیخ[1] کے وکیلوں، ان کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں حلال خوروں (مہتروں) تک کو رشوت دے دے کر اپنے اپنے کمل اس گرداب سے باہر نکالتے۔"

مخدوم الملک اور مُلّا عبدالنبی دونوں میں رقیبانہ کش مکش جاری تھی۔ ہر ایک نے دوسرے کے متعلق رسالے لکھے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کو بواسیر ہے اس لئے اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ تُو اپنے باپ کا چونکہ عاق شدہ بیٹا ہے اس لئے تیرے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ الغرض صبح و شام شاہی کیمپ علماء کے ان دینی ہنگاموں سے گونجتا رہتا تھا۔ اور بقول مُلّا عبدالقادر ایک بڑی مصیبت یہ بھی تھی کہ جاہل اکبر:

"اپنے[2] زمانہ کے علماء کو رازی اور غزالی سے بھی بہتر خیال کرتا تھا۔ پھر ان کے پھوہڑپن کو جب بادشاہ نے دیکھا تو سامنے والوں پر غائبوں کو قیاس کر کے سلف کا بھی منکر ہو گیا۔"

آخر اس عہد کا رازی جب حزم کو حرم پڑھتا ہو اور اس زمانہ کے غزالی کے گھر سے طلائی اینٹوں کی قبریں برآمد ہوتی ہوں، تو گذشتہ زمانہ کے غزالیوں اور رازیوں کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے۔ ازیں قبیل طرح طرح کے مشائخ بھی آتے اور اکبر کے سامنے جھوٹے

---

[1] سائر وکلاء شیخ و فراشان و دربانان و سائسان و حلال خوران نیز رشوتہائے کلی دادے گلیم ازاں ورطۂ بدر بُردے ۱۲۔ [2] علماء عہد خویش بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند رکاکتہائے ایشاں را دیدہ قیاسِ غائب برشاہد کردہ سلف را نیز منکر شدند۔

دعوے کرتے۔ کبھی کہتے کہ آپ کی فلاں حرم کے لڑکا ہوگا۔ بد قسمتی سے لڑکی ہو جاتی۔ ایک بڑے باکرامت بزرگ لاہور تشریف لائے۔ جب اکبر نے تنہائی میں امتحان لیا اور کچھ پیش نہ چلی، تو پیٹ کا حیلہ ظاہر کرکے دم بخود ہو گئے۔ یقیناً علماء کا یہ فتنہ بھی بڑا فتنہ تھا اور بقول بدایونی:

"علماء[1] کا یہ اختلاف کہ ایک ان میں سے ایک ہی فعل کو حرام کہتا تھا، دوسرا کسی حیلہ سے اس کو حلال ثابت کرتا تھا، بادشاہ کے انکار کا سبب بن گیا۔"

لیکن اس سلسلہ کا سب سے زیادہ سیاہ "حلقہ" وہ ہے جو اگرچہ علماء ہی کا فتنہ تھا لیکن شدتِ تاثیر نے اکبری الحاد کا اس کو سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا۔ یعنی "مُلّا مبارک ناگوری اور اس کے شہرۂ آفاق صاحبزادے"۔ مُلّا صاحب جیسا کہ ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے، بڑے پایہ کے عالم تھے۔ عُلومِ متداولہ میں اُن کو ہر فن کا ایک مستقل متن زبانی یاد تھا جب تک ناگور میں رہے، زیادہ تر معقولات اور فقہ و اصول ان کا علمی سرمایہ تھا۔ پھر یہ احمد آباد پہنچے ہیں اس زمانہ میں ہندوستان کے ساحلی شہروں میں بجائے عقلیات کے دینی عُلوم کا زیادہ چرچا تھا۔ مُلّا مبارک کو احمد آباد میں اپنے دینی تبحر کا موقعہ ہاتھ آیا، لیکن دماغ میں فطرۃً شورش تھی۔ مذاہبِ اربعہ اور ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے بعد یہ غیر مقلّد ہو گئے جیسا کہ خود ابوالفضل لکھتا ہے کہ:

"مالک[2]، شافعی، ابوحنیفہ، حنبل اور (شیعوں کے فرقہ) امامیہ کے مذہب میں اصول و فروع کے متعلق ہر قسم کی واقفیت حاصل کر لی تھی، اور سخت دوڑ دھوپ کے بعد اجتہاد کا مرتبہ ظاہر ہو گیا تھا۔ اگرچہ بزرگانِ سلف کے تقاضہ کے بموجب ابوحنیفہ کے طریقہ کے ساتھ نسبت

---

[1] اختلافِ علماء، کہ یکے فعلے را حرام می گفت و دیگرے بحیلہ ہماں را حلال می ساخت وجہ انکار گشت ۱۲۔

[2] در آئین مالک و شافعی و ابوحنیفہ و حنبل و امامیہ گوناگوں دریافت اصولاً و فروعاً بہم آورد ند و بتگاپوئے سخت پایۂ اجتہاد رو نمود۔ اگرچہ باقتضاء نیاگانِ بزرگ بروشِ ابوحنیفہ انتساب داشتند لیکن ہموارہ کردار را بجوطۂ آرائش دادے و از تقلید بر کنارہ بندگی دلیل کردے۔ احوالِ مصنّف آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ نولکشور۔

رکھتے تھے، لیکن ہمیشہ اپنے عمل کو ذاتی تحقیقات سے آراستہ کرتے تھے، اور تقلید سے علیٰحدہ رہ کر عبادت کرتے تھے:

اس غیر مقلدی کے سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ شیراز کے ایک فلسفی ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہوگئے، اور اس درجہ خصوصیت حاصل کرلی کہ "ابوالفضل گازرونی بفرزندی برگرفت"۔ اس کے علاوہ:

"تجرید[1] کے مراتب اور شفا، اشارات اور تذکرہ مجسطی کی باریکیوں، اور ان کی مشکلات کو ان سے حاصل کیا، اور گلشنِ حکمت کو اس سے بہت زیادہ تازگی حاصل ہوئی"

اس پر طرّہ یہ تھا کہ مُلّا صاحب کو تصوّف کا بھی شوق ہوگیا۔

"تصوّف[2] و اشراق کے مختلف طریقوں کا بھی مطالعہ کیا۔ اور نظر و فکر، اور خداشناسی کی کتابیں بھی نظر سے گذریں"۔

ظاہر ہے کہ شوریدہ مغزوں میں جب یہ ساری کرامات جمع ہوجاتی ہیں تو پھر ان سے بے محابا ایسی باتیں صادر ہوتی ہیں جن سے جمہور میں برہمی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ مُلّا صاحب پر مہدویت کا، کبھی شیعت کا الزام لگایا گیا۔ لیکن ابوالفضل کو اس سے انکار ہے۔ بہرحال عام علماء کو ان کے طرز و روش سے ضرور شکایت تھی، اور ان مولویوں نے چند سخت حملے بھی کئے۔ جواب باندازِ سوال کے بجائے مُلّا صاحب کو غرورِ علم نے ایک خطرناک اقدام پر آمادہ کیا۔ آپ زاویۂ درس و ارشاد سے نکل کر بیٹوں کی معیت میں ملک کی سیاست میں داخل ہوگئے۔ علم کا گھرانا تھا۔ ترقی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند ہی دنوں میں دیکھا جاتا ہے کہ وہی مُلّا مبارک جن کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ:

---

[1] مراتبِ تجرید و بسیارے غوامض شفا و اشارات و تذکرہ مجسطی را تذکار فرمودند و سرایستانِ حکمت را طراوتِ دیگر پدید آمد ۱۲ (آئین اکبری صـ۲۰۳ جلد۳۔ [2] اسالیبِ اشراق و تصوّف برخواندند و فراواں کتاب نظر و تالہ دیدہ شد ۱۲ (آئین اکبری صـ۲۰۳ جلد۳۔

شیر خاں (شیر شاہ) سلیم خاں (پسر شیر شاہ) اور دوسرے بزرگوں نے اصرار[1] کیا کہ سلطانی وجوہ سے کچھ قبول کریں۔

لیکن "از انجا کہ ہمت بلند بود و نظر عالی داشت سر باز زد[2]"۔ اب یہی مُلّا مبارک یکایک اکبر کے بارگاہ جلال میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جلوہ فرما ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ مولویوں نے ان کو اور ان کے خاندان کو ضرور ستایا تھا، اور مُلّا صاحب کو ان کی وجہ سے کچھ دنوں پورے خاندان کے ساتھ در بدر مارا مارا پھرنا پڑا۔ لیکن کیا اس کا شریفانہ یہ تھا کہ بانسری کے بجنے کو روکنے کے لئے دنیا سے بانس کے جنگل ہی نابود کر دیئے جائیں؟ اور بالفرض انتقام کے غصہ میں اگر یہی کرنا چاہتے تھے تو پھر جو چوٹ اُنھوں نے پہاڑ سے کھائی تھی، اس کا بدلہ یہ گھر کی سِل سے کیوں لینے لگے۔

بہرحال تینوں باپ بیٹوں نے اپنے شخصی انتقام کا نشانہ ہندوستان کے سُنّی مولویوں ہی کو نہیں بلکہ اسلام ہی کو بنا لیا۔ مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد جس وقت "اسلام کا ایوان" اپنے سارے متوسلین کے ساتھ جل رہا تھا، اس وقت مُلّا عبدالقادر کا بیان ہے کہ ابوالفضل کی زبان پر بسا اوقات حسبِ ذیل اشعار جاری ہو جاتے تھے[3]

آتش بدو دستِ خویش در خرمنِ خویش ۔۔۔ چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمنِ خویش

کس دشمنِ من نیست و منم دشمنِ خویش ۔۔۔ اے وائے من و دستِ من و دامنِ خویش

الغرض اکبری دربار میں ابوالفضل و فیضی کا فتنہ بھی سچ پوچھو تو یہ علماء سُوء ہی کا فتنہ تھا۔ مُلّا مبارک ناگوری کی برکت سے گمراہی و زندیقیت کا کس طرح سلسلہ شروع ہوا، اور کہاں جا کر ختم ہوا۔ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

اجتہاد کا دعویٰ اس سلسلہ میں سب سے نمایاں چیز جو شروع شروع میں ہمارے سامنے

---

[1] شیر خاں و سلیم خاں و دیگر بزرگان درمقام آں شدند کہ از وجوہ سلطانی چیزے برگیرند ۱۲۔ آئین اکبری ص۲۰۵ جلد ۳۔ [2] چونکہ ہمت بلند تھی اور نظر یہ اُونچا رکھتے تھے، انکار کر دیا۔۱۲۔

[3] آئین اکبری ص۲۰۵ جلد ۳۔

آتی ہے وہ عہدِ اکبری کا وہ مشہور محضر نامہ ہے جسے بجنسہٖ مُلّا صاحب نے اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ اور یہی وہ محضر نامہ ہے جسے مُلّا مبارک ناگوری پدر ابوالفضل و فیضی نے مرتب کیا تھا۔ اور بعض علمار سے طوعاً، بعض سے کرہاً اس پر دستخط کرائے گئے۔

ترجمہ[1]: "مطلب[2] ان امور کے درج کرنے سے یہ ہے کہ چونکہ بادشاہی عدل و انصاف اور سرپرستی کی بدولت ہندوستان آج کل امن و امان کا مرکز بنا ہوا ہے، اور اس کی وجہ سے عوام و خواص، خصوصاً ان صاحبِ علم و فضل علمار کا یہاں ان دنوں اجتماع ہو گیا ہے جو نجات کی راہوں کے رہنما اور اوتوا العلم والدّرجات کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ عرب و عجم سے اس ملک میں تشریف لائے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ اور چونکہ جمہور علمار جو ہر قسم کے عُلوم میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور عقلی و نقلی فنون کے ماہر ہیں، اور ایمانداری اور انتہائی دیانت اور راستبازی کے ساتھ موصوف ہیں۔ قرآن کی آیت اطیعُوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم (یعنی اطاعت کرو اللّٰہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبانِ امر ہیں) اور صحیح حدیثوں مثلاً یہ کہ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے زیادہ محبوب وہ امیر ہوگا جو عادل ہو۔ جس نے امیر کی اطاعت کی، اُس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اُس نے میری نافرمانی کی۔ ان کے سوا

---

[1] لفظی ترجمہ کے بجائے صحیح مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ [2] اصلی محضر نامہ یہ: "مقصود از تشئید ایں مبانی و تمہیدِ ایں معانی آں کہ چوں ہندوستان صینت عن الحدثان بیامن معدلتِ سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و امان و دائرہ عدل و احسان شدہ و طوائف انام از خواص و عوام خصوصاً علمار عرفان شعار و فضلار دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکانِ مسالک اوتوا العلم والدّرجات اند از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودہ اند۔ جمہور علمار فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند بدیں و دیانت و صیانت اتصاف دارند بعد از تدبّرِ وافی و تأمّل کافی در غوامض معانی اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم و احادیث صحیح انّ احبّ النّاس الی اللّٰہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

اور دوسرے دلائل عقلی و نقلی کی بنیاد پر یہ قرار دیتے ہیں اور فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ خدا کے نزدیک سلطانِ عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے۔ اور بادشاہ جلال الدین محمد اکبر غازی چونکہ بہت بڑے عادل، سب سے زیادہ عقل والے اور علم والے ہیں، اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں اگر وہ (یعنی اکبر بادشاہ) اپنے ذہنِ ثاقب اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی معاشی سہولتوں اور دنیاوی انتظام کی آسانیوں کو مدنظر رکھ کر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو مسلک قرار دیں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ متفقہ سمجھا جائے گا اور عام مخلوق رعایا و برایا کے لئے اس کی پابندی لازمی و لابدی ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی بات جو قطعی نصوص کی مخالف نہ ہو، اور دنیا والوں کو اس سے مدد ملتی ہو، بادشاہ اگر اس کے متعلق کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا بھی ہر شخص کے لئے لازم اور ضروری ہوگا اور اس کی مخالفت دینی و دنیوی بربادی اور اُخروی مواخذہ کی مستوجب ہوگی"۔

غالباً اسی کے بعد وہ لطیفہ پیش آیا کہ بحیثیت مجتہد و امامِ عادل ہونے کے جمعہ میں خطبہ پڑھنے کا اکبر کو خیال آیا۔ فیضی نے فارسی اشعار میں خطبہ تیار کیا۔ لیکن میدانِ جنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) من یعص الامیر فقد عصانی وغیر ذٰلک من الشواھد العقلیہ والدلائل النقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی اعدل و اعقل و اعلم باللہ اند بنا بریں اگر دریں مسائلِ دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہنِ ثاقب و فکر صائب خود یک جانب را از اختلاف بہ جہت تسہیل معیشتِ بنی آدم و مصلحتِ انتظام عالم اختیار نمودہ باں جانب حکم فرمایند متفق علیہ شود و اتباعِ آں بر عموم برایا لازم و متحتم است اگر بموجب رائے صواب علمائے خود حکمی را احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمان بودہ باشد عمل برآں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالفت موجب سخط اُخروی و خسرانِ دینی و دنیوی است۔ انتہیٰ بلفظہٖ صـ ۲۷۲ جلد ۲ مطبوعہ کلکتہ۔

میں جس کی تلوار سروں کو اُڑاتی تھی، وہ خطبہ کے لئے کھڑا ہوا تو تھرّانے لگا اور صرف دو[۲] شعر پڑھ کر منبر سے اُتر گیا۔

یہ تھی وہ پہلی منزل جہاں تقلید سے کنارہ کش ہو کر اکبر کو اجتہاد کے درجہ پر پہنچایا گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد علانیہ ائمہ و مجتہدین کی توہین و تحقیر ہونے لگی۔ دین کا بھرم اُٹھ گیا۔ مُلّا صاحب اپنے کانوں سُنی بیان فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کی جرأت اس حد کو پہنچ گئی تھی:

"اگر[۱] کسی بحث و مباحثہ کے درمیان ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا۔ فلاں[۲] حلوائی فلاں کفش دوز اور فلاں چمڑہ والے کے قول سے تم مجھ پر حجت قائم کرتے ہو؟

لیکن معاملہ ابھی صرف ائمہ مجتہدین تک پہنچا تھا۔ بدقسمتی سے ہمایوں کو چونکہ ایرانیوں کی امداد سے دوبارہ تخت و تاج میسّر آیا تھا۔ اس لئے بتقاضائے منّت شناسی عراق عجم اور ایران کے علماء و شعراء کو خود اُس نے اپنے عہد میں اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا، اور یہ دستور اکبر کے دربار میں بھی جاری رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایرانیوں اور عراقیوں کا اک سیلاب تھا جو عہد ہمایوں سے مسلسل اختتامِ دولتِ مغلیہ تک ان ممالک سے ہندوستان آتا رہا۔

---

[۱] اگر در عینِ بحث سخنِ مجتہدین را می آوردند می گفت از فلاں حلوائی و فلاں کفش دوز و فلاں چرم گر بر ما حجّت می آرید ۱۲ (ص ۲۰۷ جلد ۲)۔ [۲] کس قدر عجیب بات ہے، کہ جو بات پوری اُمّت کے نزدیک ان بزرگوں کے مناقب میں داخل ہے ابوالفضل اس کے بہانہ سے ان حضرات کی توہین کرتا ہے ان بزرگوں نے اپنے علم کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا تھا۔ نہ اس کے ذریعہ بادشاہوں تک رسائی حاصل کر کے سیاسی اقتدار اور مالی عروج حاصل کیا تھا۔ یہ حضرات اپنی روزی دست کاری یا تجارتی کاروبار سے حاصل کرتے تھے اور بلا کسی دنیاوی معاوضہ کے خالصاً لوجہ اللہ خدمتِ علم کرتے تھے۔ اسی کی برکت ہے کہ ان کے نام روشن اور اُن کی تصانیف آج تک وثیقہ ہدایت بنی ہوئی ہیں۔

یہ ٹڈیوں کا بھوکا دَل تھا جو ہندوستان کی کشت زاروں کی طرف بے تحاشا چلا آرہا تھا اور دولت مغلیہ کی طرف سے قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ادنیٰ ہندوستان پہنچ کر اس درجہ عالی ہو جاتا کہ بالآخر لوگوں کو کہنا پڑا :

پار بودم قطبک وامسال قطب الدین شدم

گر بیایم سالِ دیگر قطبِ دین حیدر شوم

اگر یہ دائرہ اقتصادی نفع اندوزی تک رہتا، تب بھی شکوہ نہیں تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ گروہ وہ تھا جو ائمۂ دین و مجتہدین سے آگے بڑھ کر بے محابا شرفِ صحبت کے سعادت یافتوں (صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) پر بھی حملہ کرنے میں قطعاً بے باک تھا۔ اکبر کو تاریخی واقعات کے سُننے کا بے حد شوق تھا۔ حریفوں نے خصوصیت کے ساتھ اس کے سامنے ان ہی کتابوں کو اور کتابوں کے بھی خاص ان حصّوں کو پیش کرنا شروع کیا، جن کا تعلق مشاجرات صحابہؓ سے تھا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں :

"صحابہؓ[1] کی شان میں سیر کی کتابوں کے پڑھنے میں جو الفاظ بادشاہ کی زبان سے نکلتے تھے خصوصاً خلفاء ثلاثہ کی خلافت، قضیۂ فدک، جنگ صفین وغیرہ کے ذکر کے وقت جو کچھ کہا جاتا تھا، کان اگر ان کے سُننے سے بہرے ہوتے تو بہتر تھا۔ میں اپنی زبان سے ان کو ادا بھی نہیں کر سکتا۔"

مجتہدین اور ائمہ پہلے وار میں ختم ہوئے ۔ اور اس دوسری ضرب نے تو اسلام کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ جیسا کہ اس کے بعد ہونا چاہیئے تھا وُہی ہُوا کہ اکبری دربار میں :

"تمام مذہب اسلام نامعقول اور (معاذ اللہ) اس کے مُرتّب اور مدوّن کرنے والے عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے۔ اور شاہنامے کے وہ دو[2] مشہور شعر جن کو فردوسی نے (اُمراء

---

[1] وآنچہ درحق صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم در وقت خواندنِ کتبِ سیر مذکور می ساختند خصوصاً در خلافتِ خلفاء ثلاثہ وقضیۂ فدک وجنگِ صفین وغیر آں کہ گوش از استماعِ آں کہ باد بزبانِ خود نتواں آورد ۱۲ ص ۳۰۸ ۔

ایران کے قول کی نقل کے طور پر) بیان کیا ہے، بطور سند پیش کئے جاتے تھے:[۱]

عرب را بجائے رسید است کار   زشیر شتر[۲] خوردن و سوسمار

تفو باد بر چرخِ گردوں تفو!   کہ ملکِ عجم را کنند آرزو

"شجرۂ طیبۂ نبوت" علیٰ صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ کے ان ثمرہائے رسیدہ تک جس کی زبان پہنچ چکی تھی، وہ آخر کب تک پھلوں سے درخت تک نہ پہنچتا۔ العیاذ باللہ آخر وہ منحوس دن بھی سامنے آ ہی گیا۔ کہ:

"ارکانِ[۳] دین کے ہر رکن اور اسلامی عقاید کے ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے مثلاً نبوت، مسئلہ کلام، دیدارِ الٰہی، انسان کا مکلّف ہونا، عالم کی تکوین، حشر و نشر وغیرہ کے متعلق تمسخر اور ٹھٹے کے ساتھ طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کئے جانے لگے۔"

یہی نہیں کہ بادشاہ ہی صرف شک میں مبتلا ہو گیا تھا، بلکہ اہلِ دربار سے بھی ان مسائل کے متعلق بحث کرتا۔ اور سب کو اپنی ذہنی کیفیت کے قریب لانے کی کوشش کرتا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ:

"عام[۴] مخلوق کو خلقِ قرآن کے مسئلہ کی تبلیغ کرتا، اور وحی کے محال ہونے پر اصرار

---

[۱] ملّتِ اسلام ہمہ نامعقول وحادث وواضع آن فقرائے عربان بودند کہ جملہ مفسدان وقطاع الطریق وآن دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بطریق نقل آوردہ متمسک می ساختند ۱۲ امت ۳۰۷۔ [۲] اونٹ کا دودھ اور گوہ کھاتے کھاتے عربوں کے حوصلے اب یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ملکِ عجم کی آرزو کرتے ہیں اس چرخ گردوں پر تف ہے۔ تف ہے ۱۲۔ [۳] در ہر رکنے از ارکانِ دین وہر عقیدہ از عقائد اسلامیہ چہ در اصول وچہ فروع مثلاً نبوت وکلام ورویت وتکلیف وتکوین وحشر ونشر شبہاتِ گوناگوں بہ تمسخر واستہزا آوردہ ۱۲ امت ۳۰۷۔ [۴] خلق را بخلقِ قرآن وتوغل در استحالۂ وحی وتشکیک در نبوات وانامات امتحان کردند ووجودِ جن وملک وسائر مغیبات ومعجزات وکرامات را انکارِ صریح آوردند وتواترِ قرآن وثبوتِ کلامیت آن وبقائے روح بعد از اضمحلالِ بدن وثواب وعقاب را بغیر از تناسخ محال می شمردند ۱۲ صت ۲۷۳۔

وغلو سے کام لیتا۔ نبوّت و امامت کے مسئلوں میں لوگوں کا امتحان لیتا،
اور جنّ و فرشتے، اسی طرح ساری غیبی ہستیوں نیز معجزات اور کرامتوں
کا کھلے لفظوں میں انکار کرتا۔ قرآن کے تواتر اور قرآن کے کلامِ خدا ہونے کو
اور بدن کے فنا ہونے کے بعد رُوح کے باقی رہنے نیز ثواب وعقاب کو
محال سمجھتا تھا۔ البتہ تناسخ کے طور پر عذاب وثواب کا قائل تھا۔"

اپنی اس تبلیغ میں غلو کی آخری حد یہ تھی کہ کبھی کبھی بھرے دربار میں اکبر سے خلافِ وقارِ شاہی بعض مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔ مثلاً بیٹھے بیٹھے یکایک ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا اور اس کے بعد حسبِ ذیل تقریر کرتا۔

"آخر اس[1] بات کو عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکایک نیند سے آسمانوں پر چلا جاتا ہے اور راز و نیاز کی نوّے ہزار باتیں خدا سے کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم ہی رہتا ہے۔ تعجّب ہے لوگ اس دعویٰ کو مان لیتے ہیں اور اسی طرح شق القمر وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں"

پھر اپنی اُٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا:

"ناممکن[2] ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں زمین سے نہ ٹکا ہو، مَیں کھڑا رہ سکوں آخر یہ ہیں کیا قصے؟"

گویا خلافِ عادت کے ناممکن ہونے کو اپنی اُٹھی ہوئی ٹانگ سے ثابت کیا جاتا تھا۔ یہی رنگ تھا جو بالآخر گہرا ہوا، گہرا ہوا اور خُوب گہرا ہوا۔ تا اینکہ نوبت باینجا رسید کہ اب اس کی زبان عیاذاً باللہ نبوّتِ کبریٰ کی شان میں بھی دراز ہونے لگی:

---

[1] ایں معنی را عقل چگونہ قبول کند کہ شخصے در یک لحظہ باگرانی جسم از خواب بآسمان رود و نود ہزار سخن گومگوئے باخدا تعالیٰ کند و بسترش ہنوز گرم باشد و مردم بآں دعوی بگروند و ہم چنیں شق القمر و امثالِ آں ۱۲۔ [2] ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا ماند استادہ توانیم ایں چہ حکایتہا است ۱۲ ص ۳۱۷۔

"اوائل ہجرت میں قریش کے قافلہ پر حملہ، چودہ عورتوں سے نکاح اور بیویوں کی رضامندی کے لئے شہد کو حرام کرنا"[1] جیسے ابلہ فریبی کے اعتراضات اُس کی زبان پر آنے لگے۔ آخری کیفیت اکبر کے نفس کی یہ ہوئی کہ سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

مُلّا صاحب کا بیان ہے:

"احمد، محمد و مصطفٰے وغیرہ نام بیرونی کافروں اور اندرونی خواتین کی وجہ سے اس شخص پر گراں گذرنے لگے۔ آخر کچھ دن کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اُس نے بدل بھی ڈالے۔ مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا تھا، اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی[2] نام سے موسوم کرتا۔"

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ:

"علماء سُو[3] اپنی اپنی تصنیفوں میں خطبہ لکھنے سے بچنے لگے۔ صرف توحید اور بادشاہی القاب کے ذکر پر قناعت کرتے۔ ان کی مجال نہ تھی، کہ بے ایمان جھٹلانے والوں کے علی الرغم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ مبارک زبانِ قلم پر لاتے۔"

یہاں تک کہ خود مُلّا صاحب کو جب مہابھارت کے ترجمہ کے شروع میں خطبہ لکھنے کی فرمائش بادشاہ نے کی تو محض اس وجہ سے انہوں نے اعراض کیا کہ بغیر نعت کے وہ خطبہ لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ تو بادشاہ

1۔ زدن قافلہ قریش در اوائلِ ہجرت و چہار دہ زن خواستن و تحریم شہد کردن برائے خوشنودی زناں ۱۲ ص ۲۰۸۔ 2۔ نام احمد و محمد و مصطفٰے و امثال آں بجہت کافراں بیرونی و زناں اندرونی گراں می آمد تا بمرور ایام اسامی چندرا از مقربان کہ بایں نام مسمی بودند تغیر دادہ مثلاً یار، محمد خاں را رحمت می خواندند و می نوشتند ۱۲ ص ۲۱۵ جلد ۲۔ 3۔ علماء سُوء در تصنیفات از خطبہ تبرّا می آوردند و اکتفا بتوحید کردند و القاب بادشاہی می نوشتند و مجال نبود کہ نام آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم علیٰ رغم المکذبین بر برند ۱۲ ص ۲۶۹۔

ہر عامی کی جرأت بھی حد سے متجاوز ہونے لگی۔ مُلّا صاحب فرماتے ہیں کہ:

"چند[1] ہندو و چند ہندو مزاج مسلمان، یہ بدنصیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر صراحۃً اعتراض کرتے تھے"۔

لیکن ان کا کوئی رد کرنے والا، ٹوکنے والا نہ تھا۔ حد ہو گئی کہ جب اکبر کے دربار میں عیسائی مشنری کا وفد پہنچا ہے تو ان لوگوں نے جہاں اور باتیں دربار میں کیں، ان میں العیاذ باللہ ایک یہ بھی تھی کہ:

"دجّال[2] کے صفات بیان کر کے (استغفر اللہ) ان کو . . . . . پر ڈالتے تھے"۔

اللہ اکبر! اتنی بدبختانہ بے ہودگی کو سُن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بَل تو کیا پڑتا، نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور خاص اپنے شہزادہ مراد کو حکم دیتا ہے:

"چند[3] اسباق ان پادریوں سے تبرکاً پڑھ لو"۔

عقائد میں جس شخص کا یہ حال ہو چکا تھا، اس کے اعمال کے متعلق سوال ہی فضول ہے۔ وہی نماز کبھی جس کے متعلق یہ حال تھا کہ:

"پانچوں[4] وقت (نماز تو نماز) جماعت کے لئے بھرے دربار میں فرمایا کرتے تھے"۔

اب ان ہی مُلّا صاحب کا بیان ہے کہ:

"دیوان[5] خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"نماز[6]، روزہ اور حج تو اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے"۔

---

[1] بدبختے چند از ہندوان و مسلمانانِ ہندو مزاج قدح صریح بر نبوّت می کردند ۱۲۔ [2] در تعریف دجال ملعون این ملاعین اوصاف اور ادرباب حضرت خیر النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم علی اغم الدجالین فرود آوردند ۱۲ ص ۲۶۹۔ [3] بستے چند یتمنا از ان بخوان ص ۶۹/۱۲۔ [4] بر پنجوقت برائے حلط در دربار می گفتند ص ۲۱۵/۱۲۔ [5] در دیوان خانہ ہیچکس یارائے آن نداشت کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند ص ۲۱۵۔ [6] نماز روزہ و حج پیش ازاں ساقط شدہ بود ص ۲۵۱۔

اور معاملہ سقوط و اسقاط تک ہی ختم نہیں ہوا تھا۔ بے دینوں نے شاہی اشارہ پاکر پھر اس کے بعد جو کچھ کیا، اس کے ذکر سے بھی دل ڈرتا ہے۔ غیر اسلامی خاندان کے آدمی نے نہیں بلکہ ایک مشہور ملا کے بیٹے نے جیسا کہ بدایونی کا بیان ہے:

"ملا مبارک[1] کے بیٹے نے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور مسخرگی کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کئے (شاہی جناب) میں ان کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے۔"

دینی شعائر کی ہجو میں اشعار بنائے گئے اور کوچہ و بازار میں وہی گائے جاتے تھے۔ جن میں کے بعض اشعار ملا صاحب نے بھی نقل کئے ہیں۔

یہ دکھانے کیلئے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں "دین کی غربت" کا نوحہ جن دردناک پیرایوں میں کرتے ہیں اس کے اسباب کیا تھے، ہم بھی چند شعر بطور "نقلِ کفر" نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غالباً یہ فیضی کی فیاضئ کفر تھی:

از حقیقت بدست کورے چند — مصحفے ماند کہنہ گورے چند
گور با کس سخن نمی گوید — سرِّ قرآں کسے نمی جوید

ایک مستزاد اس پر مستزاد ہے:

عید آمد و کارہا نکو خواہد شد ، چوں روئے عروس
ساقی مے ناب در سبو خواہد کرد ، چوں خون خروس

جزئیات کی تفصیل کہاں تک کی جائے۔ ملا صاحب کے الفاظ میں مختصر یہ ہے کہ:

"نماز و[2] روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا تعلق نبوت سے ہے ان کا نام

---

[1] پسر ملا مبارک شاگرد ابوالفضل زمسائل درباب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ و مقبول افتادہ باعثِ تربیت گشت ص ۲۵۱۔ [2] نماز و روزہ و جمیع نبوات را تقلیدات نام نہادند یعنی غیر معقول و مدار دین بر عقل گذاشتند نہ نقل۔ ص ۲۱۱۔

"تقلیدات" رکھا گیا۔ یعنی یہ سب حماقت کی باتیں ٹھہرائی گئیں، اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی نہ نقل پر"۔

ایک اور موقعہ پر نقل کرتے ہیں کہ جب کسی شرعی مسئلہ کا فکر ہوتا، تو اس وقت بادشاہ یہ کہا کرتے تھے :

"اس کو ملاؤں سے پوچھو۔ البتہ ایسی چیزیں جن کا تعلق عقل و حکمت سے ہو وہ مجھ سے دریافت کرو"۔[1]

لیکن عقل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس "دینِ جدید" کے تمام اصول و فروع سب براہِ راست "عقل سے پیدا کئے جاتے تھے بلکہ صورت یہ اختیار کی گئی کہ پہلے تو "مساواتِ ادیان" کا دعویٰ کیا گیا گویا کسی دین کو دوسرے دین پر ترجیح نہ دی جائے۔ لیکن مذاہب میں جو تناقض و تضاد ہے، "نظریۂ مساوات" پر اس کا نباہنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا۔ اس لئے ترجیح کے لئے "عقل" میزان ٹھیرائی گئی۔ تمام مذاہب کے علماء و ماہرین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ایک سے اس کے مذہب کے معلومات حاصل کئے جاتے۔ مسلمان اور ہندو تو دربار میں موجود ہی تھے، ان دو[2] کے علاوہ اس وقت تک اس ملک میں "یورپین صلیبیوں" کی بھی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ عموماً یہ لوگ ساحلی علاقوں میں بحری قزاقوں کی حیثیت سے منڈلاتے رہتے تھے۔ اور اندرونِ ملک میں ان کا داخلہ غالباً اس وقت بحیثیت بازی گروں کے ہوتا تھا۔ کیونکہ ملا صاحب نے اُن کا اپنی کتاب میں جہاں کہیں تذکرہ کیا ہے اس میں زیادہ تر یہی ہے کہ جشنِ نوروز میں فرنگیوں کی بھی ایک ٹولی آکر شریک ہوئی۔ اس نے ارغنون نامی باجا بجا کر لوگوں کو متحیر کیا (غالباً پیانو یا ہارمونیم تھا)۔ کبھی بیلوں اُڑا کر تماشہ دکھاتے تھے۔ الغرض اکبری عہد تک ان کی حیثیت بظاہر بازی گروں ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد کو انہوں نے سوداگروں کا بھیس بدلا، اور آخر میں جو کچھ ہو کر رہا وہ تو سب کے سامنے ہی ہے۔ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ[3] کی حقیقی تفسیریں کتابوں میں نہیں بلکہ صحیفۂ فطرت کے اوراق میں

---

[1] ایں را از ملایاں بپرسید و چیزے کہ تعلق بعقل و حکمت از من (صفحہ ۳۰۸)

ہمیشہ یوں ہی لکھی جاتی ہیں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ قصہ یہ ہو رہا تھا کہ اکبری دربار میں مختلف ارباب مذاہب کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے دھمکنے لگیں۔ ہر ایک اپنے اپنے مذہب کو دربار میں پیش کرتا، جن میں ایک:

"ملک[1] فرنگ کے مرتاض دانشمندوں کا گروہ جن کو پادری کہتے ہیں اور ان کے بڑے مجتہد کا نام پاپا ہے۔ ان لوگوں نے انجیل پیش کی۔ اور ثالث ثلاثہ کے متعلق دلائل پیش کئے اور نصرانیت کی حقانیت کو ثابت کیا۔"

ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ انجیل کا ترجمہ ان پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کریں۔ یہی ترجمہ تھا جس کا بجائے بسم اللہ کے "ای نام تو ژژد کرستو" سے آغاز کیا گیا ہے۔ اسی طرح:

"ولایت گجرات[2] کے شہر نوساری سے آتش پرست بھی آئے۔ انہوں نے زردشت کے دین کی حقیقت ثابت کی۔ یہ لوگ آگ کی تعظیم کو بڑی عبادت خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے بادشاہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی، اور کیانی بادشاہوں کے رسم و رواج سے واقف کیا۔"

چنانچہ:

"شاہان[3] ایران کی طرح جن کی آگ ہمیشہ جلتی رہا کرتی تھی، شیخ ابوالفضل کی نگرانی میں حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے۔"

ان کے سوا اور جو تاریکیاں تھیں وہ چراغ ہی کے نیچے تھیں۔ ہندو مذہب کے تمام

---

[1] دانایانِ مرتاض ملکِ افرنجہ کہ ایشاں را پادھری و مجتہد ایشاں را پاپا می گویند۔ انجیل آوردہ و بر ثالث ثلاثہ دلائل گذرانیدہ وحقیت نصرانیت ثابت کردہ۔ ص ۳۰۸۔ [2] آتش پرستاں از شہر نوساری ولایت گجرات آمدہ بودند دینِ زردشت را حق نمودند و تعظیم آتش را عبادت عظیم می گفتند و بجانب خود کشیدہ از اصطلاح و راہِ کیانیاں واقف ساختند ۱۲ منہ۔ [3] آتش باہتمام شیخ ابوالفضل بروشِ ملوکِ عجم کہ آتش ایشاں ہمہ بر پائے بود دائم الاوقات چہ در شب و چہ در روز در محل نگاہ می داشتہ باشند۔ ص ۳۰۸۔

فرقے اور اسلام کے بھی مختلف العقائد گروہ دربار میں موجود تھے۔ ابتداءً سب سے پوچھا جاتا تھا اور ہر مذہب والے کی رائے دریافت کی جاتی تھی جیسا کہ مُلّا صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے:

"ہر ملک[1] سے ہر قسم کے دانشمند اور مختلف مذاہب و ادیان کے لوگ دربار میں جمع ہو کر بادشاہ کی ہمزبانی کا شرف حاصل کرتے تھے۔ تحقیق و تلاش میں (جس کے سوا بادشاہ کا رات دن کوئی مشغلہ نہ تھا) مشغول رہتے تھے"۔

لیکن یہ ساری تعمیر جو ہو رہی تھی، ظاہر ہے کہ ایک "مستقل مذہبی نظام" کی تخریب و تکذیب کے بعد ہو رہی تھی۔ ممکن ہے کہ ابتداءً اُس عمارتِ منہدمہ کی چیزوں سے بھی اس جدید عمارت کی تیاری میں کام لیا جاتا ہو۔ لیکن حالات نے بتدریج کروٹ لینا شروع کیا اور نوبت آخر میں یہاں تک پہنچی کہ:

"اسلام[1] کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اُس کو بادشاہ نص قاطع اور دلیل قطعی خیال کرتے تھے، بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل، نامعقول، نوپیدا اور عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی خیال کی جاتیں"۔

اس لئے اب سلسلۂ تحقیقات میں "اسلام" کا نام تختہ سے کاٹ دیا گیا اور آخری طریقۂ کار یہ رہ گیا کہ:

"مسلمانوں[1] کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آتی تھی، اس کا انتخاب کر لیا

---

[1] صناف دانایان از ہر دیار و ارباب ادیان و مذاہب بدربار جمع شد بشرف ہمزبانی مخصوص بودند بعد تحقیق و تفتیش کہ شب و روز شیوہ و پیشہ بر ازاں نداشتند ص۲۵۶ ج۲ بر رغم اسلام ہر حکم ارباب ادیان دیگر بیان میکردند آں را نص قطعی شمردند بخلاف دین ملت (اسلام) کہ ہمہ آں نامعقول و حادث و واضع آں فقرائے عرباں ص۳۰۸ ج۲ ہر چہ خوش می آمد از ہر کس غیر از مسلمانان التفات و انتخاب نمودہ از انچہ نامرضی طبع و خلاف خواہش بود احتراز و اجتناب لازم می دانستند ص۲۵۶۔

جاتا تھا۔ اور جو باتیں کہ ناپسندیدہ اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہوتی تھیں
اُن سے احتراز اور پرہیز کو ضروری خیال کرتے تھے۔"

اس معاملہ میں اکبر کی رفتار جس نقطہ پر پہنچ گئی تھی۔ مُلّا صاحب ہی اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"پانچ چھ[1] سال کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل اُلٹ گئی۔"

مختصر یہ کہ "مساوات مذہب" اور "ترجیح بلا مرجح" رواداری و انصاف کا سارا دعویٰ انتہائی تعصب کی شکل میں بدل گیا۔ مُلّا صاحب کی عینی شہادت ہے کہ رواداراکبر اور صلح کُل والے اکبر کی ذہنیت، کا آخری حال یہ تھا کہ:

"جس[2] کسی کو اپنے اعتقاد کے موافق نہ پاتے تھے وہ بادشاہ کے نزدیک گشتنی
مردود اور پھٹکارا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کا نام "فقیہ" رکھ دیا جاتا تھا۔"

خلاصہ یہ کہ اب یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب کے اصول و فروع کا مطالعہ کیا جائے اور ترجیح و عمل کا ذریعہ عقل کے فیصلہ کو ٹھیرایا جائے۔ جیساکہ مُلّا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ خود اکبر شب و روز اسی ادھیڑ بُن میں مصروف رہتا تھا۔ علاوہ ازیں مذہب کو ریز ولیشنوں کی خراد پر چڑھانے کے لئے چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اور:

"بادشاہ[3] نے حکم صادر کیا کہ شاہی مقربین چالیس چالیس کے حساب سے ایک جگہ
بیٹھا کریں اور جو شخص جو کچھ جانتا ہو، اس کا اظہار کرے۔ اور جس قسم کے سوالات
کرنا چاہے کرے۔"

چہل تن کی اس مجلس میں مسائل پیش ہوتے تھے اور پھر عقل سے اس کا فیصلہ کیا جاتا

---

[1] بعد از پنج و شش سال اثرے از اسلام نماند و قضیہ منعکس شد ص ۲۵۵۔ [2] ہر کرا نہ بہ وفق اعتقاد خویش می یافتند گشتنی و مردود و مطرود ابدی می دانستند و نام وے فقیہ ماندند۔ ص ۳۳۹۔ [3] حکم کردند کہ از مقربان چہل کس بعد چہل تن بنشینند و ہر کس ہر چہ داند بگوید و ہر چہ خواہد بپرسد۔ ص ۳۰۸۔

تھا۔ اس کمیٹی کی ایک یہ خصوصیت بھی تھی کہ اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق :

"طرح طرح[1] کے شبہے ہنسی مذاق کی شکل میں پیش کئے جاتے، اور اگر کوئی بیچارہ جواب دینے کا ارادہ کرتا تو جواب سے روک دیا جاتا۔"

آزاد کمیٹیوں کا یہ عارضہ گویا نیا عارضہ نہیں ہے۔ سب کچھ بول سکتے ہو اور کچھ نہیں بول سکتے۔ اسلامی عقائد و اعمال پر تمسخر و استہزار کرتے ہوئے دیگر مذہبوں سے جو لیا جاتا، وہ بھی ملاحظہ ہو :

"نصاریٰ[2] سے گھنٹہ بجانے اور ثلاثہ (باپ بیٹا روح القدس) کی صورت کا تماشا یعنی بلبلان جو ان لوگوں کی خوش گاہ ہے اور ایسی ہی دوسری کھیل کود کی باتیں بادشاہ کے وظیفہ میں داخل ہوگئی تھیں۔"

واللہ اعلم بالصواب "بلبلان" کیا چیز ہے؟ "خوش گاہ ایشاں است" سے جو تفسیر کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ[3] بلبان ہے یعنی الغوزہ (اردو میں منہ چنگ یا بانسری)۔ اسی طرح مُلّا صاحب نے جہاں یہ لکھا ہے کہ "مدارِ دین بر عقل گذاشتند" اسی کے بعد اُن کا یہ فقرہ ہے :

"فرنگیوں[4] کی آمد و رفت بھی شروع ہوگئی تھی اور بعض عقلی اعتقادات بادشاہ نے ان سے حاصل کئے۔"

شاید وحی و نبوّت، معجزات و کرامات وغیرہ کے اِنکار کی بنیاد "آمد و رفتِ فرنگیاں"

---

[1] شبہاتِ گوناگوں بہ تمسخر و استہزار آوردہ اگر کسے درمعرض جواب می شد جواب ہمہ منع بود ص ۳۰۷

[2] نواختن ناقوس نصاریٰ و تماشائے صورت ثالث ثلاثہ بلبلان کہ خوش گاہ ایشاں است و سائر لہو و لعب وظیفہ شد۔ ص ۳۰۴۔ [3] بلبان بالتحریک نام سازیکہ باشتراکِ لب و دست مے نوازند و بھیس سب بہندی آنرا منہ چنگ گویند از بہارِ عجم و صاحبِ کشف بلبان را بالفتح نوشتہ و شارحیکہ ثقہ و معتبر ست بلبان را بفتحتین بمعنی الغوزہ نوشتہ ۱۲ (غیاث اللغات)۔ [4] آمد و رفت فرنگیاں نیز شد، و بعضے اعتقادیاتِ عقلی ایشاں را فرا گرفتند۔ ص ۳۱۲

پر ہی مبنی ہو۔ گویا ریشنلزم (عقلیت) جسے خود اب یورپ کے ایگناسٹگ (ارتیابی) سراسر بدعقلی قرار دے چکے ہیں۔ ہندوستان کے لئے یورپ کا یہ تحفہ کوئی جدید تحفہ نہیں ہے۔ مغربی فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی زمانہ تھا کہ جب کیتھولک مظالم سے تنگ آکر کمزور اعصاب والوں کا غضبناک گروہ یورپ میں پیدا ہو گیا تھا۔ جو سراسر مذہبی بنیادوں پر جا و بے جا طریقوں سے پیہم حملے کر رہا تھا۔ اور نادانی سے اس عہد کے لوگوں نے منافرت کی اس پیداوار کا نام "فلسفہ" رکھ دیا تھا۔

اسی طرح پارسیوں کی بھی بعض باتیں قبول کی گئی تھیں اور جیسا کہ گذر چکا شاہی محل میں انہیں کے مشورہ سے ایک "دوامی آتش کدہ" علّامہ ابوالفضل کی نگرانی میں قائم کر دیا گیا تھا۔ مُلّا صاحب نے لکھا ہے کہ آگ "آیتے است از آیاتِ خدا و نُورے است از انوارِ وے"۔ قرار دی گئی تھی۔ اور ہون کی رسم جو پارسیوں سے پہلے بھی شاہی محل میں "دختران راجہائے ہند" کی وجہ سے انجام دی جاتی تھی، اس میں اس آتش کدہ کے قیام سے اور اضافہ ہو گیا۔ خود بادشاہ اعلانیہ آتش پرستی کرتا تھا۔ اور:

"بادشاہ[1] کے مقربین بھی شمع و چراغ کے روشن ہونے کے وقت قیام کرنا اپنے لئے فرض قرار دیئے ہوئے تھے"۔

یہ تھے وہ اجزاء جو نصرانیوں اور مجوسیوں کے دین سے اس "جدید مذہب" میں شریک کئے گئے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اس "دین" پر جس مذہب کا اثر پڑا تھا وہ وہی مذہب تھا جس کو "ہندی قومیت" کی تعمیر کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونا قدرتی طور پر ضروری تھا۔ یوں تو اس مذہب کے علماء اور پیروں سے دربار بھرا پڑا تھا اور جیسا کہ مُلّا صاحب کا بیان ہے کہ:

"بادشاہ کو بچپن[2] ہی سے ہندوستان کی مختلف قوموں مثلاً برہمنوں سے

---

[1] مقرّبان نیز در وقت افروختن شمع و چراغ قیام لازم می ساختند۔ [2] از صغرِ سن بطوائف مختلف از براہمہ و باد فروشان و سائر اصنافِ ہندوان ربطے خاص و التفاتے تمام است ص ۲۶۱۔

اور بھاٹوں سے اور ازیں قبیل دوسری ہندی جماعتوں سے خاص ربط اور ان کی طرف فطری میلان تھا۔"

ماسوا اس کے:

"ہندوستان کے بڑے راجواڑوں کی لڑکیاں جنہیں بادشاہ اپنے تصرف میں لا چکا تھا، ان عورتوں کو بھی بادشاہ کے مزاج میں خاصہ دخل ہو گیا تھا۔"[1]

اور اسی کے ساتھ کالپی کا ایک برہمن جس کا نام برہمداس تھا اور جس کو پہلے "کب رائے" یعنی ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا اور بعد کو وہی "بیربل" (بہادر) کے نام سے مشہور ہوا، بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گیا تھا۔ اکبر و بیربل کے تعلّقات اس درجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ آج تک اُن کے چرچوں سے ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں۔ مُلّا صاحب نے اگر اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ بادشاہ سے اس کا تعلق "لحمك لحمي و دمك دمي"[2] کا سا ہو گیا تھا تو اس میں کیا تعجّب ہے اور آخر میں اسی بیربل کی سفارش سے ایک بڑا فلسفی برہمن جس کا نام دیوی تھا، بادشاہ کے قُرب سے معزّز ہوا۔ بتدریج اس برہمن کا اثر اکبر پر یہاں تک پڑا کہ رات کو بھی جب شاہی خواب گاہ میں چلا جاتا تھا، دیوی برہمن سے ملنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ معلوم نہیں کہ خاص اسی برہمن کے لئے یا کسی اور وجہ سے اکبر نے ایک لفٹ (جھولا) تیار کیا تھا جس پر بیٹھنے والا بیٹھ جاتا اور اُوپر کھینچ لیا جاتا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ تک دیوی برہمن جو مہابھارت کی کتھا کہنے والا تھا، اس کو چارپائی پر بٹھا کر اُوپر کھینچ کر اس قصر کے پاس جس کو بادشاہ نے اپنی خواب گاہ بنایا تھا، اس کو معلق رکھا جاتا تھا اور اس سے ہندوستانی قصّے اور ہندوستانی اسرار نیز بُتوں، آفتاب اور آگ کے پوجنے کے طریقے ستاروں

---

[1] دختران راجہائے عظیم ہند کہ خیلے بتصرف آوردہ بودند تصرف در مزاج کردہ۔ صد ۲۶۱۔ [2] تیرا گوشت میرا گوشت تیرا خون میرا خون۔ یعنی من تو شدم تو من شدی۔ ۱۲

کی تعظیم کے آداب، ہندوؤں کے جو بڑے لوگ گذرے ہیں، مثلاً برہما، مہادیو، بشن، کشن، مہامائی وغیرہ کے احترام کی صورتیں سنتا اور پھر ان کی جانب مائل ہوتا اور اُن کو قبول کرتا۔[1]

اسی طرح "پرگوتم" نامی برہمن بھی بادشاہ سے بہت زیادہ ہل مل گیا تھا، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر دینِ اکبری میں ان ہی لوگوں کے عقائد و اعمال اور رسوم و طریقوں کو جگہ ملی۔

کلام طویل ہو گیا مگر جب تک تاریکی سامنے نہ ہو، نور کی قدر نہیں ہوتی۔ گذشتہ تحریر نے واضح کر دیا کہ عہدِ اکبری اگرچہ مغل شہنشاہیت کا زمانہ تھا مگر ملّتِ اسلامیہ کو چار فتنوں نے گھیر رکھا تھا۔

(۱) علماءِ سُوء کا فتنہ۔ (۲) فتنۂ اکبری۔

(۳) روافض۔ (۴) ہندو یا عیسائی۔

فتنوں کی گنتی چار پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ "الف ثانی" یعنی دوسرے ہزارہ کے متعلق بھی کچھ ایسی روایات پیدا ہو گئی تھیں جو بجائے خود مستقل فتنہ بن گئی تھیں، اور بہت ممکن ہے کہ لفظ مجدّد کے ساتھ "الف ثانی" کا لفظ انہیں دجل آمیز روایات کی اصلاح کے لئے اضافہ کیا گیا ہو۔

اس سلسلہ میں ہم مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

---

[1] چند گاہے کہ دیوی برہمن کہ از معبرانِ مہابھارت بود بر چارپائی نشاندہ و بالا کشیدہ نزدیک بقصرے کہ آں را خوابگاہ ساختہ بودند معلق داشتہ از وے اسرار و افسانہائے ہندی و طریق عبادت ہائے اصنام و آتش و آفتاب و تعظیم کواکب و احترامِ اساطینِ کفرہ از برہما و مہادیو و بشن و کشن و مہامائی شنیدہ بال جانب گرائیدند۔ ص ۲۸۸۔

الف ثانی کا نظریہ اور دینِ الٰہی کی تدوین

عجیب بات ہے کہ تاریخوں میں اس نظریہ کا ذکر کنائے اشارے میں نہیں بلکہ کھلے کھلے لفظوں میں بکثرت کیا گیا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پچھلے مؤرخین نے اس کے ذکر میں تساہل سے کیوں کام لیا۔ حالانکہ حضرت مجدّد رحمۃ اللہ علیہ کی تجدید کی اضافت جو "الف ثانی" یعنی اسلام کی مدّتِ عمر کے دوسرے ہزار سال کی طرف ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اور انشاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ آتی ہے، اس کا زیادہ تر تعلق اکبر کے اسی نظریہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال میں واقعات درج کرتا ہوں، نتیجہ تک ہر شخص خود بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ التزاماً اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، مُلّا عبدالقادر ہی کی کتاب سے لکھ رہا ہوں اس لئے اس مسئلہ میں بھی میرا مواد ان ہی کی تاریخ تک محدود رہے گا۔

مُلّا صاحب فرماتے ہیں:

"بادشاہ نے یہ خیال پکایا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دین کی مدّتِ عمر کُل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہوگئی۔ بادشاہ کے دل میں اس کے بعد ان منصوبوں کے اظہار اور اعلان میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، جو اپنے دل میں اُس نے پکائے تھے۔ ادھر ایسے مشائخ اور علماء جن کا کچھ رعب و داب تھا، اُن سے بساط خالی ہوچکی تھی۔ للہٰذا فراغت کے ساتھ دل کھول کر احکام و ارکان اسلام کے باطل کرنے میں لگ گئے، اور نت نئے ضوابط و قواعد کا بندوبست عمل میں آنے لگا۔"[1]

---

[1] چوں در زعم خویش مقرر ساختند کہ ہزار سال از زمانِ بعثت پیغمبر اسلام علیہ السلام کہ مدتِ بقاء ایں بود تمام شد و ہیچ مانعے برائے اظہار و دواعی خفیہ کہ در دل داشتند نماند و بساط از مشائخ و علماء کہ صلابت و مہابت داشتند و ملاحظہ تمام از انہا بایستے خالی بماند بفراغ بال در صدد ابطال احکام و ارکان اسلام و بندوبست ضوابط قواعد نو مہمل و مختل ترویج بازار افراد اعتقاد در آمد ص ۳۰۱۔

یہ تھا وہ نظریہ جس کا نام میں نے "نظریۂ الف ثانی" رکھا ہے اور صرف نظریہ پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ اس کے اعلانِ عام کا ذریعہ یہ اختیار کیا گیا کہ سکّہ کا نام "سکّۂ الفی" رکھا گیا۔ اور اس پر "الف" ہی کی تاریخ ثبت کی گئی۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا تجویز کے بعد:

"پہلا[1] حکم یہ دیا گیا تھا کہ سکّہ میں "الف" (ہزار) کی تاریخ لکھی جائے۔"

پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"تنکوں اور اشرفیوں میں الف کی تاریخ لکھوائی گئی اور اس سے اِدھر اشارہ کرنا مقصود تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ مبین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری[2] ہو گئی۔"

ظاہر ہے کہ سکّہ ہی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی ہر خاص و عام تک رسائی ناگزیر ہے۔ کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ وغیرہ سے زیادہ کارگر تدبیر اشتہار کی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ پہلے سلاطین کے جتنے سکّے تھے اور خود اپنے زمانہ کے دوسرے سکّوں کو سخت ترین احکام و فرامین کے ذریعہ سے اکبر نے اُگلوا لیا تھا۔ صرف ایک ہی سکّہ باقی رکھا تھا۔ لیکن بات اس پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک کتاب بھی "تاریخ الفی" کے نام سے از سرِ نو تالیف کرائی، جس کی ترتیب و تدوین کا کام چند علماء کے سپرد ہوا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں:

"اسی[3] سال یہ حکم ہوا کہ ہجرت سے چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے اور لوگ ہر جگہ تاریخ ہجری لکھتے ہیں۔ اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو ان تمام سلاطین کے حالات پر حاوی ہو جو ابتداء سے

---

[1] اوّل حکمے کہ فرمودند ایں بود کہ در سکّہ تاریخ الف نویسند ص۳۰۱۔ [2] در تنکہا و مہرہا تاریخ الف نوشتند کہ بایں اعتبار مشعر باشد از انقراض دینِ مبین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ بیش از ہزار سال نخواہد بود ص۳۰۶۔ [3] و دریں سال حکم شد کہ چون ہزار سال از ہجرت تمام شد و ہمہ جا تاریخ ہجری می نویسند حالامی باید کہ تاریخ تالیف باید کرد کہ جامع جمیع احوال بادشاہان اسلام تا امروز کہ در معنی ناسخ تاریخہائے دیگر باشد و نام او الفی نہند و در ذکرِ سنوات بجائے ہجرت لفظ رحلت نویسند ص۳۰۶۔

اب تک اسلام میں گذرے ہیں جو دوسری تمام تاریخوں کے لئے ناسخ کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس تاریخ کا نام "الفی" رکھیں اور یہ بھی حکم دیا کہ سنون کے ذکر میں بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھیں"۔

مطلب یہ تھا کہ اپنے زمانہ کی حد تک تو سکّہ کا طریقہ اشتہار کے لئے مفید تھا لیکن اس کے بعد پھر اس کی یاد دہانی کا ذریعہ کوئی اور ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے تاریخ الفی کا ذریعہ اختیار کیا گیا۔

اکبر تک یہ نظریہ کس طرح پہنچا؟ خود اس کے اپنے دماغ نے یہ ایجاد کی یا اس کے پیچھے جو "قرنار" لگائے گئے تھے، یہ ان کی تسویل وتزویر تھی؟ صحیح طور پر اس کا پتہ نہیں چلا لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی تائید میں دلائل کا ایک انبار جمع کر دیا تھا۔ ملّا صاحب لکھتے ہیں:

"اسی[1] سال چند رذیل ادنیٰ درجہ کے لوگ جو عالم نما جاہل تھے، انہوں نے اس دعوے کے متعلق باطل دلیلوں کا رشتہ باندھ دیا کہ اس وقت حضرتِ والا ہی وہ صاحبِ زماں ہیں جو ہندو اور مسلمانوں کے بہتر ۷۲ فرقوں کے خلاف و اختلاف کو اُٹھا دیں گے" (حالانکہ بہتر ۷۲ فرقوں کا تذکرہ جس حدیث میں ہے اُس میں اُمّتی کا لفظ بھی ہے یعنی یہ بہتر ۷۲ فرقے اُن کے ہوں گے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں)۔

ہندو مسلم اختلافات کو مٹا دینا جب نظریۂ الف ثانی کا سنگِ بنیاد ہو اور اسلامی احکام وعقائد کے سوا جملہ ادیان و مذاہب اس صاحبِ زمان کو بہتر معلوم ہوں، تو کون ہوگا جو اس وارفتگی سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ چنانچہ مُلّا صاحب کا بیان ہے:

"ہندوستان[2] کے قدیم دانشمندوں کے نام سے (اس زمانہ) کے برہمن ہندی

---

[1] در یں سال اسافل وارازل عالم نمائے جاہل تقاضہ دلائل باطل نمودہ برایں آوردند کہ حالا صاحب زمانے کہ رافع خلاف و اختلاف ہفتاد و دو ملّت از مسلم و ہندو باشد حضرت اند۔ ص ۲۷۹۔ [2] برہمناں شعرہائے ہندی را از زبانِ دانایان سابق نقل کردہ می گذرانیدند بایں مضمون کہ پادشاہ عالمگیرے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اشعار نقل کر کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جن کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ جہان کا فتح کرنے والا ایک بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہوگا جو برہمنوں کی بڑی عزت کرے گا اور گائے کی حفاظت کرے گا، اور عالم کی نگرانی انصاف کے ساتھ کرے گا۔ پرانے کاغذات[1] پر ان خرافات کو لکھ کر بادشاہ کو دکھایا کرتے تھے اور بادشاہ ان کو صحیح خیال کرتا تھا"

کوئی صاحب حاجی ابراہیم صاحب سرہندی تھے جن کا ذکر اس کتاب میں مختلف مواقع پر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی آدمی تھے۔ اکبر کے زمانہ میں صوبہ گجرات کی صدارت پر سرفراز تھے۔ آپ نے گجرات سے جو تحفے بادشاہ کے پاس بھیجے، ان میں ایک تحفہ یہ بھی تھا:

"ایک جعلی عبارت[2] حضرت شیخ ابنِ عربی قدس سرہٗ کی ایک پرانی کرم خوردہ کتاب میں نامانوس حروف میں نقل کر دی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "صاحب زمان" کے پاس بہت سی عورتیں ہوں گی اور وہ ڈاڑھ منڈا ہوگا۔ اسی طرح کے چند صفات جو "خلیفۃ الزمان" میں تھے اس میں درج تھے"

(بقیہ صفحہ گذشتہ) در ہند پیدا شود کہ برہمناں را احترام کند و حفاظتِ گاؤ نماید و گیتی را بعدل نگاہبانی کند و در کاغذہائے کہنہ آں خرافات را نوشتہ می نمودند و بہ باور افتاد (ج ۲ ص ۳۲۶)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سنا جاتا ہے کہ آج بھی برہمنوں کی ایک بڑی جماعت پرانے کاغذات اور تانبے کے پتروں پر حسبِ مطلب مضامین لکھ کر زمین میں دفن کرتی ہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد "ڈسکوری" کے نام سے آسمان و زمین کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے اور ان ہی وثیقوں سے آج ہندوستان کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ ایک معتبر راوی نے مجھ سے حال ہی میں بیان کیا کہ "پونہ" کے علمی حلقوں میں اس نوعیت کے تحقیقی کاموں کا زیادہ زور ہے۔ خیال گذرا تھا کہ شاید یہ وہاں کے برہمنوں کی کوئی "نئی اپج" ہے مگر ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا پرانا دستور ہے۔ [2] عبارتے جعلی از شیخ ابنِ عربی قدس سرہ در کتاب کہنہ و کرم خوردہ بخطِ مجہول نوشت کہ "صاحبِ زمان" زناں بسیار خواہد داشت و ریش تراش خواہد بود و صفتے چند کہ در "خلیفۃ الزمان" بود درج کرد۔ (ص ۲۷۸ ج ۲)۔

مگر برہمنوں کی طرح ان کی بات نبھ نہ سکی۔ چنانچہ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ :

"آں جعل و التباس ظاہر شُد۔"

ایک اور مولوی صاحب تھے جن کا ذکر مُلّا صاحب نے مولانائے خواجہ شیرازی کے لقب سے کیا ہے۔ ان مولانا صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

"شرفاء[لہ] کے پاس سے مکّہ معظمہ سے ایک رسالہ لائے کہ صحیح حدیثوں میں ایّامِ دنیا کی پوری مدّت جو سات ہزار سال بتائی گئی ہے، وہ پوری ہو چکی ہے۔ پس یہی وقت اس مہدی کے ظہور کا ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے"۔

خود ان مولانائے خواجہ شیرازی صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ مرتب فرما کر پیش کر دیا

مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ اس تحریک کی تائید میں صرف سُنّی علماء ہی کے افراد شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ شیعی علماء کے بعض افراد بھی۔ چنانچہ ایک شیعہ عالم مُلّا عالم شریف آملی تھے۔ جو صاحبِ تالیف و تصنیف بھی۔ مُلّا صاحب نے ان کا ایک تذکرہ درج کیا ہے۔ انہوں نے محمود بسخوانی جو تیموری عہد کا ایک مشہور شطح نویس مصنّف گذرا ہے۔ اس کی کتاب سے بھی یہ مضمون نکالا کہ :

"نو سو نوے ہجری[لہ] (۹۹۰) میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص پیدا ہو گا۔ صاحبِ دینِ حق کے تمام اوصاف (اکبر) پر منطبق کر دیئے جو جمل کے قاعدے سے بھی نو سو نوے ہوتے تھے"۔

ان سب کے علاوہ ناصر خسرو کی دو رباعیاں بھی اسی نظریہ "الفِ ثانی" کی تائید میں پیش کی جاتی تھیں۔ پہلی رباعی یہ ہے :

لہ از مکّہ معظمہ رسالہ از شرفا آوردہ کہ در احادیثِ صحاح ہفت ہزار سال کہ مدّتِ ایّامِ دنیاست سپری شد و حالا وقتِ ظہورِ مہدی موعود است و خود ہم رسالہ ترتیب دادہ گذرانید۔ ص ۲۸۷۔ ۲ے۔ در سال نہ صد و نود بہ دارندہ باطل شخصے خواہد بود و ہمہ تعبیر از "صاحبِ دینِ حق" تشخیص کردہ بحساب جمل نہ صد و نود است۔ ص ۲۷۸۔

در نہ صد و ہشتاد و نہ از حکمِ قضا　　　آیند کواکب از جوانب یک جا

در سالِ اسد، ماہِ اسد، روزِ اسد　　　از پردہ بروں خرامد آں شیرِ خدا

اور "آں شیرِ خدا" سے مراد اکبر کی ذات تھی۔ دوسری رُباعی یہ ہے :

در نہ صد و تسعین دو قِرآن می بینم　　　وز مہدی و دجّال نشاں می بینم

یا ملک بدل گردد یا گردد دین　　　سرّے کہ نہاں است عیاں می بینم

بہر کیف اکبر کے زمانہ میں اتفاقاً اسلام کی عمر کے ہزار سال کا گذرنا ایک ایسا واقعہ بنا لیا گیا جس پر "الف ثانی" کے نظریہ کی یاروں نے بڑی بڑی تعمیریں کھڑی کر دیں اور مستقل طور پر طے کر دیا گیا کہ "محمدی اسلام" کی عمر پوری ہو گئی۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کر دیا گیا، کہ بالفرض اگر نہ بھی پوری ہوئی (جیسا کہ مُلّا صاحب کا بیان ہے) جب بھی :

"مُلّا مبارک[1] نے بیربر سے بادشاہ کے سامنے خلوت میں مخاطب کر کے کہا کہ جس طرح تمہارے دین میں تحریفیں ہوئی ہیں، اسی طرح ہمارے مذہب میں بکثرت تحریفیں ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے اب اس مذہب پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا۔"

ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اور دوسرا اسی کے بعد :

"اور ہجرت[2] سے اس وقت تک ایک ہزار سال کی مدت بھی پوری ہو چکی ہے۔"

نتیجہ ظاہر ہے کہ اب کسی جدید آئین کی ضرورت ہے۔ لیکن جدید آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ گذر چکا کہ "ہندو مسلم" اختلاف کو رفع کرنا۔ اب سُنئے کہ اس پر جدید حاشیہ آرائی کیا ہوئی :

"تمام مذاہب[3] میں عقل مند موجود ہیں اور پائے جاتے ہیں اسی طرح ریاضت

---

[1] دریں سال شیخ مبارک در خلوت بحضور بادشاہ بیربر گفت کہ چنانچہ در کتبِ شما تحریفات است در دینِ ما نیز تحریفات بسیار رفتہ و اعتمادے نماند ص ۳۱۲۔ [2] مدت ہزار سال از ہجرت تمام شد۔ ص ۳۱۲۔ [3] عقلا در ہمہ ادیان موجود و مہیا اند و اربابِ ریاضات و کشف و کرامات در کُل طوائف انام پیدا و حق ہمہ جا دائر، پس انحصارِ آں در یک دین و یک مِلّت کہ نو پیدا شدہ و ہزار سال برو نگذشتہ باشد چہ لازم (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ومجاہدہ کشف وکرامات والے بھی دنیا کے تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں اور حق تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ پھر ایک ہی دین و ملّت میں جو نیا پیدا ہوا ہے اور اس پر ہزار سال بھی نہیں گذرے، حق کے منحصر ہونے کی کیا ضرورت ہے، ایک کو ثابت کرنے اور دوسرے کی نفی کرنے کی ترجیح بِلا مرجح کہاں سے جائز ہوئی"۔

بہرحال آخر یہ طے کر لیا گیا کہ جدید ملّت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اکبر کی تکذیبی رفتار اس وقت تک صرف دامانِ نبوّت تک پہنچی تھی۔ الحاد کی آخری منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی "الٰہ" کا تصوّر باقی تھا اور اسی لئے اس دینِ جدید کا نام "الٰہی مذہب" رکھا گیا تھا۔ الٰہی مذہب کے لئے عموماً الہام و وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کیا اکبر نے کوئی اس کا بھی سامان کیا تھا اور کتابوں میں تو شاید اس کا بھی کچھ سراغ ملتا ہے۔ لیکن مُلّا صاحب بالخصوص ایک موقع پر یہ لکھ گئے ہیں:

"یہی[1] باتیں دعویٔ نبوّت کا سبب ہوئیں۔ لیکن نبوّت" کے لفظ کے ساتھ نہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں"۔

اور مُلّا شیری نے بھی اپنے مشہور قصیدہ میں اکبر کی ان بے ہودہ کوششوں کا اس ایک شعر میں جواب دے کر کہ:

شورشِ مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی
کز خلائق مہر پیغمبر خُدا خواہد شدن

آخر میں انہوں نے بھی کچھ "نبوّت" ہی کی جانب ظریفانہ اشارہ کیا ہے:

بادشاہ امسال دعوائے نبوّت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خُدا خواہد شدن

(بقیہ صفحہ گذشتہ) واثبات یکے ونفی دیگرے ترجیح بلا مرجح از کجا۔ ص۲۵۶۔

(صفحہ ہٰذا) [1] ایں ہمہ باعثِ دعویٔ نبوّت شد امّا نہ بلفظِ نبوّت بلکہ بعبارتِ آخر۔ ص۲۸۷

لیکن بجز ایک واقعہ کے جس کا ذکر بدایونی نے بھی کیا ہے کہ نندانہ (پنجاب) سے لوٹتے ہوئے اکبر کو شیر و شکار کا شوق ہوا، اور قمرغہ (ہانکنے) کا فرمان دے کر شکار میں مصروف ہوا چار دن تک مسلسل شکار کھیلتا رہا۔ شکاروں کا انبار لگ گیا کہ اچانک ایک درخت کے نیچے:

"اچانک[1] بادشاہ پر ایک عجیب حالت طاری ہوئی اور جذبہ عظیم وارد ہوا، حالت میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کی تعبیر ناممکن ہے۔ ہر شخص اپنے خیال کے مطابق ایک رائے قائم کرتا تھا۔"

اکبر پر یہ کس قسم کا حال طاری ہوا؟ مُلّا صاحب تو "الغیب عند اللہ" کہہ کر نکل گئے لیکن آگے چل کر خود ہی لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں بادشاہ کی اس کیفیت کی خبر نے شہرت پالی، اور طرح طرح کی گپیں اور بیہودہ باتیں عوام کی زبانوں پر آگئیں[2]۔"

بظاہر وحی و کتاب کے متعلق جو بعض خبریں مشہور ہیں۔ وہ ان ہی "اراجیف و اکاذیب" پر مبنی ہیں۔ اتنا تو ثابت ہے کہ اس درخت کو "متقدّس" قرار دیا گیا ہے اور:

"بلند[3] عمارت اور وسیع باغ کی بُنیاد اس جگہ ڈال دی اور بہت سا سونا فقراء اور مساکین کو دیا۔"

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ: "سر[4] کے بال کٹوائے۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ گیا کے "ہولی ٹری" (Holly tree) کی نقل نہ تھی۔ کیا اکبر کو پیپل کے درخت کی خبر نہ تھی جس کے نیچے ہندوستان کے مشہور بانی مذاہب "بدھا" کے ساتھ کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا؟ لیکن باوجود "عمارت عالی و باغ وسیع" کے:

---

[1] ناگاہ بیک بار حالتے عجیب و جذبہ عظیم بر شہنشاہی وارد گشت و تغیر فاحش در وضع ظاہر شد بمشابہ کہ تعبیر ازاں ممکن نبود ہر کدام ہر چیزے حمل می کردند۔ ص ۲۵۳۔ [2] ایں خبر در شرق رویہ ہند شہرت یافتہ اراجیف عجیب و اکاذیب غریب در افواہ عوام افتاد۔ ص ۲۵۳۔ [3] طرح عمارت عالی و باغ وسیع در آنجا انداختند و زر بسیار بفقراء و مساکین دادہ [4] موئے سر را قصر کردند۔

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

مُلّا شیری نے سچ کہا تھا:

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جا ہلے
کز خلائق مہر پیغمبر خدا خواہد شدن

بہر حال جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے۔ اکبر نے نبوت کا صریح اور صاف دعویٰ کبھی نہیں کیا تھا۔ جس کی شہادت مُلّا صاحب بھی دیتے ہیں لیکن کوئی صاحب تاجُ العارفین تھے۔ وُہ:

"انسانِ کامل سے خلیفۃ الزمان کی ذات مراد لیتے تھے۔ "ذاتِ اقدس" اس کا خطاب مقرر کیا تھا۔ اور بسا اوقات بلا کم و کاست اس کو بجنسہٖ خدا قرار دیتے تھے"۔[1]

لیکن پھر بھی جو بات "نبی" بننے میں حاصل ہو سکتی تھی، "عین خدا" بننے میں وُہ لُطف نہ تھا۔ بادشاہ تو خیر کوئی چیز بھی ہے۔ ہر فقیر "انا الحق" کا نعرہ لگا سکتا تھا۔ اس لئے اس کو کوئی اہمیّت بھی نہیں دی گئی"۔

کریا کرم مریم مکانی (والدۂ اکبر) کا انتقال ہُوا، تو سوگ اور ماتم کے ساتھ یہ بھی تھا:

"سر، داڑھی اور مونچھیں منڈوا کر ماتمی لباس پہنا اور بادشاہ کی موافقت میں کئی ہزار امراء، منصب داروں اور شاگرد پیشہ لوگوں نے سروں، داڑھیوں اور مونچھوں کو منڈوا دیا"۔[2]

بدایونی کی تحریر سے اکبر کے خیالات و رجحانات کا کافی اندازہ ہو گیا۔ شیخ ابوالفضل

---

[1] انسان کامل را عبادت از خلیفۃ الزمان داشتہ تعبیر آں بذاتِ اقدس نمودہ اکثر عین واجب لا اقل ولا عکس آں فہمایندہ۔ (منتخب التواریخ ص ۲۵۳)۔ [2] موئے سر و ریش را و بروت سترده لباس ماتم پوشیدند و چندیں ہزار کس از امراء و منصبداران واحدی و شاگرد پیشہ بموافقت آنحضرت رخت مصیبت اختیار کردند (دیباچہ توزک جہانگیری ص ۱۵ مطبوعہ نولکشور)

اس کا بھائی فیضی اور باپ مُلّا مبارک ناگوری، اکبر کے مریدانِ خاص[1] ہیں، جو دینِ الٰہی کی اصطلاح کے بموجب اخلاص کے چاروں مراتب (ترکِ مال، ترکِ جان، ترکِ ناموس، ترکِ دین) طے کر چکے تھے۔

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری میں شیخ ابوالفضل نے بھی اکبر کا مذہب بیان کیا ہے۔ مشیرِ خاص ہمراز اور ہمنوا ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض یہی تھا کہ وہ اکبر کی لامذہبی کی تاویل کرتا، چنانچہ اس نے اس فرض کو بخوبی انجام دیا ہے۔

جہانگیر ولی عہد اور جانشین ہونے کے ساتھ ایک واقعہ نگار بھی ہے۔ مگر وہ توزک میں جگہ جگہ اکبر کو خدارِ مجازی[2] اور مرشدِ حقیقی لکھتا ہے۔ وہ اپنے مرشد کے کچھ اوصاف نمایاں کرتا ہے:

"میرے[3] والد بزرگوار کے اوصافِ حمیدہ تعریف و توصیف کے حدّ و انداز سے خارج ہیں پدری و فرزندی کے مرتبہ سے قطعِ نظر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اخلاق پسندیدہ کے متعلق اگر مستقل کتابیں لکھی جائیں تو ایک تھوڑا سا حصّہ بھی احاطۂ تحریر میں نہ آئے۔ عظیم الشان سلطنت اور بے حد و حساب خزانوں اور دفینوں اور بے شمار ہاتھیوں اور عربی اور ترکی گھوڑوں کے باوجود درگاہِ الٰہی میں عاجزی اور فروتنی کے درجہ سے ایک بال برابر بھی قدم باہر نہیں رکھا۔

---

[1] تاریخ ہندوستان ص۵۳ ج ۵ ۔ [2] ایک دفعہ پیادہ پا باپ کی قبر کی زیارت کو گیا اور حسرت میں رہا کہ بسر و چشم نہ جا سکا۔ وجہ یہ لکھتا ہے کہ میرے والد ماجد میری پیدائش کے لئے آگرہ سے اجمیر تک کی طویل مسافت پیادہ پا طے کر کے گئے تھے۔ میں اتنا بھی نہ کروں (توزک ص۴۷)۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔ بملازمت پدر و مرشد و قبلہ و خدائے مجازی خود رسیدم (توزک ص۳۱)۔ [3] اوصافِ حمیدۂ والد بزرگوارم از حدِ توصیف و اندازہ تعریف افزوں است اگر کتابہا در اخلاق پسندیدۂ ایشاں تالیف یابد بے شائبۂ تکلّف و قطع نظر از مراتب پدری و فرزندی اندکے از بسیار آں گفتہ نیاید۔ باوجود سلطنت و چنیں خزائن و دفائن بیروں از اندازہ حساب و قیاس و فیلان جنگی و اسپانِ تازی یکسر مورد درگاہ الٰہی از عجز و فروتنی قدم فرانا نہادہ خود را کمترین مخلوقے از مخلوقات میدانستند و از یادِ حق لحظہ غافل نبودند۔

خدا کی مخلوقات میں اپنے آپ کو ایک کم ترین مخلوق سمجھ کر یادِ حق سے ایک لحظہ کے لئے بھی غافل نہیں رہتے تھے ؎

دائم[1] ہمہ جا باکس درہمہ حال
میدار نہفتہ چشمِ دل جانبِ یار (توزکِ جہانگیری)

اس مرید با اخلاص (جہانگیر) کی تردید کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دینِ الٰہی کی بنیاد کا خیال نہ بھی آتا، مگر گیا اپنے اختراع اور ایجاد کے بموجب "نیرِ اعظم" (آفتاب) کی پرستش اور کسی خیالی خدا یا دیوتا کی یاد کرنا اور ہر دم اس کا مالا جپنا "دینِ محمدی" کی دشمنی کے مخالف ہے؟

یہی مریدِ صادق تحریر فرماتے ہیں:

"میرے باپ اکثر اوقات ہر ایک دین اور مذہب کے دانشمندوں اور ماہروں اور بالخصوص پنڈتوں اور دانایانِ ہند سے صحبت رکھا کرتے تھے۔ اور باوجودیکہ اُمی (قطعاً ان پڑھ) تھے مگر دانا اور اربابِ فضل کی کثرتِ مجالست اور رات دن کی صحبت کے باعث اُن کی گفتگو سے بظاہر کوئی شخص بھی معلوم نہ کر سکتا تھا کہ یہ اُمی (ان پڑھ) ہیں۔ نظم و نثر کی اُن باریکیوں تک پہنچ جاتے تھے کہ اس سے زیادہ تصوّر میں نہیں[2] آ سکتا۔" (توزک)

ان نمائشی اوصاف کے بعد منشیانہ انداز سے اُس کی لامذہبی کی تاویل کر ڈالتا ہے۔

---

[1] دائم ہمہ جا الخ (ص۱۷ توزک جہانگیری) دوسرے موقع پر تحریر کرتا ہے۔ فکر باید کرد تا در خلوت و کثرت خاطر لمحہ از فکر و اندیشہ از خالی نباشد۔ والد بزرگوارم بلکہ باین معنی بہم رسانیدہ در کم وقتے ازیں اوقات ازیں فکر خالی بودند (ص۲۹ توزک)۔ [2] پدرِ من در اکثر اوقات با دانایانِ ہر دین و مذہب صحبت می داشتند خصوصاً با پنڈتان و دانایانِ ہند و باآں کہ اُمّی بودند از کثرتِ مجالست با دانایان و اربابِ فضل در گفتگو ہا چناں ظاہر مے شد کہ ہیچ کس پے باُمّی بودن ایشان نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں مے رسیدند کہ ما فوقے براں متصوّر نبود (توزک جہانگیری ص۱۵)۔

"شیعہ[1] کے لئے ایران اور سُنّی کے لئے روم، ہندوستان اور توران کے سوا کہیں پناہ نہیں۔ مگر ممالک دنیا کے طرز و آئین کے برخلاف اس دولتِ بے نظیر کے وسیع مُلک میں مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے لئے مساوی طور پر پناہ اور امن مہیا ہے۔"

جس طرح رحمتِ ایزدی کے وسیع الفضاء دائرہ میں تمام جماعتوں اور تمام مذہب والوں کے لئے گنجائش اور پناہ موجود ہے۔ پس اس بنا پر کہ سایہ[2] کو چاہیئے کہ ذات کا پرتو ہو۔ آپ کے ممالکِ محروسہ میں جس کی سرحد دریائے شور کے ساحل پر ختم ہوتی ہے، تمام مختلف مِلّتوں اور صحیح اور ناقص عقیدوں کے ماننے والوں کے لئے پناہ تھی، اور ایک دوسرے کی ایذا رسانی کا راستہ بند تھا۔

سُنّی شیعہ کے ساتھ ایک مسجد میں، فرنگی یہودی کے ساتھ ایک کلیسا میں عبادت کے طریقے بجالاتے تھے۔

آپ کا مقررہ اصول صلح کُل تھا۔

---

[1] ارباب ملل مختلفہ را درسعت آباد دولت بے بدلیش، جا بخلاف سائر ولایات عالم کہ شیعہ را بغیر از ایران و سُنّی را در روم و ہندوستان و توران جا نیست چنانچہ در دائرہ وسیع الفضاء رحمت ایزدی جمیع طوائف وارباب ملل را جاست بمقتضاء آنکہ سایہ میباید کہ پرتو ذات باشد در ممالکِ محروسہ اش کہ ہر حدے برکنار دریار شور منتہی گشتہ ارباب ملتہائے مختلف وعقیدتہائے صحیح وناقص را جا بودہ راہ تعرض بستہ گشتہ سُنّی یا شیعہ دریک مسجد و فرنگی بایہودی دریک کلیسا طریق عبادت مے سپردند صلح کُل شیوہ مقرر ایشاں بود۔ بائیکاں وخوباں ہر طائفہ وہر دین وآئین محبّت مے داشتند وبقدر حالت وفہمیدگی برکدام التفات ہامے فرمودند۔ شبہائے ایشاں بہ بیداری میگذشت ودر روزہا بسیار کمخواب بودند، چنانچہ مدّتِ خواب ایشاں در شباں روزے از یک و نیم پہر زیادہ نبود وبیداری شبہا را بازیافتی از عمرے دانستند ۲ ص ۱۷ و ص ۱۸ (توزک جہانگیری) [2] ایک روایت میں ہے "السّلطان ظل اللہ فی الارض" سلطان ملک میں خدا کا سایہ ہے۔ غالبًا "سایہ" کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

"ہر طائفہ اور ہر دین و آئین کے نیک اور بھلے آدمیوں کے ساتھ محبت رکھتے تھے حالت اور فہم کے بموجب ہر ایک کے ساتھ التفات فرماتے تھے۔ آپ کی راتیں بیداری میں گذرتی تھیں۔ اور دن میں بہت کم سوتے تھے۔ چنانچہ رات دن میں سونے کی مدت ڈیڑھ پہر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بیداری شب کو عمر کی واپس شدہ دولت تصور کرتے تھے۔ (توزک جہانگیری ص۱۸)۔

تنبیہ | اسلام سے بڑھ کر "صلح کُل" کون ہوسکتا ہے جس کی تعلیم ہے:

لا تسبّوا الذین یدعون	ان کو بے ہودہ بات نہ کہو جو خدا کے
من دون اللہ فیسبّوا	ماسوا کو پکارتے ہیں (معبود بناتے ہیں)
اللہ عدوا بغیر علم۔	کیونکہ پھر وہ نادانی سے آگے بڑھ کر خدا کی
(سورہ انعام)	شان میں بے ہودگی کرنے لگیں گے۔
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ	رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور
مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ	تمام مسلمان اُس پر ایمان لائے، جو
اٰمَنَ بِاللہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ	رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اُن کے
کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ	رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اُن
بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ	میں سے ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اُس
(سورہ بقرہ)	کے فرشتوں، اس کی نازل فرمودہ کتابوں

اور اُس کے تمام رسولوں پر، اس عقیدہ کے ساتھ کہ ہم خدا کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں، یہ تفریق نہیں کرتے۔

انّ من امّۃ الا خلا فیھا	ہر ایک امت میں کوئی نبی گذرا
نذیر۔	ہے۔

تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں اُس کا اصول یہ ہے:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ	دین کے بارے میں جبر و اکراہ نہیں

تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۔ ہدایت اور گمراہی نکھر گئی ۔

(قرآن حکیم)

مگر مصیبت تو یہ تھی کہ "صلح کُل" کا مطلب وہ لیا گیا، جس کی توضیح بدایونی نے کی حتیٰ کہ ایک نئے دین کی ضرورت محسوس ہونے لگی، اور خود جہانگیر کی تحریر کے بموجب "مریم مکانی" کے مرنے پر داڑھی اور مونچھیں مونڈوا دی گئیں۔ انتہا یہ کہ "جہانگیر جیسا شکار کا عاشق" لکھتا ہے :

"جو[1] ریاضتیں میرے والد نے کیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ "غذا حیوانی" کو ترک کر دیا تھا۔ تمام سال میں صرف تین مہینے گوشت کی طرف رغبت فرماتے تھے۔ باقی نو مہینے دوسری قسم کے "صوفیانہ کھانوں" پر قناعت کرتے تھے۔ اور جانوروں کے مارنے اور ذبح کرنے کو کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کے ایامِ فرخندہ فرجام (مبارک دَور) میں بہت سے مہینوں اور دِنوں میں حیوانات کا مارنا عام طور پر ممنوع تھا۔ جس کی تفصیل اکبر نامہ میں درج ہے۔ (توزک جہانگیری ص۲۲)۔

بنیادی غلطی جہانگیر اور اکبر دونوں ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اُن کے نزدیک اسلام وہ ہے جو اُن کو اچھا لگے۔ مگر درحقیقت یہ خدا پرستی نہیں خود پرستی ہے۔ اسلام اطاعت ہے۔ اطاعت میں اپنی عقل چلانا سرکشی اور تمرد ہے۔ یہ درست ہے کہ دانا اور مدبّر حاکم کا کوئی حکم بھی مصلحت اور حکمت سے خالی نہ ہوگا۔ مگر محکوم کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنی عقل پر نہیں بلکہ حاکم کے حکم پر اعتماد کرے۔

ایک سپاہی افسر کے اشارہ کا پابند ہوتا ہے اور اس کے حکم پر اپنی جان نثار کیا کرتا

---

[1] از ریاضتے کہ والد بزرگوارم مے کشیدہ اند یکے ترکِ غذائے حیوانی بود کہ در تمام سال سہ ماہ بگوشت میل میفرمودند و نہ ماہ دیگر بطعام صوفیانہ قناعت میکردند و مطلق بہ قتل و ذبح حیوانات راضی نبودند و در ایام فرخندہ فرجام ایشاں در بسیارے از روزہا و ماہہا کشتن حیوانات منع عام بود و تفصیل ایام و شہورے کہ مرتکب خوردن گوشت نمی شدند در اکبر نامہ داخل است۔ (توزک جہانگیری ص۲۲)

ہے۔ اگر فرمان کو پہلے اپنی عقل کی ترازو پر تولے اور پھر اطاعت کے لئے قدم بڑھائے تو
تو وہ سپاہی نہیں ——— کلامِ الٰہی کا اعلان ہے :

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا   تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

انسان کے سامنے جب یہ اعلان حق پڑھا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ چین بجبیں ہوا کرتا ہے۔ مگر مستقبل کی تاریخ ہمیشہ اس اعلان کی تصدیق کرتی رہتی ہے۔

اکبر کے زمانہ سے موجودہ دور تک کی ترقیات پر نظر ڈالو، تو وہ عقل[1] دور اندیش جس پر اکبر اور اس کی پارٹی کو ناز تھا، آج جہالت سمجھی جا رہی ہے۔

آلِ تیمور کی سیادت کو محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے ایک مذہب کی بنیاد ڈالنی چاہی کاش ایجادِ مذہب کے بجائے وہ دستورِ سلطنت میں اصلاح کرتا۔ پارلیمنٹری نظامِ حکومت قائم کرکے آلِ تیمور کے لئے شاہیت کو محفوظ کر دیتا تو زیادہ ممکن تھا کہ برطانوی شہنشاہیت کی طرح مغلیہ شہنشاہیت کو لازوال ورنہ دیرپا بنا دیتا لیکن وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کا تاریخی مظاہرہ کس طرح ہوتا؟

کلام اللہ نے واضح کر دیا کہ انسان فطرتاً ظالم اور جاہل ہے۔ خالقِ فطرت نے قرآن حکیم کو اسی لئے نازل فرمایا کہ ظلم کے بدلے عدل، جہل کے عوض میں علم، فطرت[2] انسان کو مرحمت ہو لہٰذا خلافِ شرع جو کچھ ہے ظلم و جہل ہے۔ عقل بلاشبہ بڑی دولت ہے۔ عقل اور علم کی خداداد دولتوں نے ہی انسان کے درجہ کو خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور بالا کیا، اور اسی لئے حکم ہے کہ علم و عقل کو کام میں لاؤ۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِى الْاَبْصَارِ (قرآن حکیم)   اے عقل والو سبق حاصل کرو۔

---

[1] اگر لاسلکی، ریڈیو، براڈ کاسٹ، کروزر، آبدوز کشتیوں، ہوائی جہازوں، راکٹوں اور فضائی اسٹیشنوں کا ذکر اکبر کے سامنے ہوتا تو وہ اسی طرح ان کا مذاق اڑاتا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور بدقسمتی یہ ہے کہ انسان آج بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہے (معاذ اللہ)۔ [2] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (اِلٰى قولہ تعالیٰ) اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔

مگر سب سے پہلے اپنی حقیقت، فطری لاچاری اور بے بسی، پھر خالق کے احسانات اور اس رابطہ اور تعلق کے تجسس میں اس کو صرف کرو، جو خالق اور مخلوق کے درمیان میں ہونا ضروری ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ	یقیناً آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش
الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ	اور لیل و نہار کی گردش میں اہلِ عقل
وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی	کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ اہلِ عقل جو
الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ	کھڑے بیٹھے اور لیٹ کر (ہر حالت)
اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی	میں خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں، اور
جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ	آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج	میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (نتیجۃً
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج	کہتے ہیں) خداوندا تو نے اس (کائنات)
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ	کو بے کار نہیں پیدا کیا۔ تو تمام نقائص
النَّارِ ۝	اور عیوب سے پاک ہے۔ ہمیں عذاب
(قرآن حکیم)	دوزخ سے محفوظ رکھ۔

ارسطو اور افلاطون، جالینوس اور بطلیموس جیسے عقل و فکر کے دیوتا دنیا میں آئے ہر ایک نے نوعِ انسان کے بہبود و فلاح کا راستہ دریافت کرنا چاہا مگر کیا وہ کامیاب ہوگئے؟ (العظمة للہ)۔ کامیابی تو درکنار اُن کی نمائشی دانش و حکمت نے انبیاء علیہم السلام کی پاک تعلیم کو بھی مکدر کر دیا۔ اسی لئے فاطر ہستی نے آخری پیغام (قرآن حکیم) میں اعلان کر دیا:

"نہیں نہیں[1]! تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں، جبتک آپ کو (رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم) اُن تمام اُمور میں حکم (جج) نہ مان لیں جن کے بارے

---

[1] فلا وربك لا يؤمنون (الیٰ قوله تعالیٰ) وسلّموا تسليما ۱۲

میں اُن کے آپس میں اختلاف ہو۔ پھر جو کچھ آپ کا فیصلہ ہو اس کے متعلق اپنے دلوں میں قطعاً کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس کے سامنے پوری طرح سرِ تسلیم خم کر دیں" (قرآن حکیم)۔

نیز اعلان فرمایا گیا:

"جو کچھ رسول[1] تم کو دیں لے لو۔ جس سے منع کریں رُک جاؤ۔ (قرآن حکیم)

حکم ہے:

"حکم پر چلو اللہ[2] کے اور حکم پر چلو رسول کے۔ اور ضائع مت کرو اپنے کئے ہوئے کام[3]"۔

بہرحال جہانگیر کو تعجب ہے کہ اتنی شوکت و حشمت، اتنی دولت و ثروت کے باوجود وہ ہر وقت خدا کو یاد کیا کرتا تھا مگر کتاب اللہ کا فیصلہ یہ ہے:

"ہدایت[4] کے واضح اور ظاہر ہو جانے کے بعد جو شخص بھی رسول کی مخالفت کرے گا، اور مسلمانوں کے راستہ کے سوا دوسری راہ چلے گا، تو ہم اس کو چلائے جائیں گے اُسی راستہ۔ جس پر وہ چلا ہے۔ پھر ہم اس کو دوزخ میں جھونک دیں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔ (قرآن حکیم)

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

---

۱ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ ۱۲ ۲ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (پ۲۶ ع ۴ سورہ محمد)۔ ۳ یعنی ہر ایک عمل کی قبولیت کے لئے شرط یہ ہے کہ خدا اور رسولِ خدا کے حکم کے موافق ہو۔ ۴ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (پ۵۔ النساء ۱۱۵)

موتِ اکبر

عیبش ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو

خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

اکبر نے ۱۰۱۴ھ میں وفات پائی۔ اور مُلّا عبدالقادر کی تاریخ ۱۰۰۴ھ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ابوالفضل نے ۱۰۱۱ھ میں وفات پائی، اور اکبر کے مرنے سے پہلے اس کی آئینِ اکبری اور اکبرنامہ ختم ہو گئے۔ پس اکبر کے مذہبی خیالات کے تغیرات کا ذکر آخر دس برس میں کسی مؤرخ نے نہیں لکھا۔

شہنشاہ اکبر کے خیالات مذہبی ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس آخر دس سال میں اُن میں کیا تغیّر پیدا ہوا۔

جہانگیر کی توزکِ جہانگیری کا ترجمہ انگریزی زبان میں میجر پرائس صاحب نے کیا ہے۔ ترجمہ میں یہ فقرہ لکھا ہے:

"شہنشاہ اکبر نے سب سے بڑے مولوی کے ہاتھ پر توبہ کی اور کلمہ پڑھ کر جنّتی مسلمانوں کی طرح وہ اس دُنیا سے رخصت ہوا"۔

مگر اس مضمون کا کوئی فقرہ اس توزک جہانگیری میں نہیں ہے جو سر ڈاکٹر سیّد احمد خان بہادر نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں چھپوایا ہے۔ (تاریخ ہندوستان ج ۵ ص ۸۶۳ و ص ۸۶۴)۔

شمس العلماء موصوف نے جلد ششم میں تحریر فرمایا ہے:

"جہانگیر نے چھوٹی توزک میں باپ کے مرنے کا حال بہت دلچسپ لکھا ہے۔ روز سہ شنبہ ہشتم جمادی الاول کو میرے باپ و مُرشد کا سانس تنگ ہوا، اور وقتِ رحلت قریب آگیا فرمایا

باباؒ[1] ! کسی آدمی کو بھیج کر میرے کُل امراء اور مقرّبوں کو بُلالو، تاکہ میں تجھ کو اُن کے سپرد کردوں، اور اپنا کہا سُنا اُن سے معاف کراؤں۔ انھوں نے برسوں میری ہمرکابی میں جانفشانی کی ہے"۔

اُمراء حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی طرف منہ کرکے اپنا کہا سُنا معاف کرایا اور چند فارسی اشعار پڑھے۔

مرنے کے وقت والد ماجد اور میرے مُرشد نے فرمایا۔ "میراں صدر جہان" کو بلاؤ کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھے۔

میراں صدر جہان حاضر ہوئے اور دو زانو ادب سے بیٹھ کر کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ بادشاہ نے خود اپنی زبان سے کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھا۔ اور میران صدر جہان سے فرمایا کہ سراہنے بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور دعاء عدیلہ پڑھیں۔ جب میران صدر جہان نے سورۂ یٰسین پڑھ کر دعاء عدیلہ ختم کی تو بادشاہ کی آنکھ سے آنسو نکلے، اور جان آفریں کو جان سپرد کی۔ (خلاصہ ص ۲۸۱ تا ص ۲۸۶ جلد ہشتم تاریخ ہندوستان)۔

رویّۂ اکبر کا اثر عوام پر

انسان اقتدار پرست ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے، اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) اکبر کے خیالات نے عوام پر کیا اثر کیا؟ اس کے لئے ملاحظہ ہو:

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

"کفّار برملا اور بطریقِ غلبہ، دارالاسلام (ہندوستان) میں احکام کفر جاری کرتے ہیں، اور مسلمان احکامِ اسلام کے اظہار سے عاجز ہیں اور اگر کر بیٹھتے ہیں تو قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ واویلاہ، واحزناہ، وامصیبتاہ۔ محمد رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کہ

---

[1] جہانگیر کو خطاب ہے۔ ۱۲

محبوب رب العالمین ہیں۔ آپ کی تصدیق کرنے والے ذلیل و خوار ہیں، اور آپ کے انکار کرنے والوں کی عزت ہوتی ہے۔ اُنہیں کا اعتبار ہے مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی تعزیت میں مشغول ہیں اور کفّار اُن کا مذاق اُڑا کر اُن کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں"۔ (مکتوب نمبر ۴۷ ص ۶۵ ج ۱)۔

جراحتِ مسلم پر نمک پاشی ملاحظہ ہو:

"کفّارِ ہند[1] بے خوف و خطر مساجد کو شہید کرتے ہیں، اور اپنے مندر اُن کی جگہ بناتے ہیں تھانیسر[2] میں کرکھیت کے حوض میں ایک مسجد اور مقبرہ تھا۔ ایک عزیز[3] نے اس کو منہدم کر کے ایک بہت بڑی چوٹی کا شوالہ بنایا ہے۔ نیز کفّار کھلم کھلا کفر کے مراسم ادا کرتے ہیں اور مسلمان اکثر احکامِ اسلام کے اجراء سے عاجز ہیں"۔ (مکتوب نمبر ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۳)۔

پھر عاجزی بھی ملاحظہ ہو:

"ہندو[4] کاوشی کے دن کھانا پینا چھوڑتے ہیں (برت رکھتے ہیں) یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ اُس روز مسلمانوں کے شہروں میں کوئی مسلمان دن میں روٹی نہ پکائے۔ رمضان مبارک کے

---

[1] کفارِ ہند بے تحاشا ہدمِ مساجد مے نمایند و در آنجا تعمیر معبد ہائے خود می سازند۔ در تھانیسر درونِ حوض کرکھیت مسجدے بودہ و مقبرہ۔ عزیزے آں را ہدم کردہ بجائے آں دیرہ کلاں راس ساختہ است و نیز کفّار بر ملا مراسمِ کفر بجامی آرند و مسلمانانِ در اجراء اکثر احکامِ اسلام عاجز اند (مکتوب ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۲)

[2] تھانیسر را بزرگ معبد برشمرند دریار سرستی نزداو بگذرد و ہندی نژاد اورا فراواں گرایش برد۔ ونزدیک آں کولابے ست "کرکھیت" نام از دور دستہا بہ نیایش آیند و تن شوہی کنند و خیرات برد ہند و آویزہ مہا بھارت در اینجا شد در آید۔ (آئین اکبری ص ۱۳۵ ج ۲)۔ [3] تہذیب ملاحظہ ہو۔ کافر کو عزیز سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ محمد میاں۔ [4] روز اکاوشی کہ ہنود ترکِ اکل و شرب مے نمایند و اہتمام دارند کہ در آں روز در بلادِ اسلام ہیچ مسلمانے در روز نان نپزد۔ دور ماہ مبارک رمضان برملا نان و طعام مے پزند و مے فروشند، ہیچ کس از زبونیٔ اسلام منع آں نے تواند نمود۔ افسوس صد ہزار افسوس ۱۲ (مکتوب نمبر ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۲)۔

مہینہ میں کُھلے بندوں روٹی اور کھانا پکاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام کی کمزوری اور پستی کے باعث کوئی منع نہیں کر سکتا۔ افسوس صد ہزار افسوس۔ (مکتوب ۹۲ ج ۲ صہ ۱۶۲)

علماء سُوء کی فتنہ انگیزی ضمنی طور پر اس طبقہ کے بھی کچھ حالات ملاحظہ فرما لئے جائیں تاکہ حضرت مجدّد صاحب کے الفاظ میں مُلّا عبدالقادر کے بیان پر روشنی پڑ سکے۔

"سارا[1] عالم بدعت کے دریا میں ڈوبا ہوا ہے اور بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہا ہے۔ کسی کی مجال ہے کہ بدعت کی مخالفت میں دم مارے اور احیاء سُنّت کے لئے لب کشائی کرے۔ اس زمانہ کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے اور سُنّت کو مٹانے والے ہیں" (مکتوب ۵۴ ج ۲ صہ ۱۰۳)۔

"ایک[2] عزیز نے شیطان لعین کو دیکھا کہ اطمینان سے بیٹھا ہے، اور اغواء اور گمراہ کرنے سے خاطر جمع ہو گیا ہے۔ اس عزیز نے اس کا سبب دریافت کیا۔ شیطان لعین نے کہا کہ اس زمانہ کے علماء سُوء خود ہی میری کافی مدد کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اس مہم سے مجھ کو فارغ کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو سُستی اور بے آئینی کہ اس زمانہ میں مذہبی امور میں واقع ہے اور جو کمزوری کہ ملّت اور دین کی ترویج میں نمایاں ہے وہ سب

---

[1] عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلماتِ بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفعِ بدعت زند و باحیاءِ سُنّت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندۂ بدعت اند و محو کنندہ سُنّت (مکتوب نمبر ۵۴ ج ۲ صہ ۱۰۳)۔ [2] عزیزے شیطان لعین را دید کہ فارغ نشستہ و از تضلیل و اغواء خاطر جمع ساختہ۔ آں عزیز سرّ آں را پرسید لعین گفت کہ علماء سُوء ایں وقت دریں وقت با من خود مددِ عظیم کردند و مرا ازیں مہم فارغ ساختند۔ الحق دریں زمان ہر سُستی و بے آئینی کہ در امورِ شرعیہ واقع شدہ و ہر فتورے کہ در ترویجِ ملّت و دین ظاہر گشتہ ہمہ از شومیِ علماء است و فسادِ نیّاتِ ایشاں۔ (مکتوب نمبر ۳۳ ج ۱ صہ ۴۷)۔

علماء سُوء کی نحوست اور اُن کی نیتوں کے فساد کے سبب سے ہے"۔

(مکتوب نمبر ۳۳ ج ۱ صـ۴۷)۔

علماء باطن اور ارباب طریقت دین کی پناہ گاہ ہیں۔ اسی لئے بارگاہِ ملّت سے مُرشد، ولی اللہ، قطب جیسے جلیل الشان خطابات سے ان کو نوازا جاتا ہے۔

مگر بہت سے خود پرست مغرور جاہ پرستی کے لئے ان خطابات کو تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اہلیّت سے عاری ہوتے ہیں، اور ان کی نفس پرستی، عیاشی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ان خطابات کے مناسب ریاضت اور مجاہدہ کر سکیں۔

"سچے اللہ والے" عوام سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اس قسم کے دھوکا بازوں کے سامنے ان کے ذاتی مقاصد ہوتے ہیں وہ عوام کو گرویدہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام بیشتر اسی قسم کے ہوا پرستوں کے دام میں اُلجھ جاتے ہیں اور سچے اللہ والوں تک رسائی کا موقعہ بہت کم میسّر آتا ہے۔

اس قسم کے دھوکا باز فقیر اور اکبر جیسے مذہبی بازی گر بادشاہ کا نقطۂ نظر ایک ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کی جِدّ و جُہد دوسرے کے لئے لامحالہ ترقی کا ذریعہ ہوگی۔ اس قسم کے تن آسان، اغراض پرستوں کے لئے شریعت ایک طرح کی زنجیر ہوتی ہے۔ جب آسانی اور آزادی سے مطلب حاصل ہو سکے تو پھر کیا ضرورت کہ شریعت کی دار و گیر میں خود کو مبتلا کیا جائے۔ لہٰذا فیصلہ کر دیا گیا تھا، اور اسی کی اشاعت کی جاتی تھی کہ "شریعت اور ہے طریقت اور"۔

"خدا رسی کے لئے اتباعِ سُنّت کی حاجت نہیں۔ پابندِ شریعت حقیقت سے بے بہرہ ہوتا ہے"۔

مولانا رومی کا ایک مصرعہ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

من استخواں پیشِ سگاں انداختم

اب علماء شریعت سے زیادہ بھونکنے والا کون ہو سکتا تھا۔ یہی لوگ اُن کا

طمعِ زرگری کا بھانڈا پھوڑنے والے ہو سکتے تھے۔ اور بسا اوقات نمائشی خرقہ و تسبیح کی عظمت و جلالت کو نظر انداز کر کے شوالہ دل کی مورتیوں کی نقاب کشائی کر دیا کرتے تھے۔ یہ گستاخ نہیں جانتے تھے:

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

لہٰذا یقینی طور پر ہڈی پر جھگڑنے والے کتّے یہی پابندِ شریعت مولوی تھے۔

منصور نے کہہ دیا تھا انا الحق۔ بایزید بسطامی کی زبان سے نکل گیا سُبحانی (یا مثلاً) لوائی ارفع من لواء محمد۔ لہٰذا ثابت ہو گیا تھا کہ "شریعت اور ہے، طریقت اور ہے"۔

اہلِ طریقت کو بسا اوقات دورانِ ریاضت میں عجیب و غریب مکاشفات ہو جایا کرتے ہیں۔ کچھ حضرات انہیں کو حصولِ مقصد اور منتہائے خدا پرستی سمجھ لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے اوہام و خیالات نے نہ جانے کتنے ناکندہ تراش شعبدہ باز مکاروں کو قلندر بنا رکھا تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ عوام کی بھیڑ گمراہی میں مبتلا ہو رہی تھی بلکہ سچے لوگوں کے بھی اس قسم کے خیالات اُن کے رُوحانی نشو و نما کو پژمردہ کر دیا کرتے تھے۔

جہانگیر بادشاہ

۱۷[1] ربیع الاوّل ۹۷۷ھ[2] بروز چہار شنبہ بمقام قصبہ فتحپور سیکری ضلع آگرہ ولادت ہوئی۔ جب کہ اس کی والدہ "شیخ سلیم چشتی" کے مکان پر مقیم تھی۔

پنجشنبہ[3] ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ بعمر ۳۸ سال بمقام آگرہ سریر آرائے دولت مغلیہ ہوا۔ اکبر اور شاہ جہاں کے درمیان جس طرح جہانگیر نسبًا واسطہ تھا،

---

[1] جہانگیر لکھتا ہے کہ والد ماجد کی عمر ۲۸ سال کی ہوگئی تھی۔ مگر کوئی لڑکا زندہ نہ رہتا تھا۔ لڑکوں کی زندگی کے لئے ہمیشہ درویشوں اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ جن کو بارگاہِ الٰہی سے روحانی قرب حاصل ہوا کرتا ہے۔ چونکہ خواجہ بزرگوار حضرت خواجہ معین الدّین چشتی اکثر اولیاء ہند کا سرچشمہ ہیں تو والد صاحب کے دل میں خیال آیا کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے اُن کے آستانہ پر حاضر ہوں، اور نذر مان لی کہ اگر خداوند عالم کوئی لڑکا عنایت فرمائے گا تو آگرہ سے درگاہ روضۂ متوّرہ تک پا پیادہ حاضر ہوں گا۔ چہارشنبہ ۱۷ ربیع الاوّل ۹۷۷ھ جب کہ ۷ پہر گذر چکے تھے اللہ تعالیٰ مجھ کو کتمِ عدم سے وجود میں لائے۔ انہیں ایّام میں جبکہ والد ماجد جویائے فرزند تھے شیخ سلیم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ یہ ایک صاحب حال بزرگ تھے جو عمر کے بہت سے مراحل طے کر چکے تھے۔ موضع سیکری کے پاس ایک پہاڑ میں قیام پذیر تھے۔ ایک مرتبہ توجّہ اور بے خودی کے دوران میں والد بزرگوار نے حضرت شیخ سے دریافت کر لیا کہ میرے کتنے لڑکے ہوں گے۔ حضرت شیخ: خداوند عالم تم کو تین لڑکے بخشے گا۔ والد ماجد: میں منّت مانتا ہوں کہ سب سے پہلے لڑکے کو آپ کے دامنِ تربیت و توجّہ میں ڈال کر آپ کی شفقت اور مہربانی کو اُس کا محافظ اور نگہبان بناؤں گا۔ حضرت شیخ: مبارک ہو۔ "ہم نے بھی اس کو اپنا ہم نام کیا"۔ اس کے بعد جب وضع حمل کے دن قریب آئے تو والدہ کو حضرت شیخ کے مکان پر بھیج دیا تاکہ میری ولادت اسی جگہ ہو اور پیدائش کے بعد میرا نام سلطان سلیم رکھا ۱۲ (توزک جہانگیری ص۲ و ص۳۔ [2] توزک ص۲۔

اسی طرح مذہبی اور سیاسی تبدیلیوں کے لحاظ سے بھی برزخ کی حیثیت رکھتا تھا۔

خود غرض مؤرخ مسلمانوں کی تمام ہی حکومتوں کو بُرا کہتے ہیں تو جہانگیر کی تعریف کیا کرتے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنا بُرا نہیں تھا جتنا بتایا جاتا ہے۔

قدرت نے فطری طور پر اس کو بہتر استعداد اور عمدہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ جس طرح اپنے ذاتی حقوق، منافع اور عیش و عشرت کی حفاظت چاہتا تھا اسی طرح وہ رعایا کے راحت و آرام اور آسودگی کا بھی خواہاں تھا[۱]۔ رعایا کا درد اس کے دل میں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ جنگل کے درندوں اور جرندوں اور ہوا کے پرندوں تک کی حفاظت کرے، اور اپنے تخت کے نیچے ان جانوروں کی بھی حق رسی کرے[۲]۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے[۳]:

"جلوس کے بعد سب سے پہلا حکم مجھ سے صادر ہوا کہ زنجیرِ عدل[۴] آویزاں کی جائے تاکہ اگر مہمات دارالعدالت کے کار پرداز ستم رسیدوں اور مظلوموں کی دادرسی میں سستی یا کوتاہی کریں، تو یہ مظلوم اس زنجیر تک پہنچ کر بذاتِ خود مجھ کو آگاہ کر سکیں"۔

"اس کے ساتھ ساتھ میں نے بارہ حکم صادر کئے تاکہ ان کو دستور العمل قرار دے کر تمام ممالک محروسہ میں اُن پر عمل کیا جائے"۔

(۱) تمغا اور میر بحری وغیرہ وہ تمام ٹیکس جو صوبوں اور کمشنریوں کے

---

[۱] ایک سفر میں خدامِ شاہی کو حکم دیا کہ جس قدر دیہات اور مواضعات راستہ کے کناروں پر پڑیں، ان کے غربا اور بیوہ عورتوں کو جمع کر کے میرے سامنے لاؤ۔ میں خود اپنے ہاتھ سے ان کو خیرات دوں گا میرا دل بہلے گا، ان کی مرادیں پوری ہوں گی۔ تاریخ ہندوستان ص۲۷ جلد ۶۔ [۲] تاریخ ہندوستان ص۲۶۶ جلد ۶۔ [۳] توزک جہانگیری ص۵۔ [۴] چار من سونے کی یہ زنجیر تھی جس کا ایک کنارہ قلعہ آگرہ کے "شاہ برج" پر تھا۔ اور دوسرا کنارہ گنگا کے دوسرے کنارہ پر پتھر کا ایک ستون نصب کر کے اس پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔ (توزک ص۵)۔

جاگیرداروں نے اپنے نفع کے لئے مقرر کر رکھے تھے، ممنوع ہیں۔

(۲) جن راستوں میں چوری اور ڈکیتی زیادہ ہو اور راستے آبادیوں سے فاصلہ پر ہوں، اُن راستوں کے اُوپر مسجدیں، سرائے اور کنویں بنوائے جائیں تاکہ ان راستوں پر آبادی رہے۔ سوداگروں کو راستہ میں ان کی اجازت کے بغیر نہ کھولا جائے۔

(۳) کافر یا مسلمان جو بھی ممالکِ محروسہ میں رہتا ہو، اُس کے مرنے پر اُس کا مال اس کے ورثہ کو دیا جائے۔ کوئی شخص اس میں دست اندازی نہیں کر سکتا۔ اور اگر وارث نہ ہو تو اس ترکہ کی حفاظت کے لئے ایک تحویل دار مستقل طور پر متعین کیا جائے تاکہ اس کو مسجدوں، سرائے، شکستہ پلوں کی مرمت، تالابوں اور کنوؤں کے بنوانے میں یعنی اُن کاموں میں جن کو شریعت نے ایسے مال کا مصرف قرار دیا ہے، خرچ کرے۔

(۴) شراب وغیرہ یعنی وہ تمام مسکرات جو شرعاً ممنوع ہیں، نہ بنائی جائیں، نہ بیچی جائیں۔ مَیں خود اگرچہ شراب پیتا ہوں اور اٹھارہ سال کی عمر سے اس وقت تک کہ میری عمر ۳۸ سال ہے کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ اوّل اوّل مَیں شرابخوری کا حریص تھا۔ کبھی کبھی دو آتشہ شراب کے بیس پیالے پی جایا کرتا تھا۔ جب اس نے رفتہ رفتہ میرے اعضاء اور قویٰ پر اثر ڈالنا شروع کیا تو مَیں اس کے کم کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ سات سال کے عرصہ میں پندرہ پیالے کے بجائے پانچ چھ پیالے کر دیئے جو مختلف اوقات میں پیا کرتا تھا۔ اس کے بعد صرف رات کا وقت مقرر کیا۔ اور اب مَیں مجبوراً صرف کھانا ہضم کرنے کے لئے پیتا ہوں۔

(۵) کسی کے مکان کو نزول[۱] نہ بنائیں۔

---

[۱] عموماً قاعدہ تھا کہ لشکر یا حکام سفر میں باشندگان آبادی کے مکانات خالی کرا کر اُن میں قیام کیا کرتے تھے خصوصاً برسات کے موقعہ پر ایسا عام طور سے کیا جاتا ہے۔ اسی کو نزول کہا جاتا تھا جس کی ممانعت کر رہا ہے ۱۲

(۶) کوئی شخص کسی سزا میں کسی مجرم کے ناک، کان نہ کاٹے، اور میں بھی اپنے خدا کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ کسی کو اس سزا سے معیوب نہ کروں گا۔

(۷) متصدیان خالصہ اور کوئی جاگیردار رعایا کی زمین کو لے کر خود کاشت نہ بنائے۔

(۸) شاہی جائداد کا کوئی حاکم یا کوئی جاگیردار کسی باشندہ کے ہاں سرکاری اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔

(۹) شہروں میں اسپتال بنائے جائیں اور جو کچھ ان کے مصارف ہوں شاہی جاگیر سے ادا کئے جائیں۔

(۱۰) اپنے والد بزرگوار کے طریقہ کے بموجب میں بھی حکم کرتا ہوں کہ میری پیدائش کے دن یعنی ۱۸ ربیع الاوّل کو اور ہر ہفتہ میں دو روز یعنی جمعرات[1] کو جو میرے جلوس کا دن ہے، اور اتوار کو جو میرے والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے کوئی جانور ذبح نہ کیا جائے۔

والد بزرگوار اتوار کے دن کی تعظیم کیا کرتے تھے کیونکہ یہ دن "حضرت نیر اعظم[2]" کی طرف منسوب ہے۔ نیز اسی دن کو وہ ابتدار آفرینش کا دن سمجھتے تھے اور جن ایّام میں کہ ممالک محروسہ میں ذبح کرنا ممنوع تھا، ان میں سے ایک دن یہ بھی تھا۔

(۱۱) والد بزرگوار کے زمانہ میں جن جن کے جو منصب، عہدے، جو وظیفے مقرر تھے وہ بدستور باقی رکھے جائیں، اور ممالک محروسہ کے اماموں کے متعلقین کے مدد معاش ان فرامین کے بموجب جو ان کے پاس ہیں بدستور

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ بعد کے بادشاہوں نے اس سنت پر عمل نہیں کیا۔ ورنہ رفتہ رفتہ ہفتہ کے تمام دنوں میں ذبح ممنوع ہو جاتا۔ ۱۲۔ [2] اکبر کے عقیدے کے مطابق آفتاب کا نام اس قدر عزت سے لیتا ہے۔

باقی رکھے جائیں - یہ لوگ لشکرِ[1] دعا ہیں - اور میراں صدر جہاں کو جو ہندوستان کے صحیح النسب سادات میں سے ہیں اور میرے والد کے زمانہ میں عرصہ دراز تک صدارت کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز رہے ہیں، میں نے مامور کر دیا کہ مستحق لوگوں کو روزانہ میرے سامنے پیش کرتے رہیں۔

(۱۲) تمام مجرم جو عرصہ سے قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، رہا کر دیئے جائیں۔

ایک مبارک[2] ساعت میں میں نے حکم دیا کہ سونے چاندی پر سکے لگ جائیں - اور ہر ایک سکہ کا علیحدہ نام مقرر کر دیا۔

سونے کے سکے | سو تولہ کا سکہ نور شاہی - پچاس تولہ کا نور سلطانی - بیس تولہ کا نور دولت - دس تولہ کا نور کرم - پانچ تولہ کا نور مہر - ایک تولہ کا نور جہانی نصف تولہ کا نورانی - چوتھائی تولہ کا رواجی -

چاندی کے سکے | سو تولہ کا سکہ کوکب طالع - پچاس تولہ کا کوکب اقبال - بیس تولہ کوکب مراد - دس تولہ کوکب سعد - ایک تولہ جہانگیری نصف تولہ سلطانی - چوتھائی نثاری - اور ایک تولہ کا دسواں حصہ (ایک ماشہ و ڈیڑھ رتی تقریباً) خیر قبول[3] -

اصلاحی احکام | جہانگیر نے ایک حکم یہ دیا تھا کہ آئندہ خواجہ سرا نہ بنائے جائیں - نہ بیچے

---

[1] ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں نے معافی خراج کی درخواست دے دی - امرا نے عرض کیا کہ حضور کی فیاضی اسی طرح جاری رہی تو سرکاری آمدنی صفر ہو جائے گی - جہانگیر نے جواب دیا کہ سائلین لشکر دعا ہیں - امرا سلطنت پر لازم ہے کہ لشکر دعا کو بڑھائیں (ص ۲۶۶ تاریخ ہندوستان) [2] تزک جہانگیری ص ۱۰

[3] سکہ کا منشا صرف یہ ہے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز آسانی سے ہو سکے اور وزن معلوم ہو جائے - ہر وقت تولنے کی ضرورت نہ رہے - سونے یا چاندی کے وزن کے بموجب سکہ کی قیمت ہوتی ہے - اس سے زیادتی یا کمی ظلم ہے جس کو شریعت نے سود قرار دیا ہے - سکہ چونکہ عام رواج کی چیز ہے لہٰذا سکوں کی زیادتی سے عام خوش حالی اور دولت کی فراوانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - ۱۲

جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس جرم کے مجرموں کو حبسِ دوام کی سزا دی[1]۔ اسی طرح بچوں والی عورتوں کی ستی کو ممنوع قرار دیا[2]۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جب تک بادشاہ کی نیّت بخیر ہو، رعایا خوش حال رہتی ہے، محصولوں میں برکت ہوتی ہے۔

چو نیّت بخیر ست نعیم دہی[3]

عدلِ جہانگیری بظاہر جہانگیر کو نور جہاں کی طرح عدل و انصاف سے بھی محبت تھی۔ اس کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ جس کو علامہ شبلی نے منظوم کر دیا۔

قصرِ شاہی میں ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نُورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اِدھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چہار طرف سے قدغن
غیرتِ حُسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک کا ڈھیر تھا ایک کُشتۂ بے گور و کفن
ساتھ ہی شاہ جہاں کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جاکے پوچھ آئیں سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن
نخوتِ حُسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حُسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن
مفتیِ دیں سے جہانگیر نے یہ فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کوئی جائے سخن
مفتیِ دیں نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح سے اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نُور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی نگاہ
جاکے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

---

[1] تاریخ ہندوستان ج ۶ صفحہ ۲۶۶۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۶۶۔ [3] توزک صفحہ 254

اب نہ وہ نورِ جمال ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے ایک امرِ حسن

مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ وزن

وارثوں کو دیئے لاکھ درہم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مکتوب نمبر ۹۲ جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ چنانچہ عالم را بنورِ عدل و عدالت بادشاہ وقت منور ساختہ است شریعت و ملتِ محمدیہ را نیز بحسن اہتمام ایشاں نصرت و عزت بخشد (مکتوب ۹۲ صـ۸۳ ج ۲)	حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے جس طرح بادشاہِ وقت کے عدل و انصاف کے نور سے عالم کو منور کیا ہے۔ اسی طرح شریعت و ملتِ محمدیہ کو بھی اُن کے حسنِ اہتمام سے نصرت و عزت بخشے۔

مکتوب نمبر ۴۷ جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں جو خود جہانگیر بادشاہ کے نام ہے:

شکر نعمت امن و امانے کہ بدولت و اقبال بندگان شامل حال عوام و خواص است بجامی آرد۔ (صـ۸۲ جلد ۳ مکتوب ۴۷)	وہ امن و امان کہ بندگانِ بارگاہ کے دولت و اقبال کے باعث خواص و عوام کے شامل حال ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رفاہیتِ خلق جب وہ احمد آباد میں پہنچا تو باوجودیکہ وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی، اور اس وجہ سے وہ احمد آباد سے اتنا ناراض ہے کہ کہتا ہے۔ "اس سے پہلے احمد آباد کو "گرد آباد" کہا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کا نام "سموستان" رکھوں یا "بیمارستان" یا

"زقوم زار" کہوں - اور پھر اتفاق سے وہ بیمار ہوگیا، اور اس کا فرزند جان پیوند شاہجہان بھی - مگر بایں ہمہ کہتا ہے :

"چونکہ یہاں کے آدمی بہت کمزور دل اور عاجز ہیں - اس خیال سے کہ ممکن ہے لشکر کا کوئی سپاہی کسی غریب پر کوئی ظلم کردے اور قاضی اور میر عدل کسی وجہ سے اس کی فریاد رسی میں سستی کر جائیں - لہٰذا میں احتیاطاً روزانہ دوپہر کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد سخت گرمی اور لو کے باوجود دریا کی طرف کے جھروکہ میں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ در و دیوار، سنتری اور چوبدار کی رکاوٹ باقی نہ رہے - اور جو شخص مجھ تک پہنچنا چاہے آسانی سے پہنچ سکے - بیماری اور کمزوری کے زمانہ میں درد و الم کے باوجود مقررہ طریقہ کے بموجب میں جھروکہ میں بیٹھتا رہا، اور تن آسانی کو اپنے اُوپر حرام قرار دیا"۔

بہرِ نگہبانیِ خلقِ خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
زپئے آسودگی جملہ تن رنج پسندم بر تنِ خویشتن

پھر لکھتا ہے :

خدا کے فضل و کرم سے عادت ایسی ہوگئی ہے کہ رات اور دن میں دو تین گھنٹہ سے زیادہ سرمایۂ وقت کو سونے میں غارت نہیں کرتا - اس سلسلہ میں دو فائدے مدِّ نظر ہیں - ایک مُلک کی حالت سے آگاہی دوم یادِ حق میں دل کی بیداری - افسوس یہ چند روزہ عمر غفلت میں گذر جائے جبکہ ایک خوابِ گراں درپیش ہے - اس بیداری کو جو بعد میں خواب میں بھی نہیں آسکتی، غنیمت جان کر ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ حق سے غافل نہیں رہنا چاہیئے"۔

باش بیدار کہ خوابے عجبے درپیش است (توزک ص ۲۳۴)

سخاوت | داد و دہش اور سخاوت مشرقی بادشاہوں[1] کا طرۂ امتیاز ہے وہ اس میں بھی شاہانہ شان[2] رکھتا تھا۔ اس کی دی ہوئی بہت سی جاگیریں اب بھی موجود ہیں۔ جمعہ[3] کے روز ایک ہزار مومنین کی دعوت اس کا معمول تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اس کی جانب سے "غلور خانے" (خیرات خانے) قائم تھے جن میں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

اکبر کی طرح اس کے بھی مرید ہوا کرتے تھے مگر اس کی تلقین یہ ہوتی تھی:

"اپنا وقت کسی مذہب کی دشمنی میں تاریک اور گندہ مت کرو۔ تمام مذہب والوں کے ساتھ "صلح کُل" کا طریقہ ملحوظ رکھو۔ کسی جاندار کو اپنے سے مت مارو۔ لڑائی یا شکار کے سوا کسی وقت بھی سخت دل مت بنو"۔

مباش درپے بے جان نمودن جاندار
مگر بعرصۂ پیکار یا بوقتِ شکار

بے شک وہ عاشق مزاج تھا مگر وہ قدرت کی تمام ہی چیزوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ شکار کا حریص بھی تھا مگر جانوروں سے اتنا ہی انس بھی رکھتا تھا۔ وہ مناظرِ فطرت کی سیر و تفریح کا شیدائی تھا اور ہر چیز کو گہری نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جو جانور یا جو جڑی بوٹی، پھول یا درخت اُس کے سامنے آتا تھا وہ گہری نگاہ سے اس کے اوصاف و خواص معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنی توزک میں اس کو درج کرتا تھا۔

لیکن اس کے عاشقانہ مزاج نے اُس کی شجاعت پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ تیموری خون سے اُس کا ہر رگ و ریشہ سرشار تھا۔ وہ عیش و عشرت کو پسند کرتا تھا مگر ضرورت کے وقت سپاہیانہ جفاکشی بھی اس کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔ اس کی شکار پسند خصلت بسا اوقات کمزوروں کے واسطے پناہ بن جاتی تھی۔ جس طرف وہ جاتا، دیہات کے کمزور

---

[1] تاریخ ہندوستان ص۲۶۷ ج۲۔ [2] ایضاً ص۲۷۔ [3] توزک ص۲۹ ع۱ یا ایشیائی۔ [4] لکھتا ہے ہمچناں طبیعت بشکار شیر مائل ست کہ تا شکار آں میسر باشد بہ شکار دیگر دستوری نمے (توزک ص۳۷۵)

باشندے شیر یا کسی درندہ کی شکایت کرتے، وہ خود اس کے شکار کے لئے آمادہ ہوتا تھا۔ اور اس طرح سینکڑوں شیروں کا بذاتِ خود شکار کیا تھا۔ ایک مرتبہ شیر اُچھل کر اُس کے ہاتھی کی عمّاری پر آ بیٹھا۔ اُس نے بندوق کا کُندا اُس کے سر پر اتنے زور سے مارا کہ چکر کھا کر شیر نیچے گرا۔ (توزک جہانگیری)

اُس نے نُور جہاں کو بھی شیر کے شکار کا مشّاق بنا دیا تھا۔ حتّٰی کہ ایک مرتبہ[1] جب چار شیروں کو نور جہاں نے ایک لحظہ میں ختم کر دیا تو کسی شاعر نے کہا تھا ؎

نور جہاں گرچہ بصورت زن ست
در صفِ مردان زن شیر فگن ست

وہ شراب خوار تھا۔ افیون بھی کھاتا تھا مگر ضبط و نظم سے غافل نہیں ہوتا تھا حتّٰی کہ وہ شکاروں[2] کی تعداد بھی لکھا کرتا تھا۔

اسی طرح اس کو اپنی ذات پر بھی پورا اعتماد تھا۔

"در کنگاش اُمورِ[3] سلطنت ملک داری، اکثر آں ست کہ برای و فہمیدی خود عمل مے نمایم و از کنگاش ہائے دیگر کنگاش خود معتبر مے دانم"۔[4]

---

[1] جہانگیر خود اس واقعہ کو لکھتا ہے۔ "چوں شیران بنظر آمدند نور جہان بیگم از من التماس نمود کہ اگر حکم شود من شیران را بہ بندوق بزنم، فرمودم کہ چنیں باشد۔ دو شیر را بہ بندوق و دوئی دیگر را بہ تیرک دو تیر زدہ انداخت تا بہ چشم بر ہم زدیم قالب ایں چہار شیر را بہ شش تیر از حیات پرداخت تا حال چنیں تفنگ اندازی مشاہدہ نہ شدہ بود۔ از بالائے فیل از درونِ عماری شش تیر انداختہ شود کہ یکے خطا نیفتد و چہار زد فرصتِ جستن و حرکت جنبیدن نیابند بہ جلدوے ایں کمان داری ہزار اشرفی نثار نمودہ یک جفت پہنچی الماس کہ یک لک روپیہ قیمت داشت مرحمت نمودم ۱۲ (توزک جہانگیری ص۱۸۶ و ص۱۸۷) [2] توزک میں لکھا ہے کہ میرے روبرو ۲۸۵۳۲ شکار ہوئے جن میں سے میں نے اپنے ہاتھ سے ۱۷۱۶۷ شکار مارے ۱۲ (تاریخ ہندوستان ص۳۶۸)

[3] امورِ سلطنت اور ملک داری کے مشورہ میں زیادہ تر یہی ہے کہ اپنی رائے اور فہم پر عمل کرتا ہوں اور دوسروں کے صلاح و مشورہ سے زیادہ اپنی صلاح اور رائے کو بہتر جانتا ہوں ۱۲۔

ایشیائی بادشاہوں کے طرز پر وہ عالی حوصلہ اور بلند ہمت واقع ہوا تھا۔ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بسا اوقات اس نے معاف کر دیا۔ اور پھر خلعت انعام و اکرام سے نوازا۔ جس کی بہت سی مثالیں تو زک میں درج ہیں۔

مذہب | اس کے دل میں مذہب کا کافی احترام تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو "نیاز مندانِ[1] درگاہِ الٰہی" لکھتا ہے اور تمنا کرتا ہے:

"امید[2] کہ مدتِ حیات در مرضیاتِ الٰہی صرف شود و نفسی بے یادِ او نگذرد"۔

جلوس کے پہلے سال بھی پنڈتوں سے مناظرہ کیا۔ جہانگیر کے چند عالمانہ سوالات پیش کرنے کے بعد جب وہ لایعنی عذر کرنے لگے اور لاجواب ہو گئے۔ تو جہانگیر نے کہا[3]:

"یہ مورتیاں مقصودِ حقیقی "معبود" کی جانب کس طرح وسیلہ بن سکتی ہیں"۔

سکوں پر کلمۂ شہادت نقش کرانا مذہب پرستی کی کافی دلیل ہے۔ شب جمعہ[4] میں علماء اور صلحاء سے مصاحبت رکھتا تھا۔ عبادات میں رات گذارتا۔ شراب قطعاً نہ چھوتا۔ اکبر آفتاب کے ناموں کی تسبیح پڑھا کرتا تھا۔ مگر اس نے علماء سے حضرت حق جل مجدہٗ کے نام لکھوائے اور ان کا وِرد رکھا کرتا تھا۔

آفتاب کو نیرِ اعظم ضرور لکھتا ہے۔ مگر عقیدہ یہ ہے کہ تارے[5] جو نورِ الٰہی کے مظہر ہیں،

---

[1] ایک فتح کی خبر سُننے پر لکھتا ہے۔ چوں ایں اخبار مسرت آثار در آگرہ بایں نیاز مند درگاہِ الٰہی رسید سجداتِ شکر بتقدیم رسانیدہ دفع و رفع ایں قسم غنیمے را محض از کرم بے دریغ واجب تعالیٰ دانست ۱۲ (توزک ص۱۰۵)۔ [2] اُمید ہے کہ ساری زندگی ایسے کاموں میں صرف ہو گی جو خدا کو پسند ہوں اور کوئی سانس اس کی یاد کے بغیر نہ گذرے گا (توزک ص۲۲۵)۔ [3] گفتم ایں پیکرہا کے شمار را وسیلہ مقصود بمعبود توانند بود (ص۱۵ توزک جہانگیری)۔ [4] توزک جہانگیری ص۱۵۲۔ [5] تعظیمِ نیرات را کہ مظاہر نورِ الٰہی اند بقدر درجات ہر یک باید نمود و موثر و موجد حقیقی در جمیع ادوار و اطوار اللہ تعالیٰ را باید دانست بلکہ فکر باید کرد تا خلوت و کثرت خاطر لمحہ از فکر و اندیشہ او را خالی نباشد ۱۲ (توزک ص۲۹)

درجہ کے بموجب ان کی تعظیم کرنی چاہیئے اور تمام ادوار و اطوار میں موثر حقیقی اور موجد صرف اللہ تعالیٰ کو جاننا چاہیئے کہ خلوت و جلوت میں کسی وقت بھی دل اس کے فکر اور اس کے دھیان سے خالی نہ ہو[1]۔

اکبر نے دربار میں جماعت نماز ممنوع کر دی تھی اور صفیں بھی خارج کرا دی تھیں۔ مگر جہانگیر نے شکارِ خاصہ[2] کے ہرنوں کی کھالوں کی جانمازیں بنوا کر دیوانِ خاص اور دیوانِ عام میں ڈلوا دیں تاکہ ان پر نماز پڑھا کریں۔

"میر عدل[3] اور قاضی جن پر امورِ سلطنت کا مدار ہے، حرمتِ شرع کے لحاظ سے اُن سے کہہ دیا کہ وہ زمین بوس نہ کیا کریں جو سجدہ کی صورت میں ہوتا ہے"۔

ہندوؤں کے عقیدہ کے بموجب اکبر نے خنزیر کی تعظیم شروع کر دی تھی۔ مگر جہانگیر جب اجمیر شریف گیا۔ وہاں رانا شنکر کے مندر میں:

"ایک مورتی[4] نظر سے گذری جو سنگِ سیاہ سے تراشی گئی تھی، گردن سے اُوپر خنزیر کی شکل اور نیچے آدمی کی شکل۔ اور عقیدۂ ناقص ہنود کا یہ ہے

---

[1] تاروں کو نورِ الٰہی کا مظہر قرار دینا خام خیالی ہے۔ نورِ حق ہر ایک مشابہت اور چگونگی سے منزہ ہے البتہ قدرتِ الٰہی کا مظہر ضرور کہنا چاہیئے مگر اس میں تاروں کی کوئی تخصیص نہیں ۱۲ محمد میاں عفی عنہ [2] پوستہائے آہو شکار خاصہ افرمودم کہ جانمازہا ترتیب دادہ، در دیوانِ خاص و عام نگہدارند کہ مردم بر آں نماز گذاردہ باشند ۱۲ توزک جہانگیری ص۱ ۔ [3] خدا جانے جہانگیر نے جانمازوں کے لئے ہرنوں کی کھال کیوں منتخب کی۔ البتہ ہمارے خیال میں غیر شرعی ٹیکسوں سے حاصل شدہ روپیہ سے بنائی ہوئی نمازوں کے مقابلہ میں یہ کھالیں بہت بہتر تھیں ممکن ہے اس کو یہی خیال ہوا ہو۔ [4] میر عدل و قاضی کہ مدار امور شرعیہ بر ایشاں ست بجہت خاص حرمت شرع فرمودم کہ زمین بوس کہ بصورت سجدہ ست نکنند (توزک ص۱) [5] صورتے دیدم از سنگ سیاہ تراشیدہ از گردن بالا بہیئت سر خوک و مابقی شبیہ بہ بدن آدمی عقیدہ ناقص ہنود آنست کہ یک وقتے بنا بر مصلحتے کہ رائے حکیم علیم اقتضا فرمودہ بدیں صورت جلوہ ظہور نمودہ است ایں صورت را بدیں جہت عزیز داشتہ پرستش می نمایند۔ فرمودم کہ آں صورت کریہہ را درہم شکستہ در تالاب انداختند ۱۲ ص ۱۲۵

کہ (معاذاللہ) حکیم علیم نے کسی وقت کسی مصلحت سے اس صورت میں جلوہ فرمایا تھا۔ میں نے حکم کیا اس کریہہ صورت کو توڑ کر تالاب میں ڈال دیں"۔

اسی موقع پر اسی طرح ایک، اور محل کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ جس میں اسی قسم کی خرافات ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حسب مراد ایک بیش بہا لعل اس کو مل گیا۔ تو

"سر بشکرانہ خداوند بندہ نواز بر زمین نیاز و فروتنی نہادہ زبان بہ شکر گویا ساختم"۔

بیت: از دست و زباں کہ بر آید کز عہدۂ شکرش بدر آید (توزک ص ۱۵۹)

مذہبی غیرت اکبر برہمنوں کے ہاتھوں اپنی پیشانی پر قشقہ لگواتا تھا مگر جہانگیر نے ایک گُرو کو جس کا نام "ارجن" تھا اور گوبندوال مقام میں وہ عرصہ سے رہا کرتا تھا۔ اور اس کے باپ دادا بھی گُرو تھے۔ جن سے اُس اطراف کے ہندوؤں اور جاہل مسلمانوں کو بھی بہت زیادہ عقیدت تھی، اس بِنا پر اُس کو سزا دی اور اس کے گھر بار کو ضبط کرلیا کہ اُس نے "سلطان خسرو" پسر جہانگیر کے ڈیرہ میں آکر اُسی مصنوعی بزرگی کے گھمنڈ میں قشقہ لگایا تھا اور ہندو سادھوؤں کے طرز پر پیشین گوئی تھی[1]۔

سال پنجم جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے :

"معلوم ہوا کہ کوکب پسر قمر خاں نے ایک سنیاسی سے آشنائی پیدا کرلی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیاسی کی باتیں جو سراسر کفر اور زندقہ تھیں، جاہل کوکب کے دل میں جگہ کر گئیں۔ کوکب نے اپنے چچازاد بھائی عبداللطیف اور شریف کو بھی اس ضلالت اور گمراہی میں اپنا شریک بنالیا ہے"۔

"جب یہ بات ہمیں معلوم ہوئی۔ ان کو حضور میں طلب کیا گیا۔ معمولی سی دھمکی میں انہوں نے اپنے وہ حیا سوز واقعات ذکر کر دیئے، جن کے بیان کرنے سے بھی طبیعت شرماتی

---

[1] چوں ایں مقدمہ بمسامع جاہ و جلال میرسد و بطلان او را بوجہ اکمل میدانستم امر کردم کہ او را حاضر ساختند و مساکین و منازل و فرزندان او را بمرتضیٰ خاں عنایت نمودم و اسباب و اموال او را بقید ضبط درآوردہ فرمودم کہ او را

ہے۔ ان کی تادیب و تنبیہ کو ضروری سمجھا۔ کوکب و شریف کو جیل خانہ بھیج دیا ــــ اور عبداللطیف کے سو کوڑے اپنے سامنے لگوائے۔ یہ خاص تنبیہ حفظِ شریعت کے لئے کی گئی تاکہ دوسرے جاہل اس قسم کی باتوں کی ہوس نہ کریں" (توزک جہانگیری صـ ۸۳)۔

کشمیر جاتے ہوئے معلوم ہوا کہ راجور محل کے اطراف میں نومسلموں میں یہ رسم جاری ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی زندہ قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ غریب آدمی کے لڑکی ہوتی ہے تو وہ اس کو مار ڈالتا ہے۔ نیز ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے ہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے[1]:

"لڑکیاں لینا تو بہت بہتر ہے لیکن دینا نعوذ باللہ۔ فرمان صادر ہوا، کہ آئندہ ان کاموں کے پاس بھی نہ جائیں اور جو شخص اس قسم کی بدعتوں کا مرتکب ہو، اس کو سخت سزا دی جائے"۔

۱۵ سنہ جلوس میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کی خبر پہنچی تو:

"کریم کارساز[2] کی درگاہ میں سرِ نیاز جھکا کہ نشاط و شادمانی کے نقارے بجوائے"۔

اگلے سال قلعہ کانگڑہ کی سیر کو گیا تو:

"میں[3] نے حکم کیا کہ قاضی اور میر عدل اور دوسرے علماء اسلام ہمرکاب رہ کر جملہ شعائر اسلام اور شرائط دینِ محمدی کو قلعہ مذکور میں ادا کریں۔

---

[1] گرفتن خود خوب۔ اما دادن نعوذ باللہ۔ فرمان شد کہ بعد ازیں پیرامون ایں امور نگردند ہر کس کہ مرتکب ایں بدعت ہا شود اورا سیاست کنند ۱۲ (تزک صـ ۳۲۲)۔ [2] سرِ نیاز بدرگاہِ کریم کارساز فرود آوردہ کوس نشاط و شادمانی بلند آوازہ گردید ۱۲ (تزک صـ ۳۲۳)۔ [3] حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام در رکاب بودہ آنچہ شعائر اسلام و شرائط دینِ محمدی ست در قلعہ مذکور بعمل آورد۔ بتوفیقِ ایزد سبحان بانگِ نماز و خواندنِ خطبہ و کشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدا ایں قلعہ تا حال نشدہ بود۔ ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم سجداتِ شکر ایں موہبت عظمیٰ کہ ہیچ بادشاہے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ حکم فرمودم کہ مسجدِ عالی درونِ قلعہ بنا نہند ۱۲ (توزک صـ ۳۴۶)۔

چنانچہ ایزد سبحان کی توفیق سے اذان، خطبہ، ذبح گاؤ وغیرہ جن سے یہ قلعہ ابتدائے تعمیر سے آج تک ناآشنا تھا، خود اپنے سامنے ان پر عمل کرایا۔ خداوند عالم کی اس بہت بڑی بخشش پر (جس کی توفیق کسی بادشاہ کو نہ ہوئی تھی اور جدوجہد کے باوجود بڑے بڑے بادشاہ اس سے عاجز رہے تھے) شکر کی نفلیں پڑھیں اور حکم کیا کہ قلعہ کے اندر ایک بہت بڑی مسجد بنوا دیں"۔

توکّل اور اعتماد علی اللہ توزک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کی ایک خاص شان اس کو حاصل تھی۔ جو بسا اوقات اس کی طبیعت پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔

امیر الامراء بیمار ہوا۔ تمام ہندو مسلمان اطبّاء علاج سے عاجز ہوگئے اور زندگی سے مایوس ہو کر سب نے اُس کی موت کا فیصلہ کر دیا۔ جہانگیر لکھتا ہے:

"اللہ تعالیٰ بفضل وکرم خود او را تشریف شفا ارزانی فرمود تا اسباب پرستانِ مشیتِ ناشناس را معلوم گردد کہ قادرِ پُر کمال ہر درد دشوار را کہ "ظاہر بینانِ اسباب گزین" دست از انہا برداشتہ باشند بمحض لطف و مرحمتِ ذاتی خویش علاج و درمانے مے تواند کرد"۔ (توزک ص۶۳)

لکھتا ہے:

"امیر الامراء کو اپنا نگہبان جانتا ہوں۔ اگرچہ تمام بندوں کا اور بالخصوص بادشاہوں کا جن کا وجود سارے جہان کی خوش حالی کا سامان ہے محافظ اور نگہبان اللہ تعالیٰ ہے"۔

۱۰۲۴ھ میں ہندوستان میں پلیگ کی وبا پھیلی، جو کئی سال تک شدّت سے پھیلی رہی۔ اس کے اسباب کے متعلق قیاس آرائیاں ہوئیں۔ جہانگیر کا مقولہ یہ تھا:

"تقدیراتِ الٰہی را گردن باید نہاد ع "چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرمان را"۔

ص۱۶۲ جلوس کے سولھویں سال بیمار ہوا۔ مرض ایسا تھا کہ اطبّا علاج نہ کر

سکے۔ ناگزیر دست از ہمہ باز داشتہ از تدبیراتِ ظاہری دل برکندہ خود را بحکیم علی الاطلاق سپردم"۔ (توزک ص۳۴۰)

پھر نور جہاں نے کچھ پرہیز کرایا۔ شراب میں کمی کرائی اور مناسب دوائیں اور غذائیں دیں۔ حکیم حقیقی نے شفا خانہ غیب سے صحتِ کامل بخش دی۔

"جلوس کے تیرھویں سال ۲۲ رمضان المبارک کو جمعہ کا دن تھا۔ حکم کیا تمام مشائخ اور اربابِ سعادت جو شہر میں قیام پذیر ہیں۔ میرے ساتھ روزہ افطار کریں۔ تین روز اسی طرح کرتا رہا۔ رات کو آخر مجلس تک کھڑا ہو کر زبانِ حال سے یہ کہتا تھا[۱]۔

خداوندگارا تونگر توئی! توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشایم نہ فرماں دہم یکے از گدایاں ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار خداوند را بندۂ حق گذار

جہانگیر اچھا تھا یا بُرا تھا، اے کاش ہمیں جہانگیر ہی مل جاتا۔

مذہبِ جہانگیر پر نظرِ ثانی

مذہب اور اخلاق کے سلسلہ میں ایک طرف یہ خوبیاں تھیں جو صفحاتِ سابق میں ذکر کی گئیں۔ اب مذہبی رجحانات کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

جہانگیر اکبر کا بیٹا بھی تھا اور مرید بھی۔ اکبر کے خیالات جہانگیر کی فطرت میں داخل

---

[۱] حکم کردم کہ جمیع مشائخ و اربابِ سعادت را کہ دریں شہر توطن دارند حاضر سازند کہ در ملازمت افطار نمایند و سہ شب بریں دتیرہ گذشت تا آخر مجلس خود بر سرپا استادہ بزبانِ حال مے گفتم ؎ خداوندگارا الخ (تزک ص۲۴۳)

تھے - جو بے اختیار موقع بر موقع رونما ہو جاتے تھے - وہ آفتاب کے لئے ہمیشہ اس قسم کے الفاظ لاتا تھا :

"حضرت نیّرِ اعظم از برج حوت بشرف خانہ حمل نزول اجلال ارزانی داشت"[1]

نجومیوں کا معتقد ہے اور بڑے بڑے کام ان کے مشورہ اور تشخیص کے بموجب ساعت سعید میں شروع کرتا ہے - بارہ برجوں کے بموجب بارہ سکّے بنوائے - جن کی ایک جانب میں ایک ایک بُرج کی تصویر کندہ تھی - وہ تاروں کو اگرچہ مؤثرِ حقیقی نہیں مانتا، مگر مؤثر ضرور مانتا ہے اور اُن کو نورِ الٰہی کا مظہر قرار دیتا ہے[2]، اور اسی لئے ان کی تعظیم ضرور سمجھتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے[4]

مذہب میں عقل پرستی پہلے عرض کیا گیا کہ مذہب میں خود رائی بغاوت ہے - مگر باپ کی طرح اس بغاوت کا عادی ہے - اگرچہ یہ بغاوت اُس سے بہت کم سرزد ہوتی ہے -

باپ[5] کی طرح وہ بھی مرید کرتا ہے اور اس کی تلقین یہ ہوتی ہے - کسی مذہب کی دشمنی سے اپنے وقت کو گندہ مت کرو - تمام مذہب والوں کے ساتھ صلحِ کُل کا طریقہ ملحوظ رکھو - کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے مت مارو مگر جنگ اور شکار میں ؎

۱؎ توزک ص۱۳۸ - ۲؎ توزک ص۲۲۹ و ص۲۳۰ - ۳؎ توزک ص۲۹ - اصل عبارت پہلے نقل کی گئی - ۴؎ توزک ص۲۹ - اصل عبارت پہلے نقل کی گئی - ۵؎ در وقتِ ارادت آوردن مریدان چند کلمہ بطریقِ نصیحت مذکور می گردد - باید کہ وقتِ خود را بہ دشمنیِ ملّتے از ملّتہا مکدر نسازند و با جمیع اربابِ ملل طریقِ صلحِ کُل مرعی دارند و ہیچ جاندارے را بدست خود نکشند - وسلاخ طبیعت نباشند مگر در جنگہا و شکارہا ؎

مباش درپئے بے جان نمودن جاندار مگر بعرصۂ پیکار یا بوقت شکار

تعظیم نیّرات را کہ مظاہر نورِ الٰہی اند بقدر درجات ہر یک باید نمود و مؤثرِ حقیقی در جمیع ادوار و اطوار اللہ تعالیٰ را باید دانست بلکہ فکر باید کرد تا در خلوت و کثرت خاطر لحہ از فکر و اندیشۂ او خالی نباشد (توزک ص۲۹)

مباش درپئے بے جان نمودن جان دار
مگر بعرصۂ پیکار یا بوقتِ شکار

ستارے جو نورِ الٰہی کے مظہر ہیں۔ ان کی تعظیم ہر ایک کے درجہ کے بموجب کرو اور تمام واقعات اور حالات میں مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو جانو۔ بلکہ ہر ایک خلوت و جلوت میں تنہائی اور مجمع میں اسی کے دھیان میں رہو اور کوشش کرو کہ کوئی لمحہ اور لحظہ اس کے خیال اور دھیان سے خالی نہ ہو۔

اس صلح کل کا اثر یہ تھا کہ جس طرح وہ مسلمان فقراء سے عقیدت سے ملتا تھا ہندو سادھوؤں سے بھی عقیدت سے ملتا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ آگ کے متعلق عقیدہ ہے "آگ خدا کا نُور ہے"۔

یہی عقیدہ تھا جس کی بناء پر اکبر شمع پرستی کیا کرتا تھا۔

"دسہرہ، دیوالی وغیرہ ہندو تہواروں کے وقت جشن ہوتا تھا۔ ہندو برہمن کلائی پر راکھی بھی باندھ دیا کرتے تھے۔

سیاست یہ تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مشترک بادشاہوں کو دونوں قوموں کے مذہبی جذبات کا مظہر بننا چاہیئے۔

اکبر تمام سال میں صرف تین مہینے گوشت کھاتا تھا۔ جہانگیر اتنا مرتاض تو نہیں، البتہ اپنے والد کی پیروی میں ہفتہ میں دو روز ذبح کی ممانعت ضرور کر دیتا تھا (ملاحظہ ہو دوازدہ احکام)

شراب نوشی اچھی نہیں مگر جس قدر مفید ہو، اس میں مضائقہ بھی نہیں حتّٰی کہ سنہ جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے:

"۲۵ ماہ آذر روز جمعہ کو شاہزادہ خرّم "شاہجہان" کا جشنِ وزن ہوا۔[۳][۴]

---

[۱] ملاحظہ ہو توزک ص ۱۲۴ وغیرہ [۲] توزک ص ۱۲۱ [۳] توزک جہانگیری ص ۵۱ (طوالت کے باعث اصل عبارت درج نہیں کی گئی)

[۴] دستور تھا کہ سالانہ وزن کیا جاتا تھا اور اس تقریب میں شاندار جشن ہوتا تھا پھر وہ سونا فقراء کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

اُس کی عمر چوبیس سال ہو چکی ہے۔ شادیاں ہو چکی ہیں صلبِ فرزند ہوگیا ہے، مگر اب تک خود کو شراب نوشی سے آلودہ نہیں کیا تھا۔ آج مَیں نے اُس سے کہا۔ بابا صاحب فرزند ہوگیا ہے۔ بادشاہوں اور بادشاہ زادوں نے شراب پی ہے۔ آج تیرے جشنِ وزن کا دن ہے مَیں تجھ کو شراب پلاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایّام میں اور اسی طرح بڑی بڑی تقریبات کے موقعوں پر شراب پی لیا کرو۔ البتّہ طریقہ اعتدال ضرور ملحوظ رکھو، کیونکہ اتنی شراب پینی جو عقل کو زائل کر دے، عقلاء نے جائز نہیں قرار دی ہے۔ شراب نوشی سے نفع اور فائدہ پیش نظر رہنا چاہیئے۔ بو علی (بو علی سینا) جو عقلاء اور اطباء کے طبقہ میں بہت وقعت رکھتا ہے۔ اُس نے یہ رباعی کہی ہے :

مے دشمن مست و دوست ہوشیار ست — اندک تریاق و بیش زہر مار ست
در بسیارش مضرت اندک نیست — در اندک او منفعت بسیار ست

زعم عقل ملاحظہ ہو، کہ شیخ بو علی سینا کے قول کے سامنے خداوندِ عالم کے احکام منسوخ ہیں اور طرہ یہ کہ علم و فضل سے نہ اکبر کو کوئی واسطہ تھا نہ جہانگیر کو۔

جہانگیر علم سے محروم | جہانگیر کے علم سے محرومی کا واقعہ ان پرستارانِ عقل کی عقلی درماندگی کا عجیب و غریب لطیفہ ہے۔ حضرت شیخ سلیم چشتی کی کرامات بیان کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے :

"ایک روز حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) نے شیخ سے اُن کی عمر کے متعلق سوال کیا۔ شیخ نے فرمایا۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالےٰ ہے لیکن اکبر اس جواب پر خاموش نہ ہُوا، اصرار کرتا رہا۔ بہت زیادہ اصرار کے بعد شیخ نے فرمایا کہ جب شاہزادہ کسی معلّم کی تعلیم سے یا کسی اور صورت سے کوئی شعر یاد کرلیں اور اُس کو پڑھیں، وہ میری وفات کی علامت ہوگی۔

آنحضرت نے (اکبر بادشاہ نے) شیخ کے ارشاد پر اعتقاد رکھتے ہوئے ان خدّام کو جو میری خدمت کے لئے مقرر تھے، تاکید کر دی کہ کوئی شخص شاہزادہ کو کوئی نظم یا نثر نہ سکھائے۔

دو سال سات ماہ اسی طرح گذر گئے۔

ایک روز ایک غریب عورت جو اس محلّہ میں رہا کرتی تھی اور نظرِ بد کا علاج کرنے میں کمال رکھتی تھی، اور اسی بہانہ سے میرے محل میں آجاتی تھی مجھے تنہا پاکر یہ شعر سکھا گئی ؂

الٰہی غنچۂ اُمّید بکشا گلی از روضۂ جاوید بنما

مَیں نے یہ شعر حضرت شیخ کو جاکر سُنا دیا۔ شیخ فوراً اُٹھے اور حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) سے جاکر اس واقعہ کو بیان کیا۔

اتّفاقاً اسی شب کو بخار ہو گیا۔

دوسرے روز "تان سین" کو جو اس زمانہ کے گویّوں میں سب سے بہتر تھا اپنے پاس بُلایا اور سماع شروع کر دیا، اور کسی کو حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) کو بُلانے کے لئے بھیج دیا۔ جب عرش آشیانی شیخ کے پاس پہنچے تو شیخ نے فرمایا کہ وقتِ وصال آگیا، اب مَیں آپ سے رخصت ہوتا ہوں، اور اپنی دستار اپنے سر پر سے اُتار کر میرے (جہانگیر کے) سر پر رکھی اور فرمایا۔ ہم نے سلطان سلیم (جہانگیر) کو اپنا جانشین بنایا، اور اس کو خدائے حافظ و ناصر کے سپرد کیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مرض بڑھتا رہا حتیٰ کہ وفات ہو گئی۔

بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ ایک طرف وہ پندارِ عقل اور دوسری طرف یہ درماندگی شریعتِ غرّا کے احکام و عقائد، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات (معاذ اللہ) قابلِ مضحکہ اور شیخ سلیم کا ایک مجذوبانہ مقولہ اکبر کے نزدیک اس قدر واجبِ احترام کہ جہانگیر کو ہمیشہ کے لئے جاہل رکھا۔

مذہبیتِ جہانگیر کا سرچشمہ نواب سیّد فرید، قلیچ خان، لالہ بیگ وغیرہ جو زمانۂ شاہزادگی سے جہانگیر کے رفیق اور معتمد علیہ تھے، حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ

سرہ العزیز کے متوسلین میں سے تھے، انہیں حضرات کی کوششوں نے جہانگیر کے رجحانات میں تبدیلی پیدا کی۔ مگر اس سے پہلے جہانگیر کا ماحول کیا تھا، اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) جہانگیر نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بہو[1] کا دودھ پیا تھا، اور پھر اسی ماحول میں اس نے زمانۂ طفولیت ختم کیا۔

حضرت سلیم چشتی قدس اللہ سرہ العزیز صاحبِ کرامات برگزیدہ بزرگ تھے۔ اُن کے اہل و عیال میں مذہبی جذبات تو ضرور ہونے چاہئیں لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ مذہبی جذبات توہمات اور خلافِ شرع رسوم و عادات سے بھی پاک صاف ہوں۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خان صاحب کا خیال تو یہ ہے۔

"اس دایہ کی صحبت نے اور اُن حالات نے جو اس کے گرد لڑکپن میں تھے جہانگیر کو خود پرست اور توہمات میں مبتلا کر دیا اور دُنیا سے بے خبر رکھا۔[2]

اکبر اور جہانگیر نے بزرگانِ چشت کو دیکھا تھا اور وہ اُن کے ہی معتقد تھے بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق اعتقاد تھا۔

"از برکات[3] رُوح پُر فتوح ایشاں کشائشہا بزرگ باین دودمان والا رسیدہ"۔

اکبر پیدائش جہانگیر کے شکریہ میں آگرہ سے اجمیر شریف تک پا پیادہ گیا تھا۔ جہانگیر سے اس قدر ایثار تو نہ ہو سکا۔ البتہ ۸ سنہ جلوس میں جب وہ اجمیر شریف گیا تو:

"جب[4] قلعہ اور حضرت خواجہ بزرگوار کے روضہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں، تو تقریباً ایک کوس کی راہ پا پیادہ طے کی"۔

راستہ کے دونوں طرف فقراء کھڑے ہوئے جن پر سونے کی بارش کی جا رہی تھی۔ اگلے

---

[1] اوّل مرتبہ کسے کہ بمن شیر دادہ والدِ شیخ بایزید (نبیرۂ شیخ سلیم) بود اما زیادہ از یک روز نیست۔ (توزک ص ۱۵)۔ [2] تاریخ ہندوستان ص ۲۶۴۔ [3] ان کی رُوح پُر فتوح کی برکتوں سے بڑی بڑی فتوحات اس بلند خاندان (خاندانِ مغلیہ) کو حاصل ہوئی ہیں ۱۲۔ (توزک ص ۱۲۳) [4] چوں قلعہ و عماراتِ روضہ بزرگوار ظاہر گشت قریب بیک کردہ راہ را پیادہ طے کردم ۱۲ (توزک ص ۱۲۵)۔

دوسرے روز شہر کے تمام چھوٹے بڑوں کو مدعو کیا اور ہر ایک کو انعام دیا۔ پھر مزار مقدس کے لنگر کے لئے ایک دیگ جو آگرہ میں بنوائی تھی، اس کو نصب کروایا اور اسمیں کھانا پکوایا۔ پانچ ہزار نفوس نے ایک مرتبہ کے پکے ہوئے کھانے سے شکم سیر ہو کر کھا لیا۔ جہانگیر نے خود موجود رہ کر کھانا کھلوایا۔ پھر جس جس نے کھانا کھایا تھا، جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے اشرفیاں دیں۔

۹ سنہ جلوس میں اجمیر شریف میں قیام تھا۔ اتفاقاً بخار ہو گیا۔ چند روز متواتر نور جہاں کے سوا کسی کو ناسازئ مزاج پر آگاہ نہ ہونے دیا۔ سارے کام بدستور جاری رکھے۔ لیکن جب ضعف کے آثار زیادہ نمودار ہونے لگے اور مرض میں تخفیف نہ ہوئی، تو حضرت خواجہ کے مزار پر حاضر ہو کر منّت مانی۔ خدا نے شفا بخشی۔

"اسی بیماری کے دوران میں دل میں طے کر چکا تھا کہ جب صحت کامل حاصل ہو جائے گی تو جیسا کہ باطن میں حضرت خواجہ کا حلقہ بگوش اور معتقد ہوں، اور ان کی توجہ کو اپنے وجود کا سبب جانتا ہوں۔ ظاہر میں بھی اپنے کانوں میں سوراخ کر کے اُن کے حلقہ بگوشوں کے جرگہ میں داخل ہو جاؤں گا۔"

۱۲ر شہر یور مطابق ماہِ رجب اپنے کانوں میں سوراخ کر کے ہر کان میں مروارید آبدار کا ایک دانہ ڈال لیا۔

جب بندگانِ درگاہ اور مخلصانِ ہوا خواہ نے یہ دیکھا تو جو لوگ یہاں موجود تھے انہوں نے نیز اُن تمام نے جو سرحدی مقامات پر تھے، اپنے اپنے کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کرائے۔

جواہر خانۂ خاص سے سچے موتی اُن کو مرحمت ہوتے رہے جو اُن کے حسنِ اخلاص کے لئے زینت بخش ہوئے۔ رفتہ رفتہ تمام ہی لشکریوں اور دوسرے لوگوں نے کان

لہ بعد از خوردن طعام بدستِ خود بہر یک از درویشان زرہا دادہ شد (توزک ص۱۲۶)

لہ توزک جہانگیری ص۱۳۲۔

چھدوا دیئے۔ (توزک صفہ ۱۳۲)

العظمۃ اللہ۔ یہ ہے خدائے قادر و قہار کی قدرت، جو عقل و دانش کے پندار میں مبتلا ہوں، اُن سے وہ کام کرائے جاتے ہیں کہ دُنیا کی تاریخ ان کا مذاق اُڑائے۔ شریعتِ مطہرہ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے مگر یہ پندارِ عقل بکریوں اور ریچھوں کی طرح اس کے کان خود اس کے ہاتھ سے چھدواتا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَار

(۲) شیخ علاؤ الدین اور شیخ بایزید، حضرت شیخ سلیم[ل] رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے

[ل] شیخ سلیم، والد کا نام شیخ بہاؤ الدین والدہ بی بی احد، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ کی اولاد سے ہیں سلسلۂ نسب یہ ہے۔ شیخ سلیم پسر شیخ بہاؤ الدین پسر شیخ سلطان پسر شیخ آدم پسر شیخ مودود پسر شیخ بدر الدین پسر شیخ فرید الدین گنج شکر قدس اللہ اسرارہم۔ شیخ فرید الدین گنج شکر قدس اللہ سرہٗ حضرت شیخ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری قدس اللہ سرہ کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہ کے خلیفہ ہیں۔

شیخ سلیمؒ ہندوستان میں شیخ سلیم اور عرب میں شیخ الہند کے خطاب سے مشہور ہیں آپ کے والد ماجد شیخ بہاؤ الدین لدھیانہ کے باشندہ تھے۔ شیخ سلیم کی ولادت سے پہلے دہلی تشریف لے آئے اور سرائے علاؤ الدین زندہ پیر میں قیام کیا۔ بقول صاحب معارج الولایت ۸۸۴ھ میں اور بقول صاحب اخبار الاخیار ۸۹۷ھ میں شیخ سلیم پیدا ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد شیخ بہاؤ الدین اہل و عیال کو لے کر فتح پور چلے آئے مگر یہاں پہنچ کر کچھ عرصہ بعد وفات ہو گئی حضرت شیخ سلیم ابھی نابالغ ہی تھے کہ والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ شیخ سلیم کے بڑے بھائی شیخ موسیٰ کے کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ انہوں نے اولاد سے بھی زیادہ ناز برداری کے ساتھ شیخ سلیم کی پرورش شروع کر دی۔ جب حضرت شیخ سلیمؒ جوان ہوئے تو آپ نے سفر کا قصد کیا۔ شیخ موسیٰ نے فرمایا کہ میری دلبستگی کا سامان تم ہی ہو، تمہاری مفارقت مجھے گوارا نہیں شیخ سلیم نے عرض کیا خدا آپ کو اولاد دے گا۔ تب تو آپ مجھے رخصت دے دیں گے چنانچہ کچھ عرصہ بعد (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تھے، جو جہانگیر کے رضاعی بھائی اور مخلص دوست تھے۔ اپنی توزک میں لکھتا ہے :

"شیخ بایزید جو پہلے دو ہزاری منصب رکھتے تھے، جلوس کے دن اُن کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بحکم خدا شیخ موسیٰ کے فرزند تولد ہوا، اور شیخ سلیم نے رخت سفر باندھا۔ شیخ سلیم مولانا مجد الدین کی خدمت میں سرہند حاضر ہوئے اور علوم ظاہری کی تحصیل میں مشغول ہوگئے۔ مولانا مجد الدین اپنے زمانہ کے ملک العلماء مشہور تھے۔ شیخ سلیم گاہ گاہ شیخ زین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے جو سرہند سے ایک کوس کے فاصلہ پر قصبہ بھدالی میں واقع ہے۔ ۹۳۱ھ میں حجاز مقدس کے سفر کے لئے روانہ ہوگئے۔ عرصہ دراز تک وہاں قیام رہا۔ متعدد حج ادا کئے اور مدت دراز تک حرم نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے مجاور رہے۔ پھر دیگر ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور بزرگان دین کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کیا۔ قطب العارفین شیخ ابراہیم چشتی سے بیعت کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ سید محمد لولی، شیخ محمود شامی، شیخ رجب علی متولی روضۂ منورہ حضرت رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دیگر شرفاء عرب حضرت سلیمؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ کم و بیش سولہ ۱۶ سال کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور سیکری کے پہاڑ پر گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ لیکن اب عوام کا رجحان شیخ کی طرف بہت کافی ہوا، اور اسی پہاڑی پر اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ شیخ سلیمؒ نے بھی اسی اثناء میں نکاح کیا۔ بابر کا حملہ، لودھی خاندان کی سلطنت کا خاتمہ، ہمایوں کا فرار، شیر شاہ سوری اور اس کی اولاد کی سلطنت اور پھر ہندوستان پر ہمایوں کا قبضہ یہ سب حضرت سلیمؒ کی زندگی میں ہوئے۔

سوری خاندان کے آخری دور یعنی شاہ سلیم کے زمانہ میں ہیمو نام ایک بقال نے جو ڈھوسر تھا مگر نہایت مدبر اور بہادر تھا، بادشاہ کا تقرب حاصل کیا، حتیٰ کہ وزیر مال اور پھر شاہ محمد شاہ عدلی کے دور میں وزیر اعظم ہوگیا۔

ہیمو کی وزارت ہندوؤں کی دلداری کے لئے اگرچہ مفید تھی، مگر اس کا طرز عام رعایا کے لئے اچھا نہ تھا۔ حضرت شیخ سلیم قدس اللہ سرہ کو بھی اس سے اذیت پہنچی حتیٰ کہ آپ نے ۹۶۲ھ میں دوبارہ سیاحت اختیار کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عدلی کی حمایت میں ہیمو مغلوں سے جنگ کر رہا تھا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سہ ہزاری منصب دیا سب سے پہلے ان کی ماں نے مجھے دودھ پلایا تھا (توزک ص۱۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حتیٰ کہ ۹۶۵ھ میں آگرہ اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اکبر جو صغیر السن تھا وہ بیرام خان کی اتالیقی میں لاہور میں جاکر پناہ گزیں ہوا، جہاں ہیمو کو شکست ہوئی اور پھر اکبر کا اقتدار عروج پر آیا۔ غالب یہ ہے کہ شیخ سلیم چشتی اس زمانہ کی سیاست سے علیحدہ نہ تھے۔ غالباً وہ مغلوں کے حامی تھے، اور بظاہر اکبر کی عقیدت مندی کا راز یہی ہے۔ اولیاء اللہ کے سوانح نگاران بزرگوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی گویا جدوجہد کرتے ہیں، تاہم کچھ اشارات ضرور مل جاتے ہیں۔ چنانچہ شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد اگرچہ اُس کا بیٹا عادل خان اُس کا ولی عہد تھا مگر اُس کے دوسرے بیٹے عبدالجلیل عرف جلال خان نے ارادہ کیا تختِ سلطنت حاصل کرلے۔ اُس نے اپنا ایک معتمد شیخ سلیم کے پاس دُعا کے لئے بھیجا۔ اگرچہ امراء دولت اور افسرانِ فوج عادل خان کے ساتھ تھے مگر حضرت شیخؒ کا یہ کشف تھا یا سیاسی تجربہ او زکاوت کہ آپ نے معتمد کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ فوراً کام شروع کردو، مخالف موافق ہو جائیں گے، کارپردازانِ تقدیر بادشاہت تمہارے نام پر لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ عبدالجلیل کامیاب ہوا۔ اپنا خطاب اسلام شاہ رکھا۔ عرف میں سلیم شاہ مشہور ہوا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ عادل خان عیاش، کم ہمت، کاہل وجود تھا۔ اُس کے برعکس اسلام شاہ سمجھدار اور تجربہ کار تھا۔ سلیم شاہ کے انتقال کے بعد بادشاہ کا سالہ اپنے خرد سالہ بھانجہ فیروز شاہ کو اپنی بہن کی آنکھوں کے سامنے (بہن کی ہزاروں منّتوں اور لجاجتوں کو پامال کرتے ہوئے) قتل کرکے بہنوئی کے تخت پر قابض ہوا۔ اُس نے اپنا خطاب محمد شاہ عادل رکھا جو شاہ عدلی کے نام سے مشہور ہوا۔ ہیمو نے اسی کے زمانہ میں وزارتِ عظمیٰ حاصل کی اور اسی کے زمانہ میں حضرت شیخ سلیم کو دوبارہ سیاحت اختیار کرنی پڑی۔ آپ کے ایک خلیفہ قاضی غیاث الدین قاضی ابراہیم آباد حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں بادشاہ سے ملنے جاتا ہوں۔ جناب والا کے طویلہ خاص میں جو عراقی گھوڑا ہے اگر وہ مرحمت ہو جائے تو بادشاہ کی نذر کروں۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ گھوڑا لے جاؤ، مگر بادشاہ کو نذر کرتے وقت یہ بتادینا کہ وہ اپنی سواری میں اس گھوڑے کو رکھیں۔ جس روز وہ کسی دوسرے کو دیں گے اُسی روز اُن کے ملک کا زوال شروع ہو جائے گا۔ قاضی صاحب نے گھوڑا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

"شیخ علاؤ الدین جو میرے سے بہت قوی تعلقات رکھتے ہیں جلوس کے دن اُن کو سہ ہزاری کے خطاب سے سربلند کیا۔ لڑکپن سے میرے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نذر کرتے وقت اپنے شیخ کا یہ مقولہ بھی نقل کر دیا۔ بادشاہ نے اُس وقت تو منظور کر لیا، مگر اس کے بعد ایک خاص مقرب کی درخواست پر گھوڑا اس کے حوالہ کر دیا۔ اسی روز سے تنزّل شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۹۶۵ھ میں اکبر سے شکست کھانے کے بعد خضر خان مخاطب بسلطان بہادر سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سوانح نگاروں نے ان دونوں واقعوں کو صرف کرامت کی شکل میں لکھا ہے۔ مگر کیا تعجب ہے کہ ان کی تہ میں گہری سیاست بھی ہو۔ بہرحال حضرت شیخ چودہ سال بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ یہ اکبر کے عروج کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ سیکری پہاڑ پر جو مکانات اور باغات حضرت شیخ کے معتقدین وغیرہ نے بنائے تھے، ان پر نظر ڈال کر حضرت شیخ نے فرمایا۔ اس پہاڑ پر عالیشان عمارتیں بنائی جائیں گی۔ اے لوگو! جس قدر رقبہ اپنے مکانات کے لئے گھیر سکو، گھیر لو، پھر جگہ نہ ملے گی۔ اس ارشاد سے پندرہ سال بعد اکبر بادشاہ نے اس مقام کو پایہ تخت بنانے کا حکم صادر کیا۔ شاہی محلات بننے کے بعد بھی آپ نے فرمایا جس عمارت کا نقشہ مجھے دکھایا گیا ہے وہ اب بھی نہیں بنی۔ آپ نے اپنے احباب کے سامنے اُس نقشہ کی تفصیل بھی بیان کی۔ کچھ عرصہ بعد اکبر بادشاہ نے حضرت شیخ کے لئے عالی شان خانقاہ اور مسجد بنوانے کا حکم دیا۔ اُس وقت یہ تعمیر بے نظیر مانی گئی۔ یہ عمارت اس نقشہ کے مطابق تھی جس کا انتظار حضرت شیخ کو تھا۔ ابتدا تعمیر کی تاریخ "ثانی المسجد الحرام" ۹۷۹ اور تاریخِ اتمام "خانقاہ اکبر" ۹۸۰ ہوئی۔

حضرت شیخ سلیم نے زندگی کا بیشتر حصہ تجرّد میں گذارا۔ آپ آخر عمر تک ہمیشہ روزے رکھتے رہے کاسر اور بارو چیزوں سے روزہ افطار کرتے تھے۔ روزانہ صبح کو ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کی عادت تھی۔ سردیوں میں بھی باریک اکہرے کپڑے ہی استعمال کرتے تھے۔ اہلِ حرمین کے طرز پر ہمیشہ نماز اوّل وقت میں ادا فرماتے تھے۔ بہت سے مخالف شرع اُمور کی اصلاح فرمائی۔ خلق اللہ کے رجوع کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء حتیٰ کہ اکبر بادشاہ حاضر خدمت ہوتا۔ آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ جہانگیر نے توزک میں مولانا غلام سرور چشتی نے خزینۃ الاصفیاء میں چند کرامتوں کا (بقیہ برصفحہ آئندہ)

پلے، اور بڑھے۔ مجھ سے ایک سال چھوٹے ہیں، جوان مردوں کی طرح نیک ذات ہیں۔ ہر ایک حیثیت سے اپنی قوم اور قبیلہ میں امتیاز رکھتے ہیں۔ کبھی کوئی نشہ کی چیز نہیں کھائی، اور اُن کو مجھ سے اس درجہ اخلاص ہے کہ میں نے "فرزندی" کے خطاب سے سرفراز کیا (توزک ص ۳۸، ۱۴، ۴)

شیخ کبیر بھی اسی سلسلہ سے متعلق تھے۔ جہانگیر کو ان سے بہت محبت تھی۔ لکھتا ہے "شجاعت و مردانگی کے باعث شاہزادگی کے زمانہ میں" شجاعت خانی" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (توزک ص ۱۳)

۳ افسونِ نُور جہاں

ان سب تعلقات اور جذبات سے بالا وہ تعلق تھا، جو جہانگیر کی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپ اور دلفریب ہے اور جس کی بنا پر جہانگیر تمام سلاطینِ مغلیہ میں ایک انوکھا اور نرالا امتیاز رکھتا ہے۔

یہ نُور جہاں کا عشق ہے، جس نے اس آزاد بادشاہ کو عہدِ طفولیت ہی میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تذکرہ کیا ہے۔ بروایت سعد الاخبار آپ نے ۲۳ حج کئے۔

سماع و سرود سے ذوق تھا، مشہور گویّا "تان سین" اکبر بادشاہ کے حکم کے بموجب حاضر ہو کر اشعار سُناتا تھا۔ روز پنجشنبہ ۲۹ رمضان المبارک ۹۷۹ھ حالتِ اعتکاف میں رحلت فرمائی اکبر بادشاہ نے عالی شان مقبرہ بنوایا جو سیکری میں اب تک تماشا گاہِ خلائق ہے (خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۴۳۲، اخبار الاخیار ص ۲۷۶ و تاریخ ہندوستان وغیرہ)

آپ کے دو فرزند تھے۔ شیخ احمد، شیخ بدرالدین رحمہا اللہ۔ آپ نے شیخ بدرالدین کو اپنا جانشین بنایا اور فرمایا کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے بھی اپنے صاحبزادے بدرالدین ہی کو جانشین بنایا تھا ۱۲ (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۳۵)۔ ایک خاص لطیفہ قابل لحاظ ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں حضرت شیخ سلیم کا سنِ ولادت اخبار الاخیار کے حوالے سے ۸۷۰ھ فارسی الفاظ میں درج ہے یعنی ہشت صد ہفتاد و ہفت۔ مگر اخبار الاخیار میں ہے فی سنۃ ثمان مائۃ و سبع و تسعین یعنی ۸۹۷ھ بظاہر کاتب نے سبعین کے بجائے تسعین لکھ دیا ہے۔ ۱۲ محمد میاں

گرفتار کر لیا تھا۔

مہر النساء کا نکاح جب شیر افگن سے کر دیا گیا، تو اگرچہ جہانگیر نے دل پر پتھر رکھ کر دائمی مفارقت پر صبر کر لیا تھا، اور عتاب رقابت کے بجائے شیر افگن کی حُسنِ خدمت کی قدر کر کے اُس کو بنگالہ کا گورنر بنا دیا تھا۔ مگر جب اُس نے بغاوت[1] کا قصد کیا، حتیٰ کہ جہانگیر کے فرستادہ قطب الدین خاں کو قتل کر کے اسی نبرد آزمائی میں قطب الدین خاں کے ہمراہیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مہر النساء کا سہاگ ختم ہو گیا، اور چار سال تک بیوگی کا زمانہ بھی ختم کر لیا تو پُرانی اُلفت نے پھر جہانگیر کے دل میں گداز پیدا کیا۔ مہر النساء کی قسمت جاگی، حتیٰ کہ وہ نُور محل اور پھر نُور جہان بن گئی۔ اسوقت وہ واقعی جہانگیر کی آنکھوں کا نور اور اُس کے دل و دماغ کی مالک تھی۔

جہانگیر بھی کہتا تھا کہ نور جہاں میری مالک ہے۔ میرے عدل و انصاف کی مالک نہیں مگر جب دل کے جذبات اور دماغ کے تخیّل پر بھی اپنا قبضہ نہ ہو تو عدل و انصاف کی پاسداری صرف رسمی اور ضابطہ کی چیز ہے۔ خوش قسمتی سے نُور جہاں قابل باپ[2] کی بیٹی اور مدبّر بھائی کی بہن

---

[1] بجرم رقابت شیر افگن کو قتل کرانے کا افسانہ حریفوں کی من گھڑت کہانی ہے جو عرصہ کے بعد گھڑی گئی۔ مستند مؤرخین نے اس کی تردید کی ہے ۱۲۔ [2] نور جہاں کے باپ کا نام مرزا غیاث تھا۔ مرزا غیاث بیگ کے والد خواجہ محمد شریف طرانی اوّلاً حاکمِ خراسان وزیر محمد خان تکلو کے وزیر تھے۔ اُن کی وفات کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کی جانب سے "مرو" کے وزیر ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد مرزا غیاث ہندوستان میں اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں ان کی قابلیت کی قدر کی گئی، اور بلند عہدہ اُن کو دے دیا گیا۔ معاملہ فہم، کارگذار اور اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے۔ شعر و سخن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ سرکاری کام سے فراغت کے بعد شعر و سخن ہی میں مشغول رہتے تھے۔ سخاوت اور حاجت روائی میں طرۂ امتیاز رکھتے تھے۔ مگر اسی قدر رشوت کے لینے میں بیباک اور بہت دلیر تھے (دیباچہ تزک جہانگیری ص ۳۱) شاہ طہماسپ صفوی وہی شاہ ایران ہیں جن کے یہاں ہمایوں نے جا کر پناہ لی تھی اور یہی خواجہ محمد شریف فرائض و آداب مہمان نوازی کیلئے شاہ طہماسپ کی جانب سے مقرر تھے (اکمال السعادت وغیرہ)۔

تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت جہانگیری کا انحصار اس طرح ہو گیا۔

دولت و پادشاہی من حالا در دست	میری حکومت و سلطنت اس وقت
ایں سلسلہ است۔ پدر دیوانِ کُل پسر	اس سلسلہ کے ہاتھ میں ہے۔ باپ
وکیل مطلق۔ دختر ہمراز و مصاحب۔	دیوانِ کُل، بیٹا وکیل مطلق، لڑکی ہمراز و مصاحب۔

اور پھر یہ دائرہ بھی صرف ایک مرکز میں سمٹ آیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے بخشی معتمد خان کا بیان ہے:

"رفتہ رفتہ[1] یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ بادشاہت کا صرف نام رہ گیا اکثر فرمایا کرتے تھے مَیں نے سلطنت نُور جہاں کو بخش دی۔ ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔"

نُور جہاں اگرچہ سنجیدہ، شریف طبع، قابل اور دانش مند عورت تھی۔ اس کے رحم و کرم اور دستِ فیض سے ہزاروں بے کس اور نادار عورتیں فیض یاب ہوئیں۔ سینکڑوں نادار لڑکیوں کے نکاح اور جہیز وغیرہ کا انتظام اُس کے خزانۂ خاص سے ہوا کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے اِنہی اوصاف نے جہانگیر کی گرویدگی کو بندگی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن وہ بسا اوقات اپنی ذاتی منشاء کو پورا کرنے کیلئے تباہ کن فتنہ بھی کھڑا کر دیا کرتی تھی۔

اُس کا یہی افسوں تھا جس کی بِنا پر مہابت خاں جیسا مخلص اور وفادار سپہ سالار جہانگیر سے باغی ہوا۔ شاہزادہ خرم سے جہانگیر اتنا خوش تھا کہ عہدِ شاہزادگی میں ہی اس کو "شاہجہاں" کا خطاب دے کر چتر وغیرہ شاہانہ امتیازات (جو بادشاہوں کے

---

[1] رفتہ رفتہ کار بجائے کشید کہ از پادشاہی بجز نامے نماند مکرر مے فرمودند کہ من سلطنت را بنور جہاں بیگم ارزانی داشتم بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت مرا ہیچ درکار نمی باید (اقبال نامہ جہانگیری مصنفہ معتمد خاں بخشی جہانگیر صـ۵۷ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء و صـ۲۲ دیباچہ تزک جہانگیری)۔

ساتھ مخصوص تھے) اُس کو مرحمت کر دیئے تھے۔

ایک مرتبہ شاہجہاں کی خدمت سے خوش ہو کر :

"اُس کے حق میں اتنی دعائیں کیں کہ اگر ایک فیصدی دعا بھی قبول ہو جائے تو اس کی آخرت اور اس کی سلطنت کی بہرہ مندی اور کامیابی کے لئے کافی ہے[1]"۔

لیکن جب نُورجہاں اس کی مخالف ہوئی تو اس فرزندِ عزیز سے زیادہ جہانگیر کو کسی سے نفرت نہیں تھی۔ شاہجہاں نے غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اپنا وکیل بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تو اس کو بات کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ مجبوراً اس عزیز ترین فرزند کو اپنی جان بچانے کے لئے شاہی فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑا، اور جہانگیر کی عمر کے آخری سال اِنھی خرخشوں کی نذر ہو گئے۔

باعث صرف یہ تھا کہ نورجہاں شاہزادہ شہریار کو جہانگیر کا جانشین بنانا چاہتی تھی کیونکہ شہریار سے شیر افگن کی لڑکی منسوب تھی (جو نُورجہاں کے بطن سے تھی) شاہجہاں کی مشہور و مسلّم قابلیّت کے مقابلہ میں شہریار طفلِ مکتب تھا، مگر داماد کی محبّت میں اُس نے مفادِ سلطنت حتیٰ کہ خاندانی مصلحت کا بھی خیال نہ کیا۔ پورے مُلک میں ایک فتنہ برپا ہو گیا۔ جس میں آصف خاں[2] (نُورجہاں کا بھائی) نُورجہاں کے مقابلہ پر تھا۔

---

[1] چندیں دعائے خیر در حق او کردم کہ از صد، یک آں با جابت مقرون گردد بجہت برخورداری دین و دولتِ او کافی ست ۱۲ (توزک ص ۲۷۷)۔ [2] آصف خاں کی لڑکی شاہجہاں سے منسوب تھی، جس کا خطاب ممتاز محل تھا۔ جو اپنی قابلیّت، وفاشعاری، حُسنِ اخلاق کے باعث شاہجہاں کی محبوب ترین بیگم تھی۔ جس کی وفات کے صدمہ میں بادشاہ کی داڑھی قبل از وقت (۳۸ سال کی عمر میں) سفید ہو گئی۔ تاج محل کا روضہ اسی پاک محبّت کا نقشِ آب دار ہے جس کی نظیر سے دنیا خالی ہے آصف خاں، شاہجہاں کا حامی تھا۔ یہ رشتہ بھی حمایت کا سبب تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاہجہاں کی ذات ستودہ صفات ہر ایک بہی خواہِ مُلک اور مدبّر کو اپنی حمایت پر مجبور کر دیتی تھی ۱۲۔

نورجہاں کا مذہب نورجہاں شیعہ تھی۔ خواجہ محمد شریف کی پوتی تھی، جو شاہ ایران "طہماسپ صفوی" کا وزیر تھا۔

ایران شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اس زمانہ میں خصوصیّت کے ساتھ شیعہ سُنّی جذبات پورے اشتعال پر تھے کیونکہ یہی زمانہ تھا جس میں آئے دن ترکوں سے جنگ رہتی تھی۔ خطبہ میں خلفاء راشدینؓ کا تذکرہ وقت کا سب سے بڑا اختلافی مسئلہ تھا۔

ایران تو درکنار ہندوستان میں بھی جنوبی ہند کے عادل شاہی اور دیگر شیعہ سلاطین اس مسئلہ سے بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ جلد سوم)۔

اسی زمانہ میں ایران میں سُنّیوں کو جبراً شیعہ کیا گیا (اکمال السعادۃ)

بابر بادشاہ (بانی سلطنتِ مغلیہ) کی وصیت اگرچہ یہ تھی کہ شاہانِ مغلیہ کو اس اختلاف سے بالا رہ کر ہندوستان کی بسنے والی تمام قوموں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اور بدن کے مختلف عناصر کی طرح اُن کو آپس میں ملا جلا رکھنا چاہیئے۔ مگر کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ سلطنتِ ایران کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کی سلطنت پر شاہانِ ایران کا سیاسی تسلط رہے تاکہ افغانوں کی طرف سے بے فکر ہو کر ترکوں کے ساتھ اطمینان سے جنگ میں مشغول رہ سکیں۔ نورجہاں جیسی فرزانہ عورت ہندوستان کی ملکہ ہو، اور شاہِ ہندوستان کے دل و دماغ پر قابو حاصل کئے ہوئے ہو۔ یہ سلطنتِ ایران کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ اس قسم کی ڈپلومیسی بڑے بڑے مقاصد میں وہ کامیابی پیدا کر دیتی ہے جو لاکھوں نفوس کی قربانیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

سلطنتِ مغلیہ میں فوجی قانون عموماً بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مگر دیوانی، فوجداری یا مذہبی حقوق کے عام معاملات عدالتوں میں طے پاتے تھے جن کے جج قاضی صاحبان ہوتے تھے۔ اب غور فرمائیے۔ محکمہ عدلیہ پر تسلط اور قبضہ کتنا بڑا اور کتنا اہم مقصد ہے لیکن نورجہاں کی ڈپلومیسی یا شیعہ اقتدار کا نتیجہ تھا کہ نوراللہ شوستری کو قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔

نور اللہ شوستری شیعوں کے نزدیک "شہیدِ ثالث" ہے۔ مگر سنیوں کو ان سے اسی درجہ نفرت تھی جتنی ایک متعصب شیعہ سے ہونی چاہیئے، جو کسی خاص پالیسی کے ماتحت قاضی القضاۃ بنا دیا گیا ہو۔

شیرازہ بندیِ کلام

اکبر و جہانگیر کے حالات کافی تفصیل سے بیان کئے گئے۔ تاکہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مندرجہ ارشاد کی تاریخی تصدیق ناظرینِ کرام ملاحظہ فرما سکیں۔

"فرزندا! یہ وہ وقت ہے کہ پہلی اُمّتوں میں اس جیسے پُر ظلمت وقت میں کوئی اولوالعزم نبی مبعوث ہوتا تھا، اور نئی شریعت کی بنیاد رکھتا تھا۔ مگر یہ اُمّت خیر الامم ہے اور اس کے نبی خاتم الرّسل ہیں علیہ وعلیٰ آلہٖ و اصحابہ الصّلوٰۃ والسّلام۔ اس اُمّت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کا مرتبہ دیا گیا ہے اور انبیاء علیہم السّلام کے بجائے ان علماء کے وجود کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا ہر سو سال کے ختم پر اس اُمّت کے علماء میں سے ایک مجدّد مقرّر کیا جاتا ہے جو شریعتِ مصطفویہ کا احیاء کرتا ہے۔ بالخصوص ایک ہزار کے بعد جو اممِ سابقہ میں کسی عظیم الشان رسول کی بعثت کا زمانہ ہوتا تھا، اور صرف نبی کے درجہ پر بھی اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ اُمّتِ محمّدیہ میں ایک ایسے جلیل الشان عالم کی ضرورت ہے جو اولوالعزم نبی کے قائم مقام ہو سکے۔

فیض رُوح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم کنند آنچہ مسیحا مے کرد[1]

---

[1] مکتوبات بحوالہ حالات نقشبند ص ۱۹۸

جہانگیر بادشاہ اور جذباتِ مجدّدی

یہی جہانگیر بادشاہ جس کے مذہبی ماحول کی یہ تفصیل تھی

حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز پر فرد جُرم لگاتا ہے[۱] :

"شیخ احمد نامی مکّار نے جو "سہرند" میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستانِ بے معنی کو اپنا شکار کر چکا ہے، اور ہر شہر اور دیار میں اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو (جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی کے آئین میں دوسروں کی بہ نسبت بہت پختہ ہوتے ہیں) خلیفہ بنا کر بھیج دیا ہے، اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام بہت سی چکنی چوپڑی نمائشی باتیں لکھ لکھ کر ایک کتاب جمع کی ہے، جس کا نام مکتوبات رکھا ہے"۔

مکتوبات شریف میں اگرچہ تاریخیں درج نہیں ہیں، مگر بظاہر جلد اوّل اور دوم اس واقعہ سے پہلے مرتب ہو چکی ہیں، اور جہانگیر کی مراد یہی جلدیں ہیں۔ کیونکہ تیسری جلد میں حضرت کے وہ مکاتیب ہیں، جو جیل خانے سے ارسال فرمائے تھے۔ لامحالہ اس کی ترتیب جہانگیر کے اس فیصلہ کے بعد ہوئی ہے۔

ہم انہیں جلدوں کے مکاتیب میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ان سے

---

[۱] شیخ احمد نام شیادے در سہرند دام زرق وسالوس فرچیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ و بہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگراں پختہ تر دانند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ و مزخرفاتے کہ بمریدان و معتقداں خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ (توزک ص۲۷۴ و ص۲۷۵)

حضرت مجدّد صاحب کے خیالات، آپ کی تعلیمات اور آپ کے مذہبی جذبات کا اندازہ کیجئے دوسری طرف جہانگیر کے عائد کردہ فردِ جرم کو سامنے رکھئے، آپ کا فیصلہ یہی ہوگا:

برعکس نام نہہند زنگی کافور

اتّباعِ سُنّت اور ردِّ بدعت اصلاح وارشاد کا مجدّدانہ طرز یہ ہے، کہ ایک ایک بدعت کی تردید کے بجائے سُنّت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اتّباع کا حکم فرماتے ہیں، اور صرف اسی کو ذریعۂ فلاح وسعادت قرار دیتے ہیں مثلاً ارشاد ہے:

"وظائف بندگی کو ادا کرنا، اور حضرت حق جلّ مجدّہ کی جانب ہمیشہ اور ہر وقت متوجہ رہنا، پیدائشِ انسان کا مقصود ہے۔ یہ بات صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ سنّتِ سیّد الاوّلین والآخرین (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ظاہراً و باطناً ہر طرح سے پوری پوری اتّباع کی جائے"۔

(مکتوب نمبر ۱۱۰ ص ۱۳۲ جلد اوّل)

اُخروی نجات اور ابدی فلاح سیّد الاوّلین والآخرین (علیہ وعلٰی آلہ الصّلوٰة والسّلام) کی اتّباع سے وابستہ ہے۔ اسی لئے ایک مسلمان حضور (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی متابعت سے درجۂ محبوبیت پر فائز ہو جاتا ہے، اور آپ کی متابعت کے ذریعہ سے ہی مرتبۂ عبدیت پر مشرف ہو سکتا ہے جو تمام مراتبِ کمال سے بالا ہے، اور مقامِ محبوبیت کے حصول کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

جو حضرات رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متابعت میں کامل تر ہوتے ہیں اُن کو انبیاء بنی اسرائیل (علیہم السّلام) سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اولوالعزم انبیاء مرسلین بھی اتباع خاتم الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تمنّا کرتے رہے ہیں۔

بلاشبہ اگر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ مبارک میں موسیٰ علیہ السّلام زندہ ہوتے تو اُن کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتباع کرنی پڑی۔

آپ کی اتباع کی افضلیت کے باعث ہی آپ کی اُمّت تمام اُمّتوں سے افضل اور بہتر ہے۔ اسی سبب سے تمام اُمّتوں میں سب سے زیادہ اور سب سے پہلے یہ اُمّت داخل جنّت ہو گی اور خداوندِ عالم کی اعلیٰ ترین نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو گی۔

(مکتوب ۲۴۹ و ۲۶۸ جلد اوّل)

سُنّت اور بدعت کی قسمیں

سرورِ دو جہاں صلّی اللہ علیہ وسلم کے عمل دو قسم پر ہوتے تھے۔ ایک بطریقِ عبادت، دوم بر سبیلِ عادت۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عمل عبادت کے طور پر ہوتے تھے اُن کے مخالف عمل کو بدعت مُنکر (واجب المنع) سمجھتا ہوں، اور اس کی ممانعت اور بندش میں بہت زیادہ جِدّ و جُہد کرتا ہوں کیونکہ دین میں ایجاد یہی ہے جو مردود ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو افعال بر سبیلِ عرف و عادت ہوتے تھے، اُن کے مخالف عمل کو بدعت مُنکر نہیں سمجھتا، اور نہ اُن کی ممانعت اور بندش میں ضرورت سے زیادہ جِدّ و جُہد کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ عمل دین سے متعلق نہیں۔ اُن کا وجود و عدم عرف کے سبب تھا، دین اور ملّت کے سبب سے نہیں۔

اور عرف و رواج ایک شہر کا دوسرے شہر کے عرف و رواج سے مختلف ہُوا کرتا ہے۔ اور ایک شہر میں بھی زمانوں کے تفاوت سے عرف و عادت میں تفاوت واقع ہو جایا کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس قسم کی سنّت کی پاسداری اور ایسی سُنّتوں پر عمل بھی بہترین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور مُنتج سعادات ہے۔ (ص ۲۴۶ جلد دوم مکتوب ۲۴۵)

اتّباعِ سنّت کے بغیر ریاضت بیکار ہے

فرزندا! روزِ فردا (قیامت) میں کام آنے والی چیز اتّباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ صوفیا کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز اور اشارات اگر اس متابعت اور اتّباع کے موافق ہوں بہت بہتر، ورنہ سراسر خرابی اور عتابِ ربّانی کا سرمایہ ہیں۔ سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا۔ اُن کی حالت دریافت کی۔

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا :

"سارے رموز و اشارات ختم ہوگئے۔ جملہ علوم و معارف ہیچ ثابت ہوئے۔ صرف اُن چند رکعتوں نے کام دیا جو درمیان شب میں پڑھ لیا کرتا تھا"۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے خلفاء راشدین کے نقشِ قدم پر چلنے کو ضروری سمجھو، کیونکہ یہ برکت اور سراسر برکت ہے۔ اور شریعتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے پوری پوری طرح احتیاط برتو۔ نہ قولاً مخالفت ہو، نہ عملاً نہ اعتقاداً۔ کیونکہ یہ مخالفت سراسر نحوست اور بربادی ہے (مکتوب ۱۸۴ ص ۱۸۵ ج ۱)۔

مدارِ فضیلت اتّباعِ سُنّت ہے اس مبارک اور پسندیدہ متابعت کا ایک ذرہ دنیا کی تمام لذّتوں اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے، اور ہر ایک عظمت کی صرف یہی ایک صورت ہے۔

(مثلاً) قیلولہ (دوپہر کو آرام کرنا) جو متابعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیّت سے ہو، اُن کروڑوں شب بیداریوں سے افضل ہے جو متابعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم ہوں۔

عید الفطر کا افطار جس کا شریعت نے حکم فرمایا ہے، ابدالآباد روزے رکھنے سے افضل ہے۔

اہلِ ریاضت بہت کچھ مجاہدے کرتے ہیں لیکن اگر وہ شریعت مطہرہ کے مطابق نہ ہوں

لہ جس شخص کو پورب کی طرف جانا ہے وہ پچھم کی طرف رُخ کر کے خواہ کتنا ہی تیز دوڑے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراطِ مستقیم ہے اور اس کے ماسوا گمراہی۔ سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر جو جد و جہد کی جا رہی ہے وہ گمراہی کو بد سے بدتر اور تاریک سے تاریک تر بنا رہی ہے ۱۲ محمد میاں عفی عنہ

توبے کار و بے سُود - اگر ان اعمالِ شاقہ پر کوئی اجر مرتب بھی ہوتا ہے تو وہ صرف دُنیاوی
دنیا کا کوئی نفع تو در کنار، ساری دنیا ہی بے حقیقت ہے۔ ایسے لوگوں کی مثال
مہتر (بھنگی) جیسی ہے - اُس کی ریاضت اور محنت سب سے زیادہ مگر اُس کی اُجرت سب سے کم۔
شریعتِ مطہرہ کے پیرو، گویا جوہری اور صراف ہیں کام بہت کم نفع بہت زیادہ
راز یہ ہے کہ جو فعل شریعت کے موافق ہوگا، وہ خداوندِ عالم کو پسند ہے جس کی
سند آپ کے پاس موجود ہے اور اس کے ماسوا ناپسند۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود　　　کفر گیرد کاملے مِلّت شود[1]

مختصر یہ کہ تمام سعادتوں کا سرمایہ اتباعِ سُنّت ہے اور جملہ خرابیوں کا ہیولا
مخالفتِ شریعت ہے - (ص ۱۳۵ جلد اوّل مکتوب ۱۱۴)

اتباعِ سنّت ہی سُلوک و طریقت ہے جو اعمال باری تعالےٰ عزّ و جل
کے قرب سے بہرہ ور کرتے ہیں وہ فرائض ہیں یا نوافل - فرائض کے مقابلہ میں نوافل کی
کوئی حیثیت نہیں - کسی فرض کو وقت میں ادا کر دینا ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے،
خواہ نیّت کتنی ہی خالص ہو۔

نماز، روزہ، ذکر، مراقبہ وغیرہ غرض جتنی نفلیں ہیں، اور مَیں تو کہتا ہوں کہ
ادا، فرض کے وقت سنن اور آداب کا لحاظ رکھنا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک روز امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز کے
بعد حاضرینِ جماعت پر نظر ڈالی تو اپنے ایک دوست کو غیر حاضر پایا - دریافت کیا کہ
وہ صاحب کیوں نہیں حاضر جماعت ہوئے - حاضرین نے عرض کیا - شب بیدار ہیں
خیال یہ ہے کہ اس وقت سو گئے۔

(عمر فاروق رضؓ) اگر تمام رات سوتے رہتے، اور نماز صبح جماعت سے ادا کرتے،

---

[1] مثلاً حجر اسود (سنگِ اسود) کو بوسہ دینا بظاہر کفر ہے مگر ایک کامل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا حکم ہے لہٰذا فرض ہے ۱۲ اسی طرح رمل، رمی جمار بلکہ خود استقبال قبلہ وغیرہ۔

یہ بہتر تھا"۔

لہٰذا کسی فعلِ مستحب کا لحاظ رکھنا اور مکروہ تحریمی تو درکنار مکروہ تنزیہی سے احتیاط کرنا، ذکر، فکر اور مراقبہ سے بدرجہا بہتر ہے۔

ہاں بیشک ذکر و فکر وغیرہ اگر پابندیٔ سُنّت اور پاسداریٔ مستحبات کے ساتھ ہوں تو ایسا شخص یقیناً کامیاب ہے۔

اسی مکتوب میں آدابِ نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے تحریر ہے:

"امام اعظم کوفی رضی اللہ عنہ بواسطۂ ترکِ ادبے از آدابِ وضو نمازِ چہل سالہ را قضا فرمودند" (مکتوب ۲۹ صـ۳۶ جلد اوّل)۔

خود نماز کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"بدانند کہ رُتبۂ نماز در رنگِ مرتبہ رویت ست در آخرت نہایت قرب در دُنیا نماز ست و نہایت قرب در آخرت در عین رویت است و بدانند کہ سائر عبادات وسائل اند از برائے نماز و نماز از مقاصد ست۔	جان لو کہ دنیا میں نماز کا مرتبہ آخرت میں دیدارِ الٰہی کی طرح ہے دنیا میں خداوند عالم سے انتہائی قرب نماز میں حاصل ہوتا ہے آخرت میں دیدارِ الٰہی کے وقت۔ اور یہ بھی یاد رکھو، کہ تمام عبادات نماز کے وسائل و ذرائع ہیں اور نماز مقصود ہے۔

(مکتوب ۱۳۷ جلد اوّل صـ۱۴۸)

نفس کُشی صرف اتّباعِ سنّت سے ہوتی ہے

انبیاء علیہم السّلام کی بعثت اور تکلیفاتِ شرعی کا مقصود اور حکمتِ نفسِ امّارہ کی تعجیز و تخریب ہے۔ خواہشاتِ نفسانی کو ہٹانے اور دفع کرنے کے لئے احکامِ شرع وارد ہوئے ہیں۔

تقاضا شریعت پر جس قدر عمل کیا جائے، اُسی قدر خواہشِ نفسانی میں زوال ہوتا ہے۔ لہٰذا خواہشِ نفس کے ازالہ میں کسی ایک حکمِ شرعی پر عمل کرنا اُن ہزار سالہ مجاہدوں اور

ریاضتوں سے بہتر ہے جو اپنی رائے سے ہوں۔ بلکہ یہ تمام مجاہدے اور ریاضتیں جو شریعتِ غرّا کے بموجب نہ ہوں، خواہشِ نفسانی کے لئے موید اور مقوی ہیں۔

برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضتوں اور مجاہدوں میں کمی نہیں کی۔ مگر کوئی بھی سودمند نہیں۔ اُن سے خود اُن کی نفسی اور عقلی خواہشات کی تقویت اور تربیت ہوئی ہے۔

مثلاً زکوٰۃ کی ایک کوڑی جس کی ادائیگی حکمِ شریعت کے بموجب ہو، اپنی رائے کے بموجب ایک ہزار اشرفی صرف کرنے سے بہتر ہے۔ حکمِ شریعت کے بموجب عید کے دن کھانا کھانا ہوائے نفسانی کے زائل کرنے میں اپنی عقل کے بموجب سالہا سال روزے رکھنے سے زیادہ مفید ہے۔

تمام شب نماز پڑھنے سے صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنا بہت زیادہ افضلیت کا حامل ہے

خلاصہ یہ کہ جب تک نفس پاک صاف نہ ہو اور اپنی سیادت کے مالیخولیا کی خباثت سے پاک نہ ہو، نجات محال ہے۔ لہٰذا موت ابدی سے نجات[1] حاصل کرنے کے لئے اس مرض کا ازالہ ضروری ہے۔ (مکتوب ۵۲ ص۶۹ و ص۷۰ جلد اوّل)

خواجہ محمد ہاشم کے نام ایک مکتوب ہے جس میں خواجہ موصوف کے چند سوالات کا جواب دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال دوم کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بہت زیادہ ریاضتیں برداشت فرمائی ہیں۔ بسا اوقات گرسنہ رہے ہیں۔ مگر طریقہ نقشبندیہ میں ریاضتوں کی ممانعت ہے۔ جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے کس سے سُن لیا، کہ طریقہ نقشبندیہ میں ریاضت ممنوع ہے۔ طریقہ نقشبندیہ میں لازم ہے کہ ہمیشہ نسبت[2] کو محفوظ رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تمام سُنّتوں کی اتّباع کی جائے۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے اکبر اور جہانگیر کے خیالات و عقائد سے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ [2] قلب ہر وقت یادِ خدا میں مشغول رہے، اس کو نسبت کہا جاتا ہے۔ اسمیں بے انتہا ترقی پذیر مدارج ہیں۔ واللہ اعلم

اپنے حالات کو مخفی رکھا جائے۔ کھانے پینے اور پہننے وغیرہ میں حدِّ اعتدال کی رعایت کی جائے یہ چیزیں شدید ترین ریاضتیں ہیں۔ بے شک عوام کالانعام ان کو ریاضت نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کے نزدیک کھانا سب سے بڑی چیز ہے لہٰذا یہ بہائم صفت فاقہ کو سب سے بڑی ریاضت جانتے ہیں۔ اس کا خیال کرتے ہوئے تو حضرت نقشبند پر لازم ہے کہ جس چیز کو عوام قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے احتیاط کریں تاکہ شہرت سے محفوظ رہیں اور اپنے حالات کو مخفی رکھ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوکا رہنا بہت آسان ہے مگر اتباعِ سُنّت اور خدا کے ساتھ اپنے تعلّق کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا اور اپنے حالات کو چھپانا اور مخفی رکھنا، شہرت اور نمائش سے بچنا، خورد و نوش وغیرہ میں اعتدال قائم کرنا بہت دشوار اور بہت دشوار ہے۔

حضرت حق جل مجدہٗ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فوق الفطرت قوّت بخشی تھی۔ آپ کی برکت سے صحابہ کرامؓ کو بھی بے نظیر روحانی قوّت عطا ہوئی تھی یہ حضرات بھوکے رہ کر بھی جہاد کرتے تھے اور اپنے سے دس گنوں پر بھی غالب رہتے تھے۔ بااین ہمہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح صوم وصال (افطار کے بغیر چند دن کا متواتر روزہ) رکھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرا خدا مجھ کو وہ طاقت بخشتا ہے جو تمہیں حاصل نہیں۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ جائز نہیں۔

مختصر یہ کہ گرسنگی اس حد تک محمود اور بہتر ہے کہ ادائے واجبات میں حارج نہ ہو۔ آج ایک وقت کے فاقہ سے ادائے واجبات میں سُستی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا یہ فاقہ کسی صورت سے بھی موجبِ برکت نہیں۔

ایک دوسرا نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ فاقہ صفائی تو بے شک پیدا کرتا ہے مگر کسی کے لئے صفائی قلب اور کسی کے لئے صفائی نفس۔ اگر فاقہ سے صفائی نفس حاصل ہو تو وہ تباہ کن ہے۔ فلاسفہ یونان اور ہندوستان کے برہمنوں اور جوگیوں کو فاقہ سے صفائی نفس حاصل ہوتی ہے جس سے گمراہی میں اور اضافہ ہو گیا۔ افلاطون جیسے بے وقوف نے انبیاء علیہم السلام

کے احکام ماننے سے اس لئے انکار کر دیا کہ خود کو راہنما سمجھتا تھا۔ یہ سراسر تباہی اور بربادی ہے۔ (خلاصہ۔ مکتوب ۳۱۳۔ ص۴۵۳ و ص۴۵۴ جلد اوّل)۔

درستی عقیدہ بنیادی فرض ہے حکماء اور اطباء کے نزدیک مسلّم ہے کہ جب تک مریض کا مرض زائل نہ ہو کوئی غذا مفید نہیں، بلکہ مقوی مرض ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مرض کا ازالہ کرتے ہیں۔ اس کے رفتہ رفتہ مناسب غذا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص قلبی امراض میں مبتلا ہے۔ کوئی عبادت یا کوئی اطاعت نفع نہیں دے سکتی، بلکہ مضر ہے۔ (ص۱۲۷ ج ۱۔ مکتوب ۱۰۵)۔

عقل درماندہ ہے، فکر نارسا، عقلاء معرفتِ حق سے محروم، اطباء دریوزہ گر ہیں اور اتباعِ عقل گمراہی ہے۔ مکتوب ۲۳ جلد سوم بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی میں مفصّل اور مدلّل طور پر مذکورہ بالا دعوؤں کو ثابت فرمایا ہے۔ خلاصہ درج ذیل ہے۔

انبیاء علیہم السّلام اہلِ عالم کے لئے رحمت ہیں۔ عقل انسانی تو اس جہان کے بنانے والے کو بھی نہ پہچان سکی تھی۔ چنانچہ متقدّمین فلاسفہ دہریہ تھے۔ نمرود خدا کا منکر تھا حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے وجود خدا کے متعلّق اس سے مناظرہ کیا جو قرآن پاک میں منقول ہے۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السّلام سے کہا۔ "میں اپنے سوا کسی خدا کو نہیں جانتا" جب ان حضرات کی تبلیغ سے وجودِ خدا عام طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ تب فلاسفہ بھی وجودِ خدا کے تسلیم پر مجبور ہوئے۔ مگر باری تعالےٰ کی صفات، حشر و نشر وغیرہ میں وہ کبھی بھی راہ یاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے ان چیزوں کو اپنی عقل کے ذریعہ سے معلوم کرنا چاہا۔ حالانکہ یہ چیزیں رسائی عقل سے بالا ہیں۔ ہم تجربہ کرتے ہیں کہ حسِّ ظاہری کسی چیز کو دوسری طرح معلوم کرتی ہے، عقل دوسری طرح۔ حواسِ ظاہری ان چیزوں کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں جن کو عقل معلوم کر لیتی ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السّلام کے معارف و حقائق سے عقل انسانی عاجز رہتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کا طریقہ دوسرے سے جُدا ہے۔ رہ گیا خداوندِ عالم کے احکام کو معلوم کرنا اور ان پسندیدہ چیزوں کو معلوم کرنا جو انسان کے لئے رُوحانی ترقی

اور حقیقی فلاح کا باعث ہوتی ہیں، ان کی واقفیت حضرت حق سبل مجدہ کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ انبیاء علیہم السّلام اسی لئے مبعوث کئے گئے کہ مرضیاتِ الٰہی سے نوعِ انسانی کو آگاہ کردیں۔ خداوندِ عالم کی عظمت اور عبادت کی جو صورت حضرت حق کی مرضی کے مطابق نہ ہو وہ تعظیم کہلانے کی مستحق نہیں۔ بلکہ بہت ممکن ہے غیر تعظیم کو تعظیم سمجھ لیا جائے۔ لہٰذا جو تعظیم و تکریم عقلی طور پر کی جائے اور وہ انبیاء علیہم السّلام کی تصدیق سے محروم ہو وہ گمراہی ہے۔ اس کے بعد فلاسفہ اور ان کے نظریات کی غلطیاں بیان فرمائی ہیں۔ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اپنے رسالہ "المنقذ من الضلال" میں تحریر فرمایا ہے کہ فلاسفہ نے علمِ طب و علمِ نجوم کو انبیاء سابقین علیہم السّلام کی کتابوں سے سرقہ کیا ہے اور ادویہ[1] وغیرہ کے خواص انبیاء علیہم السّلام کے صحیفوں سے ماخوذ ہیں۔ علمِ تہذیب و اخلاق کو اہل تصوف سے (جو ہر نبی کے متبعین میں ہوتے رہے ہیں) حاصل کیا ہے (مکتوب ۲۳ جلد ۳ ص ۳۹ تا ص ۴۲)

درستی عقیدہ کا معیار قرآن پاک اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب جس طرح علماء حق نے عقائد کو سمجھا ہے، اسی کے بموجب اپنے عقائد کو صحیح کرنا ہمارے اُوپر لازم ہے۔ ہماری اور آپ کی سمجھ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، جب تک ان بزرگوں کی توضیح اور تفسیر کے بموجب نہ ہو۔

ہر بدعتی اور ہر ایک گمراہ اپنے عقائدِ باطلہ کے لئے کتاب اور سُنّت ہی کی آڑ لیا کرتا ہے حالانکہ قطعاً بے سود اور بے معنی۔ لہٰذا سب سے پہلے عقائد کو صحیح کرنا ضروری ہے۔ اُس کے بعد حلال، حرام، فرض، واجب وغیرہ شرعی احکام کا علم۔ پھر اس کے بموجب عمل، اس کے بعد تصفیہ اور تزکیہ کا نمبر ہے۔

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کو فطری الہام کے ذریعہ سے یہ چیزیں بتائی گئیں۔ (حجۃ اللہ)۔ فطری الہام اگرچہ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ مگر الہام کرنے والے کا ضرور محتاج ہے ۱۲۔ محمد میاں

جب تک عقائد صحیح نہ ہوں، احکامِ شریعت کی واقفیت فائدہ مند نہیں، اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں صفائی قلب ناممکن۔

یہ چار رکن اور اُن کے تتمے اور تکملے یعنی سنن اور نوافل اصل اصول ہیں۔ ان کے بعد جو کچھ ہے، فضول غیر مفید اور بے کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد واجب العمل ہے۔ من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه۔ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔

شریعت کیا ہے؟ شریعت کے تین جزء ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ جب تک یہ تین چیزیں نہ ہوں، شریعت نہیں۔ جب شریعت ثابت ہوگئی، رضاء مولیٰ حاصل ہوگئی جو دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے بالا ہے "رضوانٌ من الله اکبر"

پس دنیوی اور اُخروی تمام سعادتوں کی متکفل صرف شریعت ہے۔ کوئی مقصود نہیں جس کے لئے شریعت کے ماسوا کسی اور چیز کی ضرورت ہو۔

طریقت اور حقیقت صوفیاء کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں شریعت کے جزء سوم یعنی اخلاص کی تکمیل کے لئے شریعت کے خادم ہیں۔ لہٰذا طریقت اور حقیقت کے حاصل کرنے سے صرف شریعت کی تکمیل مقصود ہے۔

وہ احوال اور وجد، عُلوم اور معارف جو صوفیاء کو اثناء راہ میں حاصل ہوا کرتے ہیں، مقصود نہیں بلکہ اوہام و خیالات ہیں، جن سے طریقت کے نونہالوں کو بہلایا جاتا ہے ان تمام حالات و مقالات سے گذر کر مقامِ رضا میں پہنچنا چاہیئے۔ جو سلوک اور جذبہ کی انتہا ہے۔ (مکتوب ۳۵ جلد اوّل ص۵۰)۔

طریقت عین شریعت ہے کچھ صوفی ایسے کشف بیان کرتے ہیں جو ظاہر شریعت کے مخالف ہیں۔ ایسے کشف، یا وسوسہ ہیں یا حالتِ سکر کا اثر ہوتے ہیں۔ باطن ظاہر سے قطعاً مخالف نہیں۔ درمیانِ راہ میں کچھ مخالفت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کامل اور "منتہی حقیقی" باطن کو ظاہر شریعت کے موافق ہی پاتا ہے۔

علماء دین اور بزرگانِ طریقت کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ علماء اسی چیز کو استدلال اور علم کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں، اور یہ حضرات کشف اور ذوق کے ذریعہ سے یہ مطابقت اور موافقت ہی بزرگانِ طریقت کے حالات کی صحت اور درستی کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے (مکتوب ۱۳ جلد اوّل ص۱۸)

بزرگانِ طریقت تمام عقائد میں جو کتاب، سنّت اور اجماعِ امّت سے ثابت ہیں، علماء اہلِ سُنّت والجماعت سے متّفق ہیں۔ متکلمین اور بزرگانِ طریقت کے درمیان فرق صرف یہی ہے کہ متکلّمین اسی چیز کو علم و استدلال سے حاصل کرتے ہیں اور یہ حضرات کشف اور ذوق سے۔ (مکتوب ۱۶۰ جلد اوّل ص۱۶۱)

صحتِ عقیدہ کے بغیر وجد و حال گمراہی ہے اتباعِ فرقہ ناجیہ کی دولت جس قیمت پر بھی میسّر ہو، احسان ہے اور موجب شکر۔ مجھے اگر یہی مل جائے، اور حال اور وجد کا کوئی حصّہ نہ ملے تو میں راضی رہوں گا اور کوئی غم نہ ہوگا۔

بعض مشائخ قدس اللہ اسرارہم سے غلبۂ حال اور وقتی سکر کے باعث کچھ ایسے عُلوم و معارف ظاہر ہوتے ہیں جو اہلِ حق کی رائے صائب کے مخالف ہیں۔ چونکہ اُن کا منشا کشف ہوتا ہے لہٰذا وہ معذور رہیں۔ اُمید ہے کہ قیامت کو اُن سے مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے اجتہاد میں کوئی غلطی ہو جائے۔ مجتہد کی غلطی پر بھی اجر مل جاتا ہے۔ لیکن حق وہی ہے جو علمائے حق فرماتے ہیں (شکر اللہ سعیہم) کیونکہ علماء کرام کے عُلوم مشکوٰۃِ نبوّت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور مشکوٰۃِ نبوّت کو وحی قطعی سے قوت حاصل ہوتی ہے جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ صوفیاء کرام کے معارف کا مدار اُن کے کشف و الہام پر ہے جس میں غلطی کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

کشف و الہام کی صحت کا معیار علماء اہلِ سُنّت کے عُلوم و تحقیقات ہیں۔ اگر کوئی کشف ان عُلوم سے بال برابر مخالف ہے، وہ دائرۂ صواب سے خارج ہے۔ یہی ہے علمِ صحیح اور حق صریح۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی ہے (مکتوب ۲۱۲ جلد اوّل ص۱۳۴)

الہام دین کے پوشیدہ کمالات کا مظہر ہے۔ وہ دین کے اندر کچھ زائد کمالات نہیں پیدا کر سکتا۔ الہام کی مثال اجتہاد جیسی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اجتہاد شریعت کے اُن احکام کو ظاہر کرتا ہے جو ظاہر شریعت میں ضرور ہیں مگر عام نگاہیں اُن تک نہیں پہنچ سکتیں اور الہام شریعت کے وقائق اور اسرار کو واضح کرتا ہے (ص۱۱۰ جلد۲ مکتوب ۵۵)

حالات سکر و وجد کے کلمات اور ان کی اصلاح کسی بزرگ نے حالتِ سکر میں یہ کہہ دیا کہ ولایت نبوّت سے افضل ہے۔ ایک بزرگ نے اسکی تاویل کی کہ نبی کی ولایت مراد ہے یعنی نبی میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک ولایت دوسری نبوّت۔ لہٰذا جو ولایت نبوّت سے افضل ہے وہ نبی کی ولایت ہے نہ کہ عام اولیاء کی ولایت۔ یہ تاویل اسلئے کی کہ نبی سے ولی افضل ہونے کا وہم نہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ معاملہ برعکس ہے۔ نبی کی نبوّت اُسکی ولایت سے افضل ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ولایت میں تنگی سینہ کے باعث خلقت کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔ اور نبوّت میں چونکہ انتہا درجہ سینہ کو وسعت اور انشراح ہوتا ہے، لہٰذا وہ حضرت سبحانہٗ کی جانب بھی متوجہ رہتا ہے اور مخلوق کی جانب بھی۔ ایک کی جانب توجہ دوسرے کی جانب توجہ میں کوئی کمی اور نقصان نہیں پیدا کرتی۔

نبوّت میں صرف مخلوقات کی جانب ہی توجہ نہیں رہتی کہ ولایت کو نبوّت پر ترجیح دی جا سکے۔ یہ تو عوام کالانعام کی شان ہے۔ نبوّت کی شان اس سے بہت بالا ہوتی ہے۔

اربابِ سکر کے لئے اس نقطہ کا سمجھنا دشوار ہے۔ یہ معرفت مستقیم الاحوال کیلئے مخصوص ہے (ص۱۳۱ جلد اوّل مکتوب ۱۰۸)۔

شیخ فرید کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

من يطع الرّسول فقد اطاع الله۔	جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی، درحقیقت اُس نے خدا کی اطاعت کی۔

حضرت حق سبحانہٗ وتعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بعینہٖ اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ پس جو اطاعت خدا کے نام پر ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ماسوا ہو، وہ خدا کی اطاعت نہیں۔ اسی مضمون کی تائید و تقویت کے لئے قد (درحقیقت) کا لفظ آیۃ کریمہ میں لایا گیا ہے، تاکہ کوئی بوالہوس ان دو اطاعتوں میں تفریق نہ کرسکے۔

دوسرے موقع پر حضرت حق جل مجدہٗ اُس جماعت کی قباحت بیان فرماتے ہیں جو ان دو اطاعتوں میں امتیاز اور تفریق پیدا کرے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

يُرِيدُونَ أَنْ يُّفَرِّقُوا بَيْنَ	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُسکے رسول
اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُولُونَ	کے درمیان فرق پیدا کریں اور کہتے ہیں
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ	کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض
وَّيُرِيدُونَ أَنْ يَّتَّخِذُوا	سے انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ
بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا أُولٰئِكَ	اس درمیان میں کوئی راستہ بنالیں
هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا	یہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں۔

بیشک کچھ مشائخ قدس اللہ اسرارہم نے غلبۂ سکر اور غلبۂ حال کے وقت کچھ ایسے کلمے کہہ دیئے ہیں جن سے بظاہر ان دونوں اطاعتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ منقول ہے کہ سلطان محمود غزنوی خرقان پہنچے تو اپنے دو وکیل شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں بھیجے کہ شیخ سے سلطان کے پاس تشریف آوری کی درخواست کریں۔

سلطان نے اپنے وکیلوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر شیخ کچھ تامّل کریں تو اُن کے سامنے یہ آیت پڑھ دیں۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ (اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور اُن لوگوں کی اطاعت کرو، جو تمہارے معاملات کے ذمہ دار ہیں)۔ چنانچہ وکلاء نے جب دیکھا کہ شیخ کو سلطان کے پاس جانے میں تامّل ہے، تو یہ آیت پڑھ دی۔ شیخ نے جواب دیا۔ اطیعوا اللہ (اطاعتِ خداوندی) کلتی ہی

پورا نہیں ہوا۔ اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) کی تعمیل سے شرمندہ ہوں اولی الامر کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔

حضرت شیخ نے اطاعتِ حق کو اطاعتِ رسول سے علیحدہ سمجھا۔ یہ کلمہ استقامت سے بعید ہے۔ مستقیم الاحوال مشائخ ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔

مستقیم الاحوال مشائخ، شریعت طریقت اور حقیقت کے تمام مراتب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی حضرت حق جل مجدہٗ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور حضرت حق کے نام پر اُس اطاعت کو جو اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر ہو، عین گمراہی قرار دیتے ہیں۔

نیز منقول ہے کہ شیخ اَمنہ۔ شیخ ابوسعید، ابوالخیر ایک موقع پر تشریف فرما تھے۔ ساداتِ خراسان میں سے ایک جلیل القدر سید بھی اس مجلس میں تشریف فرما تھے۔ اتفاقاً ایک مغلوب الحال مجذوب آپہنچا۔ حضرت شیخ نے اس مجذوب کو سیّد صاحب کی بہ نسبت زیادہ تعظیم سے بٹھایا۔ سید صاحب کو اس پر تعجب ہوا۔ شیخ نے فرمایا۔

آپ کی تعظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے واسطہ سے ہے، اور اس مجذوب کی تعظیم حضرت حق جل مجدہٗ کی محبت کے تعلق سے ہے۔

مستقیم الحال بزرگ اس قسم کے امتیاز کو بھی جائز نہیں قرار دیتے۔ یہ بھی مغلوبیتِ حال اور وقتی سکر کا اثر ہے (مکتوب ۵۲ جلد ا ص۱۵۵)۔

اسی طرح انا الحق وغیرہ کلمات کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ سب کلمات درمیانی عوارض کی بناء پر صادر ہوئے۔ جو شخص حضرت حق جل مجدہٗ کے سامنے خود کو ہر طرح ہیچ کرچکا اور فنا کے حقیقی درجہ پر پہنچ گیا، اُس کو تو اپنا وجود ہی ہیچ معلوم ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنی جانب نسبت کرکے کہے کہ "میں حق ہوں"۔ "مَیں" اسی وقت تک ہے جب تک فناء کامل حاصل نہیں ہے۔

"انا الحق گفتن از عدم حصول ایں نسبت ست، وسبحانی بر زبان آوردن

از نارسیدن بایں دولت ست"۔

اس کے بعد ہدایت فرماتے ہیں:

"ایں قسم الفاظ کہ از اکابر صادر شدہ حمل بر توسط احوال شان باید نمود و کمال شان و رائے آں گفتگو اعتبار باید فرمود (صلہ ۱۲۲ جلد ۳ مکتوب ۷۵)۔

چند بدعتوں کی اصلاح قابلِ توجہ علماء دورِ حاضر | مکتوب نمبر ۲۸۸ جلد اوّل میں تحریر فرماتے ہیں:

اس زمانہ کے اکثر خواص و عوام ادار نوافل میں بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں سُستی۔ نہ فرائض سے متعلق سنن اور مستحبات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ نہ فرائض کو اوقاتِ مستحبہ میں ادا کرتے ہیں اور نہ تکبیرِ اولے کی فضیلت کا لحاظ رکھتے ہیں، بلکہ خود جماعت کی پابندی بھی برائے نام ہے۔ فرض نماز جس طرح ادا ہو جانے اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ البتہ روز عاشورا، شب برات، ۲۷ ماہ رجب اور ماہ رجب کے پہلے جمعہ کی رات کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ لیلۃ الرغائب ان کا نام رکھا ہے، اور پورے انتظام و اہتمام سے بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ ان راتوں میں نوافل ادا کرتے ہیں اور اس کو ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ شیطان کا فریب ہے کہ سیئات کو حسنات کی صورت میں پیش کرکے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا عصام الدین ہردی، حاشیہ شرح وقایہ میں فرماتے ہیں کہ نوافل کو جماعت سے ادا کرنا اور فرائض کو چھوڑ دینا شیطان کا دامِ فریب ہے۔

جاننا چاہیئے کہ تراویح اور صلوٰۃ الکسوف کے علاوہ نوافل کو مجمع کے ساتھ ادا کرنا، مذموم و مکروہ بدعتوں میں اور اُنہیں بدعتوں میں داخل ہے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس کام (اسلام) میں ایجاد کرے وہ اُسی کے اُوپر رد کر دی جائے۔

جماعت کے ساتھ ادار نوافل بعض روایتوں میں مطلقاً مکروہ ہے۔ بعض میں کراہت

کے لئے یہ شرط بتائی ہے کہ ایک دوسرے کو بُلائے۔ روایت دوم کی بنا پر اگر ۲ دو آدمی مسجد کے کنارے جماعت کے ساتھ نفلیں پڑھ لیں تو مکروہ نہیں۔ اور تین آدمیوں کے متعلق اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ تین کی جماعت بھی مکروہ ہے، اور چار آدمیوں کی جماعت بالاتّفاق مکروہ ہے۔

اس کے بعد کتب فقہ کی عبارتیں[1] پیش کرکے محققانہ بحث فرمائی ہے۔ اس کے بعد اس قسم کی تمام جماعتوں کو مکروہ قرار دے کر فرماتے ہیں:

مکروہ کو مستحسن جاننا بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ حرام کو مباح اور جائز جاننا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ تو مکروہ کو ثواب سمجھنے میں ایک درجہ اور بڑھا ہوا ہے کہ جائز کے بجائے اُس کو ثواب قرار دیا جا رہا ہے۔ (خلاصہ، مکتوب ۲۸۸ جلد اوّل ص۳۹۴)

---

[1] افادہ کے لئے نقل کی جاتی ہیں۔ فی الفتاوی السراجیہ کرہ التطوع بالجماعۃ بخلاف التراویح وصلوۃ الکسوف، وفی الفتاوی الغیاثیۃ قال شیخ الاسلام السرخسی رحمہ اللہ التطوع بالجماعۃ خارج رمضان انما یکرہ اذا کان علی سبیل التداعی اما اذا اقتدی واحد او اثنان لایکرہ۔ وفی الثلاث اختلاف وفی الاربع یکرہ بلاخلاف وذکر فی الخلاصہ التطوع بالجماعۃ اذا کان علی سبیل التداعی یکرہ اما اذا صلوا بجماعۃ بغیر اذان واقامۃ فی ناحیۃ المسجد فلایکرہ۔ وقال شمس الائمہ الحلوانی اذا کان سوی الامام ثلاثہ لایکرہ بالاتفاق وفی الاربع اختلاف والاصح مکروہ فی الفتاوی الشافیۃ ولایصلی التطوع بالجماعۃ الا فی شہر رمضان وذالک انما یکرہ اذا کان علی سبیل التداعی یعنی باذان واقامۃ اما لو اقتدی واحد او اثنان علی سبیل التداعی فلایکرہ واذا اقتدی ثلاثہ اختلف المشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ، وان اقتدی اربعۃ یکرہ اتفاقاً وامثال ایں روایات بسیارست۔

(مکتوب ۲۸۸ جلد اوّل)

سلوک و طریقت کے وہ خانوادے[۱] جو ہندوستان میں ارشاد و تزکیہ کی خدمات انجام دیتے رہے، اُن میں سے اکثر کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا تھا۔ اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے اُن کو خاص نسبت ہونی چاہیئے تھی۔ مگر اس کے یہ معنی کسی طرح بھی نہیں ہوسکتے کہ اہلِ سُنّت والجماعت کے اجماع کے برخلاف حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو تمام صحابہ سے افضل مانا جائے۔

لیکن عام ذہن اس نکتہ سے غافل تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ہی افضل صحابہ قرار دینے لگے تھے۔ اس عقیدہ کی اصلاح بھی حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی مجدّدانہ خدمات میں داخل ہے۔

مکتوب نمبر ۲۰۲ بنام سیّد فرید صاحب صادر ہوا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"جو شخص حضرت امیرؓ کو حضرت صدیقؓ سے افضل کہے وہ اہلِ سُنّت کی جماعت میں داخل نہیں رہتا"

چند سطر بعد تحریر فرماتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں سے حضرت صدیق کے افضل ہونے پر سلف کا اجماع ہوچکا ہے۔ احمق ہے جو اس اجماع کو توڑ دینے کا وہم کرے"۔ (صـ۲۰۲ جلد اوّل مکتوب ۲۰۲)۔

---

[۱] در ہندوستان چہاردہ سلسلہ برگذارند و آں را چہاردہ خانوادہ نامند۔ ۱: ہبیبیان۔ ۲: طیفوریان - ۳: کرخیان - ۴: سقطیان - ۵: جنیدیاں - ۶: کازرونیاں - ۷: طوسیان ۸: فردوسیاں - ۹: سہروردیاں - ۱۰: زیدیان - ۱۱: عیاضیان - ۱۲: ادھیان - ۱۳: ہبیریان - ۱۴: چشتیان -

گویند حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ را چہار خلیفہ بود - حسن - حسین - کمیل - حسن بصری سرچشمہ سلاسل حسن بصری را دانند و او دو خلیفہ داشت - جیب عجمی نہ نخبتیں از دو جوش معرفت زدند - دیگر عبدالواحد بن زید (پنج سپیں از دو سیراب دل شدند) - (آئین اکبری جلد سوم صـ۱۶۵)

یہ مضمون مکاتیب شریفہ میں بہت جگہ مختلف عنوانات اور دلائل کے ساتھ تحریر فرمایا گیا ہے۔

بدعت[1] | کہتے ہیں[2] کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ بدعتِ حسنہ و بدعتِ سیئہ۔ بدعتِ حسنہ وہ عملِ نیک ہے جو عہدِ رسالت اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کے بعد پیدا ہوا ہو، اور اُس کے کرنے سے کوئی سُنّت ترک نہ ہوئی ہو۔

اور بدعتِ سیّئہ وہ ہے کہ اس کے کرنے سے سُنّت چھوٹتی ہو۔

یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں بھی حسن اور نُورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا، اور صرف تاریکی اور کدورت ہی محسوس کرتا ہے۔

---

[1] بدعت کی تعریف علماء نے یہ فرمائی ہے۔ ما احدث علی خلاف الحق المتلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قول اوفعل بنحو شبهة او استحسان ثم جعل دینًا قویمًا وصراطا مستقیما (شرح نقایہ وغیرہ) باب من یجوز الاقتداء بہ ومن لایجوز بہ۔ یعنی وہ قول یا عمل جو کسی سُنّت کے خلاف کسی شبہ یا ظاہری خوبصورتی کی بناء پر ایجاد کر کے جزوِ دین بنا لیا گیا ہو اور اُس کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا گیا ہو۔ مختصر یہ کہ ہر ایسا کام بدعت ہے جو دین کا کام سمجھا جاتا ہو، اور اس کا کوئی شرعی ثبوت موجود نہ ہو۔

[2] گفتہ اند کہ بدعت بر دو قسم ست۔ حسنہ و سیئہ۔ حسنہ آں اعمالِ نیک راگویند کہ بعد از زمان آں سرور و خلفاء راشدین علیہم الصلوٰۃ والسلام پیدا شدہ باشد و رفع سُنّت نہ نماید۔ و سیئہ آں کہ رافع سُنّت باشد۔ ایں فقیر در ہیچ بدعتے ازیں بدعتہا حسن و نورانیت مشاہدہ نمی کند و جز ازظلمت و کدورت احساس نمے نماید۔ اگر فرضاً عمل مبتدع راکہ امروز بواسطہ ضعف بصارت بطراوت و نظارت بینند فرداکہ حدید البصر گردند۔ دانند کہ جز خسارت و ندامت نتیجہ داشت۔

(بیت) بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت | کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

سیّد البشر مے فرماید علیہ وعلی آلہ الصّلوٰۃ والتسلیمات، من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔ چیزیکہ مردود باشد حسن را از کجا پیدا کند۔

اگر بالفرض کسی بدعتی کے عمل میں آج ضعفِ بینائی کے باعث تری اور تازگی نظر آتی ہے تو کل کو جب کہ نگاہیں تیز ہوں گی، سمجھ جائیں گے کہ ان کا نتیجہ صرف خسارت اور ندامت ہے ؎

بوقتِ صبح شود ہم چو روزِ معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شبِ دیجور

سیّد البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ارشاد ہے:

من احدث فی امرنا	ہمارے اس کام میں (اسلام میں)
ھذا مالیس منہ	جو شخص کوئی ایسی چیز ایجاد کرے
فھو ردّ۔	جو اس میں نہیں ہے وُہ مردود ہے۔

پس جو چیز مردود ہو وہ حُسن کہاں سے حاصل کر سکتی ہے۔

نیز سرورِ دو جہاں علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ارشاد ہے:

اوصیکم بتقوی اللہ	مَیں تم کو اللہ سے تقویٰ کرنے کی اور
والسمع والطاعۃ وان	(احکامِ خلیفہ کے) سُننے اور اطاعت کرنے
کان عبدا حبشیا فانہ	کی وصیّت کرتا ہوں، اگرچہ کوئی حبشی
من یعش منکم بعدی	غلام ہی (امیر) ہو۔ جو شخص میرے بعد
فسیری اختلافا کثیرا	تم لوگوں میں سے زندہ رہے گا وہ بہت
فعلیکم بسنّتی وسنّۃ	زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ تم پر لازم ہے
الخلفاء الراشدین المھدیین	کہ میری اور خلفاء راشدین کی سُنّت
تمسکوا بھا وعضوا	(پر چلو) اُسی سے دلیل حاصل کرو اور
علیھا بالنواجذ وایاکم	دانتوں کی کچلیوں[۱] سے اُس کو پکڑلو
ومحدثات الامور فان	اور ایجاد کردہ باتوں سے بچتے رہو،
کل محدثۃ بدعۃ وکل	کیونکہ ہر ایک ایجادہ کردہ امر بدعت

۱۔ یعنی مضبوطی سے اس پر قائم ہو جاؤ۔ ۱۲

بدعة ضلالة۔ ہر گاہ ہر مُحدث بدعت باشد و ہر بدعت ضلالت پس معنی حُسن در بدعت چہ بود و ایضاً آنچہ از احادیث مفہوم می گردد آنست کہ ہر بدعت رافع سُنّت ست تخصیص بعض ندارد پس ہر بدعت سیّئہ بود۔	ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ بہر حال جبکہ ہر نئی بات بدعت ہوئی اور ہر بدعت گمراہی تو بدعت میں حُسن و خوبی کس طرح ہو سکتی ہے۔ نیز احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک بدعت سُنّت کو اُٹھا دیتی ہے اس میں کسی بدعت کے لئے کوئی تخصیص نہیں لہٰذا ہر بدعت سیّئہ ہی ہوگی۔
قال علیه الصلوٰة والسلام ما احدث قوم بدعة الا رفع مثله من السنّة فتمسك سنّة خیر من احداث بدعة وعن حسّان قال ما احدث قوم بدعة فی دینهم الا نزع الله من سنّتهم مثلها ثمّ لا یعید الیهم الیٰ یوم القیامة۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جب بھی کوئی قوم کوئی بدعت ایجاد کرتی ہے تو اُسی جیسی سُنّت کو اُٹھاتی جاتی ہے۔ لہٰذا سُنّت کو سنبھالنا اور اس سے دلیل حاصل کرنا ایجاد بدعت سے بہتر ہے۔ حضرت حسّان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو قوم اپنے دین میں کوئی بدعت ایجاد کر لیتی ہے۔ خداوندِ عالم اُسی جیسی سُنّت اُن سے چھین لیتا ہے۔ پھر وہ سُنّت ان میں قیامت تک کبھی واپس نہیں ہوتی۔

اس کے بعد اسی مکتوب میں اس کی مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ ارشاد ہے:

کچھ علماء مشائخ نے میّت کے لئے عمامہ کو بدعتِ حسنہ کہا ہے۔ لیکن غور سے

دیکھا جائے تو اس میں ترکِ سُنّت ہے ۔ کیونکہ تین کپڑے سُنّت ہیں ۔ ان میں عمامہ کی زیادتی تین کے عدد کو منسوخ کر دیتی ہے ۔ اسی کا نام رفعِ سُنّت ہے ۔

اسی طرح کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ شملہ کو بائیں ہاتھ کی طرف ڈالے حالانکہ سُنّت یہ ہے کہ کمر پر دونوں مونڈھوں کے بیچ میں رہے ۔ لہٰذا بائیں جانب ڈالنے سے وہ سُنّت ختم ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ نیّت نماز زبان سے بھی ادا کرے تاکہ زبان اور دل میں مطابقت ہو جائے ۔ زبان سے نیّت کرنے کو بدعتِ حسنہ کہا جاتا ہے فقیر کے خیال میں اس بدعت سے سُنّت تو درکنار، فرض ختم ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ بسا اوقات عوام الناس زبان سے تو کہہ ڈالتے ہیں مگر دل قطعاً متوجّہ نہیں ہوتا، حالانکہ دل سے ارادہ کرنا فرض تھا ۔ لامحالہ اس بدعت سے فرض یعنی دل سے ارادہ کرنا ختم ہو جاتا ہے اور جب نیّت نہ ہوئی تو نماز نہ ہوئی ۔ یہی شان ہے تمام بدعتوں کی ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ :

انها زیادات علی السنّة	بلاشبہ بدعتیں سُنّتوں پر زیادتیاں ہیں،
ولو بوجه من الوجوه ،	خواہ وہ کسی حیثیت سے ہوں اور زیادتی
والزیادة نسخ فعلیکم	نسخ ہے ۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ سُنّتِ
بالاقتصار علی متابعة	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت
سنّة رسول الله صلی	پر انحصار کرلو، اور آپ کے صحابہ کرام
الله علیه وسلم والاکتفاء	کی اقتدار پر اکتفا کرو ۔ اس لئے کہ
علی اقتداء اصحابه الکرام	صحابہ کرام تاروں کی طرح ہیں جس
فانهم کالنجوم بایهم	کی اقتدار بھی کرلوگے ہدایت پالوگے
اقتدیتم اهتدیتم اما	باقی رہا قیاس اور اجتہاد، ان کو
القیاس والاجتهاد فلیس	بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ قیاس
من البدعة فی شیءٍ	و اجتہاد کسی امرِ زائد کو ثابت نہیں
فانه مظهر لمعنی النصوص	کرتے ۔ بلکہ وہ صرف آیات و احادیث

لہ مثبت امور زائد ۔ کی مراد کو ظاہر کرتے ہیں ۔

(ص۱۸۶ و ص۱۸۷ مکتوب نمبر ۱۷۶)

ملّا طاہر لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں :

کتنی بڑی نعمت ہے کہ تمام محبّ و مخلص سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احیاء و ترویج کی طرف متوجّہ ہوں، اور تردیدِ بدعت کی جدّ و جہد میں مشغول رہیں سُنّت اور بدعت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کے وجود پر دوسرے کی نفی لازمی ہے

...... چند سطر بعد :

جمیع سنن مرضیٔ حق اند جل سلطانہٗ و اضدادِ آنہا مرضیاتِ شیطان۔ (ص۲۷۸ جلد ا مکتوب ۲۵۵)

تمام سُنّتیں خداوند بالا و برتر کی پسند فرمودہ ہیں اور جو چیزیں سُنّت کے مخالف ہیں وہ شیطان کی پسندیدہ ہیں

سماع وغنا

سماع وغنا کے متعلق مکتوب ع۲۸۵ جلد اوّل میں مفصّل بحث کے بعد فرماتے ہیں :

" مختصر یہ کہ سماع[لہ] متوسطین کے لئے نافع ہے۔ اور منتہی حضرات میں بھی

لہ سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کے مکاشفات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب ایک مرتبہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزارِ اقدس پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ مزار مبارک کے قریب ایک چبوترہ ہے۔ اس خیال سے کہ اس وجودِ ملوّث کو مزارِ اقدس کے مبارک مقام پر نہ لے جانا چاہیئے، مَیں اسی چبوترہ پر کھڑا ہوگیا۔ وہیں حضرت شیخ کی رُوح پُر فتوح ظہور فرما ہوئی۔ مَیں نے دیکھا کہ چار فرشتے ایک تخت لئے ہوئے آسمان سے اُترے اور حضرت شیخ کی قبر کے پاس اس کو رکھ دیا۔ اس تخت پر حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہٗ رونق افروز تھے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان راز کی باتیں ہونے لگیں، جن کو مَیں نہیں سُن سکا اس کے بعد فرشتے تخت اُٹھا کر آسمان کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت خواجہ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک خاص قسم کے حضرات کے لئے"۔

اس قسم کے لوگوں کے اوصاف کی تشریح اور تفصیل کے بعد فرماتے ہیں :

جن لوگوں کے لئے سماع نافع ہے ، اس کے لئے بھی چند شرطیں ہیں مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ اپنے کامل نہ ہونے کا اعتقاد رکھے ورنہ ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اپنی جگہ پر رُکا ہوا ہے۔ اور اگر ترقی ہو بھی تو محض عارضی۔ باقی سماع کے نافع ہونے کی شرطیں عوارف المعارف یا دیگر اکابر مستقیم الاحوال کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن یہ دورِ حاضر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قطب الدّین میری طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے قریب بلایا۔ پھر ارشاد فرمایا۔ شعر کے متعلق تم کیا کہتے ہو۔ مَیں نے کہا۔ کلامِ حسنہ، حسن وقبیحہ، قبیح۔ یعنی ایک قسم کا کلام ہے۔ جس طرح ایک جملہ یا فقرہ اچھّا بھی ہو سکتا ہے بُرا بھی ، اسی طرح شعر بھی اچھا بھی ہو سکتا ہے بُرا بھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا ، بارک اللہ۔ اس کے بعد دریافت فرمایا۔ اچھّی آواز کے متعلق کیا خیال ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ خدا کا انعام ہے وہ جس کو چاہے اپنا انعام بخش دے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا۔ بارک اللہ۔ پھر فرمایا۔ اگر کسی شخص کو یہ دونوں میسّر ہو جائیں۔ مَیں نے عرض کیا۔ نور علیٰ نور یھدی اللہ بنورہٖ من یّشاء۔ ارشاد ہوا۔ بارک اللہ۔ اس کے بعد خواجہ نے فرمایا۔ ہمارا کام صرف یہی تھا۔ تم نے بھی کبھی کبھی یہ شعر سُن لئے ہوں گے۔ مَیں نے عرض کیا۔ آپ نے حضرت خواجہ کے سامنے یہ کیوں نہیں فرمایا۔ جواب دیا۔ خلافِ ادب تھا۔ (انفاس العارفین مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ص۴۲)۔

یہ واقعہ شاہد ہے کہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ مراقبہ، ذکر، پاسِ انفاس وغیرہ کی طرح اچھی آواز کے ساتھ کیف آور اشعار پڑھ لینے یا اشعار سُننے کو رُوحانی ترقی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ باقی ان اکابرین کے متعلق یہ وہم بھی سراسر گستاخی ہے کہ رقص وسرود جو بالاتفاق علماء حرام ہے۔ اس کو رُوحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیتے تھے (معاذ اللہ) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ آگے آئے گا ۱۲۔ محمد میاں عفی عنہ

کے لوگوں میں عموماً مفقود ہیں۔ بلکہ اس قسم کا سماع اور رقص جو آج کل رائج ہے۔ بلاشک و شبہ مضر ہے، عروج و ترقی کے منافی۔ (صٓ۳۷۔ جلد ا)

مکتوب ۲۶۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"سماع اور رقص در حقیقت لہو و لعب میں داخل ہے"۔

ممانعت سرود کے متعلق یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی ہے۔

مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ	کچھ لوگ وہ ہیں جو لہو الحدیث[1] کو
لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کو خریدتے ہیں تاکہ خدا کے راستہ سے
بِغَيْرِ عِلْمٍ ق وَّيَتَّخِذَهَا	بھٹکائے بغیر سمجھے۔ اور ٹھہرائیں اسی
هُزُوًا ط اُولٰٓئِكَ لَهُمْ	کو ہنسی۔ وہ جو ہیں اُن کو ذلت
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○	کا عذاب ہے۔

(سورۂ لقمان۔ ع ۱)

چنانچہ علمِ تفسیر کے امام حضرت مجاہد جو اکابر تابعین میں سے ہیں، اور حضرت عبّاسؓ کے ممتاز شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لَهْوَ الحدیث سے مراد غنا ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے کہ لَهْوَ الحدیث سے مراد افسانہ[2] اور غنا ہے۔

ابنِ عبّاس و ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ لہو الحدیث سے مراد غنا ہے۔ امام تفسیر حضرت مجاہد (مذکور) فرماتے ہیں کہ لا یشھدون[3] الزور کے معنی ہیں لا یحضرون الغناء (یعنی محفلِ غنا میں نہیں حاضر ہوتے) امام الہدیٰ ابو منصور ماتریدی (علمِ کلام کے امّام) سے منقول ہے، کہ ہمارے زمانہ کے

---

[1] لہو الحدیث یعنی ایسی بات جو یادِ خدا سے غافل کر دے ۱۲ منہ۔ [2] ناول یا طلسمِ ہوش ربا جیسے افسانے اور ڈرامے وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں ۱۲۔ [3] وہ مسلمان جو خدا کی بارگاہ میں کامیاب ہیں اُن کے اوصاف کے سلسلہ میں یہ آیت وارد ہوئی ہے ۱۲

قاریؔ جو گا گا کر قرارت کرتے ہیں، جو شخص ان کو شاباش دے، وہ کافر ہوگیا اُس کی بیوی حرام ہوگئی۔ اس کی تمام نیکیاں خداوند عالم برباد کردے گا۔ ابونصیر دلوسی کے حوالہ سے قاضی ظہیر الدین خوارزمی سے منقول ہے کہ جو شخص قوال یا کسی دوسرے شخص سے غنا سُنے، یا کسی حرام فعل کو دیکھ کر اس کو پسند کرے (خواہ عقیدۃً یا بلا اعتقاد) وہ اُسی وقت مرتد ہوگیا۔ کیونکہ اُس نے حکمِ شریعت کو (معاذ اللہ) باطل گردانا۔ اور جو شخص حکمِ شریعت کو باطل قرار دے وہ کسی مجتہد کے نزدیک بھی مومن نہیں۔ خداوندِ عالم اُس کی کسی اطاعت کو قبول نہیں کرے گا، اور اس کی تمام نیکیوں کو برباد کردیگا اس کے علاوہ آیات، احادیث اور فقہاء کے اقوال حرمتِ غنا کے متعلق اتنی کثرت سے ہیں کہ ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے۔

ان تمام شرعی تصریحات کے باوجود اگر کوئی شخص کسی منسوخ حدیث یا کسی شاذ روایت سے جوازِ غنا پر استدلال کرنے لگے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی زمانہ میں کسی فقیہ نے بھی جوازِ غنا کا فتویٰ نہیں دیا، اور نہ رقص و پاکوبی کو جائز مانا۔ (ص۳۳۴ و ص۳۳۵ جلد اوّل)۔

سُلوک و طریقت کے سلسلہ میں حضرت مجدّد صاحب کی تعلیم کا اندازہ کرنے کیلئے

لہ خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں تولانے والی باندیاں قرآن شریف کی قرارت بھی سیکھا کرتی تھیں اور جس طرح فی زمانہ خوش طبعی کی مجلس میں گراموفون پر قرارت کا ریکارڈ بھی سُن لیا کرتے ہیں، یہ لوگ بھی گانے کی محفل میں قرارت سُنا کرتے تھے ۱۲۔ ظاہر ہے کہ خوش طبعی کی محفل میں کلام اللہ پڑھنا کلام اللہ کی توہین ہے معاذ اللہ۔ جو تجوید یا قرارت آج کل قاری صاحبان سکھاتے ہیں وہ صرف مخارج کی تصحیح اور قرارتوں کے اختلافات کے متعلق ہے، اس کو گانے سے کوئی واسطہ نہیں۔ گانا دوسری چیز ہے۔ اُس کی ادائیگی کا طرز بھی جُدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک طریقہ وہ ہے کہ ہم کسی اُردو شعر کو اچھی آواز سے پڑھ دیں لیکن قوال یا موسیقی کا ماہر اس کو دوسری طرح خاص خاص زیر و بم اور آواز کی بلندی و پستی کے ساتھ پڑھے گا یہی فرق قرارت اور گانے میں ہے ۱۲ محمد میاں

مکتوب ۲۶۱ جلد اوّل کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمام اسلام کا رُکن دوم ہے اور جامع عبادات ہے۔ نماز نے اس جامعیت کے سبب سے ہی کُل اور مجموعۂ عبادات کا حکم پیدا کر لیا ہے اور تمام نیک کاموں سے بلند و بالا ہے۔ دیدارِ خداوندی کی دولت، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دیدارِ خداوندی کی دولت اس عالم کے مناسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں میسّر ہوتی ہے۔

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الصّلوٰۃ معراج المؤمنین یعنی نماز مسلمانوں کے لئے معراج ہے۔ نیز ارشاد ہے۔

اقرب ما یکون العبد — زیادہ سے زیادہ قرب جو بندے کو
من الرّب فی الصّلوٰۃ۔ — اپنے رب سے حاصل ہوسکتا ہے،
وہ نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیدارِ خداوندی کی دولت اگرچہ اس عالم میں کسی کو نہیں ہوتی کیونکہ یہ عالم اس کا متحمّل نہیں ہوسکتا۔ مگر تاہم اس نعمتِ عظمیٰ کا جو کچھ حصّہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل پیروکاروں کو حاصل ہوتا ہے وُہ نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر نماز کا حکم نہ ہوتا تو چہرۂ مقصود کا نقاب نہ اُٹھتا۔ طالب، وصل سے محروم رہتا۔ پیر و مرشد جو قائد و ہادیٔ طریقت ہو، وہ ہر ایک کمال اور معرفت کے باوجود اس دولت کا اسی طرح محتاج ہے، جس طرح ایک نوجوان چنانچہ شریعتِ غرّا نے ہر ایک مسلمان کے لئے نماز کو لازم قرار دیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مقصود کی آخری حد تک پہنچ سکے۔

وہ شیخِ طریقت جو اس راستہ سے منتہار مقصود تک پہنچتا ہے، اس سے کرامات کا صدور بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات اس کو علم نہیں ہوتا، مگر دوسرے لوگ اس سے کرامات کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں۔

ایسے شیخِ طریقت کی ہدایت و رہنمائی کا نور اس کے مریدوں میں سرایت کرتا رہتا ہے ۔ بلکہ مریدوں اور پھر اُن کے مریدوں میں عرصۂ دراز تک اس نُور کی کار فرمائی باقی رہتی ہے ، جب تک[1] اس کے مخصوص طریقہ کو تغیّرات اور تبدیلیوں کی گندگی سے ملوّث نہ کیا جائے اور بدعتوں کی آمیزش نہ ہو۔

ان اللہ لا یغیّر ما بقومٍ حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم

جو حالت کسی قوم کی ہے ، خداوندِ عالم اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا

جب تک وہ خود ہی اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لیں ۔

تعجّب ہے کہ مشائخ زمانہ ان تبدیلیوں[2] اور بدعتوں کو اس سلسلہ کی تکمیل تصوّر کرتے ہیں ۔ حالانکہ قرآن حکیم صفائی سے اعلان کر رہا ہے کہ دین اسلام ان بدعتوں کی ایجاد سے بہت پہلے مکمّل اور رضارحق سے مشرف ہو چکا ہے اور اس کے متبعین پر

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس شیخِ طریقت کی اپنی چیز کوئی نہیں ۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی سُنّت اور وہی تعلیم ہے جو جملہ خیر و برکات کا خزانہ ہے ۔ یہ شیخ اس کا نمونہ تھا لہٰذا صاحبِ برکت ہُوا ۔ جو اس نمونہ کی اتّباع کرے گا ، اس برکت سے حصّہ پائے گا ۔ برکتیں خاص اس شیخ کی نہیں ، بلکہ اس سُنّت مبارک اور ملّت شریف کی برکتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ شیخِ طریقت بابرکت ہُوا (واللہ اعلم بالصواب) ۔ [2] شیخ کامل سنّتِ رسول اللہ علیہ وسلم میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ، ورنہ وہ خود مردود ہوگا اور نص حدیث کے بموجب حوضِ کوثر سے محروم ۔ چنانچہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ حوضِ کوثر سے کچھ آدمیوں کو ہٹایا جائے گا ۔ مَیں کہوں گا کہ یہ تو بظاہر میرے آدمی ہیں ۔ جواب دیا جائے گا ۔ آپ کو خبر نہیں ، ان لوگوں نے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں ۔ مَیں کہونگا ، دُور ہوں دُور ہوں (مسلم شریف وغیرہ) البتہ کبھی کسی غلط فہمی کی بنا پر اور کبھی اتفاقی طور سے اُس سے لغزش ہو جاتی ہے ۔ پابندِ شریعت کا فرض یہ ہے کہ لغزش کو لغزش قرار دے ۔ مگر کور باطن سجادہ نشین شیخ کو انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم سمجھ کر اُس لغزش ہی کو اس سلسلہ کا طرۂ امتیاز گردان لیتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ۔ ۱۲

نعمتِ خداوندی کامل اور مکمل ہو چکی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

آج ان بدعتوں کو کمال دین قرار دینا اس آیۂ کریمہ کا سراسر انکار ہے معاذاللہ۔

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیارست

علماء مجتہدین نے احکامِ دین ہی کی تفصیل کر دی ہے۔ کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کی (چنانچہ فقہ کے ہر ایک حکم کے لئے قرآن پاک یا حدیث شریف کی کوئی سند پیش کرنی ضروری ہے۔ شوافع، احناف، حنابلہ اور مالکیہ کی بحث اسی میں رہتی ہے کہ کس کے مسلک کے لئے سند واضح اور قوی ہے) لہذا اجتہادی مسائل ایجاد کردہ اُمور نہیں بلکہ دین کی ایک خاص اصل ہیں یعنی قیاس۔

بہرحال نماز ہی وہ دولتِ عظمیٰ ہے جس کے متعلق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

وہ تمام علوم و معارف، احوال و مقامات وغیرہ جو نماز سے خارج اور حقیقتِ نماز سے واقفیت کے بغیر حاصل ہوں، وہ حقیقی معارف کمالات نہیں۔ بلکہ ان کی تصویر باطل ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہم و خیال ہیں۔

جو نمازی حقیقتِ نماز سے آگاہ ہوتا ہے، وہ نماز کے اندر گویا عالمِ دنیا سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ لامحالہ معراج سے مشرف ہوتا ہے۔

بہرحال پنجگانہ معراج کی یہ بے نظیر دولت صرف اس اُمّت کے لئے ہی مخصوص ہے۔ اسی اُمّت کے نبی آخرالزماں کا یہ طُرّۂ امتیاز ہے کہ شبِ معراج میں دُنیا سے آخرت میں اور آخرت سے جنّت میں پہنچ کر حضرت حق جل مجدہٗ کے دیدار سے مشرف ہوئے۔

وہ جماعت جس کو حقیقتِ نماز سے آگاہ ہی نہیں بخشی گئی، امراض باطنی کا علاج دوسری صورت سے کرنا چاہتی ہے۔

بلکہ ایک گروہ تو وہ ہے جو نماز کو غیر اور غیریت پر محمول کر کے دور از کار تصوّر کرتا ہے۔ اس تخیل کی بنیاد توحید وجودی کے مسئلہ پر ہے جس کے وہ لوگ قائل ہوتے ہیں جن کو وارفتہ اور مجذوب کہنا چاہیئے۔

حقیقتِ نماز سے ناواقفیت کے باعث ہی ایک گروہ نے سماع اور نغمہ کو اپنے اضطراب کے لئے ذریعۂ سکون قرار دیا، اور نغمہ کے پردوں میں اپنے مطلوب کا دیدار کرنا چاہا۔ لامحالہ رقص و رقاصی کو دیدار تصوّر کرنے لگے۔ حالانکہ انہوں نے سُنا ہوگا ماجعل اللہ فی الحرام شفاءً۔ خداوندِ عالم نے حرام میں شفا نہیں رکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مثال اُس ڈوبنے والے کی ہے جو تنکے کا سہارا تلاش کیا کرتا ہے۔ اگر ان حضرات پر حقیقتِ نماز کا ایک شمہ بھی منکشف ہوجاتا تو کبھی بھی سماع اور نغمہ کا نام نہ لیتے اور وجد و حال میں مشغول نہ ہوتے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

برادرِ من! نماز اور نغمہ میں جس قدر فرق ہے، اتنا ہی فرق ان کمالات میں بھی سمجھو جن کی بنیاد نغمہ یا نماز پر ہوتی ہے۔ "العاقل تکفیہ الاشارہ"۔ آج یہ کمالات پھر ایک ہزار سال کے بعد رونما ہو رہے ہیں، اور آخر اُمّت پھر اوّلین اُمّت کے رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس اُمّت کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

پہلے لوگ بھی بہتر اور پچھلے بھی۔ درمیان والوں کی نسبت کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ البتہ اس اُمّت کے پچھلے لوگوں میں اگرچہ نسبت بلند ہوگی مگر کم، بلکہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوگی۔ اور درمیان والوں کو اگرچہ اتنی بلند نسبت حاصل نہیں تھی، مگر کثرت بلکہ بہت زیادہ کثرت کے ساتھ حاصل تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ الاسلام بد غریبا و سیعود کما بد افطوبی للغرباء۔ (ترجمہ) اسلام کا آغاز اس حالت میں ہوا کہ وہ اجنبی تھا۔ اور دوبارہ اسی طرح اجنبی[1] ہو جائے گا۔ لہٰذا ایسے اجنبی لوگوں کے لئے مبارک باد۔

الف ثانی کا نظریہ اس اُمّت کے پچھلے حصّہ کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک ہزار سال بعد سے ہوگا (یعنی ۱۰۱۱ھ[2] سے)۔ وجہ یہ ہے کہ تغیرات اور تبدیلیوں کے سلسلہ میں ایک ہزار سال کو بہت[3] قوی دخل ہے۔ اور چونکہ یہ اُمّت نسخ و تبدیل سے محفوظ ہے تو لامحالہ وہی نسبت، وہی طراوت اور رونق جو ایک ہزار سال پہلے تھی ایک ہزار سال بعد

---

[1] غریب" پردیسی اور اجنبی کو کہتے ہیں اور اجنبی ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُس کے عامل اور واقف بہت کم تھے۔ چنانچہ پوری دنیا کے اربوں انسانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی مختصر سی جماعت روحِ اسلام کی حامل و تعلیمِ اسلام کی عالم و عامل تھی۔ یہی شان پھر ہو جائے گی۔ مطلب یہی رہا کہ اگرچہ آخر میں عام مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی مگر اسلام کی حقیقی رُوح کے عامل و حامل بہت کم ہوں گے۔ اور وہ اس بھیڑ میں ناجنس اور پردیسی سے معلوم ہوں گے۔ پس ایسے لوگوں کو مبارکباد جو اسلام کی خاطر نامانوس اور اجنبی بن جائیں، اور دنیاداروں کی نظروں سے گر جائیں۔ [2] سنہ ہجری کا آغاز ہجرت کے سال سے ہوتا ہے۔ اور ہجرت سے دس سال بعد گیارہویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی (واللہ اعلم)۔ [3] مکتوبات شریف میں اس حقیقت کو بار بار واضح کیا ہے کہ ایک ہزار سال پیشتر شانِ احمدی کا ظہور تھا اور ایک ہزار سال بعد شانِ محمدی کا ظہور رہا ہے، جو پہلے سے مقابلہ میں بہت زیادہ مکمّل ہے۔ اگرچہ دیگر انبیاء کے مقابلہ میں ہر ایک شان کامل اور مکمّل ہے۔ فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السّلام کی بشارت قرآن پاک میں احمد کے نام سے نقل کی گئی ہے یاتی من بعدی اسمہ احمد۔ کیونکہ ابتداءً اسی شان کا ظہور ہوا۔ یہ مضمون نہایت دقیق ہے اور بہت سے مکاتیب میں اس کو سمجھایا گیا ہے، اور پھر اپنے وجود کو شانِ محمدی کے ظہور کا پرتو قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جلوہ گر ہونے لگے گی۔ شریعت کی تائید اور ملت کی تجدید ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کی آمد اس کی دلیل ہے۔

فیضِ رُوح القدس از باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

برادرِ من! میری یہ باتیں بہت سے حضرات کو ناگوار ہوں گی۔ لیکن اگر انصاف سے کام لیں، ایک کا دوسرے کے عُلوم سے موازنہ کریں، عُلومِ شرعیہ کو معیار قرار دے کر حالات کی صحت و خرابی کا فیصلہ کریں۔ اور اس پر غور کریں کہ شریعتِ غرا نے نبوّت کی کس قدر تعظیم و توقیر کی ہے، اور ان دونوں نظریوں میں کونسا نظریہ کس اصول پر مرتب ہے، تو یہ ناگواری باقی نہ رہے گی۔

مَیں نے اپنے مکاتیب و رسائل میں بار بار لکھا ہے کہ ولایت سے نبوّت کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔

عام اولیاء کی ولایت تو درکنار خود نبی میں ولایت کی حیثیت سے نبوّت کی حیثیت افضل اور اعلیٰ ہوتی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ کمالاتِ ولایت کی نسبت کمالاتِ نبوّت کے مقابلہ میں وہ بھی نہیں جو ایک قطرہ کو بحرِ محیط سے ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے، جو میرے اُوپر منکشف ہوئی، جس کی تفسیر مَیں نے اپنے اس مکتوب میں کی ہے جو فرزندِ عزیز کے نام لکھا ہے (اگرچہ شیخ ابنِ عربی جیسے ماہرانِ طریقت اس مرحلہ پر آکر لغزش کھا گئے)۔ خداوندِ عالم کے فضل و انعام کو بیان کرنا، اس گفتگو سے میرا مقصود ہے، اپنی فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں۔ کیونکہ معرفتِ خدا، عزّ و جل بر آنکس حرام ست کہ خود را از کافر فرنگ[1] بہتر داند فکیف از اکابر دین۔ ابیات

ولے چوں شہ مرا برداشت از خاک | سزد گر بگذرانم سر ز افلاک
من آں خاکم کہ ابر نوبہاری | کند از لُطف بر من قطرہ باری

---

[1] کافر فرنگستان سے اسقدر نفرت جبکہ فرنگستان سے ہندوستان کو کوئی تعلق بھی نہ تھا۔

اگر بر روید از تنِ صد زبانم چو سوسن شکرِ لُطفش کے توانم

(مکتوب ۲۶۱ جلد اوّل ص۳۰۲ و ط۳۰۶)

تقلید و مناقب امامِ اعظمؒ | معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی صدیوں کے متعلق حضرت مجدد صاحب کی یہ رائے صرف سلسلۂ سلوک و طریقت کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو مجدد صاحب ہر زمانہ کے علماء اور فقہاء کا یکساں شکریہ ادا کرتے ہیں، اور اُن کے اقوال کو سند میں پیش کرتے ہیں۔

مجدد صاحب کو شکایت یہ ہے کہ طریقت جب کہ عین شریعت ہے تو ان درمیانی صدیوں کے مشائخ نے پابندیٔ شریعت کو ثانوی درجہ کیوں دیا۔

تعجب ہوگا کہ طریقت و حقیقت میں اس قدر بلند بالا درجہ رکھتے ہوئے حضرت مجدد صاحب کٹر حنفی ہیں۔ مکتوب ۳۱۲ جلد اوّل میں رفع سبابہ کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ما مقلداں را نمیرسد کہ بمقتضائے	ہم مقلدوں کو حق نہیں، کہ ظاہر
احادیث عمل نمودہ جرأت در	احادیث پر عمل کرتے ہوئے اشارہ
اشارت نمائیم (ط۴۲۹ مکتوب ۳۱۲)	کی جرأت کریں۔

(مکتوب ۵۵ جلد ۲ میں) ناسخ، منسوخ، اجتہادِ انبیاء اور اجتہادِ ائمہ مجتہدین پر مفصل اور عجیب و غریب بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف آوری کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ مطہرہ پر عمل کریں گے، وہ رسولؐ اللہ کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کریں گے۔ البتہ آپ کا اجتہاد اس قدر دقیق ہوگا کہ بہت سے علماء ظاہر اس کو اجتہاد نہ سمجھیں گے۔ حضرت روح اللہ کی مثال حضرت امام اعظم جیسی ہے۔

امام اعظم کوفیؒ کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی برکت اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال درجہ پابندی کے سبب سے اجتہاد اور استنباط میں وہ بلند مرتبہ

عنایت ہوا تھا کہ دوسرے علماء اس کے فہم و ادراک سے قاصر تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا فکرِ عمیق شریعتِ مطہرہ کا اصل منشاء معلوم کر کے سراسر اُس کی تفسیر کیا کرتا تھا۔ مگر دوسرے علماء اس کو ذاتی رائے سمجھ کر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اصحاب الرائے کہا کرتے تھے۔ صرف اس لئے کہ آپ کے علم و درایت اور فہم و فراست کی حقیقت تک اُن کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔

اُس دقیق و عمیق اور بلند و بالا علم و اجتہاد کے کرشمہ سے حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ واقف ہو گئے تھے۔ چنانچہ آپ کا مشہور مقولہ ہے:

الفقہاء کلھم عیال ابی حنیفہ۔	تمام فقہاء ابو حنیفہ کے پروردہ اور وظیفہ خوار ہیں۔

افسوس! کوتاہ بیں اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں۔

قاصرے گر کند ایں قافلہ لا الطعن قصور
حاش للہ کہ بر آرم بزبان ایں گلہ را
ہمہ شیران جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند
رو بہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

خواجہ محمد پارسا "فصول ستہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نزول کے بعد حضرت امام اعظمؒ کے فقہ پر عمل کریں گے۔

غالباً اس کا منشا یہی ہے کہ اس انتہائی مناسبت کے باعث جو حضرت امام کے علم و فکر کو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا اجتہاد حضرت امام اعظم کے موافق ہوا کرے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک نبی کے لئے کب جائز ہے کہ ایک اُمّتی کی تقلید کرے۔

تکلّف اور مبالغہ کی آمیزش سے ہر طرح پاک اور بلند ہو کر عرض کرتا ہوں، کہ نظرِ کشف میں مذہب حنفی کی نُورانیت دریا عظیم کی طرح ہے! اور دیگر ائمہ کے مذاہب

حوضوں اور نالیوں کی طرح ہیں۔

مشاہدہ میں بھی ایسا ہی ہے کہ اہلِ اسلام کا سوادِ اعظم امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہے۔ ایک نہایت ہی عجیب معاملہ ہے کہ تقلیدِ سنّت اور اتباعِ اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں امامِ اعظمؒ کا قدم سب سے آگے ہے۔ حتّٰی کہ مرسل احادیث کو بھی مسند احادیث کی طرح قابلِ استدلال قرار دے کر اپنی رائے پر اس کو مقدم سمجھتے ہیں، اور اسی طرح قربِ صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال کو اپنی رائے سے مقدم مانتے ہیں مگر اس کے باوجود مخالفانِ امام، امام صاحب کو اہل الرائے کہتے ہیں (یعنی اپنی رائے کو مقدم جاننے والے)۔ اور دوسرے مجتہدین، احادیث مرسلہ کو قابلِ استدلال ہی نہیں سمجھتے مگر پھر بھی مخالفین اُن کو "اہلِ حدیث" یا "محدّث" کہتے ہیں۔

مخالفینِ امام، امام کے تقویٰ اور کمالِ علم کے معترف بھی ہیں، اور پھر بھی گستاخانہ کلمات سے امام کو یاد کر کے سوادِ اعظم کے دل کو دکھاتے ہیں۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ۔	چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں۔

جو لوگ اکابر دین کو اصحاب رائے کہتے ہیں۔ اگر مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نصوصِ شرع کو نظر انداز کر کے اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے تو (افترار اور بہتان کے علاوہ) یہ بھی لازم آتا ہے کہ اہلِ اسلام کا سوادِ اعظم گمراہ اور مبتدع ہو بلکہ جرگہ اہل اسلام سے خارج ہو۔ کوئی جاہل یا زندیق ہی اس قسم کا عقیدہ رکھ سکتا ہے جو دین کے ایک بڑے حصہ کو برباد کرنا چاہے۔ یہ لوگ چند حدیثیں یاد کر کے سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام انہیں میں منحصر ہیں۔ جو ان کو معلوم نہیں وہ گویا موجود ہی نہیں۔ ان تعصب پرستوں کے تعصب پر، اور اُن کی نظر کوتاہ پر افسوس صد افسوس۔ بانی فقہ ابو حنیفہؒ ہیں، اور تسلیم ہے کہ فقہ کے تین حصہ امام اعظم کے لئے مخصوص ہیں اور ایک چوتھائی میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ،

امام احمد وغیرہ جملہ ائمہ شریک ہیں۔

سلسلۂ فقہ میں امام ابوحنیفہ گویا صاحب خانہ ہیں اور دیگر ائمہ عیال۔ باوجودیکہ مَیں اسی مذہب کا پابند ہوں مگر حضرت امام شافعیؒ سے گویا مجھے ذاتی محبت ہے۔ مَیں اُن کو بزرگ جانتا ہوں اور بعض نفلی اعمال میں اُن کے مذہب کی تقلید کرلیتا ہوں مگر اس کا کیا علاج کہ کثرتِ علم وکمال کے باوجود دوسرے حضرات امامِ اعظمؒ کے مقابلہ میں طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ والامر الی اللہ (ص۱۰۷ وص۱۰۸ جلد۲ مکتوب ۵۵)۔

مولود شریف | مکتوب ۷۲ جلد دوم بنام خواجہ حسام الدین میں تحریر فرماتے ہیں:

مولود خوانی کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "اچھی آواز کے ساتھ قرآن شریف، نعتیہ قصائد اور مناقب وفضائل کے پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے"۔

"حرفوں کا بدلنا، اس طرح گانا یا پڑھنا جس سے حروف میں تبدیلی ہو جائے نیز نغمہ کے طرز پر زیر وبم، آواز کا اُتار چڑھاؤ وغیرہ بیشک ممنوع ہے، یہ شعر میں بھی جائز نہیں۔ لیکن اگر یہ قباحتیں نہ ہوں تو کیا خرابی ہے"؟

حضرت مجدّد صاحب جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مخدوما[1]! فقیر کا دل تو یہی کہتا ہے کہ ہرگز یہ سلسلہ نہ قائم کریں۔ بوالہوس جائز کو بھی ناجائز کرا دیتے ہیں۔ اگر اجازت کچھ بھی مل جائے، نتیجہ میں بہت کچھ ہو جائیگی۔ (مکتوب ۷۲، ص۱۱۶ جلد۳)۔

کفر شیعہ | کافر کی صحبت سے بدعتی کی صحبت کا فساد بہت بڑھا ہوا ہے تمام بدعتیوں میں سب سے بدتر بدعتی وہ جماعت ہے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض رکھے۔ خداوندِ عالم قرآن پاک میں خود اُن کو کافر فرماتے ہیں۔ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ (مکتوب ۵۵ جلد۱ ص۷۱)۔

---

[1] مخدوما! بخاطر فقیرمے رسد ایں، باب مطلق نہ کنند، بوالہوساں ممنوع را میکروند۔ اگر اندک تجویز کروند بر بسیار خواہد شد۔ قلیلہ یفضی الی کثیرہ قول مشہورست (مکتوب ۷۲ جلد۱)

مدحِ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب فتنے ظاہر ہوں بدعتیں پھیل جائیں اور میرے اصحاب کو بُرا کہا تو عالِم پر لازم ہے کہ اپنے علم پر غور کرے اس کے بموجب عمل کرے۔ جو ایسا نہ کرے اُس پر خدا کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت نہ اُس کے فرض قبول ہوں گے نہ نفل۔ (صـ ۲۷۵ جلد ا مکتوب ۲۵۱)

شہر سامانہ کے سادات، قاضی صاحبان اور عمائدین کرام کو لکھتے ہیں:

معلوم ہوا ہے کہ آپ کے یہاں خطیبِ شہر نے عید قربان میں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر مبارک چھوڑ دیا ہے۔ جب کچھ لوگوں نے امام صاحب کو توجہ دلائی تو بجائے اس کے کہ فراموشی وغیرہ کا کوئی عذر کرتا، نہایت سختی اور متمردانہ انداز میں جواب دیا اور کہا کہ اگر خلفاء راشدین کے نام نہیں لئے گئے تو کیا ہوا نیز معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے حضرات نے بھی اس معاملہ میں چشم پوشی اور نرمی اختیار کی ہے، سختی کے ساتھ اس خطیب بے انصاف سے باز پرس نہیں کی۔ وائے نہ یکبار کہ صدبار وائے"

خلفاء راشدین کا ذکر اگرچہ شرائط خطبہ میں داخل نہیں، مگر اہل سُنّت والجماعت کا شعار ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ سعیہم۔

خطبہ میں خلفاء راشدین کا ذکر مبارک قصداً صرف وہی شخص چھوڑ سکتا ہے جس کا دل مریض ہو اور باطن خبیث ہو۔ مان لو، اس خطیب نے تعصب اور عناد سے ذکر مبارک نہیں چھوڑا، تاہم چھوڑنے والوں کے ساتھ مشابہت تو ہوئی۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کا کیا جواب ہوگا۔ نیز ارشاد ہوا ہے اتقوا مواضع التھم، تہمت کے مواقع سے بچو۔ تو اس صورت میں موقع تہمت سے کس طرح یہ خطیب نجات پا سکتا ہے۔

اگر اس خطیب کو حضرات شیخین رضوان اللہ علیہم کی افضلیت میں توقف ہے تو طریقہ اہل سُنّت کا تارک ہے۔ اور اگر حضرات شیخین کی محبّت میں تردد ہے، تب بھی اہلِ حق سے خارج۔ اور چونکہ یہ بے حقیقت خطیب کشمیری ہے تو بعید نہیں کہ

کشمیر کے بدعتیوں سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

اس کو معقول کرنا چاہیئے کہ جیسا کہ اکابر ائمہ نے نقل فرمایا ہے۔ حضرات شیخین کی افضلیت اجماعِ اُمّت سے ثابت ہے۔

اس کے بعد حضرت امام شافعی، امام ابوالحسن اشعری، حضرت علی کرم اللہ وجہہ ذہبی، بخاری وغیرہ سے نقول پیش فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :

اس بے انصاف خطیب سے کہنا چاہیئے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبّت کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، اور اُن کے بغض و ایذاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور حضرات شیخین رضوان اللہ علیہما اکابر صحابہ میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں۔ لامحالہ محبّت و مودّت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوئے حضرت حق جل مجدہ ارشاد[1] فرماتے ہیں۔ "آپ کہہ دیجیے کہ اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ محبّت کا مطالبہ تو مَیں کرتا ہوں، اس کے علاوہ اپنی تبلیغ و رہنمائی پر کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد[2] فرمایا :

میرے اصحاب اور دوستوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ میرے بعد اُن کو نشانہ مت بنا لینا۔ جو اُن سے محبّت کرتا ہے، درحقیقت اس کو مجھ سے محبّت ہے جس کے باعث اُن سے محبّت کرتا ہے۔ اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے، درحقیقت اس کو مجھ سے بغض ہے جس کے سبب اُن سے بغض رکھتا ہے۔ جو اُن کو تکلیف دیتا ہے وہ درحقیقت مجھے تکلیف دیتا ہے، اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے وہ خدا کو تکلیف دیتا ہے، اور جو خدا کو تکلیف دے لامحالہ خداوندِ عالم اُس کو پکڑ لے گا۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ابتداءِ اسلام سے اس وقت تک ہندوستان میں اس قسم کا

---

[1] قل لا اسئلکم علیه اجرًا الا المودة فی القربیٰ۔ [2] اللہ اللہ فی اصحابی (الحدیث)

گُل کِھلا ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اس معاملہ سے تمام شہر متہم ہو جائے، بلکہ پورے ہندوستان سے اعتماد اُٹھ جائے۔ سلطانِ وقت سُنّی اور حنفی المذہب ہے۔ اس کے زمانہ میں اس قسم کی بدعت درحقیقت بہت بڑی جرارت ہے بلکہ درحقیقت سلطانِ وقت سے منازعت اور اولی الامر کی اطاعت سے بغاوت ہے۔

(چند سطر بعد)

اس خبر وحشت انگیز نے میرے اندر جوش پیدا کر دیا۔ میری رگِ فاروقی پھڑکنے لگی۔ چنانچہ یہ چند جملے لکھ دیئے ہیں۔ (مکتوب ۱۵ جلد ۲ صـ۲۸ و ۲۹)۔

اقتدارِ شیعہ | اس زمانہ میں اس بد اندیش جماعت نے بہت زیادہ غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اطراف و جوانب میں پھیل پڑی ہے۔ (مکتوب ۵۴ صـ۷۲ جلد اول)

مکتوبات شریف کا بیشتر حصہ صحابۂ کرام کے فضائل، مشاجراتِ صحابہ کے متعلق عجیب و غریب مباحث اور اعتراضاتِ روافض کی محققانہ ردّ و قدح سے پُر ہے۔ ہر ایک مکتوب شریف کا مطالبہ ہے کہ "شاندار ماضی" کے لئے اُس کو منتخب کیا جائے۔

زفرق تا بقدم ھر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجا ست

مگر تنگیٔ اوراق اس سے زائد کی اجازت نہیں دیتا۔

ذبیحہ گاؤ | مکتوب ۸۱ جلد اوّل بنام لالہ بیگ میں ضمناً تحریر ہے:

ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعارِ اسلام ست کفار بجزیہ دادن شاید راضی شوند اما بتذبیح بقرہ ہرگز راضی نخواہند شد۔ (صـ۱۰۲ جلد اوّل)	ہندوستان میں ذبیحہ گاؤ اسلام کا ایک بہت بڑا شعار ہے۔ بہت ممکن ہے، کفار ہند جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں، مگر گائے ذبح کرانے پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتے۔

مشرق و مغرب کی بعید ترین مسافت اور ہمّتِ مجدّدانہ

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کے مطالعہ کی آپ زحمت برداشت کر چکے۔ اکبر کی کہانی سُنی۔ دینِ الٰہی کی تصویر دیکھی۔ جہانگیر کی مجذوبانہ مذہبیت سامنے آئی۔ جہانگیر کے دامنِ رجحان و جذبات پر اکبری ماحول اور نورجہاں کی فسوں کاریوں کے دھبّے بھی ملاحظہ سے گذرے اس طویل سرگذشت اور روئداد کے بعد حضرتِ مجدّد صاحب کے پاکیزہ نظریات اور کتاب اللہ و سُنّت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقدس سانچوں میں ڈھلے ہوئے آپ کے ارشادات سے بھی آپ فیض یاب ہوئے۔

اس تفصیل و تطویل کا مقصد یہ تھا کہ مسافت کی ابتداء اور انتہا کا اندازہ ہوسکے۔

ایک طرف ملحدانہ تصوّرات و جذبات کی اندھیریاں ہیں، دوسری جانب حضرت مجدّد صاحب کے جذبات و تصوّرات کے مقدس انوار۔ ان دونوں میں اتنا ہی بُعد ہے جتنا مغرب اور مشرق میں۔ بُعدِ مسافت کے علاوہ ایک طرف فقر و فاقہ، بے چارگی اور بے مائگی ہے اور دوسری جانب شاہنشاہانہ شان و شوکت اور بے پناہ عظمت و اقتدار، یہ ایسا نشیب و فراز ہے جس نے نہ صرف منزل کو بعید سے بعید تر کر دیا ہے بلکہ اتنا پُرخطر بنا دیا ہے کہ ایک قدم پر اس ہمّتِ مردانہ اور جذبۂ والیانہ کی ضرورت ہے جو نہنگِ اجل کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرسکے اور ہنستے کھیلتے موت کی گھاٹی پھاند سکے۔ بیشک یہ بھی ایک خدمت تھی کہ نمائشی درویشوں اور علماء سوء کے مقابلہ میں اصلاحی محاذ قائم کیا جاتا۔ اس پر بھی حامئ سُنّت، قامعِ بدعت، مجاہدِ ملّت جیسے القاب حاصل ہوسکتے تھے۔ مگر جب نظریہ یہ ہو:

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے۔ اگر دل ٹھیک ہے

بدن ٹھیک - اور اگر دل بگڑا ہوا ہے تو سارا بدن بگڑا ہوا - لہٰذا بادشاہ کی درستی میں سارے عالم کی درستی ہے، اور اُس کی خرابی میں سارے عالم کی خرابی ہے[1]" (مکتوب ۴۷ جلد ۱ ص۶۵)۔

اس نظریہ کے ساتھ ہمتِ عالی یہ ہے:

"ایک بہت بڑا کارخانہ میرے حوالہ فرمایا گیا ہے - پیری مریدی کے واسطے مجھ کو نہیں پیدا کیا گیا - تکمیل و ارشاد میری پیدائش کا مقصود نہیں - ایک دوسرا ہی معاملہ ہے اور دوسرا کارخانہ ہے جو میرے سپرد ہوا ہے - اس ضمن میں جو کوئی مناسبت رکھے گا، فیض پالے گا - ورنہ نہیں اس کارخانۂ عظیم کے مقابلہ پر تکمیل و ارشاد ایسا ہے، جیسے راستہ کی گری پڑی چیز"۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت اُن کے باطنی معاملات کی بہ نسبت یہی حکم رکھتی ہے۔

ہر چند منصبِ نبوت ختم ہو گیا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کے کامل متبعین کو وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے نبوت کے کمالات و خصائص میں سے حصہ مل جایا کرتا ہے"۔ (مکتوب ۶ ص۱۸ جلد دوم)

اس کارخانۂ عظیم کے ایک حصہ کی توضیح اس ارشاد سے ہوتی ہے - حضرت خواجہ احرار قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے:

"اگر میں پیر بنوں تو دنیا میں کسی پیر کو مرید نہ ملیں - لیکن ایک دوسرے

---

[1] بادشاہ نسبت بعالم در رنگ دل ست نسبت ببدن - اگر دل صالح ست بدن صالح ست - و اگر دل فاسد است بدن فاسد - بصلاح بادشاہ صلاح عالم ست و بفساد او فساد عالم (ص۴۷ جلد اوّل ص۶۵ نیز مکتوب ص۶۷ جلد دوم ص۱۳۵ وغیرہ میں یہی مضمون الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ تحریر فرمایا گیا ہے ۱۲

کام کا مجھے حکم دیا گیا ہے یعنی ترویج شریعت اور تائیدِ ملّت - چنانچہ حضرت موصوف بادشاہوں کی مجالس میں جاتے تھے اور اپنے تصرف سے اُن کو مطیع فرماتے اور ان کے ذریعہ سے شریعت کی ترویج کرتے تھے۔"

(مکتوب ۶۶ جلد اوّل صـ۸۳) -

بہر حال جب نظر اُس پر ہو جو عالمِ ظاہری کے نظام میں قلب کی حیثیت رکھتا ہے جس کو شاہنشاہ، گیتی پناہ، جہاں گیر و جہاں دار کہا جاتا ہے تو صرف خانقاہوں کی اصلاح اور علماء سُوء سے مجادلہ اور مناظرہ پر قناعت کس طرح ہو سکتی تھی - اُس ہُمائے بلند پرواز کے لئے تو بہت ہی بلند آشیانہ کی ضرورت تھی - یہی تھی کوہ استقلال استقامت کی وہ چوٹی جس پر مجددیت کی تعمیر ہوئی -

ترتیبِ عمل اور طریقِ کار

پہلے تحریر ہو چکا ہے کہ سترہ ۱۷ سال کی عمر میں آپ علومِ ظاہری سے فارغ ہو کر والد ماجد سے سلسلہ چشتیہ میں نسبت بھی حاصل کر چکے تھے۔

تحصیلِ علم کے بعد آپ آگرہ تشریف لے گئے - اور بسلسلۂ درس و تدریس چند سال آگرہ میں قیام کیا - وہاں آپ کے حلقۂ درس نے بہت جلد اتنی شہرت پالی کہ ابوالفضل اور فیضی جیسے اپنے زمانہ کے مشہور اور خود پسند ماہرین منطق و فلسفہ بھی آپکی زیارت کے مشتاق ہوئے۔

اس دورانِ قیام میں ردِّ شیعہ کا سلسلہ بھی جاری رہا - رسالہ تہلیلیہ وغیرہ اسی دوران میں تحریر فرمایا - یہ بتانا مشکل ہے کہ ملاقات میں پیش قدمی کس طرف سے ہوئی - ہاں اتنا معلوم ہے کہ ابوالفضل اور فیضی سے تعلّقات قائم ہو گئے جو اکبری فتنہ کے ہیرو تھے۔

ابوالفضل منطق اور فلسفہ کا عاشق تھا - ایک مرتبہ فلاسفہ کی تعریف اس طرح

کی کہ علماء ملت کی اس سے توہین ہوتی تھی۔ مجدّد صاحب سے برداشت نہ ہو سکا، اور فرمایا۔ امام غزالی جو ابتداء میں اعلیٰ درجہ کے منطقی اور فلسفی تھے، اپنے رسالہ "المنقذ من الضلال" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حکماء اور اطباء کے جملہ علوم انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات سے سرقہ کئے گئے ہیں۔"

جواب میں سنجیدہ تردید کے بجائے ابوالفضل برہم ہوگیا اور اُس نے امام غزالی کو سخت و سُست کہنا شروع کر دیا۔ حضرت مجدّد صاحب خفا ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرما دیا۔" اگر اہلِ علم کی صحبت کا ذوق رکھتے ہو تو علماء کی توہین سے زبان روکو۔" مجدّد صاحب اس وقت تو چلے آئے مگر بعد میں ابوالفضل نے معذرت کی، اور سلسلۂ ملاقات پھر جاری ہوگیا۔[1]

یہی زمانہ تھا جبکہ فیضی اپنی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" لکھ رہا تھا۔ مشہور ہے کہ اس تفسیر میں حضرت کی امداد بھی شریک تھی۔

ان ہی دنوں کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ عید کے چاند میں اختلاف ہو رہا تھا شرعی ثبوت سے پہلے ہی اکبر نے عید کا اعلان کر کے لوگوں کے روزے تڑوا دیئے۔ اتّفاق ایسا ہُوا کہ مجدّد صاحب اسی روز ابوالفضل سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ ابوالفضل کو معلوم ہُوا کہ حضرت روزے سے ہیں، اُس نے وجہ دریافت کی۔ مجدّد صاحب نے فرمایا۔ چاند کے متعلق اب تک شرعی شہادت مہیّا نہیں ہوئی ہے ابوالفضل نے کہا۔ "بادشاہ نے خود چاند دیکھا ہے"۔

مجدّد صاحب نے بے ساختہ فرما دیا۔

بادشاہ بے دین ست اعتبارے ندارد۔	بادشاہ بے دین ہے، اس کا اعتبار نہیں۔

ابوالفضل خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی اُس نے پانی کا پیالہ اُٹھا کر آپ کے

---

[1] مقامات امام ربّانی وغیرہ۔

منہ سے لگا دیا لیکن آپ نے ہاتھ جھٹک دیا، اور اُسی وقت غصہ میں قیامگاہ پر تشریف لے آئے اور کہلا بھیجا کہ اہلِ علم سے ملاقات کے لئے احترام شرط ہے۔ ابوالفضل کو ندامت ہوئی اور عذر و معذرت کے بعد سلسلۂ ملاقات جاری ہو گیا۔

بہرحال یہ کہنا تو دشوار ہے کہ حضرت مجدّد صاحب اس وقت اسی نظریۂ اصلاح کے لئے تشریف لے گئے تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ آگرہ کے اس قیام سے آپ کو اُن تمام سرچشموں کا علم ہو گیا جن سے اکبری فتنہ کی نہریں نکل رہی تھیں۔

یہ ممکن تھا کہ آپ ابتداء ہی سے انقلابِ سلطنت کی صورتیں سوچتے، اور کامیابی کی جدّوجہد کرتے۔ مگر آپ کو اپنے لئے سلطنت مطلوب نہ تھی، دوسرے کو سلطان بنانے میں وہی دشواری درپیش ہوتی۔ اس لئے انقلابِ سلطنت کی بجائے نظریاتِ سلطنت کی تبدیلی کو آپ نے زیادہ مفید تصوّر کیا، اور درحقیقت گورنمنٹ یا حکومت سے حقیقی تصادم یہی تھا۔

لیکن اس کے لئے بادشاہ کی اصلاح سے پیشتر کارکنانِ حکومت کی اصلاح ضروری تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ بادشاہ اور اراکینِ دولت، ذاتی اغراض کے سوا کوئی نصب العین نہیں رکھتے تھے۔ اور چونکہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے عوام کی دلجوئی ضروری سمجھتے تھے، اس لئے عامۃ النّاس کے جذبات اور خیالات کے احترام میں اپنے مذہب تک کو قربان کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اکبر کی پچاس سالہ زندگی اس کی شاہد ہے۔

اور اکبر کیا، اکبر سے بہت پہلے ملک گیری کا مقصد صرف شخصی اقتدار قرار دے دیا گیا تھا۔ ورنہ ایک مذہب، ایک قوم کے افراد میں آپس میں جنگ کرنے کے کیا معنی؟

بابر نے مغل اور افغان کا سوال پیدا کر دیا اور اُس کے قابل پوتے اکبر نے اس نظریہ کا اور اضافہ کر دیا کہ مشترک بادشاہ کا مذہب بھی مشترک ہی ہونا چاہیئے۔ عوام نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ جس کا کھاؤ اُس کا گاؤ، ہندو ہو یا مسلمان، مغل ہو یا افغان۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا سیاسی عقیدہ جب یہ تھا، کہ "السلطان کالروح"۔ سلطان جان ہے تو لازمی تھا کہ اصلاحِ روح کے ساتھ بدن اور اعضاء بدن کی نگہداشت کا لحاظ بھی فرماتے۔ تاکہ قلب کی بڑھتی ہوئی قوت کو اعضاء برداشت کر سکیں۔ ہمیشہ مفرحات اور مقویات سے علاج نہیں ہوا کرتا بلکہ مفرحات کے استعمال سے پیشتر جسدی مرض کا ازالہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں سینکڑوں مثالیں ہیں کہ بادشاہ کی اصلاح پسندی سے خود غرض اراکینِ دولت میں برہمی پیدا ہوئی، اور تھوڑے دنوں میں وہ بادشاہت ہی ختم کر دی گئی۔

کم از کم حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی تاریخ سب کے سامنے ہے۔ آپ بنفسِ نفیس خلیفہ راشد تھے۔ چونکہ تابعین کا دور تھا۔ آپ کی اصلاح کارگر ہوئی۔ ملکِ عضوض فوراً ہی خلافتِ راشدہ بن گیا۔ مگر پھر کیا ہوا؟

صرف ڈھائی سال بعد ہی اغراض پرستوں کی فریب کاریوں نے سمِ قاتل سے خلیفہ راشد کی مخلصانہ خدمت انجام دی۔ شام ہوئی تھی تو خلافتِ راشدہ کا چاند روشن تھا۔ صبح ہوئی تو آفتابِ خلافت ایسا غروب ہوا کہ آج تک دوبارہ طلوع ہونے کی نوبت نہ آئی۔

چنانچہ حضرت مجدد صاحب کے طریقِ کار کی ترتیب اس طرح تھی:

الف: غیر سرکاری سنجیدہ طبقہ کی اصلاح۔

ب: ارکانِ دولت کی اصلاح۔

ج: بادشاہ کی اصلاح۔

اس وقت ملک کے سامنے غلامی اور آزادی یا ملکی اور غیر ملکی اقتدار کا سوال نہیں تھا۔ بادشاہ ہندوستانی تھا۔ ہندوستان کسی ملک کا باج گذار نہ تھا ہر ایک ہندوستانی خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ خود مختار پنچایتی نظام، ہر ایک ہندوستانی کے شخصی حقوق شخصی عزت اور حریت کا ذمہ دار تھا۔

لہٰذا مذہبی نقطۂ نظر نیز مسلم حکومت کے بقاء و تحفّظ کے پیش نظر اصلاح کے معنی صرف یہ تھے کہ عوام النّاس، اراکینِ دولت اور خود سلاطین طے کرلیں کہ انفرادی طور پر اتّباعِ سُنّت اور اجتماعی طور پر ترویجِ شریعت، اُن کی زندگی کا نصب العین اور اُن کی تمام اجتماعی اور انفرادی جدّ و جہد کا محور ہے۔

آگرہ سے واپسی کے بعد سرہند شریف میں قیام رہا۔ والد ماجد حیات تھے۔ اُن کی زیر سرپرستی درس و تدریس، تلقین وارشاد کا سلسلہ جاری کردیا۔ ۱۰۰۷ھ میں والد صاحب کی وفات ہوگئی۔

اسی سال یا ۱۰۰۸ھ میں جب کہ عمر شریف تقریباً ۳۷ سال تھی۔ آپ نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ سامان کچھ بھی نہیں تھا محض درویشانہ توکّل اور اعتماد علی اللہ سامان ورشانہ تھا، عازمِ سفرِ حج ہو کر آپ دہلی تشریف لائے۔

دہلی میں حضرت مولانا حسن کشمیری حضرت مجدّد صاحب کے پُرانے مخلص تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہ کا ذکرِ خیر حضرت مجدّد صاحب کے سامنے کیا، اور حضرت خواجہ کی زیارت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ برفاقتِ مولانا موصوف حضرت مجدّد صاحب حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس طرف شیخِ کامل، اس طرف جوہرِ نفیس، لامحالہ پہلی ملاقات ہی میں خاص تعلق پیدا ہوگیا ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اگرچہ حضرت خواجہ سلسلۂ ارادت کے شوقین نہ تھے لیکن حضرت مجدّد صاحب کے جوہرِ نفیس نے مجدّد صاحب کی طرح حضرت خواجہ کے دل میں بھی گداز پیدا کردیا۔

حضرت مجدّد صاحب نے روانگیٔ سفر کی اجازت مانگی تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ ابھی آئے ہو، چند روز فقراء کی خدمت میں بھی رہو۔ چند روزہ قیام نے حضرت مجدّد صاحب کو حضرت خواجہ کے حالات و خصائل کے مطالعہ کا مزید موقعہ دے دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت مجدّد صاحب نے بیعت کی درخواست کی، اور چند

ہفتوں ہی میں سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ کامل بن گئے (جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے)۔

سلسلۂ نقشبندیہ کا مدار وجد و حال پر نہیں بلکہ اتّباعِ سُنّت پر ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سفرِ حج کے عزم پر نظرِ ثانی ضروری تھی۔ شریعتِ مطہرہ اس وقت حج کو فرض قرار دیتی ہے جبکہ سامانِ سفر و نفقۂ اہل و عیال فراہم ہو اور راستہ بھی محفوظ ہو۔ اس کے بغیر وجد و حال کی بنا پر حج کرنا والہانہ عمل تو ہوگا مگر شریعتِ غرّا میں ایک نفل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گا اور پھر اگر نفقۂ اہل و عیال کا فرض بھی ترک ہو، یا سوال جیسا کوئی مکروہ یا حرام فعل کرنا پڑے، تو یہ نفلیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت مجدّد صاحب جیسے بلند حوصلہ عالم کے لئے یہ سوال بھی ہو سکتا تھا کہ محض شوق یا وجد کی بنا پر یہ سفر بہتر ہے یا ہندوستان میں رہ کر تبلیغ و اصلاح کی وہ عظیم الشان خدمت جو وارثانِ انبیاء کا منصبی فرض ہے، وہ بہتر ہے۔ بظاہر اس قسم کے سوالات نے حضرت مجدّد صاحب کو اس[1] ارادہ سے باز رکھا۔ اور

[1] کوئی مستحسن فعل خواہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ معلوم ہوتا ہو، لیکن اگر اس کے لئے کسی فرض کو چھوڑا جا رہا ہے تو شکر اور وجد و حال کے پیشِ نظر ممکن ہے اُس کو معاف رکھا جائے مگر شریعتِ غرّاء کے اصول کے بموجب وہ اتّباعِ نفس اور ہوا پرستی ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص جماعت چھوڑ کر گھر میں اس لئے نماز پڑھتا ہے کہ اس کا دل تنہائی میں زیادہ لگتا ہے تو اس کو وسوسہ شیطانی اور نفس پرستی کہا جائے گا۔ اس موقعہ پر اس مستحسن اور دل پسند چیز کا ترک ہی نفس کُشی اور تقویٰ اور ریاضت ہوگا۔ بظاہر یہی نکتہ ہے جو فسخِ ارادہ کا سبب بنا۔ البتہ اس موقعہ پر ایک خاص روایت کا پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا جو حالاتِ مشائخِ نقشبندیہ سے نقل کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت کو زیارتِ بیت اللہ کا شوق حد سے زیادہ ہوا۔ ایک روز اسی بیقراری میں آپ نے دیکھا کہ تمام جنّات انسان نماز پڑھ رہے ہیں، اور سجدہ حضرت کی جانب کر رہے ہیں۔ حضرت اس معاملہ سے بہت زیادہ متحیر ہوئے اور کشف کے طور پر (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اب آپ تکمیل طریقہ اور پھر تلقین و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ مکاتیب شریف میں از اوّل تا آخر سلسلۂ نقشبندیہ کی تعریف و ترغیب اور صرف اسی طریقہ کی تلقین ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ سلسلۂ مکاتیب طریقۂ نقشبندیہ کی تکمیل کے بعد شروع ہوا۔

ارادوں کی تکمیل قدرت کا عام قانون ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست"۔

آسمانِ تاریخ پر جو چاند تارے بن کر چمکتے ہیں، قدرتی طور پر اُن کے فکر بلند ارادے عظیم الشان ہوتے ہیں۔ اُسی کے بموجب اُن کو توفیقِ الٰہی حاصل ہوتی ہے سے

ہمّت بلند دار کہ پیشِ خدا و خلق
باشد بقدر ہمّتِ تُو اعتبارِ تو

قدرت اپنے دستور کے بموجب جب بلند ارادوں کی تکمیل کرتی ہے، تو نظرِ عوام میں وہ بالکل عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور اس کو امدادِ غیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصلاحِ سلطنت بلند ترین نظریہ ہے۔ اسلامی اصول کے بموجب اصلاحِ سلطنت اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے، اور اس بلند نظریہ کے حامل کو جسقدر توفیقِ الٰہی ہو، وہ کم ہے۔ من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہی۔ معلوم ہوا کہ کعبہ معظمہ آپ کی ملاقات کے واسطے آیا ہے اور اُس نے آپ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا جو شخص کعبہ کو سجدہ کرتا ہے وہ آپکی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں الہام ہوا کہ تُو ہمیشہ زیارتِ کعبہ کا مشتاق رہتا تھا، لہٰذا ہم نے کعبہ کو تیری زیارت کے لئے بھیج دیا۔ بہرحال یہ برکت ہے اسی ایثار اور قربانی کی کہ اصولِ شریعت کے بموجب فرض و مستحب کا فرق قائم کر کے منشاء شریعت کی اتباع کی گئی۔ سچ ہے جس نے خود کو خداوندی مرضیات پر قربان کر دیا، ساری خدائی اُس کا احترام کرتی ہے۔ من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ وقال اللّٰہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

حضرتِ مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے جب اس عظیم الشان مقصد کے لئے جدّ و جہد شروع کی تو کامیابی اُن کے ہم رکاب تھی۔

الف : غیر سرکاری سنجیدہ طبقہ کی اصلاح۔ ب : ارکانِ دولت کی اصلاح،

اس عظیم الشان مقصد کی پہلی اور دوسری کڑی تھی۔

غیر سرکاری طبقہ کی ہمنوائی اور تنظیم | نمبر الف میں کامیابی کا اندازہ ــــ

(۱) حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے، جو جہانگیر بادشاہ کی تخت نشینی کے فوراً بعد شیخ فرید کے نام تحریر ہوا ہے۔

آج کہ دولتِ اسلام کے مانع کے زوال اور بادشاہِ اسلام کے جلوس کی بشارت خواص و عوام کے کانوں تک پہنچی۔ اہلِ اسلام نے اپنے اُوپر لازم قرار دے لیا ہے کہ بادشاہ کے ممد و معاون ہوں، اور ترویجِ شریعت اور تقویتِ ملت کیلئے رہنمائی کریں۔ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسّر ہو خواہ ہاتھ سے (مکتوب ۴۷ ج ۱ ص ۶۵)

معلوم ہوتا ہے کہ خواص و عوام کی بے شمار جماعت آپ کے ساتھ ہے جو انقلاب یا اصلاحِ حکومت کے لئے بے چین ہے۔ آپ جنگ و جدال کے فتنہ کو دبا کر چاہ رہے ہیں کہ ارکانِ دولت اور مشیرانِ خصوصی کے ذریعہ سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔

مذکورہ بالا شیخ فرید ایک رکنِ دولت ہیں۔ جو اکبر کے زمانہ میں میر بخشی تھے۔ تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جن پر انعام و اکرام کیا۔ اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے :

"شیخ فرید بخاری[۱] جو میرے والد کی خدمت میں میر بخشی تھے، مَیں نے

---

[۱] اکبر کے مرضِ وفات میں سب سے پہلے جہانگیر کی ملازمت اختیار کی اور پھر تخت نشینی کی جدوجہد میں جہانگیر کے بازوئے راست رہے اور ملازمت میں پیش دستی کے سبب سے ان کو "صاحب السیف والقلم" کا خطاب شمشیر مرصع، خلعت و دوات و قلم مرصع اور ایک لاکھ روپیہ عطا ہوا۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۸۵ ج ۶)

اُن کو خلعت، شمشیرِ مرصع، دوات وقلم مرصّع مرحمت فرما کر اُسی خدمت پر بحال رکھا۔ اور اُن کی سربلندی کے لئے ما بدولت نے فرمایا کہ مابدولت تم کو "صاحب السیف و القلم" جانتے ہیں"۔ (توزک ص۷)

جلوس س۲ھ میں جب جہانگیر کا بڑا لڑکا خسرو باغی ہو گیا۔ جس کے تعاقب میں بنفسِ نفیس جہانگیر کو اس قدر جدّو جہد کرنا پڑی، کہ رات سے دوپہر تک برابر دوڑتا رہا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ افیون اور شراب جو بطور طلب استعمال کیا کرتا تھا، دوپہر تک اس کا خیال بھی نہ آیا۔ اس یلغار میں شیخ فرید، ہراول کے افسرِ اعلیٰ تھے اور جہانگیر سے چند گھنٹے پہلے لاہور پہنچ کر خسرو کی بہت بڑی فوج کو اپنی تھوڑی فوج کے ذریعہ سے اس قدر پھرتی سے شکست دی کہ جب شیخ فرید کی فتح اور خسرو کے فرار کی خبر جہانگیر کو پہنچی تو لوگوں کو یقین نہ آیا۔ (توزک ص۳۱)۔

اس کے بعد "صاحب السیف والقلم" یعنی شیخ فرید کی حُسنِ خدمت پر :

"بخطاب والائے مرتضیٰ خاں سرفراز گردانیدم"۔ (ص۳۳ توزک)۔

جہانگیر بادشاہ ۸ رجمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو تخت نشین ہوا حضرت مجدد صاحب کی عمر اس وقت ۴۳ سال ہے سیلسلہ نقشبندیہ میں داخل ہوئے صرف سات سال گذرے ہیں۔ لیکن خلق اللہ کی ایک بے شمار جماعت آپ کے ساتھ ہے جس کے جذبات کی آپ ترجمانی مکتوب بالا میں فرما رہے ہیں۔

(۲) جہانگیر کی تحریر پہلے گذر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت باقاعدہ منظم تھی۔ وہ کہتا ہے اور اپنے نظریہ کے بموجب کہتا ہے :

"ہر شہر[۱] و دیار میں ایک ایک خلیفہ کو بھیج رکھا ہے جو اپنے کام میں

---

[۱] بہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی از دیگراں پختہ تر داند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ ۱۲ (توزک ص۲۷۵)۔

بہت پختہ ہیں۔

بہر حال اس منظم جد و جہد نمبر الف کی کامیابی کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب نمبر ب میں کامیابی ملاحظہ فرمائیے۔

ارکانِ حکومت کی اصلاح مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دربار کے جتنے ممتاز رُکن سُنّی تھے، آپ نے سب کو اپنا حلقہ بگوش کر لیا تھا۔ چنانچہ خانخاناں، خان جہاں، خانِ اعظم، خواجہ جہاں، مرزا داراب، قلیج خاں، نواب سید فرید صاحب وغیرہ کے نام خطوط مکاتیب میں موجود ہیں۔

یہ تمام حضرات دولتِ جہانگیر کے عمائدین ہیں۔ بالخصوص عبد الرحیم خانخاناں[1]

[1] اکبر بادشاہ کے مشہور اتالیق بیرم خاں کے خلف رشید تھے۔ ۷۲ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۶ھ میں انتقال ہوا۔ سندھ اور گجرات وغیرہ کو فتح کیا۔ بیرم خاں اگرچہ امامیہ تھے مگر خانخاناں سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ حضرت مجدّد صاحب اپنے مکاتیب میں اسی طرح تنبیہ اور ہدایت فرماتے ہیں جیسے اپنے مرید کو۔ خان خاناں نے کسی خط میں فقراء کے ساتھ اپنے حسنِ سلوک کا بیان اس انداز سے کیا تھا جس سے استغناء اور برتری مترشح ہوتی تھی۔ حضرت مجدد صاحب مکتوب ۶۸ جلد اوّل میں تنبیہ فرماتے ہیں "دولت مندوں کے لئے تواضع زیبا ہے اور اہلِ فقر کے لئے استغناء اور بے نیازی۔ کیونکہ علاج ضد سے ہوا کرتا ہے۔ آپ کے خطوط سے استغناء مترشح ہوتا ہے اگرچہ آپ کا منشا تواضع ہے (مگر طرزِ تحریر مناسب نہیں) — ایک سطر بعد تحریر فرماتے ہیں — "بیشک فقراء کی خدمت بہت کی ہے مگر اُن کے آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ اس خدمت کا ثمرہ حاصل ہو سکے۔ اتقیاءِ اُمّت تکلفات سے بری ہیں۔ وہ متکبّرین کے مقابلہ میں تکبّر کیا کرتے ہیں" (ملخصاً) مکتوب ۶۸ صـ۸۵، جلد اوّل۔ بہر حال اہلِ علم و تقوے کی بہت خدمت کرتے تھے۔ شعراء کی بھی ایسی ہی قدر کرتے تھے۔ کئی مرتبہ سونے سے تول کر کچھ شعراء کو انعام دیا۔ ایک مرتبہ جہانگیر سخت خفا ہو گیا اور خانخاناں کو بھی اپنے حالات سے مجبور ہو کر دربار میں حاضر ہونا پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جہانگیر فوراً خانخاناں کو قتل کرا دے گا۔ خان خاناں نے حضرت مجدّد صاحبؒ سے دعا کی درخواست کی۔ خدا کے فضل سے تمام خطرات رفع ہو گئے اور خان خاناں کو موت کے بجائے خلعت ملا ۱۲ ملخصاً

عہدِ اکبر سے اتنا اقتدار یافتہ ہے کہ گویا آدھی سلطنت کا مالک ہے۔

اور اگرچہ جہانگیر اس سے زیادہ خوش نہیں تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ بغاوت کی نوبت بھی آئی، مگر اس کی عظمت و جلالت سے مرعوب بھی رہتا تھا۔ سلطنت کی حمایت میں کارہائے نمایاں اس سے ظاہر ہوئے۔ وفات کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ میں جہانگیر نے تبصرہ کیا ہے۔

"خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود، و زبانِ عربی و ترکی و فارسی و ہندی مے دانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتیٰ علومِ ہندی بہرۂ وافی داشت، و در شجاعت و شہامت و سرداری برایتے بل آیتے بود، و بزبانِ فارسی و ہندی شعر نیکو گفتی و واقعاتِ بابری را بحکمِ عرش آشیانی فارسی ترجمہ کردہ و گاہے بیتے و لیاناً رباعی و غزلے میگفت۔" (توزک ص۴۲۹)۔

داراب خاں : خان خاناں کا لڑکا تھا۔ جو شاہجہاں کا رفیقِ خاص رہا۔ حتیٰ کہ شاہجہاں کی بغاوت کے زمانہ میں شاہجہاں کی حمایت کرتا ہوا لشکرِ شاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اسی طرح دوسرے حضرات دولتِ جہانگیری کے ممتاز رُکن تھے۔ جو زمانۂ اکبر سے مقتدر حیثیت رکھتے تھے۔ ایک فقیر بے نوا نے شوکت و حشمت کی اُونچی چوٹیوں پر رہنے والوں کو کس طرح شکار کر لیا، ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ بالخصوص جبکہ دیکھا جاتا ہے کہ ساری عمر میں کسی ایک زمیندار کو مسخر کر لینا بھی ہمارے لئے دشوار ہے۔

حسنِ اتفاق یا تائیدِ غیبی حضرت مجددؒ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے مقصد کے لئے زمانۂ اکبر میں ہی جدّ و جہد شروع کر دی تھی، اور کیا عجب ہے کہ اکبر پر بھی کوئی نظر پڑ گئی ہو۔ جیسا کہ ایک روایت ہے کہ اکبر نے آخر زمانہ میں اپنے خیالات[1] و عقائد

---

[1] موت اکبرؒ کے ماتحت لکھا جا چکا ہے کہ وفات کے وقت اکبر نے میران صدر جہاں کو بُلوا کر

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سے توبہ کی۔ مگر بظاہر حضرت مجدّد صاحب کی جدوجہد کا سلسلہ ابھی اکبر تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ قدرت کا ایک کرشمہ نمودار ہوا۔ یہ پچاس سالہ چٹان جس کے حرکت دینے میں بے انتہا طاقت صرف ہوتی، دفعتہً راستہ سے ہٹ گئی، اور ۱۰۱۴ھ میں اکبر نے ہمیشہ کے لئے تختِ سلطنت کو رخصت کر دیا۔

ابتدائے سلطنت جہانگیر کے موقعہ کو حضرت مجدّد صاحب نے بہت غنیمت سمجھا، اور جو عمائدینِ سلطنت اس وقت تک ہموار ہو چکے تھے۔ ان کے ذریعہ سے کام شروع کیا۔

ذیل میں چند مکاتیب کا خلاصہ اُردو میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ خطوط عمائدین سلطنت کے نام ہیں۔ اگرچہ مضمون میں کسی قدر طوالت ہو جائے گی مگر حضرت مجدّد صاحب کے جذبات، آپ کا طریقِ کار، اور اُس زمانہ کے حالات وغیرہ پر روشنی پڑ جائے گی۔

شیخ فرید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :

عالم کے اعتبار سے بادشاہ کی وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے۔ لہٰذا صلاحِ بادشاہ صلاحِ عالم ہے، اور فسادِ بادشاہ فسادِ عالم۔

آپ خود واقف ہیں کہ قرنِ ماضی (زمانۂ اکبر) میں مسلمانوں پر کیا گذری کُفّار کُھلم کُھلا، دلیری اور جرأت کے ساتھ دارالاسلام (ہندوستان) میں احکامِ کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکامِ اسلام کے اجراء سے عاجز تھے۔ اگر کرتے تھے، تو قتل کر دیئے جاتے تھے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی کہ محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ذلیل ہوں، اور آپ کے منکرین کی عزت ہو۔ مسلمان زخمی دلوں سے اسلام کی تعزیت کر رہے ہوں، اور مخالفین و معاندین مذاق اڑا کر جراحتہائے مسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کلمۂ شہادت پڑھوایا اور خود بھی کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر صدر جہان کو سرہانے بٹھا کر سورۂ یٰسین اور دعاء عدیلہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جن کے ختم پر بادشاہ نے جان تسلیم کی ۱۲

پر نمک پاشی کرتے ہوں۔

آج جب بادشاہِ اسلام کے جلوس کا مژدہ خاص و عام کے کانوں میں پہنچا، تو اہلِ اسلام نے اپنے اُوپر لازم جان لیا کہ ترویجِ شریعت اور تقویتِ ملت کیلئے بادشاہ کے ممد و معاون ہوں اور جس قسم کی امداد مطلوب ہو، دریغ نہ کریں۔

مسائلِ شرعیہ کی تفصیل و توضیح اور کتاب و سُنّت و اجماع کے بموجب عقائدِ کلامیہ کا اظہار حکومت کی سب سے مقدم امداد ہے تاکہ کوئی بدعتی[1] یا گمراہ بیچ میں کُود کر بادشاہ کو راستہ سے نہ بہکا دے، اور معاملہ نہ بگڑ جائے۔

اس قسم کی امداد اُن علماء حق کا مخصوص حصّہ ہے جن کا نصب العین آخرت ہو۔ وہ علماء دنیا، جن کا مطمحِ نظر دنیاء دنی ہے، اُن کی صحبت سمِّ قاتل ہے، اور اُن کا فساد متعدّی۔

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گُم است کرا رہبری کند

گذشتہ قرن میں جو بلا آئی، وہ اسی جماعت کی نحوست کے سبب سے۔ یہی لوگ بادشاہوں کو راستہ سے بھٹکاتے ہیں۔ انہی کی بدولت اسلام میں بہتر[2] فرقے ہوئے۔ غیر عالم اگر گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی دوسروں کو تباہ نہیں کرتی۔ البتہ اس زمانہ کے اکثر صوفی نما جاہل بھی یہی شان رکھتے ہیں کہ ان کی خرابی دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص ہر قسم کی امداد کی طاقت کے باوجود کوتاہی کرتا ہے وہ کارخانۂ اسلام میں رخنہ ڈالتا ہے۔ لا محالہ عند اللہ معتوب ہوگا۔ اسی بنا پر یہ قلیل البضاعت بھی چاہتا ہے کہ دولتِ اسلام کے معاونین کے جرگہ میں اپنے آپ کو ڈال دے، اور جہاں تک ممکن ہو، ہاتھ پاؤں مارے۔ من کثر سواد قوم فھو منھم (جو کسی

---

(۱) علماء کلام بدعتی کے لفظ سے عموماً اہلِ شیعہ یا خوارج مراد لیتے ہیں۔

جماعت کے حلقہ میں اضافہ کرے وہ اسی میں شمار ہوتا ہے)۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی فروخت کا اعلان ہوا تھا تو ایک بڑھیا بھی تھوڑا سا سُوت لے کر پہنچ گئی تھی۔ تا کہ خریدارانِ یوسف کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ اُس کا کُل سرمایہ یہی تھا۔ میں بھی اپنی مثال ایسی ہی سمجھتا ہوں۔

ہاں جناب والا جبکہ پورے طور پر بادشاہ سے تقرّب رکھتے ہیں اور ہر قسم کی امداد بادشاہ کی کر سکتے ہیں تو توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں ہر طرح سے ترویجِ شریعت کی پوری کوشش کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کو بے بسی سے نجات دلائیں گے (مکتوب ۴۷ جلد اوّل ص۶۵ و ص۶۶)۔

مکتوبِ بالا سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدّد صاحب کے نزدیک اراکینِ دولت کی اصلاح بادشاہ کی اصلاح سے مقدم تھی کیونکہ فساد کا اصلی سبب یہی لوگ تھے۔

بظاہر حضرت مجدّد صاحب کی جماعت میں نواب صاحب پیش پیش ہیں حضرت مجدّد صاحب متواتر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ مکتوب ۱۹۳ میں تحریر فرماتے ہیں:

یوں تو جس زمانہ اور جس شخص سے بھی ترویجِ دین اور تقویتِ ملّت کی خدمت انجام پائے، بہتر ہے۔ لیکن بے بسیٔ اسلام کے موجودہ دَور میں آپ جیسے جوان مردانِ اہلِ بیت[1] کے لئے ترویجِ دین اور تائیدِ ملّت زیب دیتا ہے اور آپ جیسوں ہی کا مخصوص کام ہے کیونکہ یہ دولت آپ ہی کے خاندانِ مقدس کی خانہ زاد ہے۔

آپ ہی کے طفیل سے دوسروں نے یہ دولت حاصل کی ہے اسی جلیل الشان خدمت کی انجام وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی اور سچّی وراثت ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"آج وہ زمانہ ہے کہ اگر امر و نہی کا دسواں حصّہ بھی چھوڑ دو گے تو تباہ ہو جاؤ گے

---

[1] نواب صاحب سیّد ہیں ۱۲

لیکن اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا کہ اگر دس میں سے ایک کو بھی انجام دے لیں گے تو نجات پا جائیں گے۔

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید سواراں را چہ شد

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بادشاہِ اہلِ اسلام کی توجہ اہلِ کفر کی جانب نہیں رہی ہے مسلمانوں پر لازم ہے، رسوماتِ کفر کی قباحت پوری طرح بادشاہ کے ذہن نشین کرادیں، اور اگر ضرورت سمجھیں تو کسی عالم کو بلالیں۔ احکامِ شرعی کی تبلیغ کے لئے کرامتوں کا اظہار ضروری نہیں اگر افہام و تفہیم اور ارشاد و تبلیغ کے سلسلہ میں کوئی جماعت تکلیف بھی برداشت کرے تو اُس کی عین سعادت ہے۔ کیا انبیاء علیہم السّلام نے تکالیف برداشت نہیں کیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہ ہے[1] "کہ جس قدر تکلیف مجھ کو دی گئی، کسی نبی کو نہیں دی گئی"۔ (مکتوب ۱۹۳۔ صـ۱۹۳ و صـ۱۹۴ ج۱)۔

مفتی صدر جہاں[2] وہی بزرگ ہیں۔ جن کو اکبر نے وفات کے وقت خاص طور سے کلمۂ شہادت پڑھوانے کے لئے بلوایا تھا۔ اور پھر اس بنا پر کہ یہ سیّد تھے اور اکبر کے زمانہ میں مدّتوں منصب صدارت افتاء پر فائز رہے تھے۔ جہانگیر نے بدستور منصب صدارت پر فائز رکھا اور کچھ اختیارات میں مزید توسیع کر دی۔ اور پھر مذہبی احترام کی بنا پر اُن کو اور قاضی القضاۃ کو سجدۂ شاہی بجا لانے سے بھی مستثنیٰ کر دیا تھا۔ حضرت مجدّد صاحب

---

[1] ما اوذی نبیٌ مثل ما اوذیت ۱۲ [2] ملا عبدالقادر بدایونی اُن سے ناراض ہیں فرماتے ہیں کہ اکبر کے حکم کے بموجب انہوں نے داڑھی کٹوادی تھی (ان کا بیان پہلے گذر چکا ہے)۔ قصبہ پہانی ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ غرباء کو اُن سے بہت فائدہ پہنچا۔ ۱۰۲۲ھ میں ایک سو بیس برس کی عمر پا کر انتقال کیا مگر ہوش و حواس میں کوئی خرابی نہیں آئی تھی۔ ابتداء میں شعر کہتے تھے مگر مفتی ہونے کے بعد شعر کہنے چھوڑ دیئے۔ (صـ۹۸۹ تاریخ ہندوستان جلد ۵)۔

اُن کو تحریر فرماتے ہیں :

مشہور ہے **النّاس علیٰ دین ملوکھم** (آدمی اپنے بادشاہوں کے ڈھنگ پر ہوا کرتے ہیں) لہٰذا اصلاحِ عوام کے لئے اصلاحِ سلاطین ضروری ہے حکومتِ موجودہ میں ملتِ اسلام سے پہلے جیسی ضد اور نفرت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ائمہ اسلام صدورِ عظام اور علماء کرام پر لازم ہے کہ اپنی تمام ہمت شریعتِ غرّا کو رائج کرنے میں صرف کر کے شروع ہی میں اسلام کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کر دیں اور اسمیں ہرگز ہرگز تاخیر نہ کریں۔

غریبوں کے دل اس تاخیر کے باعث مضطرب ہیں۔ قرنِ سابق کا تصوّر دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ مبادا اُس کی تلافی نہ ہوسکے تو دین سے یہ اجنبیت اور طویل ہو جائیگی۔

اگر بادشاہانِ گرامی ترویجِ شریعت پر متوجّہ نہ ہوں اور اُن کے مقرّبین بھی خود کو معاف اور ذمّہ داری سے سبکدوش سمجھیں اور حیاتِ چند روزہ کو عزیز جانیں، تو لامحالہ فقراء اہلِ اسلام کے لئے بہت دشواری ہو جائے گی۔

آنچہ از من گُم شدہ گر از سلیمان گُم شدے
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن، بگریستے

(مکتوب ۱۹۴ - صـ ۱۹۵ جلد ۱)

خانِ اعظم[۱] : امراء اکبری میں سے ہیں۔ عہدِ جہانگیری میں بھی حکومت کے

---

[۱] خانِ اعظم - اصلی نام مرزا عزیز۔ پسر شمس الدین آمگہ۔ اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا۔ جی جی بیگم والدہ خانِ اعظم کی خاطرداری بادشاہ اپنی حقیقی ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ۱۰۰۸ھ میں جی جی بیگم کا انتقال ہوا تو اکبر نے تابوت کو کندھوں پر اُٹھایا، اور پھر سوگ میں داڑھی اور مونچھوں کے بال منڈوائے۔ بہت سے اُمراء دولت نے بھی بادشاہ کی ہمدردی میں بادشاہ کی اتباع کی۔ مرزا عزیز، اکبر کے ساتھ کھیلا تھا۔ اسی وجہ سے اکبر سے بے تکلف اور بہت زیادہ بیباک اور آدابِ شاہی سے نا آشنا تھا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ میرے اور عزیز کے درمیان (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

عظیم الشان رکن ہیں۔ اُن کو تحریر فرماتے ہیں :

مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اسلام اجنبی تھا جب اُس کا آغاز ہؤا، عنقریب پھر اجنبی ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کو مبارک باد جو اسلام کو سنبھالنے کے سبب سے سب کی نگاہوں میں غیر مانوس اور اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت، اور بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کُفّار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمّت کرتے ہیں۔ بے تحاشا احکامِ کفر جاری کرتے ہیں اور کوچہ و بازار میں اہلِ کفر کی تعریف و توصیف کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کو احکامِ اسلام کے ابزار کی ممانعت ہے اور شرعی احکام کی بجا آوری میں مطعون اور مذموم ہیں۔

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "جوئے شیر" حائل ہے جس کو میں عبور نہیں کر سکتا۔

مرزا عزیز کو اکبر کی مذہبی بدعتیں ناپسند تھیں۔ چنانچہ اُس نے بادشاہ کے پاس رہنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے متعلقہ صوبہ میں ہی رہتا تھا۔ ۳۹ جلوس میں اکبر نے ملاقات کے لئے بُلایا تو اُس نے صاف صاف لکھ دیا کہ عثمانؓ اور علیؓ کے بجائے آپ نے ابوالفضل اور فیضی کو مقرر کیا ہے۔ شیخین کی جگہ کس کو مقرر فرمائیں گے۔ اس کے بعد بادشاہ کی اطلاع کے بغیر حج کو روانہ ہو گیا (اس کا قصّہ رقعاتِ ابوالفضل میں ہے)۔

مشہور ہے کہ حرمین شریفین میں بہت سا روپیہ صرف کیا۔ روضۂ مبارک کا پچاس سالہ خرچ یک مشت شریف کو دیا۔ ۱۰۰۳ھ میں حج سے واپس ہؤا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ واپسی حج کے بعد اکبر کا مرید ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اکبر کی وفات کے بعد اس کی ایک تحریر پکڑی گئی جس میں اکبر کے پوست کندہ حالات درج تھے۔ جن کے متعلق جہانگیر کہتا ہے "از خواندن و دیدن از مو بر اعضائے من راست شد۔" مرزا عزیز کو حکم ہؤا کہ اپنی اس تحریر کو پڑھ کر سب کو سنائیں۔ جہانگیر کو خیال تھا کہ اس تحریر کے دیکھتے ہی خوف کے مارے مر جائے گا۔ مگر اُس نے نہایت دلیری سے تمام تحریر سنائی۔ بہر حال (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سبحان اللہ و بحمدہ۔ کہا جاتا ہے کہ الشرع تحت السیف (شریعت تلوار کے سایہ میں ہے)۔ شرع شریعت کی رونق سلاطین سے وابستہ مانی جاتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ واحسرتاہ واویلاہ۔

آج کل آپ کا وجود شریف غنیمت ہے۔ ہم لوگ جو اس معرکہ میں ضعیف و شکست خوردہ ہیں۔ صرف آپ ہی کو جانتے ہیں۔ خداوندِ عالم آپ کی مدد فرمائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" ایمان کامل اسی وقت ہوگا کہ لوگ مجنون کہنے لگیں"۔ وہ مبارک جنون (جس کا اصل منشاء اسلامی حمیت اور کامل درجہ کی اسلامی غیرت ہے) آپ کے وجود باجود میں نظر آتا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں تھوڑے کام کی بھی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے۔ اصحابِ کہف نے اپنے زمانہ میں خدا کے لئے صرف ہجرت کی تھی۔ ان کی یہی خدمت خدا کے یہاں قابلِ وقعت مانی گئی۔ غلبۂ اعداء کے وقت اگر سپاہی تھوڑی جدّ وجہد بھی کرتے ہیں تو بہت زیادہ اعتبار پیدا کر لیتے ہیں۔ مِلّی جہاد جس کی آپ کو توفیق ہوئی ہے وہ جہادِ اکبر ہے۔ اس کو غنیمت سمجھئے اور زیادتی کی کوشش فرمائیے۔

اسی سلسلہ میں حضرت خواجہ احرار قدس اللہ سرہ العزیز کا طرزِ عمل تحریر فرمانے کے بعد حضرت موصوف بادشاہوں اور امراء کے پاس جا کر اُن کو اپنے اخلاق سے مسخر کر کے ان کی اصلاح فرماتے تھے۔

" ملتمس یہ ہے کہ جبکہ اس خاندان بزرگ (نقشبندیہ) کے اکابر اور بزرگوں کے ساتھ محبّت رکھنے کے سبب سے خداوندِ عالم نے آپ کو اثر و رسوخ عطا فرمایا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) گفتگو میں بہت بیباک تھا۔ طبیعت ذکی پائی تھی۔ تاریخ، خطِ نستعلیق اور مدعا نویسی میں کمال حاصل تھا۔ رنگین سخن، شعر کا شوقین تھا۔ ۱۰۳۳ھ میں جہانگیر کی وفات سے تین سال پہلے انتقال ہوا۔ خان اعظم کی ایک بہن خانِ خاناں سے منسوب تھی۔ ۱۲ (خلاصہ)

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ لن یؤمن احدکم حتّٰی یقال انہ مجنون ۱۲

اور ہمعصروں اور دوستوں کی نظر میں تعظیم و تکریم مذہب آپ کی ذات سے ہی وابستہ ہے، تو کوشش کیجئے کہ اہلِ کفر کے وہ احکام جنہوں نے اہلِ اسلام میں بدشوقی اور مذہب سے بے التفاتی پیدا کر دی ہے، وہ سب منسوخ نہ ہوں تو کم از کم اکثر تو منسوخ ہو جائیں، اور ان منکرات اور قباحتوں سے اہلِ اسلام محفوظ رہ جائیں۔ سابق سلطنت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دینِ مصطفوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰة والسّلام کے ساتھ ضد اور عناد ہے۔ اس سلطنت میں بظاہر وہ ضد اور عناد نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ مسئلہ سے ناواقف ہونے کے سبب سے ہے۔ بہرحال یہ خطرہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ عناد اور ضد پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کیلئے وہی دشواری پھر پیدا ہو جائے ع

چو بید بر سر ایمان خویش مے لرزم

(مکتوب ۶۵- جلد ۱ ص۸۲ و ص۸۳)

خان جہان حسین قلی خاں - یا حسین قلی بیگ - بیرام خاں کے بھانجے ہیں ولی بیگ ذوالقدر باپ کا نام تھا جو بیرام کے زمانہ میں حُسنِ خدمات اور حُسنِ اعتماد میں تمام اُمراء پر فوقیت رکھتا تھا۔

یہ خان جہان بھی زمانۂ اکبر میں پنج ہزاری منصب رکھتے تھے۔ عہدِ جہانگیری میں سلطنت کے مقتدر رُکن ہیں۔ دونوں حکومتوں کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت مجدّد صاحب نے اُن کو بھی اپنے نصب العین کے لئے مقرّر فرمایا ہے۔ مکتوب ۵۴ جلد میں درج فرماتے ہیں:

دنیاء فانی کی لذّتیں اور نعمتیں خوش گوار ہوتی ہیں، اگر اُن کے ضمن میں تقاضاء شریعت پر عمل بھی ہو۔ ورنہ یہ لذّتیں شکر میں ملے ہوئے زہر کی طرح ہیں۔ جس سے نادان کو دھوکا دیا جاتا ہے۔

دنیاوی لذّتوں کے سمِّ قاتل کی اصلاح اگر حکیم مطلق جلّ شانہٗ کے تریاق سے کرلی جائے، یعنی شرعی احکام کی تلخی اور شیرینی سے ان کی تلافی کی جائے، تو اس

تھوڑی سی ترمیم سے جو سراسر سہل ہے، اور سہولت ہی پر مبنی ہے ملک ابدی حاصل ہو جاتا ہے۔

بہرحال عقل دُور اندیش سے کام لینا چاہیئے۔ بچوں کی طرح بادام اور اخروٹ کے لالچ میں شکار نہ ہونا چاہیئے۔

یہی خدمت جو درپیش ہے اگر اس کو شریعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کے ساتھ جمع کرلیں تو انبیاء علیہم السلام جیسی خدمت انجام دیں گے، اور دین متین کو منوّر اور معمور کر دیں گے۔

ہم جیسے فقیر اگر سالہا سال جاں توڑ کوشش کرتے رہیں، تب بھی آپ جیسے شاہبازوں کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے (مکتوب ۴۷ جلد ۳ صـ ۹۱ و ۹۲)۔

جلد ثانی میں مکتوب ۶۷ بنام خان جہاں موصوف ایک مستقل رسالہ ہے۔ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے جملہ عقائد و عبادات کو نہایت ہی سلیس اور سنجیدہ طور پر اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ گویا تبلیغ و مناظرہ کے لئے خان جہان کو تیار کر رہے ہیں۔ اس مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بادشاہِ وقت، سات پُشت سے سُنّی حنفی مسلمان ہے۔ اس زمانہ میں، جو قیامت سے قُرب اور نبوّت سے بُعد کا زمانہ ہے۔ کچھ طالب علموں نے حرص و طمع کی نحوست سے جس کا اصل منشاء خبثِ باطن ہے، بادشاہوں اور اُمراء کا تقرب حاصل کر لیا ہے۔ ان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ دینِ متین میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں اور سادہ لوحوں کو راستہ سے ہٹا دیا ہے۔

ایسا عظیم الشان بادشاہ جب کہ تمہاری باتوں کو دل سے سُنتا ہے اور اُن کو قبول کرتا ہے تو کتنی بڑی دولت ہے کہ صریحًا یا اشارتًا حسبِ موقع کلمۂ حق جو اہل سُنّت والجماعت کے عقائد کے مطابق ہو، گوش گذار کرتے رہو۔ بلکہ ہمیشہ منتظر رہو اور جب بھی موقع ملے اسلام کی کوئی خوبی اور کفر و کافری کی خرابی ذہن نشین کر دو۔

ڈیڑھ صفحہ کے بعد:

بادشاہ رُوح ہے، تمام آدمی بدن۔ اصلاحِ سلطان کی کوشش نوعِ بنی آدم کی اصلاح کی کوشش ہے۔ اصلاح یہی ہے کہ جس صورت سے مناسب ہو، احکامِ اسلام بادشاہ کے ذہن نشین کرائے جائیں۔ اگر یہ دولت میسّر ہو جاتی ہے، تو انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی وراثت میسّر آجاتی ہے۔ آپ کو یہ دولت مفت مِل رہی ہے، اس کی قدر کیجئے۔ (ص ۱۳۳ و ص ۱۳۵ جلد ۲)

اصلاحِ سلطنت کو مقاصدِ زندگی میں شامل کر لینے کی یہ ایک مدبّرانہ شان ہے کہ اس مقصد کو گویا اپنا کام تصوّر فرما لیا ہے، اور جس طرح اپنے کسی کام کے لئے منّت، سماجت، خوشامد اور ہمت افزائی کی جاتی ہے وہی تمام باتیں یہاں بھی کی جا رہی ہیں۔

حالانکہ یہی امراء اور حکّام ہیں جن کے نام مکتوب میں وہ خطوط بھی ہیں جو تلقین و ارشاد، تزکیہ اور اصلاح یا دیگر علمی مباحث سے متعلق ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب حضرات حضرت مجدد صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ ان تمام مکاتیب میں استغناء اور بے نیازی کی وہی شان ہے جو ایک شیخ اور مرشد کے مکتوبات میں ہونی چاہیئے۔ ان مکاتیب میں انہی امراء کے اعمال پر محاسبہ بھی ہے، تنبیہات بھی ہیں اور عقائدِ باطلہ یا فاسد خیالات کی تردید بھی قوت اور صفائی کے ساتھ کی گئی ہے۔

حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی اور تبلیغی شان کو پوری طرح نمایاں کرنے کے لئے اگرچہ ان مکاتیب کا پیش کرنا بھی ضروری تھا، مگر بخوفِ طوالت اس سعادت سے محرومی کو برداشت کیا جا رہا ہے۔

قلیج خاں[1] کے نام مکتوب ۶۷ میں تقویٰ و طہارت کے متعلق مفصّل ارشادات

---

[1] قلیج خاں اندجانی۔ اندجان ضلع فرغانہ، دریائے جیحوں کے جنوب میں ہے۔ سلاطین چغتائیہ کی خدمت میں اس کے باپ دادا کارہائے نمایاں کرتے رہے ہیں۔

قلیج خاں اکبر کا بہترین جرنیل تھا۔ ۱۷ جلوس اکبری میں سورت (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

دوم آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ لاہور جیسے بڑے شہر میں آپ کے وجود سے بہت سے احکامِ شرعیہ نے رواج پیدا کر لیا ہے۔ دین کو تقویت اور ملّتِ بیضاء کی تائید ہوتی ہے۔ یہ شہر فقیر کے نزدیک ہندوستان کے تمام شہروں میں قطبِ ارشاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر کی خیر و برکت ہندوستان کے تمام شہروں پر اثر ڈالتی ہے۔ اگر اس شہر میں دین کو رواج حاصل ہوا، تو سب جگہ ایک قسم کا رواج پیدا ہو جائے گا۔ حق سبحانہٗ آپ کی مدد فرمائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ رہے گی۔ جو غالب ہوتے ہوئے حق پر ہو گی۔ اس کی مدد چھوڑنے والے قیامت تک اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ (جلد ا صلہ ۹۶۔ مکتوب ۷۶)۔

لالہ بیگ : دربار جہانگیری کے امیر ہیں۔ اُن کو تحریر ہے :

تقریباً ایک قرن گذر گیا۔ اسلام کی غربت و بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کُفّار اب اس پر بھی قناعت نہیں کرتے کہ بِلادِ اسلام میں کُھلم کُھلا احکامِ کفر جاری کریں۔ بلکہ خواہش یہ ہے کہ احکامِ اسلام کُلّیۃً زائل ہو جائیں اور اسلام و اسلامیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے مضبوط قلعہ کو (جس کی بنیاد میں لوہا اور شیشہ بھر اگیا تھا) ایک ماہ سترہ روز میں فتح کر لیا۔ بہادری اور جنگی و آئینی تدبّر کے ساتھ صالح، متقی، علم دوست اور کٹّر سُنّی تھے۔ حضرت مجدّد صاحب کے پیر بھائی تھے۔ درس و تدریس اور خدمتِ طلبہ کے حریص تھے۔ صوبہ داری لاہور کے زمانہ میں مدرسہ میں جا کر فقہ، تفسیر و حدیث کے درس میں ایک پہر روزانہ حاضری دیتے۔ مذہبی علوم کی محبّت کے ساتھ شعر و سخن سے بھی شوق تھا۔ المفتی تخلّص تھا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۲ رمضان ۱۰۱۳ھ کو پشاور میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالےٰ۔ زمانہ وفات میں تیس ہزاری منصب اور پانچ ہزار سواروں کے افسر تھے۔

معاملہ یہاں تک بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کا کوئی شعار ظاہر کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔

ابتداء بادشاہت میں اگر اسلامیت نے رواج پا لیا اور مسلمانوں نے اعتبار پیدا کر لیا تو فبہا۔ ورنہ اگر کچھ توقف ہوا، تو مسلمانوں کے لئے کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ الغیاث، الغیاث، ثم الغیاث، الغیاث۔

دیکھنا ہے کہ کونسا صاحبِ نصیب اس سعادت کے لئے مستعد ہوتا ہے اور کونسا شاہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے (مکتوب ۸۱ جلد اول ۱۰۶)۔

یہ اُمراء دولت جن کا اُوپر تذکرہ کیا گیا، ہفت ہزاری، تیس ہزاری اور پنج ہزاری ہیں، جو وزراء دولت، گورنر اور بڑے بڑے جرنیل ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم فتح اللہ، شیخ عبدالوہاب، سیّد محمود، سیّد احمد، خضر خاں لودھی، مرزا بدیع الزماں، جباری خاں، سکندر خاں لودھی وغیرہ کتنے ہی افسرانِ فوج، حکّام اور عہدہ داران ہیں جو دو ہزاری، سہ ہزاری منصب رکھتے ہیں، دربار تک اُنکی رسائی ہے اور وہ حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حلقہ بگوش ہیں مکتوبات شریف میں اُن کے نام مکاتیب ہیں۔ جن میں اصلاحِ نفس، پابندیٔ شریعت، تصحیح عقائد اور روحانی مقاصد وغیرہ وغیرہ کے متعلق گراں قدر تعلیمات و ارشادات ہیں۔ جن کی خوبی مطالعہ پر موقوف ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ اکبری و جہانگیری کے تمام سُنّی ارکان و اعضاء حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تحریک کے اعضاء و اراکین ہیں۔

ایک مضبوط نظام ہے جس میں اہل سُنّت والجماعت تعلقہ دار اور حکومت کے تمام ورنہ اکثر و بیشتر منصب دار منسلک ہیں، اور اس نظام کا سر رشتہ حضرت مجدّد صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ آپ موقعہ بموقعہ اس نظام کو حرکت دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کم و بیش پانچ سو حضرات کے نام چھ سو اکیاون مکتوب

ہیں جو تین جلدوں کے تقریباً ایک ہزار صفحات میں درج ہیں۔ مکتوبات کے طرزِ خطاب سے معلوم ہوتا ہے، یہ پانچ سو حضرات ہندوستان کے مختلف گوشوں کے سنجیدہ اہلِ علم اور ذی اثر حضرات ہیں جو اپنی اور نوعِ انسان کی اصلاح میں مشغول اور منہمک ہیں۔

مجدّد صاحب نے بغاوت کیوں نہیں کی

نص حدیث کے بموجب مسلمان بادشاہ سے بغاوت صرف اُسی وقت جائز ہے جبکہ واضح اور بیّن طور پر اُس سے ارتکابِ کفر ہو۔

مشرکانہ اور کفریہ افعال کا ارتکاب اگرچہ حرام ہے لیکن کسی شخص کے کفر کا فیصلہ اسی وقت کیا جائے گا جب کہ اس کو مسلمان قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔

بہت ممکن ہے زمانہ اکبر میں حضرت مجدّد صاحب کی تحریک نے اتنی قوت حاصل نہ کی ہو کہ اکبر جیسے خرّانٹ شہنشاہ کی چالیس سالہ شہنشاہیت کا مقابلہ کر سکے۔ حالانکہ اعلانِ جہاد کے لئے اتنی قوّت کا ہونا ضروری ہے کہ بظاہر اسبابِ کامیابی کی توقع کی جا سکے۔ اور کیا تعجب ہے حضرت مجدّد صاحب کی تحریک نے اکبر تک اپنا اثر پہنچا دیا ہو اور یہ قول اگرچہ مشہور نہیں، مگر ممکن ہے صحیح ہو، کہ اکبر نے وفات سے کچھ پہلے توبہ کر لی تھی۔

لیکن بظاہر حضرت مجدّد صاحب اکبر کو اغراض پرست اور فاسق مسلمان قرار دیتے ہیں۔ جو اغراض پرستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اکبر سے زیادہ علماء سوء اور اغراض پرست جماعتوں اور افراد کی آپ مذمّت فرماتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لئے اراکینِ حکومت کی اصلاح کو مقدّم اور موقوف علیہ گردانتے ہیں۔

اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے لئے حکومت کا خواہاں نہ ہو، بلکہ حکومت کی اصلاح اس کا نصب العین ہو، وہ خونریزی کو صرف اسی وقت ضروری سمجھے گا جب اس کے بغیر اور کوئی چارہ باقی نہ رہے۔ مقرّبین اور وزراء کی جماعت میں

جو رسوخ پیدا کیا جاچکا تھا، وہ اگرچہ فوری انقلاب نہیں کر سکتا تھا مگر انقلاب کی توقّعات سے مایوسی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ضرورت تھی کہ ان اصلاح پسند مقرّبین کے جذبات اصلاح کو مزید تقویت پہنچائی جائے اور اپنے نصب العین کو اتنا نمایاں اور بیّن کر دیا جائے کہ اس کے ماسوا، کا اُن کو شک و شبہ بھی باقی نہ رہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگی اُس وقت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جہاد بالسّیف کا اعلان فرماتے تو یہی مقرّبین یقین کر سکتے تھے کہ تحصیلِ حکومت کا ایک ڈھونگ رچایا گیا ہے اور حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے دعویٰ اصلاح کو بھی وہی اصلاح خیال کی جاتی جس کا اعلان ابراہیم لودھی کے مقابلہ پر بابر نے یا ہمایوں کے مقابلہ پر شیر شاہ سوری نے کیا تھا۔

نتیجہ کیا ہوا۔ یہی کہ ایک چیرہ دست کی جگہ دوسرے نے حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں اکبر اپنے پچاس سالہ عہد میں ہندوؤں کے حوصلے اتنے بڑھا چکا تھا کہ اس جدّ وجہد اصلاح میں خود اقتدارِ مسلم کے زوال ہی کا خطرہ تھا۔ اس کے ماسوا، شاہ عباس ایران میں شیعہ بادشاہ تھا۔ ہندوستان میں شیعہ پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ کیا کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ملکہ نورجہاں کی امداد کے لئے ایرانی قزلباش دندناتے ہوئے ہندوستان پہنچ جاتے۔

بہر حال اس وقت مدبّرانہ اور عاقلانہ لائحہ عمل اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مقرّبین اور وزرار، جو آوازِ اصلاح پر کان دھر سکتے تھے، اس آواز کو اُن کے دلوں کی گہرائیوں میں اتنا اُتار دیا جائے کہ وہ سراسر اصلاح بن جائیں۔

دعوے بہت کچھ کئے جاتے ہیں مگر اُن کا اثر اور اُن میں قوّتِ جاذبہ جب ہی پیدا ہوتی ہے کہ ایثار، قربانی، جفاکشی اور فداکاری سے ان کی صداقت کا یقین پیدا کر دیا جائے۔

آپ کو یاد نہیں، دنیا کے سب سے بڑے مصلح نے ساری دنیا کے مقابلہ پر اپنی اصلاح پسندی کے دعویٰ کا ثبوت کس طرح دیا تھا۔ ۲۳ سالہ عہدِ نبوّت کے بیشتر حصّہ میں

صبر آزما قربانیوں، عبرت انگیز فداکاریوں سے اپنی صداقت کا نہ صرف یقین دلایا بلکہ صداقت کی آواز انصاف پسند متقابلین کے دلوں میں اس طرح اُتار دی کہ وہ سرتاپا آوازِ صداقت بن گئے، اور وہی جو کافر تھے اب اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (کافروں کے مقابلہ میں شدید ترین طاقت) بن گئے۔

حضرت حمزہ، حضرت فاروقِ اعظم کی سیرت پڑھو اور دیکھو کہ بدترین کافر کس طرح رشید ترین مجاہدِ حق بن گئے۔ اور پھر غور کرو کہ یہ انقلاب تلوار کی طاقت سے ہوا یا حق و صداقت، اخلاق و ضمیر، ایثار اور قربانیوں کی خاموش قوت سے۔

بلاشبہ یہ قوی اور نہایت مضبوط طریقۂ جنگ ہے جو اس وقت تک کیا جاتا ہے جب تک اس کی کامیابی کے امکانات باقی رہیں اور اسی طرزِ جنگ کو مقاومت بالصبر کے مذہبی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آج کل کی اصطلاح میں عدمِ تشدد کی جنگ کہا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت سے ناآشنا نہ ہوں گے کہ جب مکہ معظمہ میں اس طریقۂ جنگ کو آزمایا جارہا تھا تو تلوار اور قوت سے جنگ ممنوع تھی۔ جب وہ تمام طبیعتیں جن کو انصاف پسندی کا کچھ بھی حصہ مرحمت ہوا تھا، ایک ایک کرکے حلقہ بگوش ہوچکیں، اور صرف وہی ظاہر پرست ذہنیتیں باقی رہ گئیں، جن کا اعلیٰ انصاف قوت ہی ہوتا ہے، اور تلوار کی چمک کے سوا کوئی نور اُن کی شوخ اور دلیر آنکھ کو خیرہ کرہی نہیں سکتا، تب خاص خاص احتیاط اور شرائط کے ساتھ تلوار اُٹھانے کی اجازت دی گئی۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جنگ کے یہ دونوں طریقے آج بھی مشروع[1] ہیں اور شریعتِ غرا، موقع بموقع ہر ایک کے اجراء کا حکم دے کہ ایک ہی ثواب دونوں کے لئے تجویز فرماتی ہے۔ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہ ہے:

افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر و فی روایة — کہ سلطان ظالم کے سامنے صداقت اور انصاف کا کلمہ ہر ایک جہاد

---

[1] ملاحظہ ہو اتقان فی علوم القرآن باب الناسخ والمنسوخ۔

کلمۃ عدل۔ سے افضل ہے۔

بہرحال اس طرزِ جہاد کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت مجدّد صاحب اپنی صداقت نیز سلطان اور سلطنت کی خیر خواہی کا آخری ثبوت پیش کریں۔

گرفتاری اور سزایابی

حضرت مجدّد صاحب کی یہ جوڑ توڑ[1] (جس کو قرآن پاک کی زبان میں کَید کہا جاسکتا ہے) بلاشبہ کامیاب رہی۔

(۱) لیکن حضرت مجدّد صاحب کی یہ کامیابی نور جہاں اور اس کی پارٹی کے لئے خطرناک تھی خصوصاً جبکہ وارثِ تاج و تخت کا سوال بھی سامنے آگیا تھا۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے نور جہاں اپنے داماد شہریار کو تختِ جہانگیر پر جاگزیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کے برمقابل مذہب پرستی، اور سُنّی مسلک ہونے نے حضرت مجدد صاحب کے پورے گروپ کو قدرتی طور پر شاہجہاں سے وابستہ کر رکھا تھا۔

---

[1] حضرت علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک جماعت تیار کرتا ہے جو سیاسیات میں خاص خاص نظریات کی حامل ہوتی ہے۔ جن کی تعلیم قرآن اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ ایمان اور ارکانِ اسلام ایسی جماعت میں داخل ہونے کے لئے اوّلین شرائط ہیں پھر اس جماعت کو حکم ہے کہ اگر ممکن ہو، قوت سے ورنہ جوڑ توڑ سے اعداء اللہ کی جماعتوں کو شکست دے کر اپنے نظریات کی اشاعت کرے۔ ارشاد ربّانی ہے انھم یکیدون کیداً و اکید کیداً۔ وہ لوگ (اعداء اسلام) جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں، اور میں (خداوندِ عالم) بھی جوڑ توڑ کرتا ہوں ۱۲ خاکسار کا خیال ہے کہ اس خداوندی جوڑ توڑ سے متاثر ہو کر ہی انسان پکارا کرتا ہے "ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال"۔ تاریخ اسلام پر غور کیا جائے تو دونوں جماعتوں کے کَید اور جوڑ توڑ کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) ردِّ روافض کے متعلق حضرت مجدّد صاحب کی جدّ و جہد اور بیباکانہ جرأت نے اس پارٹی کو اور بھی زیادہ نگاہِ نور جہاں میں مقہور و معتوب کر دیا تھا۔

(۳) سلسلۂ نقشبندیہ کی ترغیب و تحریص، اتباعِ سُنّت کی تاکید، سماع، غنا، رقص و سرود کی مخالفت نے اس گروہ کو بھی لازمی طور پر برافروختہ کر دیا تھا، جس نے رقص و سرود کی طرب انگیز صورتوں ہی میں چشتیت کو منحصر کر دیا تھا۔

اور پڑھ چکے ہو کہ جہانگیر کی مذہبیت اسی جماعت کی آبشار سے سرشار تھی حتیٰ کہ اُس نے کان چھدوا کر باطنی حلقہ بگوشی کا مظاہرہ، ظاہری حلقہ بگوشی سے بھی کر دیا تھا۔ شیخ کبیر، شیخ علاؤالدین وغیرہ اسی جماعت کے ممتاز ارکان تھے بلکہ ذمہ دار رہنما تھے، جو جہانگیر کو بہت زیادہ محبوب تھے۔

یہ تھا جہانگیر کی حکومت کا داہنا بازو جس نے حضرت مجدّد صاحب اور آپکی جماعت کو آئینی طور پر شکست دینے کی کوشش شروع کر دی۔

مکتوبات کی پہلی اور دوسری جلد مرتب ہو چکی ہے۔ جس میں ان رُوحانی مقامات کا بیان بھی ہے جن کے سمجھنے کے لئے رُوحانی استعداد کی ضرورت ہے۔

ان کور باطنوں کو مقالاتِ مجدّدی کے سمجھنے کی توفیق تو کیا ہوتی، ہاں معاندانہ موشگافیوں کے ذریعہ سے مجدّد صاحب کے برخلاف سازش کرنے کا موقع بڑی ہوشیاری سے نکال لیا۔

(۴) کوئی صاحب تھے حسن تھاں[1]، افغان۔ کابل کے رہنے والے۔ وہ حضرت

---

[1] مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی نے ہدیہ مجدّدیہ میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ مصنف "مناقب العارفین" شاہ فتح محمد فتحپوری چشتی فرماتے ہیں کہ جب مشائخ اور اکابر کے حالات تحریر کرتے ہوئے حضرت شیخ احمد کابلی سرہندی (حضرت مجدّد صاحب) کے حالات کی نوبت آئی اور حضرت شیخ عبدالحق کی وہ تحریریں جو حضرت مجدّد صاحب کے متعلق تھیں میری نظر سے گذریں تو مجھے بہت تعجب ہوا کہ اگر مجدّد صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (بقیہ برصفحہ آئندہ)

مجدد صاحب سے بیعت ہوئے۔ پھر حضرت مجدد صاحبؒ کے کسی متوسل سے اُن کو آزردگی پیدا ہوگئی۔

طبیعت میں کجی تھی۔ ناراضگی کسی خادم سے تھی۔ مگر وہ خود حضرت مجدد صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شانِ اعلیٰ وارفع میں واقعی وہ کلمات ادا کئے ہیں جو صریح کفر ہیں تو پھر شیخ آدم بنوری جیسے جلیل القدر شیخ کامل اور علماء و محدثین، صاحب حال وقال اور بلخ، بخارا اور کابل وغیرہ ممالک کے وہ علماء، جو پختگیِ دین میں اپنی نظر نہیں رکھتے، کس طرح اس سلسلہ میں داخل ہیں۔

شیخ نور الحق خلف شیخ عبد الحق دہلوی رحمہم اللہ، دہلی میں موجود تھے۔ میں اس معمہ کے انکشاف کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نور الحق صاحب نے حسن خاں افغان کا واقعہ بیان کیا جو اُوپر ذکر کیا گیا۔ نیز یہ کہ غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکاتیب کے اصل مسودات ارسال فرمائے اور تحریر فرمایا کہ اس قسم کے کلمات مجھ سے کبھی بھی صادر نہیں ہوئے، یہ میرے ایک مرید کی شرارت ہے جس نے مجھے بدنام کیا اور خود میری بد دعا میں مبتلا ہو کر بخارا میں ارتداد کی تہمت میں قتل کر دیا گیا۔ پھر شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی کا اپنے خیالات سے رجوع فرمانے اور حضرت مجدد صاحب سے صفائی کرنے کا واقعہ بیان کیا اور پھر اپنی اس غلطی پر معذرت کے لئے حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی کے قلم کی دستخطی تحریر مجھ کو دکھائی۔ جس سے مجھے اطمینان ہوا۔

حضرت شیخ نور الحق صاحب موصوف کے متعلق تحریر ہے کہ اپنے والد ماجد سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر سلسلۂ قادریہ میں والد ماجد سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے دونوں صاحبزادوں یعنی حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت خواجہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں سے خلافت حاصل کی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں انتہائی کمال حاصل کیا، اور سعیدی اور معصومی دونوں نسبتوں کو جمع کیا۔ آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔ صحیح بخاری کی مشہور شرح (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

سے آزردہ ہو کر حضرت مجدد صاحب کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا۔

سوانح نگار حضرات کا بیان ہے کہ اُس نے خود اپنی طبیعت کی کجی سے (اور ہمارے خیال میں حکومت کے داہنے بازو کے ایماء سے) حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات میں تحریف کی۔ کُفریہ اور زندیقانہ عبارتوں کا اضافہ کر کے بیس نقلیں مرتب کیں اور ہندوستان و افغانستان کے مشہور علماء و مشائخ کے پاس وہ نقلیں بھیجیں اور فتاوے طلب کئے۔

حضرت شیخ عبدالحق[۱] صاحب محدث دہلوی بھی اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تیسیر القاری آپ کی ہی تصنیف ہے۔ ۱۱۷۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (ہدیہ مجددیہ ص۱۰۴ و ص۱۰۵ و مکاتیب حضرت مرزا مظہر جانجاناں بضمن کلمات طیبات)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] حضرت شیخ عبدالحق صاحب اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم باعمل ہیں۔ متقی اور پرہیزگار۔ ۱۲ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر زمانۂ شباب میں حرمین شریفین حاضر ہو کر مولانا عبدالوہاب صاحب متقی سے علومِ ظاہری کی تحصیل کی۔

ابتداء میں حضرت شیخ سید جمال الدین ابوالحسن موسیٰ پاک شہید خلف الصدق شیخ حامد گیلانی قدس اللہ سرہ العزیز سے مرید ہو کر استفادہ کیا۔ پھر شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب مرصعی سے استفادہ اور تکمیل کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ دہلی میں درس و تدریس تصنیف و تالیف آپ کا مشغلہ تھا۔

جہانگیر بادشاہ آپ کا احترام کرتا تھا۔ توزک میں لکھتا ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و اربابِ سعادت ست، دولت ملازمت دریافت کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوالِ مشائخ ہند بنظر درآمدہ۔ خیلے زحمت کشیدہ۔ مدتہا ست کہ درگوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر مے برد۔ مرد گرامی ست۔ صحبتش بے ذوق نیست۔ بانواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم۔ (توزک ص۲۸۵)۔

(یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسی سفر میں جب سرہند میں تھا تو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حضرت مجدّد صاحب کی تردید میں مضامین اور رسالے تحریر فرما دیئے۔

⑤ وحدت الوجود کا مسئلہ جو صوفیاء کے نزدیک عرصہ سے چلا آرہا تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت مجدّد صاحب کو سزا دی تھی اور اُس نے چند ہفتہ بعد دہلی پہنچ کر شیخ عبدالحق صاحب کو باریابی کا موقعہ دیا ہے)۔ اس کے بعد ایک اور ملاقات کا ذکر توزک میں ہے۔ حضرت مجدّد صاحب سے معاصرت کے باعث نیز حسن خاں افغان کے اس فتنہ کے سبب سے کدورت رہی۔ مگر پھر جب حضرت مجدّد صاحب نے اپنے مکتوبات کا اصل مسوّدہ بھیجا تو مولانا عبدالحق صاحب نے اپنے خیالات سے رجوع کیا اور حضرت مجدّد صاحب کے کمالات کے معترف ہو گئے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب مجدّدی دہلوی اپنے رسالے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ شیخ عبدالحق نے ابتداء میں بلا تحقیق و تفتیش حضرت مجدّد صاحب پر اعتراضات کئے تھے مگر انکشافِ حقیقت کے بعد رجوع کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے تو دیکھا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مجدّد صاحب کی طرف اشارہ کرکے ارشاد فرماتے ہیں "جس کو ہم سے اخلاص ہوگا، ان سے بھی ہوگا" جب شیخ نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت دیکھی تو اپنے خیالات سے تائب ہوئے اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ حضرت خواجہ حسام الدین احمد صاحب کی خدمت میں تحریر لکھ کر بھیج دی۔

میاں شیخ احمد سلمہ کے ساتھ میری صفائی باطن اور مخلصانہ محبت آج کل بہت بڑھی ہوئی ہے۔ بشریت کا کوئی بھی پردہ حائل نہیں رہا معلوم نہیں کیا بات ہے۔ اس سے قطع نظر کہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں سے بُرائی نہ رکھنی چاہیئے، غیر معمولی طور پر ذوق، وجدان اور غلبہ کے قسم کی ایک کیفیت محسوس کرتا ہوں جس کو میں بیان نہیں کرسکتا۔ اللہ مقلب القلوب و مبدل الاحوال ہے۔ ظاہر بینوں کو تعجب ہوگا مگر میں نہیں جانتا کہ کیا حالت درپیش ہے اور اس کی کیا مثال پیش کروں۔ اس کے بعد اپنی اولاد کے نام ایک طویل تحریر میں ارشاد فرماتے ہیں :

آنچہ مسودات اعتراضات بر کلام میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حضرت مجدّد صاحب نے اس کی تردید فرما کر شریعتِ مقدّسہ کے بموجب دوسری حقیقت واضح فرمائی۔

صوفیاء کہا کرتے تھے "ہمہ اوست"۔ حضرت مجدّد صاحب نے اصلاح فرمائی۔ "ہمہ از وست"۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت مجدّد صاحب گرفتار کر کے جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے اور سزایاب ہوئے۔

مقدمہ اور وجوہاتِ سزایابی کے متعلق جہانگیر کا پوتا دارشکوہ اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء میں تحریر کرتا ہے:

"در اواخر حال بعضے بر شیخ تہمت کردند کہ شیخ مے گوید کہ مرتبہ من زیادہ است از خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم۔ اما ایں محض بہتان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نوشتہ ام ہمہ را در آب بشویند۔ غبارے کہ بہ نسبت ایشاں بخاطر رسیدہ بود بصفا انجامید۔

حضرت مجدّد صاحب کی دُعا تھی: "خداوندا ایں مرد از کمالات خود اں چنیں خبری دہد اگر صادق ست مارا دلیلِ صدق و حقانیتِ او الہام فرما، یا او را تصرّفے در ما پیدا آید، کہ رفع شبہ و التباس کند"۔

شیخ عبدالحق محدّثؒ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ میں ۹۴ سال کی عمر پاکر رخصت ہوئے۔ ہدیہ مجددیہ میں یہ بھی ہے کہ شیخ عبدالحق صاحب بھی حضرت مجدّد صاحب کی طرح بارگاہِ خواجہ باقی باللہؒ سے اکتسابِ انوار کیا کرتے تھے۔ نیز حاشیہ میں یہ بھی ہے کہ "در ۹۸۵ھ بخدمت شیخ موسیٰ قادری خرقہ قادریہ زیب تن ساختہ۔ بظاہر ان سب حضرت نے استفادہ کیا ہے۔ شیخ موصوف کی تصانیف ۱۰۰ سو سے زیادہ ہیں۔ علمی طبقہ میں آپ کی تصانیف کافی شہرت رکھتی ہیں۔

ماخوذ از خزینۃ الاصفیا صفحہ ۱۶۴ جلد ۱۔ و ہدیہ مجددیہ صفحہ ۱۰۱ تا صفحہ ۱۰۵ و توزکِ جہانگیری وغیرہ۔

وافترار مخالفان ست بر شیخ۔[1]

خزینۃ الاصفیار[2]، حالات مشائخ نقشبند[3]، مقامات[4] و حالات مجدد الف ثانی وغیرہ کا بیان یہ ہے:

حضرت مجدد صاحب نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں ایک طویل مکتوب کے ضمن میں تحریر فرمایا:

دوسری[5] مرتبہ اس مقام کا مشاہدہ کرتے وقت دوسرے بہت سے مقام نظر آئے جو ایک دوسرے سے بلند تھے۔ جب اُن سے ایک بلند تر مقام پر رسائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ مقام حضرت ذی النورین عثمان غنیؓ کا ہے اور دوسرے خلفار کا بھی اس مقام پر عبور ہوا ہے۔ اس مقام سے بالاتر حضرت صدیقؓ کا مقام ظاہر ہوا اور دوسرے خلفارِ عظام کا بھی اس مقام پر عبور ہوا ہے۔ چنانچہ اس بلند و بالا مقام پر رسائی ہوئی۔

خواجہ بزرگ حضرت شاہ نقشبند رحمہ اللہ کو ہر مقام پر میں نے اپنی ہمراہ دیکھا اس طرح کہ صرف عبور کا تفاوت تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام سے بلند کوئی مقام سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ البتہ مقامِ نبوّت بیشک بلند و بالا تھا۔ حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کے برابر ایک دوسرا نہایت ہی نفیس اور بہت نُورانی مقام

---

[1] سفینۃ الاولیار مطبوعہ مطبع مدرسہ آگرہ ۱۸۵۳ء با اہتمام مسٹر بیل صاحب ط۳۳۹۔ [2] خزینۃ الاصفیار مصنفہ غلام سرور چشتی مطبوعہ نول کشور بزبان فارسی از ص۶۱۱ تا ص۶۱۳۔ [3] حالات مشائخ نقشبندیہ مصنفہ مولانا محمد حسن صاحب نقشبندی ساکن کوٹلہ متصل کرت پور ضلع بجنور مطبوعہ لحسن المطابع مراد آباد۔ [4] مصنفہ مولانا عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی۔ [5] یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اپنے حالات کو اپنے شیخ سے پوشیدہ رکھنا اہلِ طریقت کے نزدیک کفرِ طریقت ہے۔ اسی طرح کبھی ارشاد و تعلیم کے لئے غیبی واردات و حالات کا بتانا ضروری ہوتا ہے تاکہ ارباب طریقت فائدہ حاصل کر سکیں اور کبھی کیفیات و حالات کا غلبہ اظہارِ حقیقت پر مجبور کر دیتا ہے، اور بسا اوقات اس کے لئے لفظ موجود نہیں ہوتے تو عبارت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ۱۲

نظر آیا، جس سے بہتر مقام کوئی نہیں دیکھا گیا تھا۔ مقامِ صدیقی سے وہ صرف اسی قدر بلند تھا جیسا کہ صدر مقام زمین سے کسی قدر بلند ہوا کرتا ہے۔ معلوم ہوا، کہ یہ مقامِ محبوبیت ہے۔ یہ مقام رنگین تھا اور منقش۔ اس مقام کا عکس پڑنے سے بندہ بھی خود کو رنگین اور منقش پا رہا تھا۔ پھر رنگینی اور نقش و نگار کی اس کیفیت کے باوجود خود کو لطیف محسوس کرنے لگا۔ اور ہوا یا بدلی کے ٹکڑے کی طرح اپنے آپ کو آفاق میں منتشر محسوس کرنے لگا، اور اسی حالت میں کنارے پر جا لگا۔ حضرت خواجہ بزرگ مقامِ صدیقؓ میں رہے اور میں اپنے آپ کو اس کے برابر کے مقام میں کیفیتِ مذکورہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ (مکتوب ۱۱ جلد ۱ ص ۱۵)۔

(اس مکتوب میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں تاہم اس جلد کے دیگر مکتوبات[1] میں توضیح و تفسیر کر دی گئی ہے۔ مگر جن کو بہانہ کی جستجو تھی، اُن کو تحقیق و انصاف سے کیا واسطہ۔ محمد میاں)

---

[1] مثلاً مکتوب ۲۰۸ جلد اوّل میں عروج و ترقی کی کیفیت کی مثال پیش فرماتے ہوئے تحریر ہے۔ علماء فلسفہ کا خیال ہے کہ دھوئیں میں کچھ مٹی کے اجزاء بھی ہوتے ہیں۔ بسا اوقات دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ مٹی کے اجزاء بھی آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت وہ پانی اور ہوا کے مقام سے بلند ہیں۔ لیکن جب دھوئیں کی یہ کشش ختم ہو جائے تو لامحالہ وہ مٹی کے اجزاء زمین پر پہنچیں گے۔ کیونکہ اُن کا یہی مقام ہے۔ یہی مثال اہل اللہ کے عروج و صعود کی ہے۔ جذب وغیرہ کی کشش میں بسا اوقات ایک سالکِ طریقت عروج کر جاتا ہے، اور اُونچے اُونچے مقامات سے بھی آگے تجاوز کر جاتا ہے۔ مگر اس کی مثال مٹی کے ذرات کی ہوتی ہے کہ جب تک دوسرے کی کشش باقی ہے، عروج رہتا ہے اور جب وہ عارضی کیفیت ختم ہو جاتی ہے، وہ اپنے اصل مقام پر آجاتا ہے۔ بہرحال انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کی بارگاہیں اور مقامات معین ہیں۔ اولیاء اللہ کے مقامات کو مقاماتِ انبیاء سے وہی نسبت ہے جو آئینہ کو آفتاب یا ماہتاب سے۔ (ص ۲۰۶ و ص ۲۰۷ جلد ۱)

چونکہ نور جہاں کے بے پناہ اختیارات کے باعث جہانگیر کے دربار میں روافض کا دخل بہت زیادہ تھا اور حضرت مجدّد صاحب نے اس مذہب کی تردید میں چند رسالے اور کتابیں تصنیف فرمائی تھیں۔ جس کے باعث یہ لوگ حضرت مجدّد صاحب کے جانی دشمن ہو گئے۔ لہٰذا فرصت وقت کو غنیمت جان کر یہ مکتوب بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اور یہ سمجھایا کہ شیخ احمد خود کو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے بہتر اور بالاتر جانتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا مقام صدّیقِ اکبر کے مقام سے بلند ہے۔

بادشاہ رنجیدہ ہوا۔ شیخ کو اپنے پاس طلب کیا اور اس کے متعلق استفسار کیا۔ حضرت شیخ نے جواب دیا۔

جس طرح اہلِ سُنّت کے نزدیک وہ شخص سُنّی نہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دے، جماعت صوفیہ کے نزدیک وہ شخص صوفی نہیں جو خود کو کُتّے سے بہتر جانے جو خبیث ترین مخلوق ہے چہ جائیکہ حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھے۔

جو کچھ مکتوبات میں تحریر ہوا، مقاماتِ سُلوک کے سیر و عروج کا ذکر ہے۔ جو صوفیہ کو پیر و دستگیر کی توجّہ سے حاصل ہوا کرتا ہے۔

صوفیاء کا یہ عروج ایسے مقامات پر تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے۔

دربارِ شاہی میں اُمراءِ دربار رات دن حاضر رہتے ہیں، اور اگر کسی وقت کسی ضرورت یا کسی مصلحت سے سپاہی کو طلب کر کے بادشاہ اس کو ہمکلامی کا شرف بخشے، تو وہ محض عارضی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے اور درباری اپنے مقام پر بلند رہتا ہے۔ اس عارضی قرب کے سبب سے سپاہی کا درجہ مقربِ سلطانی سے بلند نہیں مانا جا سکتا۔

اسی طرح ہم لوگوں کا عروج ایک وقتی کیف ہوتا ہے، اس کیفیت کے

ختم ہو جانے پر سرہند کا وہی پُرانا جھونپڑا اپنا مقام ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو پہچانتے ہوئے اس بلند و بالا مقامِ صدّیقی کے مالک یعنی صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا تصوّر بھی ناممکن ہے۔

علاوہ ازیں اسی مکتوب میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس مقام کے عکس سے میں نے خود کو رنگین پایا۔ نُورِ آفتاب اور اس سے منوّر ہونے کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ آفتاب آفتاب ہی ہے۔ زمین پر اس کی روشنی پڑ جاتی ہے روشن ہو جاتی ہے۔ مگر کیا زمین آفتاب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے؟۔ ان دلائل و براہین سے حضرت مجدّد صاحب نے بادشاہ کو مطمئن کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے سزا دینے کے بجائے اعزاز و اکرام سے واپس کیا۔

حضرات شیعہ کے لئے یہ شکست غیر قابلِ برداشت تھی۔ اب انہوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

بادشاہ سے کہا کہ شیخ احمد نے ہزاروں جاں نثار مرید اپنے گرد جمع کر لئے ہیں خطرہ ہے کہ ملک میں کوئی فتنہ کھڑا کر دے۔ وہ ایک مغرور شخص ہے۔ خرابیٔ نیّت کی تصدیق اس سے ہو سکتی ہے کہ سجدۂ تحیّت جو بادشاہ جہاں پناہ کے لئے جائز مانا جاتا ہے، وہ اس کا منکر ہے۔ اُس نے پہلے بھی شاہی احترام سے کنارہ کیا اور آپ آئندہ بھی امتحان فرمالیجئے۔ وہ بارگاہ میں حاضر ہو کر بھی سر نہیں جُھکائے گا۔

بادشاہ کے لئے یہ سیاسی خطرہ مذہبی خطرہ سے زیادہ تشویش ناک تھا۔ دوبارہ حضرت شیخ کو طلب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر مکاتیب کی عبارتیں جو ان کوتاہ فہموں کی فہم سے بالا تھیں، توڑ مروڑ کر پیش کیں۔ کچھ علماء کے فتاویٰ نظرِ سلطان سے گذرانے جن میں حضرت مولانا عبد الحق محدّث دہلوی کے تردیدی مضامین بھی تھے۔

حضرت مجدّد صاحب دوسری مرتبہ جب دربار پہنچے تو درباری ادب آموزوں نے شاہانہ آداب بجالانے کی ہدایت کی۔ جب تخت بوسی یا سجدہ[1] کی فرمائش کی

---

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

گئی تو حضرت شیخؒ نے سختی سے انکار فرمایا۔

"پس ہمہ علماء بخاطر داری امراءِ دربار فتویٰ بر قتلِ شیخ نوشتند"۔

مگر بادشاہ نے پھر بھی تحمّل سے کام لے کر صرف دو سال کے لئے قید خانہ میں بھیج دیا[۱]۔ شاہزادہ[۲] خرّم شاہجہاں کو حضرت سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ اُس نے اپنے خاص الخاص معتمد افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن کو حضرت مجدّد صاحب کی خدمت میں بھیجا، اور فقہ کی کتابیں اُن کے ساتھ کر دیں اور عرض کیا کہ جبکہ علماء نے سجدۂ تحیّت کو جائز بتایا ہے۔ اگر جناب والا بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ کر لیں تو میں ذمّہ دار ہوں کہ جناب کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

مگر حضرت مجدّد صاحب نے فرمایا۔

"ایں[۳] رخصت است و عزیمت دراں ست کہ سجدہ بہ غیر اللہ نہ کردہ شود"۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" میں اس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے ہیں :

سہل باشد در رہ فقر و غنا گر رسد جاں را تعب تن را عنا
رنج و راحت داں چو شد مطلب بزرگ گرد گلہ توتیائے چشمِ گرگ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۱؎ مکتوب ۹۲ جلد دوم بنام میر محمد نعمان صاحب میں، غیر خدا کے لئے عموماً اور دربار شاہی کے لئے خصوصاً سجدہ کی سختی سے تردید فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو ص۱۶۲ جلد ۲ - یہ جلد بھی غالباً اس مقدمہ سے پہلے شائع ہو چکی ہے - اس صورت سے معاملہ کو پیش کرنے میں مخالفین کیلئے دو فائدے تھے۔ اگر حضرت مجدّد صاحب سجدہ نہ کریں تو باغی قرار دیئے جائیں اور سجدہ کر لیں تو مریدین اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ محمد میاں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ ہم نے خزینۃ الاصفیاء کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے۔ دیگر کتابوں کا مضمون بھی یہی ہے۔ محمد میاں۔ ۲؎ ماخوذ از ہدیہ مجددیہ ص۱۰۔ ۳؎ جان کے بچانے کے لئے یہ بھی جائز ہے۔ مگر اصل یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔ ۱۲

کے بود در راہِ عشق آسودگی　　　سر بسر در دست و خوں آلودگی
تا نہ سازی بر تو آسائش حرام　　　کے توانی زد براہِ عشق گام
غیر ناکامی دریں رہ کام نیست　　　راہِ عشق ست ایں رہ حمام نیست

جہانگیر نے قید و بند[1] پر بس نہیں کی بلکہ دولت کدۂ مجدّدی کو لوٹنے کا حکم دیا۔ مگر مجدّدانہ صبر و تسلیم یہ تھا کہ نہ خود آپ نے بد دُعا کے لئے لب کشائی کی، اور نہ اپنی اولاد یا خدّام کو اجازت دی کہ بادشاہِ اسلام کے لئے کسی قسم کی بد دُعا کریں۔

شنیدم کہ مردان راہِ خدا　　　دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ

عام مؤرخین مقدمہ اور گرفتاری کی یہ روئیداد پیش کرتے ہیں مگر وہ ڈپلومیسی بھی ملاحظہ فرمائیے جس پر جہانگیر کاربند ہے۔ فارسی داں ناظرین کی دلچسپی کے لئے تزک کی عبارت بجنسہٖ نقل کی جاتی ہے۔

"دریں ایام[2] (۲۳ خورداد ۱۴ جلوس مطابق جمادی الاخریٰ ۱۰۲۸ھ) بعرض رسید کہ شیخ احمد نام شیادے در سہرند دامِ زرق و سالوس فرد چیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ و بہر شہرے و دیارے یکے از مریدانِ خود را کہ آئینِ دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگراں پختہ تر دانند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ و مزخرفاتے کہ بمریداں و معتقداں خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ

---

[1] ہدیہ مجدّدیہ صفحہ ۱۰۱۔ [2] انہیں دنوں میں عرضی پیش کی گئی کہ شیخ احمد نامی ایک مکّار نے سہرند (سرہند) میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستان بے معنی کو شکار کر کے اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بمقابلہ دوسروں کے بہت پختہ ہیں، ہر ایک شہر اور قصبہ میں بھیج رکھا ہے، اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام کچھ چکنی چپڑی باتیں لکھ کر ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام مکتوبات رکھا ہے۔ اور اس میں ملات کی جھگڑالو کتاب میں بہت سے بیکار مقدمات (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مکتوبات نام کردہ دوران جنگ مہملات بسا مقدمات لاطائل مرقوم گشتہ کہ بکفر و زندقہ منجر مے شود ازاں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنار سُلوک گذارم بمقام ذی النورین افتاد۔ مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بصفا ازانجا درگذشتم بمقامِ فاروق پیوستم و از مقامِ فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے درخود آں نوشتہ و ازانجا بمقامِ محبوبیت واصل شدہ و مقامِ مشاہدہ افتاد بغایت منوّر و ملون خود را بانواعِ انوار و الوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفراللہ ازمقام خلفاء درگذشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخیہا کردہ کہ نوشتنِ آں طولے دارد و از ادب دُور ست۔ بنابریں حکم فرمودم کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہرچہ پرسیدم جواب معقول نتوانست و او باعدمِ خرد و دانش بغایت مغرور و خودپسند ظاہر شد۔ صلاحِ حالِ او منحصر دریں دیدم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لکھے ہیں، جو کفر و زندقہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ منجملہ اس کے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ اثناء سلوک میں حضرت ذی النورینؓ کے مقام پر میرا گذر ہوا۔ ایک دوسرا مقام نہایت نفیس، صاف اور بلند نظر آیا۔ وہاں سے گذر کر حضرت فاروقؓ کے مقام پر میرا عبور ہوا اور حضرت فاروقؓ کے مقام سے گذر کر حضرت صدّیق اکبرؓ کے مقام پر عبور ہوا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک مقام کی اس کے مناسب علیحدہ علیحدہ تعریف لکھی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ مقامِ صدیقی سے گذر کر مقامِ محبوبیت پر واصل ہوا، اور ایک دوسرا مقام مشاہدہ میں آیا۔ نہایت منوّر اور رنگین۔ میں نے اس کے رنگوں اور اس کے انوار کے عکس سے خود کو منوّر اور رنگین محسوس کیا۔ "استغفراللہ" مطلب یہ ہے کہ مقامِ خلفاء سے گذر کر ایک بلند مرتبہ پر پہنچا، اور دوسری گستاخیاں کی ہیں جن کا درج کرنا طول رکھتا ہے اور ادب سے دُور ہے۔ اسی بناء پر میں نے حکم کیا کہ "درگاہِ عدالت آئین" میں حاضر کریں۔ حسب الحکم حاضر خدمت ہوا، اور (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد تا شوریدگیِ مزاج و آشفتگیِ دماغش قدرے تسکین پذیرد و سوزشِ عوام نیز فرو نشیند۔ لاجرم بانی رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد۔

(ص۲۷۴ و ص۲۷۵ تُزکِ جہانگیر)

ہمارے زمانہ کی ایک اصطلاح ہے "مسل کا پیٹ بھرنا"۔ اپنی اس رپورٹ سے جہانگیر اسی کی نظیر پیش کر رہا ہے۔

ایک ایسے موقعہ پر ہمارے زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

توانا ؤں کے بس میں ہے سراپا حقارت سے ہزاروں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینہ میں کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا

حضرت مجدّد صاحب جیل خانہ میں

تسلیم و رضا کی مکمّل تصویر

جیل خانہ سے چند ماہ پہلے حضرت مجدّد صاحب اپنے احباب واصحاب سے فرمایا کرتے تھے، کہ عنقریب میرے اُوپر[۱] ایک بَلا نازل ہوگی، جو میرے لئے مقاماتِ ولایت کی ترقّیات کا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) جو کچھ دریافت کیا، اُس کا معقول جواب نہ دے سکا۔ عقل و دانش کے فقدان کے باوجود ظاہر ہوا کہ مغرور ہے اور خود پسند۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کی حالت کی اصلاح صرف اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ چند روز زندان میں محبوس رہے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی کسی قدر سکون پذیر ہو اور عوام کی سوزش بھی دب جائے۔ مجبوراً "بانی رائے سنگدلن" کے حوالہ ہوا کہ قلعہ گوالیار میں قید رکھیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ اصلاح، طریق کار، راستہ کی مشکلات نتائج اور ثمرات پہلے سے حضرت مجدد صاحب کے سامنے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

باعث ہوگی۔ اس بَلا کے نزول کے بغیر ان ترقیات کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت مجدّد صاحب قلعہ گوالیار میں پہنچے تو وہاں کئی ہزار غیر مسلم بھی قید میں تھے۔ حضرت مجدّد صاحب نے تبلیغ کی۔ ان کو مشرف بہ اسلام کیا اور سینکڑوں آدمیوں کو ارادت سے سرفراز کر کے درجاتِ ولایت پر پہنچایا۔

حضرت مجدّد صاحب نے زمانۂ قید میں کبھی بھی بادشاہ کو بد دُعا نہیں کی بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر بادشاہ مجھ کو جیل خانہ میں نہ بھیجتے تو اتنے ہزار نفوس دینی فوائد سے کیسے بہرہ اندوز ہوتے، اور ہمارے مراتب کی ترقی جو اسی مصیبت کے نزول پر منحصر تھی، کیسے حاصل ہوتی۔

آپ کے حلقہ بگوش صوفیاء کرام جو چاہتے تھے کہ بد دُعا کر کے باطنی تصرفات سے بادشاہ کو نقصان پہنچائیں، اُن کو خواب میں نیز بیداری میں منع فرماتے تھے (خزینۃ الاصفیاء ص۶۱۳)۔

چونکہ حضرت مجدّد صاحب حتیّٰ الوسع انبیاء علیہم السّلام کی سُنّت کو نہیں چھوڑتے تھے تو تقدیرِ الٰہی کا تقاضا ہُوا کہ جیل خانہ کے ذریعہ سے حضرت یوسف علیہ السّلام کی اس سُنّت کو بھی ادا کرایا جائے۔

آنہا کہ پائے در رہ مولےٰ نہادہ اند — گام نخست بر سرِ دنیا نہادہ اند
آوردہ اند لشت بریں آشیان بود — پس چوں فرشتہ روئے بہ عقبیٰ نہادہ اند
آں طوطیاں رہ چو قدم بر گرفتہ اند — طوبےٰ ہم کہ بر سرِ طوبےٰ نہادہ اند
زادِ رہ و ذخیرۂ ایں وادیٔ مہیب — در طشت سر بریدہ چو یحییٰ نہادہ اند
اوّل بزیر پاء سگاں خوار گشتہ اند — و آخر چو باد سر سوئے مولیٰ نہادہ اند

ذیل میں چند مکتوبات کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو جیل خانہ سے ارسال کئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سوچی اور سمجھی ہوئی ہیں۔ یہی ہے فراستِ مومن جس کے متعلق ارشاد ہے۔ یری بنور اللہ۔ مومن اللہ کے نُور سے دیکھتا ہے ۱۲۔ محمد میاں عفی عنہ

گئے ہیں۔ مکتوبات کا ہر ایک فقرہ سُلوک و طریقت، شریعت و حقیقت کا درسِ گراں مایہ ہے۔

مکتوب ۲ جلد ۳ بنام فرزندِ گرامی خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔

حمد و نعت کے بعد تحریر ہے

فرزندانِ گرامی! وقتِ آزمائش اگرچہ تلخ اور بے مزہ ہے، لیکن اگر توفیق ہو تو بہت غنیمت ہے۔

آج کل جب کہ آپ کو فرصت میسر ہے۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہو۔ فرصت کا ایک لمحہ اور ایک لحظہ بھی بے کار مت ضائع کرو۔

تین چیزیں ہیں۔ تلاوتِ[۱] قرآن مجید۔ طویل[۲] قرات کے ساتھ ادائے نماز۔ کلمہ[۳] طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ورد۔ ان میں سے کسی ایک کا ورد ہر وقت رکھو۔ کلمہ لا سے نفس کے معبودوں کی نفی کرو۔ اپنے مقاصد اور اپنی مرادوں کو دفع کرو۔ اپنی مراد مانگنا یہی اپنی معبودیت کا دعویٰ ہے۔ ساحت سینہ میں اپنی کوئی مراد، وہم و خیال میں اپنی کوئی ہوس باقی نہ رہے، بندہ کی اصلی شان اسی وقت ظاہر ہوتی ہے اپنی مراد مانگنے میں اپنے مولےٰ کی مراد کی تردید اور اپنے مولےٰ کے ارادہ کا مقابلہ ہے۔ گویا اپنے آقا کے حکم کو رد کر کے خود کو آقا قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کی قباحت کو پوری طرح ذہن نشین کر کے نفسانی معبود کے دعوائے معبودیت کی تردید کرو۔ اس ابتلاء اور آزمائش کے دور میں اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ کی عنایت سے یہ بات پوری طرح میسر ہو جائے گی۔

زمانۂ ابتلاء کے سوا دیگر اوقات میں اپنی مرادیں اور خواہشات سدِّ سکندری بنی رہی ہیں۔ خدا خیریت رکھے، ملاقات ہو یا نہ ہو، ہماری نصیحت یہی ہے کہ اپنی مراد یا ہوس باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہو۔ رضائے الٰہی اور ارادۂ خداوندی ہو۔ حتّٰی کہ میری رہائی جو آج کل تمہارا بڑا مقصود بنا ہوا ہے وہ بھی مقصود و مراد نہ رہے۔

اور حضرت حق جل مجدہ کی مقرر فرمودہ تقدیر، اُس کے ارادہ اور اُس کی مرضی پر پوری طرح راضی ہو جاؤ۔

اپنی والدہ کو بھی یہ مضمون پوری طرح سمجھا دو۔

اس زندگی کے باقی حالات اس قابل ہی نہیں کہ معرضِ تحریر میں آئیں۔ کیونکہ وہ ختم ہونے والے ہیں۔ چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ پڑھنے کی رغبت دیتے رہو جہاں تک ہو سکے، اہلِ حقوق کو میری طرف سے راضی رکھو۔

حویلی[1]، سرا، کنواں، باغ اور کتابوں کا غم بہت معمولی بات ہے۔ اگر ہم مر جاتے تب بھی جاتی رہتیں۔ اب زندگی میں جاتی رہیں، کوئی فکر نہیں۔ اولیاء اللہ ان چیزوں کو خود چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ اب شکر ادا کرو کہ خدا نے اپنے اختیار سے ان چیزوں کو چھوڑا دیا۔

جہاں بیٹھے ہو اسی کو وطن سمجھو۔ چند روزہ زندگی جس جگہ بھی گذرے، یادِ خدا میں گذرنی چاہئے۔ دنیا کا معاملہ آسان ہے، آخرت کی طرف متوجہ ہو اپنی والدہ کو بھی تسلّی دیتے رہو اور آخرت کی طرف رغبت دلاتے رہو۔

اگر حق سبحانہٗ تعالیٰ چاہیں گے، آپس میں ہماری سب کی ملاقات ہو جائیگی ورنہ حکمِ خدا پر راضی رہو۔ اور دُعا کرو کہ دار السّلام (جنّت) میں سب ایک جگہ ہوں اور ملاقاتِ دنیا کی تلافی کریں۔ (مکتوب ۲ صلے و صکے جلد سوم)۔

مکتوب ۱۶ ج ۳ شیخ بدیع الدّین صاحب کے نام ہے۔ تحریر ہے:

شیخ فتح اللہ صاحب کے ذریعہ سے مکتوبِ گرامی موصول ہوا۔ مخلوق کے ظلم و تعدّی کی شکایت تحریر تھی۔ یہ چیزیں درحقیقت جماعتِ اولیاء کا جمال ہیں۔ اور ان کے زنگ کے لئے صیقل۔ لہٰذا تنگ دلی اور کدورت کا سبب کیوں ہوں۔

اوّل اوّل جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہنچا تو محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کی ملامت

---

[1] پہلے گذر چکا ہے کہ جہانگیر نے یہ تمام چیزیں ضبط کر لی تھیں ۱۲

کے نورشہروں اور دیہات سے بلند ہو کر نورانی بادلوں کی صورت میں میرے پاس پے درپے پہنچ رہے ہیں۔ اور میرے معاملہ کو پستی سے اونچی بلندی پر پہنچا رہے ہیں تربیتِ جمالی سے سالہا اس مسافت کو طے کیا ہے۔ اب تربیتِ جلالی سے ان مراحل کو طے کیا جارہا ہے۔ صبر و رضا کے مقام میں رہو۔ جمالی و جلالی کو مساوی سمجھو۔

تحریر فرمایا تھا کہ ظہور فتنہ سے نہ ذوق رہا ہے نہ حال۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ ذوق و حال میں اور زیادتی ہوتی۔ کیونکہ وفائے محبوب سے جفائے محبوب زیادہ لذّت بخش ہوا کرتی ہے۔

کیا ہوگیا؟ عوام کی طرح بات کر رہے ہو، اور محبّتِ ذاتیہ سے بہت دور ہوگئے ہو۔ بہرحال گذشتہ کے برخلاف، آئندہ جلال کو جمال سے بڑھا ہوا سمجھو اور انعام کے مقابلہ میں تکلیف کو بہتر تصوّر کرو کیونکہ جمال و انعام میں محبوب کے مراد کے ساتھ اپنی مراد کی بھی آمیزش ہے، اور جلال و تکلیف میں صرف محبوب کی مراد سامنے ہے اور اپنی مراد کی مخالفت ہے۔ (ص ۱۲ و ۱۳ جلد ۳)۔

مکتوب ۱۵ ج ۳ ص ۱۸ حضرت میر محمد نعمان صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

معلوم ہوا کہ میری رہائی کے متعلق خیراندیش احباب کی جدّ وجہد کامیاب نہیں ہوئی الخیر فیما صنع اللّٰہ تعالیٰ۔ بمقتضائے بشریت کسی قدر افسوس ضرور ہوا۔ مگر تھوڑی دیر بعد خداوندِ عالم کے فضل و کرم سے وہ تمام حزن و افسوس مسرّت اور خوشی میں بدل گیا، اور خاص طور پر اس کا یقین ہوگیا کہ یہ جماعت جو ہماری ایذاء رسانی کے درپے ہے، اس کی مراد جب کہ حضرت حق جل مجدہ کے ارادہ کے مطابق ہے، تو تنگ دلی اور حزن و ملال بے معنی اور دعویٰ محبّت کے سراسر مخالف۔

محبوب کی ہر ایک ادا، محبوب ہی ہے۔ عاشق جس طرح انعام و نوازشِ محبوب سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح اس کی تکلیف و ایذاء سے لذّت حاصل کرتا ہے۔

بلکہ تکلیف و ایذاء میں لذّت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ حظِ نفس ، اور اپنی خواہش و مراد کے شائبہ سے بھی مُبرّا ہے۔

حضرت حق جل سلطانہٗ جمیلِ مطلق ہیں۔ اس بندۂ ناچیز کی آزار و پریشانی منظور ہے، ان کی عنایت سے (جل جلالہ) یہ بندۂ ناچیز خوش ہے، بلکہ لذّت محسوس کر رہا ہے۔ اور جب کہ اس جماعت کی مراد حضرت حق جل مجدہ کی مراد سے منطبق ہے تو لامحالہ ان کی مراد بھی نظرِ احقر میں پسندیدہ اور موجبِ لذّت ہے۔

کسی شخص کا فعل جو فعلِ محبوب کا مظہر ہو، فعل محبوب ہی نظر آتا ہے، اور فعلِ محبوب کی طرح لذّت بخش ہوتا ہے۔

عجیب معاملہ ہے۔ اس شخص سے ستم و جفا جس قدر زیادہ ہو، نظرِ عاشق میں وہ اتنا ہی بھلا اور پیارا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں غضبِ محبوب کی صورت کی نمائش زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ دیوانگانِ رہ عشق کا معاملہ ہی اُلٹا ہے۔

لہٰذا اس شخص کی بُرائی چاہنا، اور اس کی بُرائی کے درپے ہونا، منافیِ محبّت ہے۔

یہ شخص کیا اور اسکی حقیقت کیا، وہ صرف فعلِ محبوب کا آئینہ دار ہے۔

جو لوگ درپئے آزار ہیں، تمام مخلوق میں سب سے زیادہ پیارے معلوم ہوتے ہیں۔

احباب سے فرمایئے کہ تنگیٔ دل دُور کریں اور اس جماعت کی تکلیف دہی کا خیال بھی چھوڑ دیں، بلکہ چاہیئے کہ اُن کے افعال سے لذّت اندوز ہوں۔

ہاں چونکہ دُعا کے لئے مامور ہیں لہٰذا حضرت حق جل سلطانہٗ سے بھی عاجزی اور تضرّع کے ساتھ دفعیہ بلا کی دُعا کریں۔

یہ یاد رکھو۔ غضبِ حقیقی دشمنانِ خدا کا حصّہ ہے۔ عاشقانِ خدا کے لئے صرف صورت غضب ہے جو حقیقت میں عین رحمت ہے اور استفہ رمنافع کی حامل

کہ ان کی تفصیل ناممکن۔ نیز اس صورتِ غضب میں منکروں کی خرابی مضمر ہے اور اُن کی ابتلاء کا سبب و باعث۔

شیخ محی الدّین ابنِ عربی قدس اللہ سرہٗ کا قول ہے کہ عارف ہمّت نہیں رکھتا یعنی وہ ہمّت نہیں رکھتا جس کے ذریعہ سے دفعیہ بلا کا قصد کرسکے۔ کیونکہ جب مصیبت عارف کے عقیدہ میں مراد محبوب اور از جانبِ محبوب ہے۔ یہ محبِّ ناتواں اُس کے دفع کرنے کی ہمّت کس طرح کرسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حکمِ دُعا کی تعمیل بھی ضروری ہے مگر وہ صرف تعمیل ہی ہے، آرزوئے دل نہیں۔ کیونکہ تمنّاء دلی تو وہ ہے جو مراد محبوب ہو۔ (مکتوب ۱۸ و ۱۹ جلد ۳)

ان مکتوباتِ قدسیہ کو دیکھو، حق تعالےٰ کے ساتھ کیسا صحیح تعلق ہے، اور کیسی بے مثال محبّت۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

ان خطوط میں جواب ہے اُن جذبات کا جو حضرت میر نعمان اور دوسرے خدّامِ عالی مقام کے دل میں پیدا ہو رہے تھے کہ ہمّتِ باطنی کے ساتھ دُعا کر کے موذیوں کو برباد کر دیا جائے۔

بلا شبہ یہ چیز ان حضرات کے لئے مشکل نہ تھی، جن کے حق میں ارشادِ نبوی ہے لو اقسم علی اللہ لابرہ (اگر خدا کی ذمہ داری پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا اُن کی قسم پوری کرے) وہ چاہتے تو سلطنت تہ و بالا ہو جاتی۔

گروہے عمل دار عزلت نشیں — قدمہائے خاکی دمِ آتشیں

بیک نالہ ملکے بہم بر کنند — بیک نالہ کوہے ز جا بر کنند

قوی بازوانند کوتاہ دست — خردمند دیوانہ ہشیار مست

حضرت امام ربانی نے ان جذبات کو ٹھنڈا کر دیا، اور بجائے ان انتقامی جذبات کے دعاء خیر کے جذبات دلوں میں بھر دیئے۔

آں کشتہ ہیچ حقِ محبت ادا نہ کرد
کز بہرِ دست و بازوِ قاتل دُعا نہ کرد

خان خاناں، خان جہاں، صدر جہاں وغیرہ جو حضرت مجدّد صاحب سے عقیدت مندی اور ارادت مندی کے ساتھ حکومت کے سر اور خان بہادر بھی تھے، ان کے لئے حضرت مجدد صاحب کا یہ ابتلاء و امتحان کس قدر پیچیدہ مسئلہ تھا مگر اس کو کس قدر آسانی سے حل کیا، ان کے خلوص ارادت مندی اور جوشِ عمل میں کتنا اضافہ کر دیا۔

جہانگیر نے مکر، فریب، غرور وغیرہ کا جو الزام لگایا تھا، اس کا کیسا عملی جواب دیا۔ یہ ہے اسلام کی سیاست جس سے باطل پرستوں کی باطل ڈپلومیسی کا جواب دیا جاتا ہے، اور یہ ہے وہ مقاومت بالصبر یا عدمِ تشدّد کی جنگ جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ	صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد حاصل
وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ	کرو۔ بیشک نماز (جو توجّہ الی اللہ
اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ○	کے لئے خدا کا بتایا ہوا طریقہ ہے) شاق
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ	ہوا کرتی ہے مگر اُن لوگوں پر جو
مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ	خشوع اور خضوع کرنے والے ہیں جو
اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○	اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے

ملنے والے ہیں۔ اور اس کے پاس واپس ہو کر جائیں گے۔

یہ مضمون اور یہی نکتہ ہے جو دیگر احباب کے نام خطوط میں مختلف عنوان سے واضح کیا جا رہا ہے۔ تمام مکاتیب کا نقل کرنا طوالت ہے۔ البتہ آخر میں ایک مکتوب اصل عبارت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ حضرت مجدّد صاحب نے اس قید و بند سے رُوحانی حیثیت سے کیا حاصل کیا۔

چونکہ اس مکتوب کا ترجمہ اور تفسیر مفصل تصنیف کا خواہاں ہے، لہٰذا بجنسہٖ عبارت نقل کرنے پر قناعت کی جاتی ہے۔

حاصلِ قید | مخفی نماند کہ تا زیانیکہ بعنایت اللہ سبحانہٗ آں عنایت بصورتِ جلال و غضب او تعالےٰ تجلّی نفرمود و محبوس قفس زندان نگشتم۔ از تنگنائے شہودی بالکلیہ نرستم و از پس کوچہائے ظلال خیال و مثال بتمام نہ برآمدم و در شاہراہِ ایمان بغیب مطلق العنان۔ تبختری ننمودم و از حضور بغیب و از عین العلم و از شہود باستدلال بروجہ کمال نہ پیوستم۔ و ہنر دیگراں عیب و عیبِ دیگراں را ہنر بذوق کامل و وجدانِ بالغ نیافتم و شربتہائے خوش گوار بے ننگی و بے ناموسی و مرباہائے مزادار خواری و رسوائی را نچشیدم و از جمالِ طعن و ملامتِ خلق حظ نگرفتم۔ و از حسنِ بلا و جفاء مردم محفوظ نشدم و کالمیت بین یدی الغسال گشتہ بالکل ترک ارادہ و اختیار نکردم۔ و رشتہائے تعلّق آفاق و انفس را بتمام و کمال نگسستم و حقیقتِ تضرّع و التجا و انابت و استغفار و ذل و انکسار را بدست نیاوردم و تسطاکس رفیع المنزلت استغنا حضرتِ حق سبحانہٗ را کہ محفوف بسرادقات عظمت و کبریائی ست مشاہدہ ننمودم و خود را بندۂ خوار و زار و ذلیل و بے اعتبار و بے ہنر و بے اقتدار و باکمال احتیاج و افتقار معلوم نساختم۔ وما ابرئ نفسی ان النّفس لامّارۃ بالسوء الّا ما رحم ربّی انّ ربی لغفور رحیم

اگر بمحض فضلِ تواتر فیوض و وارداتِ الٰہی جل سلطانہٗ و توالی عطیات و انعاماتِ لامتناہی او سبحانہٗ دریں محنت کدہ شامل حال ایں شکستہ بال نمے شد نزدیک بود کہ معاملہ بیاس رسد و رشتۂ اُمید گسستہ گردد (مکتوب ۵۰ بنام میر محمد نعمان صاحب ص۱۱ و ص۱۲ جلد ۳)۔

قید سے رہائی اور لشکرِ شاہی میں حراست

حضرت مجدّد صاحب کو قلعہ گوالیار میں مقیّد کیا گیا۔ مگر بظاہر خط و کتابت اور ملاقات پر وُہ پابندی نہیں تھی جو بیسویں صدی عیسوی کے مہذّب قید خانوں میں ہوتی ہے۔

پرچہ نویس جو عموماً ہر ایک چیز کو بادشاہ تک پہنچا دیا کرتے تھے انہوں نے حضرت مجدّد صاحب کے حالات، آپ کے خیالات، عزائم اور ارادوں کو بھی جہانگیر تک پہنچایا۔ اب جہانگیر یقیناً حیران ہوگا کہ جس شخص کو شیاد، مکّار، مغرور، خود پسند، کافر اور مرتد بتایا گیا تھا، خود اس کے پرچہ نویس اُس کو پیکرِ صدق و صفا، مجسمۂ اخلاق اور اسلامی کمالات کی جیتی جاگتی تصویر قرار دے رہے ہیں۔

جس کی دولتِ ایمانی نے جیل خانہ میں پہنچ کر ازلی ڈاکوؤں، چوروں اور بدمعاشوں کو بھی صداقت و ہدایت کے رنگ میں رنگ دیا۔

وہ کافر بے دین جن کی عمر ظلم و جفا، ایذا خلق اللہ اور امنِ عامہ کی تباہی و بربادی میں گذری تھی۔ جن کو جیل خانہ کی سخت سے سخت تکلیف بھی رام نہ کر سکی تھی۔ صرف ایک سال کے عرصہ میں وہ سب حلقہ بگوشِ اسلام اور راستی و راست بازی کے حریص نظر آ رہے ہیں۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ:

دو سال کے بعد بادشاہ اپنے فعل سے نادم ہوا اور حضرت شیخ کو اپنے پاس طلب کر کے بہت زیادہ اکرام و احترام کیا اور بہت کچھ معذرت کی، اور حضرت شیخ سے اس قدر محبت کرنے لگا، کہ کسی وقت حضرت شیخ کی جُدائی گوارا نہ کرتا تھا، اور شاہزادہ خُرّم کو حضرت شیخ کے حلقۂ مریداں میں داخل کیا۔ چنانچہ شاہجہاں و

عالمگیر کے زمانہ تک بادشاہ اور جملہ علماء و وزراء سلسلۂ مجدّدیہ کے حلقہ بگوش ہوتے رہے۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صـ۶۱۳)

یہ درست ہے کہ دراز عرصہ تک حضرت مجدّد صاحب کو لشکر شاہی میں حراست کی زندگی گذارنی پڑی، اور بہت ہی کم کسی جگہ نقل وحرکت کی اجازت ملی۔ مگر یہ ارادت مندی اور محبّت تھی یا ڈپلومیسی اور سیاست؟ ہمارا خیال ہے کہ نُور جہاں کی سیاست کو اس میں بہت بڑا دخل تھا۔ غالباً نور جہاں کو خطرہ تھا کہ حضرت مجدد صاحب کو مطلق العنان کر دینے میں شاہجہاں کو قوّت پہنچے گی۔

| دو سال یا ایک سال | سوانح نگار متفقہ طور پر مدّت قید دو سال بتاتے ہیں

مگر جہانگیر ۲۱ خورداد (اساڑھ) سنہ ۱۵ جلوس کے روزنامچہ میں لکھتا ہے:

"دریں تاریخ[1] شیخ احمد سرہندی را کہ بجہت دکان آرائی، خودفروشی، وبے صرفہ گوئی روزے چند در زندانِ ادب محبوس بود، بحضور طلب داشتہ خلاص ساختم خلعت و ہزار روپیہ خرچے عنایت نمودہ، در رفتن و بودن مختار گردانیدم"۔ (تو زک جہانگیری صـ۳۱۲)۔

جہانگیر کی آئین دانی قابلِ داد ہے کہ حکم رہائی میں بھی ان الزامات کا لحاظ رکھتا ہے جن کو گرفتاری اور سزا کا سبب قرار دے چکا ہے۔

مسل کا پیٹ بھرنا تو ہمارے معمولی وکیل اور معمولی حکّام بھی بخوبی جانتے ہیں۔ جہانگیر تو مغلیہ شہنشاہیت کا کامیاب بادشاہ تھا۔ وہ اس رسم وراہ سے کس طرح ناواقف ہوسکتا تھا۔

بہر حال اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے ایک سال شمسی میں بھی ابھی

---

[1] شیخ احمد سرہندی جن کو دکان آرائی خودفروشی اور بے ہودہ گوئی کے سبب سے چند روز زندانِ ادب میں محبوس کیا تھا، اپنے سامنے طلب کرکے رہا کر دیا۔ خلعت اور ایک ہزار روپیہ خرچ عنایت کرکے جانے اور رہنے کا ان کو اختیار دے دیا۔

دو دن باقی تھے کہ رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ بظاہر فرمان شاہی براہ راست حضرت مجدّد صاحب کے پاس نہیں پہنچایا گیا۔ اور کسی دوسری سیاست کے ماتحت ایک سال تک کار پردازانِ دربار نے حضرت مجدّد صاحب کو وطن جانے کا موقع نہیں دیا۔ کڑی پابندی و نگرانی کے ساتھ شاہی کیمپ کے ساتھ رکھا۔ اس کو مریدانِ حضرت مجدّد صاحبؒ نے حبس اور قید قرار دیا ہے، اگرچہ جہانگیر اس کو رہائی سمجھتا رہا۔

اس کے بعد توزکِ جہانگیر حضرت مجدّد صاحب کے تذکرہ سے خاموش ہے۔ لیکن توزکِ جہانگیری سے زیادہ صحیح اور معتمد توزک یعنی مکتوباتِ مقدّسہ (جو ڈھائی سو برس بعد کسی سر سیّد احمد صاحب کی کوشش سے فراہم اور طبع نہیں ہوئے، بلکہ ابتداءِ تحریر سے وہ سینکڑوں ہاتھوں میں پہنچتے رہے اور پھر سینکڑوں سے ہزاروں اور لاکھوں کے ہاتھ میں پہنچ کر آج تک تواتر کے طور پر محفوظ اور مستند ہیں) حضرت مجدّد صاحب کی کامیابی کی مزید تفصیلات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

بادشاہ کو وعظ و پند اسی سال رمضان شریف میں روزانہ بعد مغرب بادشاہ سے خاص صحبت رہتی تھی۔ جس کی کچھ حالت اپنے صاحبزادگان کو تحریر فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یہاں کے حالات مستحق حمد ہیں عجیب و غریب صحبتیں گذرتی ہیں اور الحمدللہ ان صحبتوں میں اُمورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ کے متعلق جو گفتگو بادشاہ سے ہوتی رہتی ہے اُس میں بال برابر بھی مداہنت و مساہلت، چشم پوشی اور چرب زبانی کو دخل نہیں ہوتا۔ وہی باتیں، انہیں الفاظ اور عبارتوں سے جو خلوتوں اور خصوصی مجالس میں بیان کی جاتی تھیں، ان معرکوں میں بھی حق تعالےٰ کی توفیق سے وہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال بھی لکھوں تو ایک دفتر درکار ہے۔ خصوصاً آج

۱۷ رمضان المبارک کی شب میں خصوصیت سے انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور یہ کہ جملہ مسائل حل کرنے کے لئے عقل کافی نہیں ہے، آخرت کے عذاب و ثواب پر ایمان لانے، حق تعالیٰ کے دیدار اور خاتم الرسل (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ختمِ نبوت اور ہر صدی کے مجدّد اور خلفاء راشدین کی پیروی، تراویح کے مسنون ہونے، تناسخ کے باطل ہونے، جنّ اور جنوں اور اُن کے عذاب و ثواب کے متعلق بہت زیادہ بیان کیا گیا اور خُوب اچھی طرح سُنا گیا۔ اقطاب، ابدال، اوتاد، ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر بھی اسی ضمن میں آیا۔ الحمد للہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام تذکرہ برمحل ہو رہا ہے (مکتوب ۴۳ ص۷۶ جلد ۳)۔

اس کے بعد صاحبزادوں کو بھی حضرت مجدّد صاحب نے اپنے پاس بُلا لیا۔ اب یہ پورا گھرانا پورے لشکر کی تبلیغ و تلقین میں مشغول ہو گیا۔ چنانچہ مکتوب ۷۲ میں خواجہ حسام الدّین کو تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ کہ آپ صحت و عافیت سے ہیں اور دُور افتادہ دوستوں کے حالات کی تحقیق و تفتیش سے غافل نہیں ہیں۔

یہاں کے فقراء کے حالات مستحقِ حمد ہیں کہ عین بلا میں عافیت ہے، اور پراگندگی خاطر کے موقعہ پر اطمینان اور دل جمعی حاصل ہے۔ جو فرزند اور دوست کہ ہمراہ ہیں اُن کے اوقات بھی یادِ خدا میں دل جمعی کے ساتھ گذرتے ہیں اور ان کے حالات روبہ ترقی ہیں۔ لشکر کی زیادتی ان کے حق میں ایک خانقاہ بن گئی ہے کہ سپاہیوں کی رنگ، برنگی کے اندر بھی سکون اور وقار ان کا حصّہ ہے، اور متفرّق قسم کی پابندیوں اور گرفتاریوں کے دوران میں جو اس وطن کی خصوصیات ہیں، یہ لوگ صرف ایک مقصود کے گرفتار اور پابند ہیں۔ نہ کسی کو ان سے کام اور نہ ان پر کسی کا احسان۔ اس کے باوجود اعتماد اور اعتبار مسلوب ہے۔ حبس و قید کی دولت میں گرفتار ہیں۔ عجیب گرفتاری ہے کہ اس کے مقابلہ پر ایک جَو کے عوض میں بھی رہائی نہیں خرید سکتے۔

اور عجیب قید ہے کہ اس کے مقابلہ میں رہائی کی قیمت ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔
(مکتوب ۷/۲ جلد ۳ ص ۱۱۵)۔

صاحبزادے وطن واپس چلے گئے مگر حضرت مجدد صاحب لشکری حراست میں ہیں۔ چنانچہ مکتوب ۷/۸ جلد ۳ ص ۱۳ میں تحریر فرماتے ہیں۔

فرزندانِ گرامی جس قدر ہمیشہ ساتھ رہنے کے خواہشمند ہیں اسی قدر ہم بھی مشتاق ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ تمام آرزوئیں میسر نہیں ہوا کرتیں۔

لشکر میں اس طرح بے اختیار اور بے بس رہنے کو بہت غنیمت جانتا ہوں۔ اس جگہ وہ میسر ہے کہ دوسری جگہ بظاہر وہ میسّر نہیں آسکتا۔ اس جگہ کے علوم و معارف احوال و مقامات کچھ اور ہی ہیں۔ ایک رکاوٹ جو بادشاہ کی جانب سے ہے، میں اس کو حضرت حق جل مجدہٗ کی انتہائی رضامندی کا دریچہ تصوّر کرتا ہوں اور اس میں ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ خصوصاً ان جھگڑوں کے زمانہ میں عجیب کاروبار ہے فرزندانِ عزیز دل میں کُڑھ رہے ہیں اور اس جدائی سے بے چین ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا شوق ان کے شوق سے بڑھا ہوا ہے۔ اگرچہ تقاضاء قیاس یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے زیادہ محبت ہو۔ کیونکہ اولاد شاخیں ہیں اور شاخیں جڑوں کی زیادہ محتاج ہوا کرتی ہیں۔ مگر مقررہ اصول یہی ہے کہ باپ کو اولاد سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اسلاف سے یہی چلا آرہا ہے اور یہی تجربہ ہے (مکتوب ۷/۸ ص ۱۳ جلد ۳)۔

ایک اور مکتوب میں صاحبزادگان کو تحریر فرماتے ہیں:

عام طور پر ہماری گرفتاری کو نظرِ تشویش سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس ضیق سے رہائی کی خواہش کی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ نامرادی، ناکامی اور بے اختیاری میں کس بلا کا حُسن ہے۔ اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہو سکتی ہے کہ بندہ کو اس کے اختیار سے بے اختیار کر کے اپنے اختیار میں رکھیں اور امورِ اختیار کو بھی اس کے اختیار سے خارج کر کے اپنے ارادہ و اختیار کے تابع کر لیں اور اس کو ایسا ہی بے اختیار کر دیں

جیسے غسل دینے والوں کے ہاتھ میں مردہ" (جو اعتماد علی اللہ اور تسلیم و رضا کا اعلیٰ ترین درجہ ہے)۔

زمانۂ گرفتاری میں جب اپنی ناکامی اور نامرادی پر نظر کرتا ہوں تو عجیب لطف حاصل ہوتا ہے مگر جو اس مزہ سے ناآشنا ہیں، اُن کو اس کا لطف کیا معلوم۔ بچے سمجھتے ہیں کہ مزہ صرف شیرینی میں ہے اور جو تلخی سے مزہ لینے لگتا ہے اُس کے نزدیک شیرینی ہیچ ہے۔

"مرغ آتشخوارہ کے لذت شناسد دانہ را"۔ (مکتوب ۸۳ صفحہ ۱۲۲ جلد ۳)

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مجدّد صاحب کو وطن شریف جانے کی اجازت ہو گئی۔ مگر حالاتِ سلطان کی نگہداشت آپ کا نصب العین تھا اور ہمّتِ عالیہ مدبّرانہ انداز میں سلطان کی جانب منعطف رہتی تھی۔ جلد سوم میں ایک مکتوب بنام سلطان جہانگیر ہے جس میں ظاہر کیا ہے کہ آپ کے پاس لشکرِ غزا ہے اور ہمارے پاس لشکرِ دُعا۔ جس کے بغیر لشکرِ غزا کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ اور پھر اس کو احادیث سے ثابت کیا ہے۔ بظاہر یہ مکتوب سرہند شریف سے بھیجا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت مجدّد صاحب دہلی یا آگرہ میں لشکر کی حراست میں ہوں اور بادشاہ پایۂ تخت سے باہر کسی مہم کے لئے گیا ہوا ہو، اُس وقت یہ خط بھیجا گیا ہو۔

کامیابیاں

حضرت مجدّد صاحب کی کامیابی کا پہلا قدم وہ ہے کہ جہانگیر خصوصی مجالس میں آپ سے وعظ و نصیحت سُنتا ہے۔ اس کے بعد اگرچہ کسی خاص سیاست یا جہانگیر کی عقیدت مندی کے باعث حضرت مجدّد صاحب لشکرِ شاہی میں زیرِ حراست رہے مگر اس حراست اور لشکر میں ہمہ وقت موجودگی کا نتیجہ یہ ہوا

کہ لشکر میں ترویجِ شریعت کی ایک رُوح پیدا ہو گئی۔

قلعہ کانگڑہ کی فتح اس کے بعد اسی سال میسّر ہوئی جس پر جہانگیر نے بہت زیادہ مسرّت کا اظہار کیا اور سجداتِ شکر ادا کئے کیونکہ یہ ایسی فتح تھی جو گذشتہ ہزار سال کی طویل مدّت میں کسی بادشاہِ اسلام کو میسّر نہ آئی تھی باوجودیکہ ہر ایک ذی حشمت بادشاہ اس کی تمنّا کرتا رہا۔ اور بقول جہانگیر ظاہر بینوں کی نظرِ کوتاہ میں اس کی فتح ناممکن تھی۔ لیکن یہ کس کی جدّ و جہد کا ثمرہ تھا؟

(۱) اس مہم کے لئے اوّل نواب سیّد فرید[۱] نامزد ہوئے تھے۔ جو حضرت مجدّد صاحب کے خاص الخاص ارادت مند تھے۔ اور جن کو جہانگیر نے مرتضیٰ خاں کا خطاب دیا تھا۔ ان کی وفات ہو گئی تو یہ مہم عبدالعزیز[۲] خاں نقشبندی کے سپرد ہوئی۔ اس کے بعد قاضی، میرعدل اور دیگر علماء اسلام کو لے کر جہانگیر بنفس نفیس قلعہ کانگڑہ کی سیر کو گیا، اور وہاں اذان، نماز، خطبہ وغیرہ شعائر اسلام جاری کرائے۔ مسجد بنوائی اور شعائر اسلام کے اجراء پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔[۳]

اکبر کے بیٹے جہانگیر کی یہ مذہبیت کیا قابلِ تعجب نہیں؟

(۲) جہانگیر نے کشمیر جاتے آتے دو مرتبہ سرہند شریف میں مقام کیا۔

غرہ بہمن[۴] ماہ الٰہی، روز مبارک شنبہ ظاہر بلدہ سہرند منزلِ اقبال گشت۔ یک روز قیام کردہ بسیر باغ خوش وقت گشتم (توزک ص۳۲۹)

پھر گیارہ ماہ بعد "دی" یعنی ماگھ ۱۶ھ جلوس (مطابق محرم ۱۰۳۱ھ تقریباً) کی ۲۱ کو:

---

[۱] توزک ص۲۲۴۔ [۲] توزک ص۳۲۵۔ ص[۳] توزک ص۳۲۶۔ [۴] بہمن ماہ الٰہی (پھاگن) کی یکم تاریخ ۱۵ھ جلوس (تقریباً محرم ۱۰۳۰ھ) روز مبارک شنبہ شہر سرہند سے باہر نزولِ اقبال ہوا ایک روز قیام کر کے باغ کی سیر سے مسرور ہوا۔

باغ سہرند[1] مسرّت افزائے خاطر گشت، دو روز قیام نمودہ، از سیر و تماشائے آں محفوظ گشتم۔ (توزک ص۳۴۴)

جہانگیر نے ان دو قیاموں کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا۔

مگر مشہور یہ ہے کہ "جہانگیر کے اقبال نے یہاں تک ترقی کی کہ سرہند میں حضرت امام ربّانی کا مہمان بننے اور آپ کے باورچی خانہ کا کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا۔ کھانا اگرچہ سادہ تھا۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ میں نے ایسا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا (حالات مشائخ نقشبند ص۲۳۵)۔

نیز یہ کہ جہانگیر آخر عمر میں کہا کرتا تھا :

میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جس سے نجات کی اُمید ہو، البتہ میرے پاس ایک دستاویز ہے۔ اس کو اللہ تعالےٰ کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ دستاویز یہ ہے کہ مجھ سے ایک روز شیخ احمد سرہندی نے فرمایا تھا کہ " اگر اللہ تعالےٰ ہمیں جنّت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے"۔

بہرحال اگر جہانگیر کے اقبال نے واقعی یہاں تک ترقی کر لی تھی تو یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت مجدّد صاحب کی بھی عظیم الشّان کامیابی ہے۔ مگر درحقیقت حضرت مجدّد صاحب کی اصل کامیابی یہ ہے :

(۳) کہ ایسی فضا پیدا کر دی کہ شاہجہاں اور عالمگیر اپنی کامل دین داری کے ساتھ تقریباً ایک صدی تک حکومت کرتے رہے اور یہی فضا باقی رہتی اگر عالمگیر کے جانشین فکر و ہمّت سے محروم نہ ہوتے۔

اکبر ابتدار میں دین دار تھا۔ مگر پھر بے دین ہو گیا۔ جہانگیر مذہبی جذبات رکھتا تھا مگر ساری عمر بھٹکتا رہا اور مذہبی انسان نہ بن سکا۔ کیوں ؟

پہلے پڑھ چکے ہو کہ ان دونوں کی لادینی یا برگشتگی کا اصلی سبب ارکان حکومت

---

[1] باغ سہرند مسرّت افزار خاطر ہوا۔ دو روز قیام کر کے اس کے سیر و تماشا سے محظوظ ہوا۔

یا وہ نام نہاد علماء تھے جو دین کے پیرایہ میں دنیا پرستی کرتے تھے۔ ان عاقبت فروشوں کو ایوانِ حکومت سے کس نے نکالا؟

نور جہاں کا بھائی آصف خاں اب بھی تھا اور پہلے[1] سے زیادہ طمطراق کے ساتھ نظامِ حکومت کا بلکہ شاہجہاں کے تاجِ شاہی کا قیمتی ہیرا تھا۔

اُس کی بیٹی ممتاز محل[2] نور جہاں سے زیادہ اپنے نامور سرتاج (شاہجہاں)

---

[1] نور جہاں کے تمام داؤ پیچ کو توڑ کر عین وقت پر شاہجہان کو دکن سے پنجاب بُلانا (جہاں جہانگیر کی وفات ہوئی تھی) اور تخت پر قابض کرا دینا یہ آصف خاں کا کام تھا۔ شاہجہاں تقریباً چھ سال سے شاہی افواج اور بھائیوں کی فوجوں کا مقابلہ کرتے کرتے اب بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اگر آصف خاں کی حکمتِ عملی نہ ہوتی، تو قوتِ بازو سے تخت حاصل کرنا شاہجہاں کے لئے بہت دشوار تھا۔

اسی کے شکریہ میں شاہجہاں نے آصف خاں کو عمِ دانا (عقل مند چچا)، عضد الخلافہ، یمین الدّولہ کا خطاب دیا اور سلطنت کا وکیل مقرر کیا۔ ہشت ہزاری ذات ہشت ہزار سوار، دو اسپہ سہ اسپہ منصب ہوا۔ پندرہ بھری انعام میں دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر حیثیت سے اس کا منصب پہلے سے بہت زیادہ بڑھایا۔

[2] نہایت ہوشیار، مدبر، سلیقہ شعار، نیک ذات عورت تھی۔ جہانگیر کی ناراضی کا زمانہ شاہجہاں کے لئے حد سے زیادہ پریشانی اور مصیبت کا زمانہ تھا لیکن یہ سلیقہ مند اس کی ہر حالت میں اسکی مونس و غمگسار رہی اور حقِ رفاقت ادا کیا۔ مگر افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ ۲۶ رجمادی الاوّل ۱۰۳۷ھ کو شاہجہاں اورنگ نشین ہوا۔ اور صرف ساڑھے تین سال بعد ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ کو اس سلیقہ مند بیوی نے انتقال کیا۔ ۱۹ سال نکاح میں رہی۔ ۱۴ بچے ہوئے۔ ۸ لڑکے ۶ لڑکیاں۔ سات کا انتقال ہو گیا۔ سات زندہ چھوڑے۔ دارا، شجاع، عالمگیر، مراد چاروں شاہزادے اسی محل سے تھے۔ بادشاہ کو اس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ صرف ۲ دو بال بادشاہ کی داڑھی میں سفید تھے۔ مگر اس غم میں تھوڑے دنوں میں ساری داڑھی سفید ہو گئی۔ (تاریخ ہندوستان وغیرہ)۔

کو عزیز تھی۔

(نور جہاں اور جہانگیر کی محبت اوراقِ تاریخ کا ایک پرانا افسانہ بن گئی۔ لیکن ممتاز محل اور شاہجہاں کی محبت کی شہادت تین سو برس کے بعد آج بھی تاج[1] محل کی بے نظیر عمارت دے رہی ہے۔ اور درحقیقت سچی محبت یہ تھی، کہ اٹھائیس سال گذرنے کے بعد بھی اپنی اس محبوبہ کو نہیں بھولا) مگر آصف خاں کی سیاست اب بدلی ہوئی ہے۔ ممتاز محل اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر شاہجہاں کی ہم مذہب ہوگئی ہے۔

مختصر یہ کہ حکومت کا وہ داہنا بازو جو تقریباً ستر سال برسرِ اقتدار رہ کر حکومت کے رگ و ریشہ میں اپنا تسلط جما چکا تھا۔ آج اُس نے اس طرح شکست کھائی کہ نہ شاہجہاں کا بال بیکا کر سکا، نہ عالمگیر کا۔

کیا اب حکومت میں ہندوؤں[2] کا حصہ نہ تھا۔ کیا شیعوں کو حکومت سے خارج

---

[1] دنیا کی بے نظیر عمارت ہے جس میں ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں برابر برابر ہیں۔ یہ عمارت سنگِ مرمر کی اپنی خصوصیات میں بے نظیر ہے۔ ۱۰۵۲ھ میں بارہ سال کے عرصہ میں پچاس لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی۔ پرگنہ حویلی اکبر آباد و نگرچند کے مضافات سے تیس موضع جن کی جمع چالیس لاکھ دام تھی، اور اس کے علاوہ بازار اور سرائے وغیرہ جن کی آمدنی بھی تقریباً اتنی ہی تھی غرض دو لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کی جائداد اس روضہ کے لئے وقف ہوئی تاکہ اس روضہ کے اطراف میں جو حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں، فقراء اور مساکین اور حفاظ قرآن ان میں قیام کریں اور ان کو وظیفے اس آمدنی سے دیئے جائیں (ماخوذ از تاریخ ہندوستان)۔ کاش یہ وقف اگر محفوظ ہوتا تو ہندوستان میں مصر جیسا جامع ازہر قائم کیا جا سکتا تھا۔

[2] راجہ ٹوڈرمل، اکبر بادشاہ کا وزیرِ اعظم تھا۔ اُس نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے پر مجبور کیا۔ اس سے پہلے ہندو صرف ہندی جانتے تھے مگر راجہ ٹوڈرمل کے اصرار سے جب وہ فارسی سے بھی واقف ہوگئے تو مسلمانوں کے برابر تمام محکموں میں اعلیٰ منصب اور عہدے حاصل کرنے لگے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

کر دیا تھا۔ کیا اب عیسائیوں کی آمد بند ہو گئی تھی۔ اکبری فتنہ کا ہر ایک عنصر موجود تھا۔ مگر صرف ایک تریاق نے تمام زہریلے جراثیم کو ختم کر دیا تھا۔ درحقیقت یہ ہے وہ کامیابی جو مجدّد صاحب کی مجدّدیت کی روشن دلیل ہے۔

(۴) جبکہ اکبر دنیا میں امن و آشتی کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک مشترک دین کی تلقین کر رہا تھا، اور آسمان آئین و دانش کے تارے ابوالفضل، بیربل، راجہ ٹوڈرمل، مُلّا مبارک وغیرہ اس کے نورتن کے ماہ و پروین بنے ہوئے تھے۔ دنیا کی ہر ایک دولت قدموں پر تھی۔ ہر ایک فیروزمندی سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی، عظمت و جلالت کا سکّہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا حتیٰ کہ دین و مذہب کی لعنتوں سے بے نیاز ہو کر ہر ایک مذہب کا ہر ایک شہسوار اور سورما شاہی درشن کے وقت زمینِ نیاز پر سجدہ بیزی شروع کر دیتا تھا۔ تو کس کو خیال تھا کہ یہ مذہب جس کی بنیادیں اس قدر مضبوط ہیں، ایسا فنا ہو گا کہ تاریخ کی کتابوں میں بھی تفتیش و تحقیق کے بعد کچھ آثار مشکل سے مل سکیں گے

مگر دینِ اکبری کو فنا کے گھاٹ کس نے اُتارا؟

ہر فرعونے راموسیٰ۔ اکبر جیسے جلیل القدر شہنشاہ کے مقابلہ کے لئے شیخ احمد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چنانچہ شاہجہاں کے زمانہ میں ہندو عہدہ داروں کی تعداد زمانہ اکبر سے دوگنی تھی۔ ہندوؤں کی فارسی دانی سے اردو کی ترقّی ہوئی اور ایک جدید تہذیب نے جنم لیا۔ رگھناتھ شاہجہاں کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کا معتمد علیہ تھا۔ سعد اللہ خاں نے ہی اس کی تربیت کی تھی۔ سعد اللہ خاں کے مرنے کے بعد شاہجہاں نے اس کو ایک عرصہ تک سعد اللہ خاں کی جگہ وزارتِ عظمیٰ پر فائز رکھا اور رائے رایان کا خطاب دیا (تاریخ ہندوستان ص۲۶۹ جلد ۶)۔

چندر بھان کو رائے چندر بھان کا خطاب دیا گیا اور دار الانشاء (سکریٹریٹ) کے افسروں میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے راجہ مہاراجہ ہیں جن کو بڑی بڑی مہموں میں بڑی بڑی فوجوں کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ ازبکوں اور ایرانیوں نیز جنوبی ہند کے بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ میں راجپوت بہادر شاہجہاں کے دستِ راست رہے۔ وغیرہ وغیرہ

جیسا مجدّد بھیجا گیا۔

ملّتِ مصطفویہ پر ایک ہزار سال گذر جانے کے بہانہ اکبر نے دینِ الٰہی کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن خدا کے پاک بندے شیخ احمد مجدّد نے دنیا کو بتا دیا کہ یہ خاتم النّبیین کا مذہب ہے جس کے مقدّس دامنوں کو میدانِ حشر کے کناروں تک پھیلا دیا گیا ہے جو جو ان مقدّس دامنوں کو سمیٹنا چاہے گا وہ خود ہی سمٹ جائے گا۔ لا تزال طائفة من امّتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خذلهم حتّٰی یاتی امر الله۔

عالمگیر کے ناخلف جانشینوں نے مسلمانوں کی حکومت ختم کر دی۔ مگر الحمد للہ رُوحِ مذہبیت ختم نہ ہوئی اور حضرت مجدّد صاحب کے قابل جانشینوں نے اس کے بقاء و تحفّظ کی دوسری صورتیں پیدا کر لیں۔ جن کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ والحمد لله علیٰ ذٰلك۔

⑤ سلوک کے سلسلہ میں کامیابیوں کا بیان کرنا ہماری حیثیت سے بالا ہے نیز موضوعِ تاریخ سے بھی زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ ایک نمایاں حقیقت سامنے ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ توضیح یہ ہے کہ اگرچہ بقول ابوالفضل ہندوستان میں اصحابِ طریقت کے چودہ ۱۴ خانوادے تلقین وارشاد کی خدمت انجام دے رہے تھے لیکن سلسلہ چشتیہ کو نمایاں رسوخ حاصل تھا۔

وصول الی اللہ بہر حال بہترین مقصد ہے وہ جس خانوادہ کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو۔ مگر اس حقیقت کا انکار نہیں ہو سکتا کہ وجد و حال، سماع و غناء وغیرہ کے سلسلہ میں جو توسّع اور گنجائش سلسلہ چشتیہ وغیرہ میں ہے، اس کا اثر عوام پر بُرا پڑتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

به پنج بیضه که سلطاں ستم روا دارد
زنند لشکریانش هزار مرغ بسیخ

وسیع المشربی کو ترک کر کے اتّباعِ سُنّت کو اصل سلوک قرار دینا، اور اس کا جذبہ متوسّط درجہ کے مسلمانوں میں پیدا کرنا حضرت مجدّد صاحب کا کارنامہ ہے۔ جس کا دائرہ آج تک وسیع ہوتا جارہا ہے وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔ (اس کی توضیح و تفصیل کیلئے مولانا محمد طیّب صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو جو مرتبۂ مجدّد کی تحقیق کے سلسلہ میں اسی حصّہ کے آخر میں شامل کیا گیا ہے)۔

وفات حسرت آیات

وفات سے چند ماہ پہلے آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنی عمر تریسٹھ برس کی معلوم ہوتی ہے۔ اتّباعِ سُنّت کا شوق جس کو درجۂ فنا تک پہنچا چکا ہو، کیا عجب ہے، غیر اختیاری اُمور میں بھی اس کو مطابقتِ سُنّت کی توفیق نصیب ہو۔

اپنی عمر کے آخری شعبان میں حسبِ معمول پندرھویں شب کو عبادت کے لئے خلوت خانہ میں تشریف لے گئے تو بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ معلوم نہیں، آج کس کس کا نام دفترِ ہستی سے کاٹا گیا۔ یہ سن کر حضرت امامؒ نے فرمایا۔ تم تو بطور شک کہہ رہی ہو۔ کیا حال ہوگا اُس شخص کا جس نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو کہ اس کا نام دفترِ ہستی سے محو کیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد و ہدایت کا سب کام صاحبزادوں کے سُپرد کر دیا، اور اپنا تمام وقت قرآن مجید کی تلاوت اور افکار و اشغالِ طریقت میں صرف فرمانے لگے۔ سوا نماز کے خلوت سے باہر تشریف نہ لاتے تھے۔ نفل روزوں اور صدقات و خیرات کی بھی اس زمانہ میں بہت کثرت فرمائی۔

وسط ذی الحجہ میں حضرت کو ضیق النفس کی بیماری لاحق ہوئی۔ تپ محرقہ شروع ہوا۔ جو یوماً فیوماً ترقی کرتا چلا گیا۔ انہیں ایّام میں ایک روز فرمایا کہ حضرت پیرانِ پیر کو میں نے دیکھا، بڑی مہربانی مجھ پر فرمائی۔

۱۲؍ محرّم کو فرمایا کہ بس اب چالیس پچاس دن کے اندر مجھ کو اس عالم فانی سے

سفر کرنا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بتاریخ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ[1] تریسٹھ برس کی عمر میں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جس رات کی صبح کو آپ دنیا سے جانے والے تھے، حسبِ معمول تہجد کی نماز کے لئے اُٹھے اور بڑے اطمینان سے وضو کرکے نماز پڑھی اور خدام سے فرمایا کہ تم لوگوں نے تیمارداری میں بہت تکلیف اُٹھائی۔ اب آج یہ تکلیف ختم ہے۔ اخیر وقت میں ذکر اسمِ ذات کا بہت غلبہ تھا۔ ذکر کرتے کرتے روح مبارک رفیقِ اعلیٰ سے مِل گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

نمازِ جنازہ حضرت کے فرزند ثانی خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی اور اپنے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد صادقؒ کی قبر مبارک کے سامنے خاص شہر سرہند میں مدفون ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جس کے متعلق آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ میرے قلب کے انوار وہاں چمکتے ہیں۔

روضۂ مبارک کی تعریف میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی محدّث دہلوی مہاجر مدنی نے چند اشعار نظم فرمائے ہیں جو تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔

اے خاک پاک روضۂ عبیری و عنبری — کہ اہلِ جہاں ز بوئے تو مدہوش گشتہ اند
ساقی فشاند بر تو خوش آبے کہ اہل دہر — عاقل بہ پشت آمدہ مخمور رفتہ اند
سر زخاک خلد تو داری کہ اہلِ ارض — یک نفحہ از تو یافتہ بر چرخ رفتہ اند
نے نے تو از تربتِ یثرب سرشتہ اند — پنہاں ز روم و شام بہ سرہند ہشتہ اند
ایں خاک احمدی ست بذات احد نگر — نے یک کہ صد ہزار ازیں خاک جستہ اند
اہلاً و مرحباً چہ پلے زدار تو بسے — اقفال بُعد بر رُخِ اعدات بستہ اند
یارب مکن خلاص ازیں خاک ورمرا — بدحال آں کساں کہ ازیں خاک رستہ اند

---

[1] خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۶۱۸ جلد ا میں تاریخ وفات یکم صفر ۱۰۳۴ھ روز سہ شنبہ بوقت صبح درج ہے ۱۲ منہ

شیرے بخواب ناز بہ پہلوئے دو شبل[1] یارب چہ رازہاست کہ اینجا نہفتہ اند
تنہا غنی نہ نغمۂ مدح تو ساز کرد
کرّ و بیانِ عرشس ہمیں گونہ گفتہ اند

باقیات صالحات

اولاد ـــــ خلفاء ـــــ تصانیف

حق تعالےٰ نے آپ کو سات فرزند عطا فرمائے۔ چار کی وفات حضرت مجدّد صاحب کے سامنے ہوئی۔ تین فرزند آپ کے بعد مرکزِ فیوضات بنے۔

فرزندِ اوّل: حضرت خواجہ محمد صادقؒ جو حضرت مجدّد صاحب کے سامنے ہی وفات پاگئے۔ آپ مادر زاد ولی تھے۔ آغازِ عمر میں ہی ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے تھے۔ آپ کی حسن اور استعداد صلاحیّتِ طبع پر حضرت مجدد صاحب کو ناز تھا۔ آپ کو خود حضرت مجدّد صاحب اولیاء کبار میں شمار فرمایا کرتے تھے۔ وفات کے بعد سرہند شریف کی زمین کو متبرک سرزمین کہا کرتے تھے کیونکہ خواجہ محمد صادقؒ یہاں مدفون تھے اور آپ کی قبر شریف انوار و رحمت کا خزانہ تھی۔

حضرت مجدّد صاحب کو آپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ مکتوباتِ قدسیہ میں اس صدمہ کا اور آپ کے کمالات کا ذکر موجود ہے۔ سنِ ولادت ۱۰۰۰ھ، وفات ۹ ربیع الاوّل ۱۰۲۵ھ۔ کُل عمر ۲۵ سال۔

فرزند دوم: حضرت خواجہ محمد سعیدؒ (المعروف) بخازن الرحمۃ۔ ولادت ۱۰۰۵ھ۔ وفات ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۰۷۰ھ (ذکر آگے آئے گا انشاء اللہ تعالےٰ)۔

فرزند سوم: حضرت خواجہ محمد معصوم ملقب بعروۃ الوثقیٰ۔ طریقہ کی

---

[1] شبل: بچہ شیر ۱۲

اشاعت آپ سے بہت زیادہ ہوئی۔ دہلی کی مشہورِ عالم خانقاہ جو مرجعِ عرب و عجم تھی، آپ ہی کے سلسلہ کی ہے۔ ولادت باسعادت ۱۰۰۷ھ۔ وفات ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ۔

فرزند چہارم: حضرت خواجہ شاہ محمد یحییٰ۔ حضرت مجدد صاحب کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۹ سال تھی تحصیلِ علوم اور تکمیلِ طریقت اپنے بھائیوں سے کی۔ وفات ۱۰۹۶ھ۔

تین فرزند اور تھے:

۱: محمد اشرف

۲: محمد فرخ۔ ۱۸ سال کی عمر میں قضا کر گئے۔

۳: محمد عیسیٰ۔ ۸ سال کی عمر میں رخصت ہوگئے (خزینۃ الاصفیاء ص۶۱۰)۔

آپ کی ذریاتِ طیبات کا یہ حال ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ نے پہلی ہی نظر میں ان کو پہچان لیا تھا، اور فرمایا تھا:

"فرزندانِ آں شیخ کہ اطفال اند اسرارِ الٰہی اند۔"

صاحبِ روضۃ السلام کا قول خزینۃ الاصفیاء میں نقل ہے:

"شیخ احمدؒ را دو خارقِ عظیم بر صفحۂ روزگار باقی اند۔ یکے کتاب مکتوبات و دیگر رسائل مصنفہ وے کہ اخدے از مشائخ ایں چنیں معارف و حقائق و مکاشفات خود برملا درج تالیفات خود نہ کردہ است کہ وے فرمود۔ دوم فرزندانِ گرامی وے کہ بتصرفِ خود ایشاں را از روئے علمِ ظاہر و کمالاتِ باطنی مثل ذات خود ساخت"۔

(خزینۃ الاصفیاء ص۶۱۰ جلد ۱)

خلفاء: خلفاء کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ البتہ مکتوبات کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے برکاتِ مبارکہ صرف حدودِ ہندوستان میں محدود نہ تھے، بیرونِ ہند کے بہت سے حضرات ہیں جن کے نام مکتوبات ارسال فرمائے گئے

ہیں۔ جہانگیر کی تحریر پہلے گذر چکی ہے کہ ہر شہر اور دیار میں آپ کے خلفاء موجود ہیں۔ چند خلفاء کرام کا ذکر اسی حصّہ کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے (انشاء اللہ تعالیٰ)

الکلام المنجی میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی خلفاء کے سلسلہ میں تحریر ہیں جو اپنے زمانہ کے مشہور و معروف علماء اور اکابر اولیاء تھے۔

شیخ حمید بنگالیؒ۔ شیخ عبدالحیؒ۔ شیخ نور محمد فتنیؒ۔ شیخ مزمل پوربیؒ۔ شیخ نور محمد بہلدیؒ۔ شیخ حامد بہاریؒ۔ مولانا فرخ حسینؒ۔ سید باقر سارنگ پوریؒ۔ سید محب اللہ مانک پوریؒ۔ سید حسین مانک پوریؒ۔ مولانا شیخ عبدالہادیؒ بدایونی۔ شیخ طاہر لاہوریؒ۔ مولانا امان اللہ لاہوریؒ۔ شیخ طاہرؒ بدخشی۔ الحاج خضر افغانؒ۔ مولانا صادق کابلیؒ۔ مولانا محمد ہاشمؒ (خادم) خواجہ محمد ہاشمؒ برہان پوری۔ مرشد میرزمان بیگؒ۔ شیخ فضل اللہ برہان پوریؒ۔ مولانا حمیدالدین احمد آبادیؒ۔ حاجی حسینؒ۔ شیخ داؤد سانگیؒ۔ مولانا غازیؒ نوگجراتی۔ میر محمد نعمانؒ اکبرآبادی۔ خواجہ محمد صدیقؒ کشمی دہلوی۔ شیخ بدیع الدینؒ سہارن پوری۔ شیخ احمد دیبنیؒ (دیوبندی)۔ شیخ عبدالقادرؒ ابنالکی۔ شیخ محمد مریؒ۔ شیخ سلیمؒ بنوری۔ شیخ آدم بنوریؒ۔ مولانا بدرالدینؒ سہرندی۔ شیخ خضر بہلول پوریؒ۔ مولانا محمد یوسفؒ سمرقندی۔ مولانا عبدالغفورؒ سمرقندی۔ مولانا محمد صالح کولابیؒ۔ شیخ کریم الدینؒ باباحسنؒ۔ ابدالیؒ۔ الحاج محمد فرکتیؒ۔ مولانا یار محمدؒ قدیم طالقانی۔ مولانا یار محمد جدید۔ صوفی قربان قدیمؒ۔ صوفی قربانؒ جدید ارگنجی۔ مولانا قاسم علیؒ۔ شیخ حسن ترکیؒ۔ شیخ یوسف برکیؒ۔ شیخ عبدالرحیمؒ برکی۔ مولانا صغیر احمدؒ رومی حنفی۔ شیخ عبدالعزیز نحویؒ مغربی مالکی یا حنبلی۔ شیخ علی المحققؒ مالکی مدنی۔ شیخ زین العابدینؒ۔ شیخ علی طبریؒ شافعی مکیؒ۔ شیخ احمد استنبولی حنفی فقیہ عثمانی یمنی شافعی۔ سید مبارک شاہ بخاریؒ۔ مولانا حسنؒ بخاری۔ قاضی تولک بخاری۔ شیخ عیسیٰؒ مغربی محدث۔ شیخ محمد مدنیؒ صاحبزادگان گرامی وغیرہ (الکلام المنجی ص۲)۔

تصانیف | مکتوبات[۱] قدسیہ جو در حقیقت علوم و معارف کا بہترین خزانہ ہیں۔ مبدا[۲] و معاد۔ معارف[۳] لدنیہ۔ مکاشفات[۴] غیبیہ۔ شرح[۵] رباعیات عارف باللہ خواجہ

محمد باقی۔ رسالہ[6] تہلیلیہ، رسالہ ردّ روافض۔ رسالہ[7] فی اثبات النّبوت۔ رسالہ[8] بسلسلۂ حدیث وغیرہ۔

باطنی کمالات

مندرجہ بالا عنوان ہمارے لئے بہت دشوار ہے۔ مثل مشہور ہے "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ بدقسمتی یہ ہے کہ باطنی کمالات کے نہ ہم بادشاہ ہیں نہ جوہری۔

سراپا ظاہرش نورست و جان ست
مپرس از باطنش کانِ بے نشان ست

مکاشفات و کرامات کو عام طور پر کمالات تصوّر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صوفیاء کرام کی سوانح انہیں چیزوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

حضرت مجدّد صاحب ان چیزوں کو کمالاتِ اصلیہ نہیں تصوّر فرماتے۔ بلکہ ایک جگہ تو ان کو "بچوں کے کھلونے" فرمادیا ہے۔ ارشاد و تلقین کی کثرت یعنی مریدوں کی بہتات، حلقۂ ذکر کی وسعت، فراخی بھی حضرت مجدّد صاحب کے نزدیک "راستہ کی پڑی ہوئی چیز ہے"۔ دریں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت و الّا لا۔

(مکتوب ۶ جلد دوم ۱۶)

عنوان کی دشواری قلم رکھ دینے پر مجبور کر رہی ہے۔ مگر مقصود تصنیف ناتمام

[1] مجموعہ کنز البرکات، احوال امام ربّانی ص۱۱۱ میں ہے:

آوازہ ارشاد ایشاں بجہان جہانیاں رسید۔ وغلبانگ ہدایت بلند بہ عالم وعالمیان گردید۔ کوس قطبیت بنام ایشاں زدند ونقارۂ غوثیت باسمِ آنجناب نواختند۔ نورِ ولایت، و برکات و ظہورِ کرامات وخوارق عادات، از ایشاں آں قدر ظاہر گردید کہ از تحریر و تقریر بیرون ست۔ وکشف مقاماتِ قربِ الٰہی بہ آنجناب بمرتبہ رسید کہ از بیان وتبیان افزوں ست۔ پھر ص۱۲۲ پر ہے خوارق وکراماتِ ایشاں ہفت نوشتہ اند ۱۲ (خطبہ شوقیہ)

رہ جائے گا۔ اگر کچھ بھی ظاہر نہ کیا جائے کہ اسلام کے اس سیاسی جانباز نے روحانیت میں کس قدر بلند درجہ حاصل کیا تھا۔

اسلام سب سے پہلے اپنے پیرو سے کہلواتا ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	میری نماز، میری تمام قربانیاں، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العلمین کے لئے ہے۔

پھر وہ مقدس تعلیم پیش کرتا ہے جس کی روشنی میں سیاست، اقتصاد، معاشرت، امو نمانہ داری غرض نوعِ انسان کی زندگی کا ہر شعبہ عبادت بن جاتا ہے، اور پھر یہی شریعت عین طریقت ہوتی ہے۔

اس لئے لازم ہے کہ ایک مومنِ قانت، پکّا اور سچّا مسلمان ان جملہ شعبہ جات میں مہارت رکھتا ہو، اور پھر اس مہارت کے بموجب وہ رُوحانیت اور طریقت میں بھی درجہ بلند اور رتبہ عالی رکھتا ہو۔

تفصیلی کرامات، خوارقِ عادات، تصرّفات وغیرہ کو حالات مشائخ نقشبند مقامات وحالات امام ربانی، برکاتِ احمدیہ، حضرات القدس، کنز البرکات وغیرہ کے حوالہ کرتے ہوئے چند اصولی چیزیں درجِ ذیل ہیں جن سے رُوحانیت کے سلسلہ میں مراتب حضرت مجدد صاحب کی بلندی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آیۃ مذکورہ کا حاصل تسلیم و رضا ہے۔ یہی حیاتِ مسلم کا نصب العین ہے اور یہی عبدیت اور بندگی کی حقیقی تفسیر ہے۔ کامل بندہ وہی ہے جو اپنے عجز و قصور، اپنی بے حقیقتی اور اپنی بے بضاعتی کو سامنے رکھ کر خود کو ہیچ در ہیچ تصوّر کرے۔ پھر یہ تصوّر، تصوّر ہی نہ رہے بلکہ یقین بن جائے۔ حتّٰی کہ اس کا ارادہ، اس کی تمنّا وغیرہ ہر ایک چیز فنا ہو جائے صرف ذاتِ حق جل مجدہٗ اس کے سامنے ہو۔ وہ اُس کا ہو اور اُس کے لئے ہو۔ حضرت حق جل مجدہ کا ارادہ اس کی تمنا ہو، مشیتِ الٰہی اس کی آرزو ہو۔ اپنے ارادہ اور تمنّا حتّٰی کہ

اپنی ہستی اور اپنے وجود سے وہ اتنا غافل ہو جائے کہ بھولے سے بھی اس کا تصوّر نہ آئے۔

فنائے ارادہ، فنائے مراد، فنائے تمنّا اور فنا فی اللہ کی یہ شان طبیعت پر جبر کر کے پیدا ہوگی۔ یہ تسلیم و رضا کی ابتداء ہے۔ حضرت مجدّد صاحب مکتوب ۳۶ جلد ا ص ۵۰ پر فرماتے ہیں:

"از جمیع اینہا گذشتہ بمقام رضا باید رسید کہ نہایت مقامات سلوک ست [۱]"۔

یہ فنائیت عادتِ ثانیہ بن جائے۔ طبیعت پر جبر و قہر بالکل نہ ہے۔ یہ درجہ بلند ہے، اور اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ وہ اس کیفیت سے لذّت اندوز ہو۔ ارادۂ الٰہی کے مقابلہ پر اپنے نامراد ہونے میں اس کو لذّت آئے۔ اپنی تمنّا سے زیادہ مشیّتِ الٰہی اس کو محبوب ہو۔ ہر ایک اذیّت اور تکلیف اُس کو راحت و آرام معلوم ہو۔ یہ درجۂ محبّت ہے۔ یہ مرتبہ سب سے بلند ہے۔

حضرت مجدد صاحب مکتوب ۳۳ جلد دوم ص ۴۸ میں تحریر فرماتے ہیں:
محبوب نظرِ محب میں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت اور واقع کے لحاظ سے ہر وقت محبوب ہی ہے۔ محبوب ہر ایک حالت میں محبوب ہے۔ اگر تکلیف پہنچائے تب بھی محبوب، راحت دے تب بھی محبوب۔

جو حضرات دولتِ محبّت سے مشرف ہوں، اُن کے خیال میں عموماً انعام اور ایلام دونوں صورتوں میں مساوی طور پر محبّت کی زیادتی ہے اور بہت تھوڑے حضرات ہیں جن کے نزدیک اس کا عکس ہے۔

دولت مندانِ محبّت کی بہت مختصر سی جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انعام و اکرام کے مقابلہ میں تکلیف و ایلام زیادہ محبّت بخش ہے۔ بہر حال دولت مندانِ محبّت اپنے

---

[۱] وجد و حال، علوم و معارف جس کا ذکر مکتوب گرامی کی سطر بالا میں ہے، ان تمام سے گذر کر "مقامِ رضا" پر پہنچنا چاہیے جو مقاماتِ سلوک کی انتہا ہے ۱۲

محبوب کے متعلق ہر ایک حالت میں بہترین عقیدہ اور بہترین ظن رکھتے ہیں۔ وہ ہر صورت میں کرشمہ ہائے محبّت ہی سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

گلے پر چھری چلا کر بدن کا ایک ایک عضو جُدا کرے، نظرِ محبّ میں یہ بھی لُطف و کرم ہے اور اپنے حق میں عین صلاح اور بہبود۔

جب اس حُسنِ اعتقاد کے حاصل ہو جانے سے نظرِ محبّ میں فعلِ محبوب کی کراہت اور ناگواری، لذّت و راحت سے بدل جائے تو وہ اب محبّتِ ذاتی کی دولت سے مشرف ہوا۔ جو حبیب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص وصف ہے اور صرف آپ کے ساتھ ہی یہ وصف مخصوص ہے۔

اس صورت میں رنج و الم، انعام و اکرام سے زیادہ لذّت و فرحت کا سبب ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مرتبہ رضا سے بلند ہے کیونکہ مرتبۂ رضا میں صرف یہ ہے کہ ایذاء و ایلامِ محبوب پر راضی ہے، یہ ضروری نہیں کہ طبیعت میں ناگواری بھی نہ ہو۔ اور اس مرتبہ میں ناگواری کا تو ذکر ہی کیا، ایذاء و ایلامِ محبوب میں انعام و اکرام سے بہت زیادہ لُطف حاصل ہوتا ہے۔ جانبِ محبوب سے جس قدر جفا زیادہ ہو، جانبِ محبّ سے فرح اور سرور زیادہ ہوگا۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اصل مکتوب شریف)۔

بہرحال رُوحانی کمالات میں مقامِ رضا سب سے بلند مقام ہے اور مقامِ محبّت اس سے بھی بلند، جو رحمۃ للعالمین محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص وصف ہے۔ یعنی اس کا سرچشمہ صرف ذاتِ اقدس رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مکتوبات جو جیل خانہ سے آپ نے بھیجے ہیں، اُن پر نظرِ ثانی کرو۔ بالخصوص اس مکتوب شریف کو دیکھو جس کو بجنبہ اصل عبارت[1]

---

[1] جس کا عنوان ہم نے "حاصلِ قید" قائم کیا ہے ۱۲ محمد میاں غفراللہ۔

کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اور حضرت مجدّد صاحب کے بلند ترین مرتبہ اور مقام کا اندازہ کر لو۔

پھر اس کے بعد حضرت مجدّد صاحب کا مکتوب ۶ صلا ۱۶ جلد ۲ دیکھو۔ جو بجنسہٖ درجِ ذیل ہے اور جس کی شرح اور تفصیل بھی اربابِ ذوق کے حوالہ ہے۔

انگارم کہ مقصود از آفرینش من آں ست کہ ولایت محمدی بولایتِ ابراہیمی علیہما الصلوات والتحیات منصبغ گردد و حسنِ ملاحت ایں ولایت باجمالِ صباحت آں ولایت متمزج شود۔ و ردّ فی الحدیث اخی یوسف اصبح وانا املح بایں انصباغ و امتزاج مقامِ محبوبیتِ محمّدیہ بدرجہ علیا رسد ماناکہ مقصود از امر باتّباعِ ملتِ ابراہیم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسّلام محصولِ این دولتِ عظمیٰ بودہ است وطلب صلوات و برکات مماثل صلوات[1] و برکات حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسّلام از برائے ایں غرض بودہ (پھر بفاصلہ چند سطور) وآنچہ مقصود از آفرینش خود می دانستم معلوم شد کہ بحصول پیوست ومسئول ہزار سالہ باجابت قرین گشت الحمد للہ الذی جعلنی صلۃ[2] بین البحرین و مصلحًا بین الفئتین الکمل الحمد علیٰ کل حال والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ خیر الانام وعلیٰ اخوانہ الکرام من الانبیاء و

---

[1] اشارہ ہے اس درود کی طرف جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس درود میں دعا ہے کہ یا اللہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد پر جیسی صلوات وبرکات نازل ہوئیں ایسی ہی صلوات وبرکات محمّد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی آل پر نازل کر ۱۲ [2] علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں ایک پیشگوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل کی ہے کہ یکون فی اُمّتی رجل یقال لہ صلۃ یدخل الجنّۃ بشفاعتہ کذا وکذا۔ خدا کی قدرت کہ یہی لفظ صلہ حضرت امام ربّانی کے قلم سے اپنے لئے نکل گیا۔ اس امتِ مرحومہ میں آپ سے پہلے یہ لفظ اپنے لئے کسی نے نہیں استعمال کیا۔ ان فی ذٰلک لآیات ۱۲

الملائکۃ العظام (پھر بفاصلۂ چند سطور) اے فرزند باوجود ایں معاملہ کہ بخلقت من مربوط بودہ است کارخانۂ دیگر عظیم بمن حوالہ فرمودہ اند، برائے پیری و مریدی مرانیاوردہ اند و مقصود از خلقتِ من تکمیل و ارشادِ خلق نیست، معاملہ دیگر است و کارخانۂ دیگر دریں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت و اِلّا لا معاملہ تکمیل و ارشاد نسبت بآں کارخانہ امرے است، ہمچوں مطروح فی الطریق دعوات انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والتّسلیمات نسبت بمعاملات باطنیہ ایشاں ہمیں حکم دارد ہر چند منصب نبوّت ختم یافتہ است، اما از کمالاتِ نبوّت و خصائص آں بتطرایق تبعیت و وراثت کمل تابعاں انبیاء رانصیب است۔ (مکتوب ۶ جلد ۲ صـ۱۶)

مکتوب ۷، جلد دوم صـ۱۷ و صـ۱۸ میں محبّت، محبوبیت، مُحبّیت کے فرقِ مراتب بیان فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

فوق مقامِ رضا قدمے نیست مگر خاتم الرسل علیہ و علیہم الصّلوٰۃ و التّسلیمات ازاں مقام خبر دادہ۔

پھر چند سطر بعد فرماتے ہیں:

جائز ست کہ دراں موطن خاص کہ فوقِ مقامِ رضاست، خادمے را از خادمانِ ایشاں بوراثت و تبعیت، جا دہند و بطفیل محرم آں بارگاہ سازندے از کریماں کارہا دشوار نیست الخ

ان بلند ترین مراتب اور مقامات کی تفصیل موضوع کتاب سے خارج ہے۔ اربابِ ذوق، مکتوبات شریف نیز مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم، مکتوبات حضرت مرزا مظہر جان جاناں، الکلام المنجی، زبدۃ المقامات، انوار احمدیہ، ہدیہ مجددیہ وغیرہ سے ان کی تفصیلات معلوم فرما سکتے ہیں

(۲) پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہٗ نے طریقہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں مختلف حضرات سے حاصل کی تھی۔ اس سلسلہ میں دو چیزیں حضرت مجدّد صاحب کے رُوحانی کمال اور آپ کی رُوحانی عظمت پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں۔

الف: حضرت خواجہ محمد باقی باللہ اویسیؒ نقشبندی جو سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مجدّد صاحب کے شیخ طریقت تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پیر مرشد حضرت خواجہ امکنکی نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ہندوستان پہنچ کر اس سلسلۂ عالیہ کو رواج دوں۔ یہ بہت بڑی خدمت تھی جس کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں نے معذرت کی مگر حضرت شیخ نے استخارہ کا حکم فرمایا۔

استخارہ میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک درخت کی شاخ پر ایک خوبصورت طوطی بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ طوطی ہمارے ہاتھ پر آبیٹھے تو اس سپرد شدہ خدمت میں بہت کامیابی ہو۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ طوطی شاخِ درخت سے پرواز کرکے میرے ہاتھ پر آبیٹھی۔ میں نے اس طوطی کی چونچ میں اپنا لعاب دہن ڈالا، اور اس طوطی نے میرے منہ میں شکر ڈالی۔

صبح کو میں نے اپنے استخارہ کا یہ واقعہ حضرت شیخ خواجہ امکنکی کو سُنایا۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ طوطی ہندوستان میں ہوتی ہے لہٰذا تمہیں بہت جلد ہندوستان جانا چاہیئے۔ امید ہے کہ ہندوستان میں تمہارے دامن سے ایک عزیز وجود پذیر ہوگا۔ جس سے ایک عالم منوّر ہو جائے گا اور تمہیں بھی ان سے فائدہ پہنچے گا۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ فرماتے ہیں کہ جب میں وطن سے روانہ ہو کر ہندوستان میں سرہند پہنچا تو مجھے (نظرِ کشفی سے) بتایا گیا کہ "ایک قطب کے قریب تم فروکش ہوئے ہو"۔ اس قطب کے حلیہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ اگلے صبح کو اس قطب کی جستجو میں سرہند کے تمام گوشہ نشین اور درویش حضرات سے ملاقات کی۔ مگر جن جن حضرات

سے ملاقات ہوئی، اُن میں سے نہ کسی کے اندر قطبیت کے آثار و حالات نظر آئے، اور نہ اس حلیہ کا کوئی شخص ملا۔ بالآخر یہی خیال کیا کہ شاید اس شہر کا کوئی شخص آئندہ اس مرتبہ کو پہنچ جائے اور اس وقت وہ صرف قابلیت اور استعداد رکھتا ہو اب جب آپ تشریف لائے، تو جیسے ہی مَیں نے آپ کو دیکھا وہ حلیہ یاد آ گیا۔ آپ کو اس حلیہ کے مطابق پایا۔ اور اس قابلیت کی علامتیں بھی تمہارے اندر موجود ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت خواجہ نے یہ بھی فرمایا کہ قیامِ سرہند کے زمانہ میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرہند میں ہم نے ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا ہے۔ جس کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے اور دوسرے آدمی اس چراغ سے بہت سے چراغ روشن کر رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کے متعلق ہی اشارہ تھا[1]۔ اس کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے کسی دوست کو تحریر فرمایا:

شیخ احمد[2] نام مردے ست از سہرند، کثیر العلم و قوی العمل روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کردہ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمودہ بآں ماند کہ چراغ شود کہ عالمہا ازو روشن گردد۔

الحمد للہ[3] تعالیٰ احوالِ کاملہ او مرا بیقین پیوستہ و ایں شیخ

---

[1] ہدیہ مجددیہ ص۸۵ و ص۸۶ ۱۲۔ [2] شیخ احمد سرہند کے ایک صاحب ہیں۔ کثیر العلم، قوی العمل۔ چند روز فقیر کے ساتھ نشست و برخاست کی۔ ان کے اوقات و حالات سے بہت سے عجائبات مشاہدہ میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک چراغ ہوں گے جن سے بہت سے جہان روشن ہوں گے۔ [3] الحمد للہ اس کے احوالِ کاملہ کا مجھ کو یقین ہو گیا ہے۔ اس شیخ کے برادر اور اقربا تمام ہی مرد صالح اور علماء ہیں۔ چند صاحبان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا ہے طبیعتیں بلند اور عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ ان کے فرزند جو ابھی بچّے ہیں "اسرار الٰہی" ہیں مختصر یہ کہ شجرۂ طیبہ ہے جس کو خدا نے اچھی طرح جمایا اور اُگایا ہے۔

مشارٌ الیہ برادران و اقربا دارد۔ ہمہ مردم صالح و از طبقۂ علماء چندے را دعا گوئے ملازمت کردہ۔ جواہر عالیہ دانستہ استعدادہائے عجیب دارند۔ فرزندانِ آں شیخ کہ اطفال اند اسرار الٰہی اند۔ بالجملہ شجرۂ طیّبہ ست انبتہ اللہ نباتاً حسناً۔

اس کے بعد حضرت خواجہ فرمایا کرتے تھے:

شیخ[1] احمد آفتابے ست کہ مثل ماہزاراں ستارہا در سایۂ او گُم اند۔

(ہدیہ مجدّدیہ ص۸۶ حالات مشائخ نقشبند و مقامات امام ربّانی وغیرہ)

حضرت خواجہ نے سلسلۂ ارشاد و تلقین حضرت مجدد صاحب کے حوالہ فرما دیا، تو فرمایا کرتے تھے:

امروز در زیر فلک ازیں طائفہ علیہ چوں ایشاں نیست۔ ایشاں از مکمّل مراداں و محبوباں اند۔ ایشاں قطب اند۔ بعد از صحابہ و کمل تابعین و مجتہدین چوں ایشاں معدودے چند از اخص الخواص بنظر در می آیند۔ ما دریں سہ چہار سال شیخی نہ کردیم۔ چند روز بازی کردیم۔ اما الحمد للہ والمنۃ کہ ایں بازی دریں دکان پردازیٔ ما بے فائدہ نہ شد کہ چوں ایشانے بروئے کار آمد۔

(مقاماتِ امام ربانی ص۳۹)

---

[1] شیخ احمد وہ آفتاب ہیں کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کے پرتو میں گُم ہو جاتے ہیں۔

[2] دورِ حاضر میں اس جماعتِ عالیہ (جماعتِ درویشاں) میں آسمان کے نیچے ان کی کوئی نظیر نہیں یہ مکمّل مراد اور مکمّل محبوب ہیں۔ قطب ہیں۔ صحابہ، تابعین، کاملین اور آئمہ مجتہدین کے بعد ان جیسے اخص الخواص معدودے چند نظر آتے ہیں۔ ان تین چار سال میں ہم نے مرشدی نہیں کی۔ چند روز ہم نے بازی لگائی۔ مگر الحمد للہ والمنۃ کہ ہماری بازی اور ہماری دکان پردازی بے فائدہ نہیں رہی۔ جبکہ ان جیسا شخص بروئے کار آگیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ:

شیخ[1] باقی باللہ ہمہ مریداں و احباب و اصحاب خود را برائے توجہ و تکمیل حوالہ وے مے فرمود و خود ہم برائے استفادہ در محفل توجہ وے تشریف مے آورد و وے فرمود کہ شیخ احمد آفتابے ست کہ ہر دو عالم از فیض و فضل وے منوّر است (خزینۃ الاصفیا ص۶۰۹ ج ا)

حضرت خواجہ نے ایک مکتوب حضرت مجدّد صاحب کے نام ارسال فرمایا۔ مکتوب کے مطالعہ سے حضرت مجدّد صاحب کے مرتبہ عالی کے ساتھ حضرت خواجہ کے بے نظیر اور سبق آموز انکسار و تواضع کا اندازہ ہوتا ہے۔

مکتوب گرامی کا پہلا جملہ ہے:

مدّتے[2] ست کہ عرض نیاز مندی بدرگاہِ ولایت نہ کردہ ام۔

دو سطر میں مضمون مکتوب ہے۔ اس کے بعد آخری فقرہ یہ ہے:

دیگر[3] چہ نویسم سخن درویشاں بحضرت شما نوشتن بغایت بے شرمی ست حکایت اوضاع صوفیہ بغایت بے جا۔ الغرض مارا حدِ خود باید دانست و از فضول احتراز باید کرد (مقامات امام ربّانی ص۳۹)۔

شاہزادہ دارا شکوہ نے اپنے اور شاہجہاں کے استاد مُلّا شیخ میرک ابنِ فصیح الدین رحمہما اللہ کا ایک طویل واقعہ بیان کیا ہے۔

---

[1] شیخ باقی باللہ نے اپنے تمام مریدوں اور احباب و اصحاب کو توجہ اور تکمیل کے لئے حضرت مجدّد صاحب کے حوالہ فرما دیا تھا اور خود ہی استفادہ کے لئے ان کی محفلِ توجہ میں تشریف لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ شیخ احمد ایک ایسا آفتاب ہے کہ ان کے فیض و فضل سے دونوں عالم منور ہیں۔ [2] عرصہ سے دربارِ ولایت میں عریضہ نیاز ارسال نہیں کیا۔ [3] اور کیا لکھوں۔ آپ کی بارگاہ میں درویشوں کی بات لکھنا انتہا درجہ بے شرمی ہے اور حالات صوفیاء کی حکایت غایت درجہ بے موقعہ۔ الغرض ہمیں اپنی حد پیش نظر رکھنی چاہیئے اور بے کار بات سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس کے آخر میں مُلّا میرک شاہ صاحب فرماتے ہیں :

ہر[1] چہار سوال کہ در خاطرِ من خطور کرد، شیخ احمد جواب آں وافی و کافی داد پس معتقد و مرید گشتم۔

مولانا[2] عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی جو مشہور و معروف جلیل القدر عالم ہیں ابتدا میں حضرت مجدّد صاحب کے مخالف تھے۔ ایک روز حضرت مجدّد صاحب کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے مولانا عبدالحکیم صاحب کو مخاطب فرما کر یہ آیت پڑھی۔

قل اللہ ثمّ ذرھم۔ کہو اللہ پھر اُن کو چھوڑ دو۔

اس آیت کے سُنتے ہی حضرت شیخ کا جذب اور شوقِ الٰہی دل میں جگہ کر گیا اور فوراً قلب سے ذکر جاری ہو گیا۔ جب خواب سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ قلب ذکر میں جاری ہے۔ اس کمال و تصرّف کو دیکھ کر ساری مخالفت ختم ہو گئی۔ حضرت مجدّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باقاعدہ سلسلہ میں داخل ہوئے، اور روحانی کمالات حاصل کئے۔

علماء ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا موصوف نے ہی حضرت شیخ احمد صاحب کو مجدّد الف ثانی لکھا ہے (خزینۃ الاصفیاء صـ۶۱۴، الکلام المنجی وغیرہ)۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حضرت مجدّد صاحب کے مناقب و محامد تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

---

[1] چار سوال جو میرے دل میں آئے تھے (جن کا ذکر بھی حضرت مجدّد صاحب کے سامنے نہیں ہوا تھا) مجدّد صاحب نے از خود ان کا کافی اور شافی جواب دے دیا۔ پس میں معتقد اور مرید ہو گیا۔ [2] مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی مشہور و معروف عالم ہیں۔ علوم ظاہری اور باطنی کے بہترین ماہر۔ آپ کی گراں قدر تصنیفات عالمِ اسلامی میں خاص شہرت رکھتی ہیں شاہجہاں کے مشیر خاص رہے ہیں۔ شاہجہاں نے دو مرتبہ ان کی برابر سونا تُلوا کر ان کی خدمت میں پیش کیا اور بہت کچھ جاگیر و عطیات پیش خدمت کئے (مفصّل تذکرہ انشاء اللہ آگے آئے گا)۔

لا یحبه الا مؤمن تقی، ولا	مومن پرہیزگار آپ سے محبت کرتے ہیں
یبغضه الا منافق شقی۔	اور بدبخت منافق آپ سے بغض رکھتے ہیں[1]

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بشارت دی کہ تم علم کلام کے مجتہد[2] ہو۔ شیخ بدرالدین صاحب خلیفہ حضرت مجدد صاحب مصنف حضرت القدس فرماتے ہیں۔ ایک روز حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے میں مشرف ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت والا! مجھے اپنی نسبت سے بہرہ مند فرمائیں۔ حضرت خواجہ نے جواب دیا تم نے ایسے شخص سے نسبت حاصل کی کہ اس کی رہنمائی تمہارے لئے بھی کافی اور سارے عالم کے لئے کافی ہو سکتی ہے[3]۔

جمع الجوامع میں علامہ سیوطیؒ نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یکون فی امتی رجل	میرے امت میں ایک شخص ہوگا۔
یقال له صلة یدخل	جس کو صلہ (جوڑنے والا) کہا جائے گا
الجنة بشفاعته کذا	اس کی شفاعت سے بیشمار آدمی
وکذا من الناس۔	جنت میں داخل ہوں گے۔

شیخ بدرالدین قدس اللہ سرہ العزیز کتاب مذکور میں فرماتے ہیں، کہ ہمارا خیال ہے کہ اس بشارت کے مصداق حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہیں۔

حضرت مجدد صاحب نے خود بھی یہ لفظ ایک مکتوب میں استعمال فرمایا ہے۔

الحمد للہ الذی جعلنی صلة بین البحرین ومصلحاً بین الفئتین۔ (خدا کا شکر ہے اُس نے مجھے دو سمندروں میں صلہ (وصل پیدا کرنے

---

[1] مکتوبات حضرت شاہ غلام علی صاحب بحوالہ خطبہ شوقیہ۔ [2] حالات مشائخ نقشبندیہ، ص۲۰۲۔ [3] خزینۃ الاصفیاء ص۶۱۱ جلد۱۔

والا) اور دو جماعتوں میں صلح قائم کرنے والا بنایا ہے)۔

چنانچہ صوفیاء کرام کی دو جماعتیں یعنی علماء شریعت اور صوفیاء کرام (جو وحدت الوجود کے قائل ہیں، ان دونوں جماعتوں کے افتراق کو جو اس مسئلہ کے متعلق عرصہ سے چلا آرہا تھا، پیوندِ صلح سے جوڑ دیا۔[1]

جملہ مشائخِ طریقت کی جانب سے عطیۂ خلافت اور سلسلۂ قادریہ میں تکمیلِ مکمل۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز حلقۂ مریدین میں مراقبہ میں مشغول ہیں۔ حضرت شاہ سکندر[2] صاحب نبیرہ حضرت شاہ کمال[3] صاحب کیتھلی قدس اللہ سرہما حاضر ہوتے ہیں اور ایک خرقہ حضرت مجدد صاحب کے دوشِ مبارک پر ڈال دیتے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب مراقبہ سے فارغ ہوئے۔ حضرت شاہ سکندر صاحب کو تشریف فرما پایا۔ کھڑے ہوئے، معانقہ کیا اور اعزاز و اکرام سے بٹھایا۔

حضرت شاہ سکندر صاحبؒ نے فرمایا۔ یہ خرقہ جو دوشِ مبارک پر ڈالا ہے۔ وہ مبارک جبہ ہے جو حضرت شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کی یادگار ہے جو ہمارے ہاں پشتہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ حضرت جدّامجد (شاہ کمال کیتھلی) نے وفات کے وقت میرے حوالہ کرکے فرمایا تھا کہ یہ امانت ہے، اس کو اپنے پاس رکھو، جس کو ہم بتائیں گے، اُن کو دے دینا۔

کچھ عرصہ سے حضرت جدّ امجد مجھے تاکید فرما رہے تھے کہ یہ جُبّہ جناب کے حوالہ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص۶۰۹۔ [2] حضرت مجدد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آفتاب پر نظر ڈالی جا سکتی ہے مگر حضرت شاہ سکندر کے قلب مبارک کی تابانی و درخشانی اس قدر تیز ہے کہ اس پر نظر نہیں پڑ سکتی ۱۲۔ [3] ان کا تذکرہ پہلے بھی گذرا ہے۔ حضرت مجدد صاحب کی پیدائش کے وقت آپ بقیدِ حیات تھے۔ حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ عبدالقادر قدس اللہ سرہ العزیز کے بعد حضرت شاہ کمال کیتھلی کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

کر دوں - میری طبیعت نہیں چاہتی تھی کہ اس گراں قدر دولت کو اپنے پاس سے جُدا کروں - مگر جب رُوحِ مبارک حضرت جدّ امجد قدس سرہٗ کا اصرار زیادہ بڑھا حتّٰی کہ عدم تعمیل کی صورت میں مجھ کو دھمکایا بھی گیا تو چار و ناچار اس امانت کو خدمتِ اقدس میں پیش کر رہا ہوں -

حضرت مجدّد صاحب خرقہ مبارک زیب تن فرما کر خلوت میں تشریف لے جاتے ہیں - دل میں خیال گذرتا ہے کہ یہ مشائخ کرام پہلے مجھے معنوی خلیفہ بناتے، پھر خرقہ عنایت ہوتا تو موزوں تھا - فوراً دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ المشائخ شاہ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ اپنے جملہ خلفاء حتّٰی کہ حضرت شاہ کمال کیتھلی قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ رونق افروز ہیں - مقدّس روحوں کا اجتماعِ عظیم ہے - حضرت شیخ المشائخ نے خلعت معنوی عطا فرمایا یعنی اپنی نسبت سے مالا مال کر دیا -

حضرت مجدّد صاحب کے دل میں خیال گذرتا ہے کہ میری تربیت مشائخِ نقشبند نے فرمائی ہے لہٰذا میں انہیں بزرگوں کا ہوں - آج مجھے سلسلہ قادریہ کی نسبت عطا کی جا رہی ہے - اس تصوّر کے ساتھ ہی دیکھا کہ حضرت عبد الخالق عجدوانی قدّس اللہ سرہ العزیز سے لے کر حضرت خواجہ باقی باللہ[1] تک جُملہ مشائخ نقشبند تشریف لے آئے - حضرت خواجہ نقشبند علیہ الرحمۃ حضرت خواجہ شاہ عبد القادر جیلانیؒ کی برابر تشریف فرما ہوئے اور اب آپس میں گفتگو شروع ہوئی -

مشائخ نقشبند نے فرمایا - شیخ احمد ہماری تربیت سے کمال و تکمیل کو پہنچے - آپ خواہ مخواہ ان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں -

اکابرِ قادریہ اور حضرت شاہ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز نے جواب دیا -

شیخ احمد[1] نے اوّل چاشنی ہمارے خوان سے چکھی ہے -

---

[1] ایام شیر خوارگی میں حضرت مجدّد صاحب ایک مرتبہ بیمار ہو گئے - انہیں ایام میں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس بحث میں حضرات چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ بھی تشریف لے آئے، اور چونکہ حضرت مجدّد صاحب نے ابتدا میں اپنے والد ماجد سے ان سلسلوں میں نسبت حاصل کی تھی لہٰذا ان سب حضرات نے بھی اپنے اپنے دعوے پیش کردیئے۔

ان تمام حضرات کی گفتگو جاری تھی کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی۔ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ چونکہ شیخ احمد کی تکمیل سلسلہ نقشبندیہ میں ہوئی ہے لہٰذا اسی کو رواج دیں، اور باقی دیگر سلسلوں کی نسبت بھی القا کردی جائے۔

یہ سلسلہ صبح سے جاری ہو کر ظہر کے قریب ختم ہوا۔ حضرت مجدد صاحب ظہر کے وقت تک مراقبہ میں مشغول رہے[1]

سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سندِ تکمیل

درحقیقت اصل سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب وسنن کا مکمّل اتّباع ہے۔ یہ اتّباع جس قدر مکمّل ہو، سندِ تکمیل اتنی ہی بہتر اور بالا ہوگی۔ بقول حضرت مجدّد صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ایک سُنّت ٹکسالی سکّہ ہے جو بارگاہِ رب العٰلمین میں منظور بلکہ محبوب ومقبول ہے۔

جو شخص اس ٹکسالی دولت سے بہرہ مند ہو، وہ یقیناً بارگاہِ رب العزّت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلی تشریف لے آئے۔ مجدّد صاحب کے والد صاحب نے دعا کے لئے اس شیر خوار بچّہ کو شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کردیا۔ شاہ صاحب نے زبان مبارک بچہ کے منہ میں دے دی۔ اس سعید بچہ نے اس کو خوب چوسا۔ حضرت شاہ کمال صاحب فرماتے ہیں بچہ کچھ ہماری اولاد کے لئے بھی رہنے دو۔ تم تو چاہتے ہو کہ ہماری نسبت تم ہی حاصل کرلو۔ پھر حضرت شاہ صاحب نے ان کے والد صاحب سے فرمایا یہ آپ کا بچہ بہت سعید ہوگا۔ اس جملہ سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے (حالات مشائخ نقشبند)۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] حضرات القدس مصنفہ حضرت مولانا بدرالدین صاحب خلیفہ حضرت مجدّد صاحب حالات مشائخ نقشبند ص۲۰۶۔

میں اعلیٰ ترین قبولیت حاصل کرے گا، اور بجا ہوگا کہ اس کے پیروؤں اور معتقدوں[1] کا درجہ بھی خدا کے نزدیک مقبول ہو۔ کیونکہ پیروی کا مفہوم یہی ہے، کہ وہ بھی آداب و سُنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو وظیفۂ زندگی بنا چکا ہو۔

اتباعِ سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باعث حضرت مجدّد صاحب نے جو مراتب حاصل کئے، ان کا کچھ تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اب آخری شرف ملاحظہ ہو۔ شیخ محمد نعمان جو حضرت مجدّد صاحب کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا نعمان سے کہہ دو۔ جو شیخ احمد کے نزدیک مقبول ہے وہ ہمارے نزدیک اور حضرت حق جل مجدہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اور جو اُن کے نزدیک مردود ہے وہ ہمارے اور حضرت باری تعالیٰ کے نزدیک بھی مردود ہے (خزینۃ الاصفیار جلد ۲ صفحہ ۱۰۶)

حضرت مجدّد صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

ایک روز مراقبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے ایک اجازت نامہ لکھ دوں جو آج تک کسی کے لئے نہیں لکھا۔ نیز سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جس جنازہ[2] پر تم نماز پڑھ دوگے، اُس میت کو بخش دیا جائے گا"

(خزینۃ الاصفیار صفحہ ۶۰۸)

---

[1] صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے مناقب و محامد تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث میں ارشاد فرما چکے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ [2] نماز جنازہ میں دعاء مغفرت ہوتی ہے جو شخص مستجاب الدعوات ہو، اُس کی یہ برکت لازمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس نے خود کو خدا اور رسول کے حوالہ کر دیا، اس کی جس قدر ناز برداری ہو، کم ہے۔

من[1] کان لِلّٰہ، کان اللہ لہ۔

رب[2] اشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لابرہ (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ ہے مبارک نتیجہ اس مقدس نصب العین کا کہ:

اِنَّ[3] صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

بہرحال اس قسم کے کمالات بہت ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنیں باقی

عمر بگذشت و حدیثِ دردِ ما آخر نشد
شب[4] بآخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

حضرت کی مجددیت[5]

آپ سے پہلے صدی کے مجدد[6] ہوا کرتے تھے۔ الف کا مجدد کوئی نہیں ہوا۔

---

[1] جو خدا کا ہوا، خدا اُس کا ہو گیا۔ [2] بہت سے ہیں جو راہِ خدا میں پراگندہ بال گرد آلودہ ہیں۔ خدا کے یہاں اُن کا یہ درجہ ہے کہ اگر وہ خدا کی ذمہ داری پر قسم کھا بیٹھیں، تو خدا کو ان کی قسم کا احترام ہو۔ وہ اس کو ضرور پورا فرمادے ۱۲۔ [3] میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ [4] وقت تحریر ۳ بج کر ۴۵ منٹ شب چہار شنبہ مورخہ ۸ رجمادی الاوّل ۱۳۶۰ھ۔ محمد میاں۔ [5] ماخوذ از خطبۂ شوقیہ۔ [6] چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کسی کو نبوت ملنے والی نہیں۔ لہذا آپ کی شریعت کے قیامت تک محفوظ رہنے کے انتظامات بھی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

الف ثانی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا - اور الف اوّل میں خود ذاتِ اقدس و اطہر، سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود تھی - آپ سے پہلے جس قدر مجدّد صدیوں کے گذرے ہیں، کوئی مجدّد دین کے تمام شعبوں کا مجدّد نہیں ہوا - بلکہ خاص خاص شعبوں کے مجدّد ہوتے رہے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ایک ایک وقت میں متعدّد[1] مجدّد نظر آتے ہیں - کوئی علمِ حدیث کا، کوئی فقہ کا - پھر اس میں بھی کوئی فقہ حنفی کا مجدّد ہے، کوئی شافعی کا - اور کوئی سلوک واحسان[2] کا - لیکن یہ چیز اللہ تعالےٰ نے آپ ہی کے لئے مخصوص رکھی کہ آپ دین کے تمام شعبوں کے مجدّد ہیں - جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ سے پہلے کے مجدّدین کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت خاص خاص چیزوں میں حاصل تھی، اور آپ کو تمام چیزوں کی نیابت عامّہ تامّہ حاصل تھی وشتان ما بینھما - اب سے پہلے مجدّدین کی خدمت کا اثر صرف ایک صدی کے لئے ہوتا تھا اور آپ کی مجدّدیت ایک ہزار سال کے لئے ہے - آپ کے سوا دوسرے مجدّدین کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قدرتِ کاملہ کی طرف سے بیش از بیش کر دیئے گئے اور اُمّت کو ان انتظامات سے بطور پیشین گوئی آگاہ کر کے مطمئن کر دیا گیا - بعض اہم انتظامات کی خبر قرآن مجید میں ہے اور بعض کی احادیثِ صحیحہ میں - چنانچہ ہر صدی میں مجدّد کا ہونا بھی انہیں انتظامات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا تذکرہ احادیثِ صحیحہ میں ہے - سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں - ان اللہ یبعث لھذا الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا - اس حدیث کی شرح میں علماء کرام نے مستقل تصانیف کی ہیں - حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی کتاب الفوائد الجمّۃ فیمن یبعثہ اللہ لھذہ الامۃ قابلِ مطالعہ ہے - ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ایک صدی میں ایک ہی مجدّد ہونا چاہیئے مگر یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ تاریخی واقعات کے تتبع اور مولانا شاہ ولی اللہؒ جیسے محققین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے ۱۲

[2] آج کل جس چیز کو تصوّف کہتے ہیں احادیثِ نبویہ میں اس کو احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۱۲

مجدّدیت نہ معلوم اُمّت کے کتنے لوگوں کے علم میں نہ آئی اور نہ معلوم کتنوں کی مختلف فیہ رہی ۔ جو اختلاف کہ معاندانہ یا معاصرانہ ہو، بیشک وہ قابلِ لحاظ نہیں،[1] مگر جو اختلاف شرائط مجدّدیت کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کی وجہ سے ہو، وہ بیشک قابل لحاظ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام ربّانی کی مجدّدیت کو ان چیزوں سے بھی محفوظ رکھا۔ آپ کی مجدّدیت کا تمام اُمّت کو دنیا کے ہر گوشہ میں علم ہوا، اور جو لوگ اس معاملہ میں اہل حل وعقد ہو سکتے تھے، اُن سب نے آپ کی مجدّدیت کو تسلیم کر لیا۔ بلکہ جو لوگ بدعات کی محبّت یا اپنی سرد بازاری کے خیال سے آپ سے عناد رکھتے تھے وُہ بھی مجبور ہوئے[2] کہ زبان سے آپ کے مجدّد ہونے کا اقرار کریں ۔ جس طرح مذہب شیعہ کی بنیاد قرآن مجید کی عداوت پر ہے ۔ کوئی شیعہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے دل میں قرآن مجید سے دشمنی اور نفرت نہ ہو ۔ مگر قرآن مجید کا رُعب یہ ہے کہ اپنے کو مسلمان کہنے کے بعد قرآن مجید سے دشمنی کا اظہار کرنے کی جراءت نہیں ہوتی بلکہ ضمیر کے خلاف زبان سے

---

[1] مثلاً حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کے مرشد حضرت سیّد احمد بریلوی کی مجددیت کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس بنا پر اختلاف کیا کہ ان دونوں بزرگوں نے صدی کا آخر نہیں پایا، اور مجدّد کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں موجود ہو ۔ حضرت ممدوحؒ تذکرۃ الرشید ص۲۹۳ میں لکھتے ہیں وھن ھھنا حصحص ان ما اشتھر بین العوام بل الخواص کالاعلام ان مولانا اسمٰعیل الشھید الدھلوی ومرشدہ السیّد البریلوی کانت ولادتہ سنۃ احدی من المائۃ الثالثۃ عشر من مجدّدی المائۃ خال عن التحصیل لا یقولہ صاحب التکمیل ۱۲ ۔ [2] بعض منکرین کو غیب سے سزائیں بھی ملیں ۔ جیسا کہ سیّد برزنجی مدنی کے متعلق حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب نے حالاتِ حضرت شہیدؒ کے ص۵۵ میں نقل فرمایا ہے کہ اس نے ایک رسالہ حضرت امام ربّانی کی ردّ میں لکھا تھا حضرت شیخ محمد فرخ نبیرۂ حضرت امام ربّانی کی بددُعا سے دریا میں ڈوب گیا ۔ سیّد برزنجی مذکور کے رسالہ کا ردّ مولانا عبدالحی رحٗ صاحب لکھنوی نے لکھا ہے ۔ جس کا نام الکلام المنجی ہے ۔ جو مولوی وکیل احمد صاحب کے نام سے طبع ہوا ہے ۔

اقرار بغیر مفر نہیں ۔ قریب قریب بفضلہ تعالےٰ والانعامہ یہی حالت حضرت امام صاحب ربّانی کی ہے ۔

آپ کی مجدّدیت کے بیان میں ایک مستقل اور بے نظیر کتاب تالیف ہو چکی ہے جس کا نام شواھد التجدید ہے ۔ جس کا ایک قلمی نسخہ بھوپال کی خانقاہ عالیجاہ مجدّدیہ میں موجود ہے ۔

مجدّد کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ اس کو اپنے مجدّد ہونے کا علم ہو ۔ مگر حضرت امام ربّانی کو اپنے مجدّد ہونے کا علم علیٰ وجہ الکمال تھا ۔ جیسا کہ بعض مکتوبات میں خود تحریر فرماتے ہیں ، خصوصیت سے ملاحظہ ہو ، مکتوب ۴ جلد ۲ ص ۱۴ ۔

مجدّد کی سب سے بڑی پہچان اُس کے کارنامے ہیں ۔ حمایتِ دین ، اقامتِ سنّت اور ازالۂ بدعت میں اس کی خاص شان ہوتی ہے ۔ غیر معمولی کوشش اُس سے ظہور میں آتی ہے ۔ اور اس کی کوشش کا غیر معمولی نتیجہ توقّع سے بہت زائد نکلتا ہے ۔

حضرت امام ربّانی نے کیسی کیسی کوششیں مذکورہ بالا خدمات کے لئے کیں ۔ اور کیسا انہماک اور کیسا شغف آپ کو اس میں تھا ۔ پھر اُن کوششوں پر کیسے غیر معمولی ثمرات توقعات سے بدرجہا زائد مرتب ہوئے ۔

گذشتہ اوراق سے کسی قدر اندازہ ان تمام چیزوں کا ہوتا ہے اور آئندہ اوراق میں حضرات خلفاء کی خدمات سے مزید اندازہ ہوگا ۔ انشاء اللہ ۔

توضیحِ مجدّد

حضرت مجدّد صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ گذر چکا ۔ عقیدۂ مجدّد کے متعلق بھی خطبۂ شوقیہ کا اقتباس پیش کیا جا چکا ۔

اس موضوع پر حضرت مولانا محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مضمون[1] یقیناً اس کا مستحق ہے کہ تصنیف ہذا کو اُس سے سعادت اندوز

---

[1] یہ مضمون الفرقان کے مجدّد نمبر میں شائع ہوا تھا ۔ محمد میاں ۔

کیا جائے، لہٰذا بجنسہٖ درج ہے۔

مجدّد الف ثانی رحؒ

حضرت مجدد صاحبؒ کی تاریخی حیثیت سے کتنی ہی طویل و عریض سوانح لکھ لی جائے لیکن ساری سوانح حیات کی وہ رُوح جس سے اُن کی ذاتِ گرامی دنیا میں آفتاب بن کر چمکی اور آج بھی اپنے اندر وہی جذب مقناطیسی کا اثر رکھتی ہے، صرف ایک ہی صفتِ جمیلہ ہے جو اُن کے اس لقب "مجدّد" سے نمایاں ہے۔ کسی ذات کا مجدّد مان لینا اُس کے غیر معمولی کمالات علمیہ و عملیہ کا اقرار کر لینا ہے۔ کیونکہ تجدیدِ دین کا منصب اصلی تو انبیاء علیہم السّلام کا ہے۔ اور پھر اس میدان کے مرد وہ ہیں جو نبوّت کے ترکہ کے وارث بن کر اُس سے کوئی غیر معمولی حصّہ پائیں۔ پس جس طرح کسی ذات کو نبی مان لینے سے اُس کے لئے تمام بشری کمالات کا اقرار خود بخود لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کو مجدّد تسلیم کر لئے جانے سے اس میں وراثتِ نبوّت کے غیر معمولی خطوط کا اعتراف بھی خود بخود ہی لازم ہو جاتا ہے۔

منصبِ نبوّت سے عہدۂ مجدّدیت کی اس نسبت کا ہی یہ اثر ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السّلام یہ منصبِ جلیل کسی اپنی شخصی جدّوجہد یا کسی اجتماعی اور جماعتی تجویز سے نہیں ملتا، اسی طرح مجدّدوں کو بھی عہدۂ تجدید نہ اُن کی اپنی ذاتی جانفشانی و محنت سے ہاتھ لگتا ہے نہ کسی جماعت کے من سمجھوتہ سے۔ بلکہ یہ محض من اللہ ایک موہبۂ عظمیٰ ہوتی ہے جس کے لئے غیبی انتخاب سے افراد چُن لئے جاتے ہیں۔ اور مخلوق کے دلوں میں ان کی مقبولیت خود بخود قائم کر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے انبیاء کرام کے لئے بعثت من اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یا جیسے حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا یا جیسے بَعَثْنَا اِلَیْهِمْ رُسُلًا وغیرہ۔

ٹھیک اسی طرح حدیث نبوی نے مجدّدوں کے لئے بھی یہی بعثت من اللہ کا کلمہ اختیار کیا ہے۔ارشادِ نبوی ہے :

انّ اللہ یبعث لھٰذہ	بلاشبہ اللہ تعالےٰ ہر صدی کے آغاز
الامّۃ علی راس کل مائۃ	میں اس اُمّت میں ایسے لوگوں کو
سنۃ من یجدّد لھا دینھا	مبعوث کرتا ہے جو اُمّت کے لئے دین
(مشکوٰۃ)	کی تجدید کریں۔

اور جیسے قرآن نے نبی کا انتخاب من اللہ بتایا ہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ، ایسے ہی اس حدیث میں مجدّد کی نسبت بھی انّ اللہ یبعث فرمایا گیا ہے۔جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں منصبوں کا انتخاب من جانب اللہ ہی ہوتا ہے۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ نبوّت اصل ہے اور تجدید اس کا ظلّ ہے۔ وہاں الہام قطعی ہے جس کو وحی کہتے ہیں، یہاں ظنّی ہے۔اُس کا منکر خارج از اسلام ہے، اس کا منکر خارج از صلاح و تقویٰ ہے۔بہر صورت مجدّدیت، نبوّت کا ایک نہایت روشن اور درخشاں پرتو ہے۔اس لئے مجدّد علم و عمل کے لحاظ سے نبی کا سایہ اور اخلاق و ملکات کے لحاظ سے نبی کا نمونہ ہوتا ہے۔پس مجدّد کہہ لینے کے بعد کسی اور منقبت کا درجہ ہی باقی نہیں رہتا کہ اس کے ذریعہ مجدّد کی تعریف کی جائے۔اور اگر کی جائیگی تو وہ اسی وصف تجدید کی ایک تفصیل ہوگی جس کا متن لفظ مجدّد ہوگا پس اگر حضرت مجدّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمہ مجدّد ہیں اور ضرور ہیں تو اُن کی ہمہ منقبت یہی ہے کہ وہ مجدّد ہیں اور "الف ثانی کے مجدّد" ہیں۔ہم کو الف ثانی کی تجدیدی خصوصیات کا سراغ لگانے کے لئے یہ نکتہ بطور معیار ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ چونکہ منصب تجدید، منصب نبوّت کا پورا پورا ظلّ اور اُس کے قد و قامت کا سایۂ اصلی ہے۔اس لئے شئونِ تجدید بھی شئونِ نبوّت سے ملتی جلتی ہیں۔انبیاء علیہم السّلام باوجود

جامع کمالات ہونے کے کمال غالب وحی لے کر آتے ہیں جس کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے تمام اصلاحی پروگرام میں غلبہ اور زور اسی اصلاحی نقطہ کا زیادہ ہوتا ہے جو اس زمانہ کے مخصوص مفاسد کے مٹانے میں مؤثر ہو۔

قومِ عاد تمدّن کی گہرائیوں میں پھنس کر اُونچی اُونچی بلڈنگیں اور عظیم الشّان سنگین عمارتیں تیار کرنے میں ہمہ تن لگ کر دین اور دیانت کو خیرباد کہہ چکی تھی اس لئے حضرت ہود علیہ السّلام نے بھی تقویٰ وغیرہ کے عام اصلاحی خطاب کے ساتھ خصوصیت سے جو خطاب کیا ہے، وہ وہی تھا جو اس تمدّنی غلو و افراط کے استیصال کے لئے تھا۔ چنانچہ فرمایا:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً	کیا تم ہر اُونچے مکان پر ایک یادگار
تَعْبَثُونَ ○ وَتَتَّخِذُونَ	کے طور پر بے ضرورت عمارت بناتے
مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ○	ہو اور بڑے بڑے محل تیار کرتے ہو
وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ	جیسے تم کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے
جَبَّارِينَ ○	اور جب کسی پر دار و گیر کرتے ہو تو

بالکل ظالم اور جابر بن کر دار و گیر کرتے ہو۔

قومِ ثمود نے اپنے اوقات، دنیا کی سرسبزیوں، چمن بندی کے نظر فریب مناظر اور پہاڑی بلڈنگوں کی دلکش سینریاں مہیا کرنے میں صرف کر رکھے تھے۔ جس سے وہ خدا اور رسول سے بے گانہ محض بن گئے تھے۔ اسی لئے صالح علیہ السّلام نے اپنے پروگرام میں غایت حصہ ان ہی امور پر نکتہ چینی کرنے اور انہیں کی اصلاح کا رکھا۔ فرمایا:

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا	کیا تم کو اسی دنیا کی چیزوں میں بے فکری
آمِنِينَ ○ فِي جَنَّاتٍ	سے رہنے دیا جائے گا یعنی باغوں
وَعُيُونٍ ○ وَزُرُوعٍ وَّ	اور چشموں میں اور کھیتوں اور ان

نَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ ○	کھجوروں میں جن کے گچھے خوب
وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ	گندھے ہوئے ہیں اور کیا تم پہاڑوں
بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ ○	کو تراش کر اتراتے ہوئے مکان بناتے رہوگے

قوم لوط میں لواطت اور اغلام کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے تو انہوں نے عام اصلاح کے ساتھ خصوصی اصلاح اس مرض کی فرمائی اور اسی پر قوم کو زیادہ لتاڑا۔ فرمایا:

اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ	کیا تمام دنیا جہان والوں میں سے
الۡعٰلَمِيۡنَ ○ وَتَذَرُوۡنَ	تم یہ حرکت کرتے ہو کہ مردوں سے
مَا خَلَقَ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ	بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے پروردگار
اَزۡوَاجِكُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ	نے تمہارے لئے جو بیویاں پیدا کی ہیں
عٰدُوۡنَ ○	ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو۔ اصل یہ ہے
	کہ تم حدِ انسانیت سے نکل جانے والے ہو۔

اصحاب الایکہ ناپ تول کی خیانت میں مُبتلا تھے تو حضرت شعیب علیہ السّلام نے اس کی اصلاح کو اپنا غالب پروگرام قرار دیا، اور خصوصیت سے فرمایا:

وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ	اور تم ناپ تول میں کمی مت کرو۔
وَالۡمِيۡزَانَ اِنِّيۡۤ اَرٰٮكُمۡ	مَیں تو تم کو فراغت کی حالت میں
بِخَيۡرٍ وَّاِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ	دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھ کو تم پر ایسے
عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ	دن کے عذاب کا اندیشہ ہے جو مصائب
	کا جامع ہوگا۔

قومِ نوح نے خدائی طاقتیں پتھر کی مورتیوں اور مٹی کے ڈھیروں میں مان رکھی تھیں۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے زیادہ تر حصّہ ان ہی معبودانِ باطل کی کمزوریوں کے اظہار و اثبات میں صرف فرمایا۔ اور کہا کہ:

يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ	اے میری قوم اگر میرا تم میں رہنا اور

مَّقَامِیْ وَتَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ	تم کو نصیحت کرنا گراں معلوم ہوتا ہے
اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ	تو میرا تو اللہ پر بھروسہ ہے۔ تم اپنا
فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ	کام پوری قوت سے کرو، اور اپنے
ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ	شرکار کو بھی بُلالو، اور جو کرنا ہو دل
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ	کھول کے کرو اور میرے حق میں جو
وَلَا تُنْظِرُوْنِ ○	کر گزرنا ہو، کر گزرو، اور مجھے کوئی
(سورہ یونس۔ آیۃ ۷۱)	مہلت نہ دو۔

بہر حال قوموں میں جن رُوحانی مفاسد اور باطنی امراض کا غلبہ رہا ہے اسی قسم کے خصوصی معالجات لے کر انبیار علیہم السّلام مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر یہی وجہ ہے کہ ہر ایک نبی نے اپنی قوم کو اسی کی ذہنیت کے مناسب اپنے اعجازی دلائل بھی دکھلائے ہیں قبطیانِ مصر میں سحر و ساحری کا زور تھا جو سانپ بچھو بنا کر لوگوں پر اپنا رعب قائم کرتے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے وہ عصا دکھلایا جس نے اژدہا بن کر سارے ہی مصنوعی سانپوں کا خاتمہ کر دیا۔

قبیل میلادِ عیسوی بنی اسرائیل کی بھیڑ بکریوں میں طبّ اور علاج کی عجوبہ سازیوں کا زور شور تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام دمِ مسیحائی حتّٰی کہ احیاء موتیٰ لے کر تشریف لائے۔ جو سارے علاجوں کی غایت (صحت) سے بھی آگے کی چیز ہے۔

قوم ثمود میں کوہ تراشی یعنی پہاڑوں کو تراش کر عمارت بنانے اور گویا پتھروں کو موم کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کی استعداد بہت زیادہ تھی۔ تو ایک اونٹنی کو معجزہ اور علامتِ عذاب کے طور پر پیدا کیا گیا مگر اس طرح کہ پتھروں کی چٹانوں سے بغیر نر و مادہ کے، پتھر پھوڑ کر ایک دم نمایاں ہو گئی۔

عرب جاہلیت میں فصاحت و بلاغت کا زور شور تھا، تو حضرت خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا معجزہ یہی علمی معجزہ دیا گیا جس نے سارے عالم کی فصاحت و بلاغت کو

مات دے دی اور فصیحوں کو تھکا کر عاجز کر دیا۔

غرض نبیؐ وقت قوم کی ذہنیت ہی کے مناسب خوارق بھی لاتا ہے اور اسی کے امراض باطنی کے مناسب اصلاحی پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔

چونکہ مجدّدیت، نبوّت کا اصلی ظلّ ہے، اس لئے اُمّتِ محمّدیہ کے مجدّدوں کو بھی وہی شان دی گئی ہے جو انبیاء سابقین کو عطا ہوئی تھی۔ اُمّت میں قرون اور ادوار گزرتے رہنے سے جس جس قسم کے فتن ظہور کرتے رہے، اسی قسم کے اصلاحی طریق لے کر مجدّدین اُمّت بھی مبعوث ہوتے رہے۔ اگر کسی وقت میں دیانت کی کمی ہوئی تو مجدّدِ دیانت آئے۔ جنہوں نے شعائر دیانت برپا کئے۔ اگر دیانت ہوتے ہوئے نظامِ ملّت کبھی زیادہ پراگندہ ہو گیا تو ایسے ہی مجدّد آئے، جنہوں نے اپنے حلقۂ اثر کو باہم شیر وشکر کر دیا۔ اگر کبھی نفوس میں اخلاقی کدورت اور زنگ لگ گیا تو ایسے ہی مجدّد آئے جنہوں نے اخلاق کا تزکیہ کر کے نفوس کو مجلّٰی اور مصفّٰی کر دیا۔ اگر اُمّت کبھی ریاضت کشوں کے خوارق پر مفتون ہوئی تو ایسے ہی مجدّد آئے جنہوں نے اپنے خوارق وکرامات سے ہر شعبدہ باز کے کرشموں کا طلسم توڑ کر رکھ دیا۔[1] غرض یوں سمجھنا چاہیئے کہ انبیاء سابقین میں نبوّت کی جس جس رنگ کی نسبتیں تھیں، اتنی ہی اور اسی رنگ میں ولایت کی نسبتیں اُمّت کے مجدّدوں کو عطا فرمائی گئیں تاکہ اُمّت کے ہر طبقہ کی اصلاح اس کے مناسب طُرُق سے ہو۔

الف ثانی کا آغاز اُمّت کے حق میں تمام اگلے اور پچھلے فتنوں کا فتح باب تھا۔ کیونکہ نبیٔ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کی خیریت ختم ہو جانے کے متعلق دو مدّتوں کی

---

[1] پھر نفسانی فتنوں کے ساتھ آفاقی فتنے بھی جس نوع کے آئے۔ مجدّدین وقت کو اُسی کے استیصال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت واستعداد دے کر بھیجا۔ کسی مجدّد نے فتنۂ شیعیت کو ختم کیا۔ کسی نے فتنۂ باطنیت کو۔ کسی نے ادعاء نبوّت کے فتنوں کا تار پود بکھیرا۔ اور کسی نے عیسائیت کی وسوسہ اندازیوں کا استیصال کیا۔ کسی نے شرک کا تانا بانا اُدھیڑ دیا۔ کسی نے ثنیت کے ستون ڈھائے، اور کسی نے ثنویت کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ دیا۔

اطلاع دی تھی۔ ایک یہ کہ میری اُمّت کی عمر پانچ سو سال ہے یا پانچ سو سے کم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اُمّت کی عمر ہزار سال ہے جیسا کہ ذخیرۂ روایات میں دونوں حدیثیں موجود ہیں۔ پانچ صدی گذرنے پر فتنۂ تتار کا ظہور ہوا جس نے حقیقتاً اُمّت کی خیریت ہی نہیں، سرے سے اُمّت ہی کو ختم کر دیا تھا۔ گویا عالم سے مسلمانوں کا، اور اُن کی شوکت و قوّت کا استیصال ہو چکا تھا۔ مگر حافظِ حقیقی نے انجام کار خود تاتاریوں ہی کے قلوب کو اسلام قبول کرنے پر جُھکا دیا۔ جنہوں نے خلافت عثمانیہ (ٹرکی) کی بنیاد رکھ خود اسلام کی وکالت شروع کر دی، اور اس کے معین و مددگار بن گئے۔ اقبالؔ نے خوب کہا تھا ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانہ سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

درحقیقت قصرِ خلافت ہی نہیں بلکہ قصرِ اُمّت کا ایک نیا سنگِ بنیاد تھا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فتنۂ تتار منکشف ہوا جو پانچ صدی گذرنے پر ظاہر ہوا۔ اس لئے پہلی حدیث میں آپ نے اُمّت کی عمر پانچ سو سال ارشاد فرمائی۔ چھٹی صدی سے گویا اُمّت کی نئی تعمیر ہوئی، اور اس کے عُلوم و کمالات کے نشر و اشاعت کا ایک جدید اور بہترین دَور شروع ہوا۔ عراق و خراسان میں خصوصاً اور محروسہ ہائے اسلامی میں عموماً لاکھوں کی تعداد میں یکتائے روزگار فضلاء، فقہاء، علماء، صوفیاء اور اکابرِ اُمّت اُٹھے، اور دین کو از سرِ نو زندہ کر کے پاکیزہ پاکیزہ لباسوں میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ عُلوم و کمال کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور دشمنانِ حق کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ مصر، شام، خراسان و عراق، ادھر دوسرے عجمی ممالک اسلامی شوکتوں سے مالا مال تھے۔ کسی غیر کی مجال نہ تھی کہ اسلام کے رُعب افزا چہرہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے۔ رفتہ رفتہ پانچ صدی کا دوسرا دَور ختم ہونے لگا تو اُمّت میں انحطاط کا نیا دَور شروع ہوا۔ ابتداءً دینی اور معنوی شوکتوں میں فتور آنا شروع ہوا، اور انجام کار ظاہری رعب و قوّت اور شوکتوں کے اضمحلال کا وقت بھی آ پہنچا۔

الف اوّل کے اختتام اور الف ثانی کے آغاز ہی سے اسلامی ملّت کے خلاف غیر مسلم اقوام کی منظم ریشہ دوانیاں شروع ہوتی ہیں۔ یوں تو ابتداء ہی سے ان اقوام کا ایک مستقل موضوع عمل مسلمانوں میں انتشار پیدا کر کے ان کی قوّتوں کو ضعیف کرنا رہا ہے چنانچہ منافقین یہود نے آغازِ اسلام ہی سے ایسے مفسدانہ اقدامات شروع کر دیئے تھے اور انہیں کی ناپاک مساعی سے ملّتِ اسلامیہ میں شیعیت و خارجیت وغیرہ کے فتنوں کی بنیاد پڑی جن کی بدولت لاکھوں مسلمان قتل و غارت کی نذر ہوئے۔ لاکھوں بے وطن ہوئے۔ خلافت کی بنیادوں میں تزلزل آیا۔ بعد کی کتنی ہی خلافتیں اور سلطنتیں تہ و بالا ہو گئیں۔ پھر مذہبی رنگ میں کتنے ہی فرقے پیدا ہو گئے جس سے اُمّت کی طوفانی ترقّی بھی ایک دم رُک گئی، اور اُمّت کا زوال بھی ممکن ہوتا گیا، لیکن ہزار سال کے بعد ان مفسدانہ مساعی نے منظم صورت اختیار کر لی، اور عیسائی اقوام نے اسلامی ممالک سامنے رکھ کر تدریجاً ایک تخریبی پروگرام مرتب کیا جو بالآخر ہندوستان، اسپین، عراق، شام، مصر، ریاستہائے ٹرکی وغیرہ کی تخریب میں مؤثر اور کامیاب ثابت ہوا۔

بہرحال ہزار سال کے اس دورہ کے بعد ادھر تو اغیار نے تخریبِ اُمّت کا عزم مصمّم کیا، اور ادھر خود اُمّت میں دینی بے پروائی اور قلّتِ دیانت نے نفوذ کرنا شروع کر دیا۔ بدعات و منکرات نے عزائمِ دین کی صورت اختیار کر لی، اور رسومِ شرکیہ اور محدثاتِ شنیعہ نے اندر ہی اندر پرورش پا کر اسلام کے اصلی رنگ و رُوپ کو متغیّر کر دیا۔ اس لئے گیارھویں صدی گویا اُمّت کے لئے اندرونی اور بیرونی، مذہبی اور سیاسی فتن و آفات کا ایک پیش خیمہ تھی، اور گویا کوئی ظاہری و باطنی مرض ایسا نہ تھا جس کی تخم ریزی اُمّت کے قلوب میں نہ ہو چکی ہو۔

اس لئے اس صدی کے مجدّد کے متعلق ان صد انواع فتن کو دیکھ کر خود ہی رائے قائم کر لینی چاہیئے کہ اس کی رُوحانیت کس قدر بلند پایہ اور اس کا طرزِ تعلیم و تلقین کس درجہ مؤثر اور ہمہ گیر ہوگا، جو ان فتن میں اُمّت کے ایمانوں کی نگہبانی کرے اور ان

ظاہری و باطنی آفات کے تھپیڑوں میں کشتیِ اسلام کو کھیتا ہوا کنارہ پر لگا گئے۔

اسی الف ثانی کے مجدّد حضرت امام ربّانی شیخ احمد سرہندی ہیں جن کے علوم و معارف نے ابنائے کفر و ضلال میں تہلکہ مچا دیا اور جن کی نور پاش ہدایتوں نے تاریک سینوں کو منوّر کر دیا۔ حضرت مجدّد صاحب کی تعلیمات کو دیکھو اور سب گوشے سامنے نہ آسکیں تو ایک مکتوبات ہی پر نظر ڈالو کہ علومِ ظاہر و باطن کا ایک سمندر ہے جس کی تہ کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اگر ایک طرف قلب و رُوح کے مخفی مقامات کا پردہ فاش ہو رہا ہے تو دوسری طرف حقائقِ شرعیہ اور اسرارِ فقہیہ منصّۂ شہود پر آتے جا رہے ہیں اگر ایک طرف کتابِ رُوح کے غیر محسوس اوراق اُلٹ رہے ہیں تو دوسری طرف ہدایہ و توضیح کے علمی مقامات کھُل رہے ہیں۔ اگر کہیں رجالِ غیب سے رابطہ کا ذکر ہے، تو علماء و طلباء کی محبّت کے جذبات بھی انہیں مکتوبات سے ہویدا ہو رہے ہیں۔ جہاں علم کی موجیں اُٹھ رہی ہیں، وہیں خوارق و کرامات کا سمندر بھی اُمنڈ رہا ہے۔

غرض ایک ایسے دورہ کے لئے جو ظاہری و باطنی آفات کا محور ہو، جیسے جامع کمالات اور عارج عرش مجدّد کی ضرورت تھی۔ حق تعالےٰ نے ویسا ہی مجدّد بنا کر حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا، جن کی بصیرت افروز تعلیمات نے کتنے ہی گمرہانِ بادیہ ضلالت کو راہِ مستقیم پر لگایا، اور کتنے ہی تلوّن پذیر قلوب کو تمکن و استقامت پر جما دیا۔ کتنے ہی وہ علوم و معارف جو بارگاہِ نبوّت سے چلے تھے لیکن راستہ کی ناہمواریوں نے انہیں راستہ میں روک دیا تھا، حضرت مجدّد صاحبؒ کی بدولت منصّۂ شہود پر آگئے اور علومِ نبوّت کے کتنے ہی بند شدہ دروازے از سرِ نو کھُل گئے۔

پھر چونکہ اس زمانہ کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض ابتداع اور بدعت پسندی تھا۔ جس نے عمل و اعتقاد دونوں کو کھوکھلا اور بے مغز کر دیا تھا[1] پس حضرت مجدّد صاحب

---

[1] اسی لئے حضرت مجدّد صاحب کی تعلیمات میں بھی غالب رنگ اتّباعِ سنّت اور بدعت سے اظہارِ نفرت ہے غرض ظاہر و باطن کی بے راہ روی اور آزادی سے بچا کر اس اتّباع کی راہ پر چلانا حضرت کی تعلیم کا ممتاز شعار تھا۔

کے بے انتہا مناقب میں سے صرف دو جملے اس کے اظہار مناقب کے لئے بس کرتے ہیں ایک یہ کہ وہ مجدّد ہیں جس کی حقیقت ظلّیتِ نبوّت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ الف ثانی کے مجدد ہیں۔ جو نبصّ حدیث شیوعِ فتن کے لحاظ سے خطرناک صدی تھی، اور جس کا طبعی مقتضیٰ یہ تھا کہ اس سرے پر کوئی معمولی مجدّد نہیں بلکہ ایک رئیس المجدّدین فرد بھیجا جائے جو ایسے عظیم مہالک و فتن کی مدافعت کر سکے۔ پس میرا یہ مضمون درحقیقت صرف انہیں دو لفظوں "مجدّد" اور "الف ثانی" پر دائر ہے، اور میرے خیال میں مجدّدی مناقب کا بڑے سے بڑا دفتر انہیں دو جملوں کی شرح ہوگا۔ کیونکہ ایک لفظ سے فتن و آفات کی کثرت و قوّت واضح ہے اور دوسرے سے ان فتن کی زبردست مدافعت نمایاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خیر کی قوّت شر ہی کے فروغ سے کھل سکتی ہے۔ پس جب کہ نبصّ حدیث اس صدی میں شرور و آفات کی برسات کی خبر دی گئی ہے تو اس سے اس صدی کے مجدّد کی روحانی قوّتوں، علمی برکتوں اور عملی ہمّتوں کی لگاتار جھڑیوں کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ جس نے فتنوں کی کیچڑ اور گندگی کو دھو کر اُمّت کے جسم کو صاف کر دیا تھا اور عرب و عجم میں اپنی برکات کی ترو تازگی پھیلا دی تھی۔

اپنے بعض بزرگوں مثل حضرت مفتیِ اعظم مولانا عزیز الرّحمن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اس موقعہ پر یہ واقعہ نقل کر دینا بھی دلچسپی اور اظہارِ حقائق سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت مجدّد صاحب قدس سرہ دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس زمین پر پہنچے، جہاں آج دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے تو ٹھٹک کر فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی بُو آتی ہے (بعینہٖ یہی مقولہ اپنے بزرگوں سے حضرت سیّد احمد صاحب رائے بریلوی رحمۃ اللہ کی نسبت بھی سُنا جبکہ انہوں نے جہاد پر جاتے ہوئے دیوبند میں قیام فرمایا تھا)۔

اور سب جانتے ہیں کہ یہ دارالعلوم مشرق و مغرب کے مسلمانوں کے لئے کتاب و سنّت اور ان کے متعلق علوم کی ایک عدیم النظیر درس گاہ ہے جو اس دورِ تجدّد میں بھی اسلاف کی ایک امانت کو سنبھالے ہوئے ہے۔ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سُنا ہے

کہ یہ درس گاہ بحیثیت مجموعی خود ایک مجدّد کی شان رکھتی ہے ، جس کا غالب شعار آج کے دورِ بدعت و الحاد میں اتباعِ سُنّت کی تلقین اور حقیقی مسالکِ صحابہ کی ترویج ہے اور وہ بحمد اللہ ان تعلیمات کے لحاظ سے ایسی ثابت و راسخ شمع ہے جس کی روشنی مسلسل اور غیر منقطع ہے ۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دار العلوم کا یہ اتباعِ سُنّت کا شعار جبکہ وہ حضرت مجدد صاحب کی پیشین گوئی کا ظہور ہے ، درحقیقت حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمۃ ہی کے تجدیدی کارناموں میں سے ایک سنہرا کارنامہ ہے ، اور انہیں کے قلبِ روشن کی ہمّت کا ایک مظاہرہ ہے جو اس چار دیواری کی صورت میں اتباعِ سُنّت کا نور پھیلا رہا ہے ۔

اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت مجدّد صاحبؒ کی تجدید محض وقتی تھی ، بلکہ ان کے مجدّدانہ عُلوم و کمالات ان کے وارثین نیز ان کی تعلیمات اور ان کے پیغام کے عامل اس دار العلوم کے ذریعہ آج تک بھی دینِ متین کی تجدید کر رہے ہیں ، اور جب تک منظورِ الٰہی ہے ، کرتے رہیں گے ۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ہ

خُلفاء و صاحبزادگان حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ

حضرت خواجہ شیخ محمد سعید صاحب[1] قدس اللہ سرہ ملقب بہ خازن الرحمۃ

آپ حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے خلف الرشید ہیں ۔ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مجدّد صاحب نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری ایّام میں گوشہ نشینی اختیار فرما کر کارخانۂ ارشاد و تلقین صاحبزادگان کے حوالہ کر دیا ۔ لہٰذا آپ حضرت مجدّد صاحب

---

[1] خزینۃ الاصفیاء میں شیخ احمد سعید نام درج ہے ۱۲ محمد میاں عفی عنہ

کے جانشین بھی ہیں۔

ولادتِ باسعادت ایک ہزار پانچ ہجری (۱۰۰۵ھ) بمقام سرہند شریف۔

عہدِ طفولیت حضرت موصوف کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند حضرت شیخ خلیل اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کو مکتوب تحریر فرمایا ہے۔ وہ حضرت موصوف کی مختصر اور جامع سیرت ہے۔ اُس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (درمیان میں کچھ حصّہ دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے جو حوالۂ کتب کے ساتھ قوسین میں دے دیا گیا ہے)۔

ایّامِ طفولیّت سے مقبولیت، کرامت، ولایت و نجابت کے آثار آپ کے حالات و اطوار سے نمایاں تھے۔

(چار پانچ سال کا سِن تھا کہ آپ سخت بیمار ہو گئے۔ آپ سے دریافت کیا گیا، کس چیز کو دل چاہتا ہے؟ جواب دیا، حضرت خواجہ کو (یعنی حضرت خواجہ باقی اللہ کو) حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کا تذکرہ حضرت خواجہ سے کیا۔

حضرت خواجہ نے فرمایا:

با ما حریفی و زندی کرد و غائبانہ از ما بازی برد[1]

(۲۵ جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات ہوئی (قدس اللہ سرہ العزیز) جب کہ حضرت شیخ محمد سعید کی عمر صرف سات سال تھی)[2]

چنانچہ حضرت خواجہ کی زیارت نہیں حاصل ہوئی۔ مگر حضرت خواجہ آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

"محمد سعید حریف ست۔ از ما غائبانہ نسبت گرفتہ است"

ع فی المھد ینطق عن سعادۃ جدہ[3]

یہی جوہرِ عالی تھا جس کا لحاظ فرماتے ہوئے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ

---

[1] حالات مشائخ نقشبند ص ۲۷۲ - [2] محمد میاں - [3] مکتوبات مذکورہ

سرہ العزیز نے تحریر فرمایا تھا:

فرزندانِ[۱] ایں شیخ (مجدّد صاحب) کہ اطفال اند، اسرارِ الٰہی اند۔ استعداد ہائے عجیب دارند۔ بالجملہ شجر طیّبہ اند انبتہا اللہ نباتاً حسناً۔[۲]

نیز فرمایا کرتے تھے:

خواجہ احمد سعید[۳] و محمد معصوم ہر دو پسران خواجہ احمد پارہ ہائے جواہر اند کہ بے بہا اند۔ و در ایّامِ خورد سالی بمقاماتِ احمدیہ رسیدہ اند۔[۴]

تحصیلِ علوم | (والد ماجد حضرت مجدّد صاحب۔ برادر بزرگ خواجہ محمد صادق صاحب اور حضرت شیخ طاہر صاحب لاہوری (خلیفہ حضرت مجدّد صاحب) سے عقلی و نقلی علوم حاصل کئے۔ تجوید و قرارت میں اعلیٰ کمال حاصل کیا، اور صرف سترہ سال کی عمر میں تحصیلِ عُلوم سے فراغت پاکر خدمتِ تدریس شروع کر دی، اور اسی طرح سُلوک و طریقت میں بھی کمال حاصل کر لیا۔[۵]

عِلمی کمالات | روایت و درایت حدیث، اصولِ حدیث، سند اور اسماء رجال میں مہارت اور حذاقت کے مالک تھے۔ تفقہ اور فقہی بصیرت میں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔

آپ کی فقہی تحقیق و تدقیق بسا اوقات حضرت مجدّد صاحب کے اشکالات کے لئے اطمینان کا باعث بنتی تھی۔ حضرت مجدّد صاحب اس بے نظیر مہارت و بصیرت سے مسرور ہو کر دعائیں دیتے۔ اپنی خوش نصیبی پر ناز اور فضل ایزدی

---

[۱] شیخ موصوف (حضرت مجدد صاحب) کے فرزند جو خورد سال ہیں، اسرارِ الٰہی ہیں۔ عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شیخ احمد ایک مبارک درخت ہیں۔ جس کو خدا نے نہایت ہی اچھی طرح اُگایا اور بڑھایا ہے ۱۲ [۲] حالات مشائخ نقشبند ص۲۷۲۔ [۳] خواجہ احمد سعید اور محمد معصوم جواہر بے بہا ہیں اور ایّامِ خورد سالی میں مقاماتِ احمدیہ پر پہنچ چکے ہیں ۱۲۔ [۴] خزینۃ الاصفیاء ص۶۳۸ جلد اوّل۔ [۵] مکتوباتِ خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ جلد ۳۔ و حالات مشائخ نقشبند ص۲۷۳ وغیرہ۔

کا شکر ادا کرتے۔

زُہد و تقویٰ ابتدار شعور سے پابندیٔ شریعت، تقوےٰ اور طہارت میں والد بزرگوار کا نمونہ تھے۔ اتباعِ سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حریص اور ہر ایک موقعہ پر عزیمت[1] پر عمل کے عادی۔

دنیاوی تدبیر و تدبّر اخروی معاملات میں کمال عقل کے ساتھ، دنیوی معاملات میں بھی تدبّر اور حسنِ تدبیر کے مالک تھے۔ حضرت مجدّد صاحب اکثر معاملات میں مشورہ فرماتے، اور ان کی رائے کو پسند فرماتے۔

رُوحانی کمالات حضرت مولانا سیّد غلام علی شاہ صاحب دہلوی مجدد مائۃ اثنا عشر، کی مجلس میں ذکر آیا کہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی فرمایا کرتے ہیں کہ مجدّد صاحب کے دونوں صاحبزادے تجدید ملّت اور مجددیت میں حضرت مجدّد صاحب کے شریک ہیں۔

حضرت سیّد غلام علی شاہ صاحب نے فرمایا:

اور تو کچھ معلوم نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حضرت مجدّد صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ میرا اور میرے لڑکوں کا معاملہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ مصنّف شرح وقایہ اور اُن کے دادا کا۔ مصنّف شرح وقایہ کے دادا سبقاً سبقاً اپنی مشہور تصنیف "وقایہ" تالیف فرماتے جاتے تھے اور مصنّف شرح وقایہ یاد کرتے جاتے۔ اسی طرح جو عُلوم و معارف ہم

---

[1] شریعتِ غرّا بسا اوقات عوام کی سہولت کے لئے احکام میں گنجائش پیدا کر دیتی ہے، اس کو رخصت کہتے ہیں مثلاً جیسا کہ مجدّد صاحب کے حالات میں پڑھ چکے ہو کہ ظالم بادشاہ کے ظلم سے بچنے کیلئے یہ بھی جائز ہو سکتا تھا کہ سجدۂ سلطانی کی کوئی تاویل کر لی جاتی۔ چنانچہ شاہجہان نے اسی کا مشورہ دیا تھا مگر حضرت نے اس کو منع فرما دیا۔ ایسے موقعہ پر اصل حکم پر بلا تاویل عمل کرنا عزیمت کہلاتا ہے اور اس گنجائش کو رخصت کہتے ہیں۔

پر منکشف ہوتے ہیں، ہمارے دونوں لڑکے "محمد سعید و محمد معصوم" خود بخود ان کو محفوظ کر لیتے ہیں۔[۱]

بہر حال اُمورِ باطنیہ میں حضرت مجدد صاحب کے راز دار تھے۔ اور مِلّی خدمات میں شریکِ کار۔ امراضِ ظاہری کے مریض اُن کی توجّہ سے شفایاب ہوتے تھے، اور امراضِ باطنی کے بیمار اُن کے تصرّف سے شاہراہ جمعیت خاطر پہ گامزن۔ مختصر یہ کہ وہ قطب المحققین، وارث المرسلین خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہ العزیز کے اس قول کے مصداق تھے کہ ما فضلیا نیم۔[۲]

ان کے جلالت و عظمت کے لئے صرف ایک واقعہ کا نقل کر دینا کافی ہے۔

ایک مرتبہ مشاہدہ کیا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتماع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صدرِ مجلس ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک درخواست بارگاہِ رسالت میں پیش کی۔ رسالت پناہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب تحریر فرمایا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔[۳]

درخواست میں تحریر تھا:

ایشاں[۴] و مایاں در عنایاتِ الٰہی جل سلطانہٗ برابریم و ما ایں ہمہ محن و ریاضاتِ شاقہ کشیدہ ایم و اینہا نہ وجہش چیست۔[۵]

حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے:

---

۱ خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۶۳۸۔ ۲ مکتوبات جلد سوم۔ یعنی فاضل اور زائد چیز ہیں۔
۳ یہ خدا کا انعام ہے جس کو چاہے عطا فرمائے۔ وہ بڑے انعام والا ہے۔ ۴ یہ خواجہ محمد سعید صاحب اور ہم عنایاتِ الٰہی جل سلطانہٗ میں مساوی ہیں۔ باوجودیکہ ہم نے اس قدر محنتیں اور سخت سخت ریاضتیں برداشت کیں، انہوں نے ان کے مقابلہ میں کچھ بھی محنت نہیں برداشت کی اِس مساوات کا سبب کیا ہے۔ ۱۲۔ ۵ مکتوب سوم مکتوبات خواجہ معصوم جلد ۳۔

محمد سعید علماء راسخین اور زمرۂ سابقین میں سے ہے۔ خلیلِ خدا ہے۔[1] خلعت خُلّت جو مجھ سے جُدا ہوگا، وہ محمد سعید کو عطا ہوگا۔ عروج و نزول کے جس مقام پر میں پہنچا، محمد سعید میرے ہمراہ تھا۔ محمد سعید خازن رحمت ہے۔ قیامت کے روز خزائن[2] رحمت کی تقسیم محمد سعید کے سپرد ہوگی۔[3]

مقبولیتِ دُعا سرہند شریف میں وبا کی کثرت ہوئی۔ لوگ حاضر خدمت ہوئے، دُعا کی التجا کی۔ اُسی وقت سے وبا کافور ہوگئی۔ جتنے بیمار تھے، شفایاب ہوئے (خزینۃ الاصفیاء ص۶۳۹)

جمالِ ظاہری باطنی جمال و کمال کے ساتھ ظاہری جمال بھی اس درجہ کا تھا کہ دیکھنے والا فریفتہ ہوجاتا تھا۔[4]

حج بیت اللہ شریف عالمگیر اور داراشکوہ میں چشمک رہا کرتی تھی۔ حضرت موصوف حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ عالمگیر حاضر خدمت ہوا، اور دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا:

"جو ترویجِ شریعت کا عہد کرے، وہ کامیاب ہوگا۔"

عالمگیر نے عہد کیا۔ فرمایا: انشاء اللہ کامیاب ہوگے۔[5]

زیارتِ حرمین شریف کے موقعہ پر کمالاتِ رُوحانی کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ جب بعافیت واپسی ہوئی تو حکومتِ عالمگیر عروج پر تھی۔

وفات عالمگیر نے دہلی تشریف لانے کی درخواست کی۔ حضرت موصوف نے معذرت

---

[1] حضرت مجدد صاحب کے ایک مکتوب کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ رُوحانی کمالات کی کچھ قسمیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ان کا سرچشمہ ہیں۔ صحابۂ کرام سب سے پہلے سیراب ہونے والے اور تمام اولیاء اُن کا پرتو ہیں۔ پھر طبیعت اور استعداد کے مناسب رُوحانی کمالات میں سے اولیاء اللہ کو حصہ ملتا ہے۔ کسی کو کسی خاص قسم میں سے، کسی کو مختلف اقسام میں سے ۱۲ محمد میاں [2] یعنی سلسلۂ مجددیہ کے متوسلین کے لئے واللہ اعلم۔ [3] حالات مشائخ نقشبند۔ [4] خزینۃ الاصفیاء ص۶۳۹۔

[5] حالات مشائخ نقشبند ص۲۷۴

فرمائی۔ مگر جب عالمگیر کا اصرار زیادہ بڑھا۔ آپ دہلی تشریف لائے۔

آپ دہلی میں قیام فرما تھے کہ مرض کا آغاز ہوا۔ اُمّیدِ زیست منقطع ہونے لگی تو آپ نے چاہا کہ سرہند پہنچ جائیں۔ پالکی کے ذریعہ سرہند روانہ ہوئے۔ راستہ میں "سنبھالکہ" مقام پر بتاریخ ۲۷ جمادی الثانیہ ۱۰۷۲ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ۶۵ سال عمر پائی۔

جنازہ مبارک سرہند پہنچایا گیا اور حضرت مجدّد صاحب کے مقبرہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ستّر اسّی سال بعد کثرتِ بارش کے باعث قبر مبارک بیٹھ گئی۔ جنازہ کُھل گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ جسم شریف مع کفن بجنسہٖ محفوظ تھا اور خوشبو سے مہک رہا تھا۔[1]

آپ کے پانچ فرزند اور بہت سے خلفاء آپ کے بعد آپ کے علوم و معارف کے وارث بنے۔ رحمہم اللہ۔

العُروۃ الوُثقٰے۔ خواجہ محمّد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز

مجدّد الف ثانی کے فرزندِ ثالث۔ جلیل القدر خلیفہ

کمالاتِ مُطہّرہ کے اِمام

ولادتِ باسعادت ۱۰۰۷ھ (ایک ہزار سات) بمقام بسی متصل سرہند۔ اسی سال حضرت مجدّد صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مجدّد صاحب فرمایا کرتے تھے:

محمّد معصوم[2] کی ولادت ہمارے لئے مبارک ہوئی کہ ایسے شیخِ کامل یکتا روزگار کی خدمت حاصل ہوئی۔

تعلیم والد بزرگوار۔ برادر محترم محمّد صادق صاحب، اور شیخ طاہر صاحب خلیفہ حضرت

---

[1] مشائخ نقشبند صفحہ ۲۸۰۔ [2] تولد این فرزند بسیار ارجمند است کہ بعد تولدِ وے مراصحبت اینچنیں پیر روشن ضمیر میسّر گردید (خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۶۲۴ جلد اوّل)۔

مجدّد صاحب سے عقلی اور نقلی علوم حاصل کئے اور جملہ علوم و فنون میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں علومِ ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ حضرت مجدّد صاحب فرمایا کرتے تھے:

بابا ہمیں تم سے بہت بڑے بڑے کام لینے ہیں، جلد تحصیلِ علوم سے فارغ ہو جاؤ۔

حُلیہ لانبا قد پُر اندام، گندمی رنگ، ابرو کشادہ، بینی بلند، آنکھیں بڑی بڑی، چہرہ اور تمام اعضاء خوبصورت اور مناسب، خط بھرا ہوا۔ داڑھی سفید۔[1]

اخذِ طریقت گیارہویں سال والد ماجد سے بیعت ہو کر تعلیمِ طریقت شروع کر دی۔ عمر مبارک چودہ سال تھی کہ ایک خواب دیکھا۔

میرے بدن سے ایک نُور آفتاب کی مانند نکل رہا ہے۔ سارا عالم اور عالم کا ذرّہ ذرّہ اس سے روشن ہے۔ اگر یہ غروب ہو جائے تو سارا عالم تاریک ہو جائے۔

حضرت مجدّد صاحب نے تعبیر فرمائی "تم قطبِ عالم ہو گے۔ یہ بشارت ہے۔ یاد رکھو اور کوشش کرو۔

سولہ سال کی عمر میں تحصیلِ علوم سے فراغت پا کر سلوک طریقت کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو گئے، اور بہت جلد اعلیٰ مدارج طے کر لئے۔ حتیٰ کہ حضرت مجدّد صاحب کی اولاد میں سب سے سبقت لے گئے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ ہر دو صاحبزادگان والد ماجد کے ساتھ مدارجِ عالیہ کو طے کرتے ہوئے مجدّدی خدمات میں شریک اور مددگار تھے۔

اس رفاقت اور تعاون کے متعلق حضرت مجدّد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میری اور ان بچوں کی مثال شارح وقایہ اور اُن کے دادا جیسی ہے۔ اس مضمون کو حضرت خواجہ معصوم کے برادر زادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ عبدالاحد وحدتؔ نے منظوم فرمایا ہے:

مجدّد بتوصیفِ او لب کشاد بفرمود کاے پورِ عرفان نژاد

---

[1] حالات مشائخ نقشبند ص ۳۳۲

زعفراں نوشتم ورق در ورق ہمہ خواندی ازمن سبق در سبق
تو یک نکتہ زیں لوح نگذاشتی ہر آنچہ نہادم تو برداشتی
تو آخر چو من قطبِ دوراں شوی زمن ایں بشارت بہ یاد آوری

اخلاق جانشینِ مجدّد کے اخلاق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت مجدّد رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح جانشین ہے جس کو قطبیت کی بشارت مجدّد صاحب نے دی اور دنیا نے اس بشارت کو صحیح تسلیم کیا۔ یہی آپ کی تعلیم تھی اور یہی آپ کا طرز کہ :

"تم خوش دل ہو یا کسی وجہ سے تنگ دل، مگر اچھے یا بُرے جس سے بھی ملو، کشادہ پیشانی اور وسیع اخلاق کے ساتھ ملو۔ جو شخص جو معذرت کرے اُسے قبول کرو۔ اپنے اخلاق اچھے رکھو، کسی پر اعتراض مت کرو۔ نرم اور ملائم بات کہو۔ گفتگو میں سختی ہرگز مت برتو۔ نماز، روزہ، شب بیداری اسباب بندگی اور عبادت کے طریقے ہیں، درویشی نہیں۔ کسی سے رنجیدہ نہ رہنا، کسی کو رنجیدہ نہ کرنا، درویشی ہے۔ اگر یہ حاصل کرلوگے واصل ہو جاؤگے۔

کسی نے محمد بن سالمؒ سے پوچھا۔ اولیاء اللہ کی شناخت کیا ہے؟ فرمایا گفتگو میں نرمی، اخلاق کی عمدگی، کشادہ پیشانی، سخاوت اور استغنار دوسروں پر اعتراض نہ کرنا، معذرت کرنے والوں کے عذر قبول کر لینا۔ خدا کی ساری مخلوق پر شفقت۔

سخاوت غیر مستطیع احباب۔ تنگ دستوں اور مفلسوں کے لئے گویا آپ مربّی تھے۔ جب ضرورت کا اظہار کیا جاتا، اس کو پورا فرماتے، ورنہ ہمدردانہ کوشش کرتے۔ بسا اوقات اظہارِ ضرورت سے پہلے ہی آپ کی ذکاوت اور فراستِ ایمانی ضرورت مند کے چہرہ بشرہ سے اس کی ضرورت معلوم کر لیتی اور حاجت روائی کر دیتی۔

ایک شخص کے یہاں چھ مہمان آگئے۔ وہ خود فاقہ سے تھا، اُس پر مہمانوں کا بار۔ وہ فوراً بارگاہِ معصومی میں حاضر ہوا۔ مگر فرطِ ادب اور حیاء کے باعث کچھ نہ کہہ سکا۔

آپ کا طریقہ تھا کہ جب آپ کے یہاں آم آتے، تو فی کس دس آم دیتے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

ان کو دس آم دے دو، اور دس ان کے ایک مہمان کے، دس دوسرے کے دس تیسرے کے۔ غرض ستر آم ان کو عنایت فرمائے۔ پھر کچھ اشرفیاں مرحمت فرمائیں، اور ارشاد ہوا۔ تم خود کو اولاد کی طرح سمجھو۔ جب ضرورت ہو، ہم سے طلب کرو۔

قناعت و استغناء والد ماجد نے فرما دیا تھا:

فرزندا! خانقاہ کی ٹوٹی چٹائی کو تخت سلطنت سمجھو۔ پرانی جھونپڑی اور سوکھی روٹی پر قناعت کرو۔ صحبتِ اُمراء اور مجلسِ بادشاہ سے پرہیز رکھو۔

حضرت معصومؒ نے اس عہد پر زندگی ختم فرما دی۔ شاہجہاں کی تمنّا تھی کہ حضرت خواجہ کی رفاقت حاصل ہو مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ عالمگیر بارگاہِ معصومی میں حاضر ہوا۔ حلقہ بگوش ارادت ہوا۔ محل سرائے شاہی میں رفاقت و ہم نشینی کی تمنّا کرتا رہا۔ لیکن قطبِ عالم کے لئے کب ممکن تھا کہ وہ جگہ سے جنبش کرے۔ جب اصرار زیادہ کیا تو حضرت نے اپنے صاحبزادہ مولانا سیف الدّین صاحب کو عالمگیر کی باطنی تربیت کے لئے بھیج دیا۔

احترامِ اکابر حضرت شیخ محمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ، حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز سے صرف دو سال بڑے تھے۔ عمر کے ایسے تفاوت میں نہ خوردگی اور بزرگی کا احترام ہوتا ہے، اور نہ ادب و تعظیم کی کوئی خاص پاسداری کی جاتی ہے۔ لیکن خواجہ محمد معصوم صاحب اپنی جلالت و عظمت کے باوجود حضرت شیخ موصوف کا حد سے زیادہ احترام فرماتے۔

شام کے وقت خواجہ محمد سعید صاحب پالکی میں سوار ہو کر تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔ پالکی دولت سرائے معصومی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ حضرت خواجہ پالکی دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے اور جب تک پالکی نظر کے سامنے رہتی، کھڑے رہتے۔

بارہا عرض کیا گیا کہ حضرت شیخ کو آپ نظر بھی نہیں آتے، وہ اکثر دوسری طرف دیکھتے رہتے ہیں، کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت خواجہ جواب دیتے، دکھانا مقصود نہیں۔

مکان میں ایک بیری کا درخت تھا۔ اُس کے بیر پہلے حضرت شیخ کی خدمت میں بھیج دیتے۔ اس کے بعد خود کھاتے یا دوسروں کو کھلاتے۔

حلقۂ درس سُلوک و طریقت کے اوراد و معمولات تہجّد، اشراق، چاشت، زوال، اوّابین وغیرہ طویل نوافل کے باوجود درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ حدیث شریف اور تفسیرِ قرآن سے خاص شغف تھا۔ اسی کا عموماً درس ہوتا تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں مشتاقانِ علوم بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

تفسیر و حدیث کے علاوہ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا درس بھی آپ دیتے تھے، اور اس کے دقیق مضامین کو شرح و بسط سے بیان کرتے اور شبہات کا حل فرماتے۔

حلقۂ ارشاد اوراد و وظائف، نوافل اور تلاوت، ذکر و تسبیح، وعظ و تلقین، درس و تدریس کے مشاغل دو تین بجے شب سے شروع ہو کر بارہ بجے شب تک جاری رہتے۔ دوپہر کو تھوڑا سا وقت قیلولہ کے لئے ملتا۔

بایں ہمہ وسعتِ اخلاق نے آپ کو خلق اللہ کا محبوب بنا دیا تھا۔ گرویدگی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں زیارت اور حصولِ طریقت کے لئے حاضر ہوتے۔

مؤرخین کا اتّفاق ہے کہ حضرت مجدّد صاحب کے خلفاء میں سب سے زیادہ فیض آپ کے ذریعہ سے پہنچا۔ تقریباً نو لاکھ[1] مردوں اور عورتوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ

---

[1] یہ تعداد مشکوک ہے کیونکہ اس زمانہ میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد کروڑوں نہیں بلکہ لاکھوں ہی کی شمار میں تھی اور تقریباً اتنی ہی ہوگی۔

کی۔ سات[1] ہزار خلیفہ صاحبِ ارشاد ہوئے۔ ایک ہفتہ میں آپ کے فیضِ صحبت سے ایک طالب درجۂ فنا و بقار کو پہنچ جاتا، اور ایک ماہ میں کمالاتِ ولایت سے مشرف ہو جاتا۔

کشفِ مقاماتِ الٰہیہ نہایت صحیح تھا۔ دُور دراز کے مریدوں کی غائبانہ تربیت فرماتے۔ اور دُور[2] دراز مسافت کے باوجود بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ولایت محمدی ہے یا موسوی یا عیسوی۔

اورنگ زیب بادشاہ حلقہ میں حاضر ہوا[3] کرتا، اور جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتا حضرت کا رعب عالمگیر پر اس قدر غالب تھا کہ عالمگیر زبانی گفتگو نہ کر سکتا۔ جو کچھ عرض کرنا ہوتا، تحریر پیش کرتا۔

سفرِ حج کو جاتے ہوئے جن جن مقامات پر گذر ہوا، جوق جوق خلق خدا حاضر

---

[1] آپ کے چھ فرزند آپ کے خلفار ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ (انشاءاللہ) ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اسمار گرامی حالات مشائخ نقشبند میں درج ہیں۔ محمد باقر لاہوری۔ محمد حنیف کابلی۔ محمد صدیق پشاوری مرزا امان اللہ برہانپوری۔ شیخ محمد علیم اللہ جلال آبادی۔ مرزا عبید اللہ بیگ۔ مُلّا حسن علی پشاوری۔ مُلّا موسیٰ بھٹی مُلّا بدرالدین سلطانپوری۔ حکیم حافظ عبدالحکیم نوہانی۔ شیخ بایزید سہارنپوری۔ حاجی حبیب اللہ حصاری۔ شیخ محمد مراد۔ شیخ آدم ٹھٹھی۔ سیّد یوسف کرویزی۔ میر شرف الدین حسین لاہوری۔ شیخ انور نور سرائی۔ شیخ منصور جالندھری آخوند سجاول مترجم شرح وقایہ (وغیرہ وغیرہ) ۱۲ [2] کشف و مراقبہ تو یقینی چیز ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ طبعی ذکاوت و ذہانت کے باعث طرزِ تحریر سے اندازہ فرما لیتے کہ ولایت کی اقسام میں سے کس قسم کے ساتھ اس کی طبعی استعداد مناسبت رکھتی ہے۔ بہرحال جو طریقۂ تعلیم و تربیت میں اس درجہ ماہر ہو اور پھر مقبولیت بھی اس کو حاصل ہو تو کیا تعجب ہے کہ اس کے ہزاروں خلفار اور لاکھوں مرید ہوں۔ [3] ۷ ارشعبان ۱۰۶۲ھ کو عالمگیر ملتان کا گورنر بنایا گیا اور چار سال تک اس علاقہ میں حکومت کرتا رہا۔ یہ حاضری اسی زمانہ میں ہوتی رہی۔ عالمگیر کا طرز شاہجہاں کے سامنے بھی یہی تھا وہ زبان سے کم ادا کرتا تھا۔ لحاظ کے سبب سے اپنا ما فی الضمیر تحریر میں ادا کرتا تھا۔

ہوئی اور بیعت و عقیدت کے بیش بہا موتی دامنوں میں بھر کر لے گئے۔

حجازِ مقدّس میں دنیائے اسلام اور بالخصوص حرمین شریفین کے طالبانِ مولےٰ انے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے بیعت کی اور رُوحانی فوائد کی دولتیں لُوٹیں۔

نظامِ اوقات تھوڑے وقت میں زیادہ کام کیا جا سکتا ہے اگر اوقات میں نظم ہو۔ حضرت خواجہ کے نظامِ اوقات میں بھی سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع نمایاں تھی۔ تمام زائرین اور متوسلین کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا۔ عموماً عصر کے بعد وعظ و پند کی کل مجلس ہوتی۔ ظہر کے بعد درس اور تحریرِ خطوط کا وقت تھا۔ بسا اوقات عصر کے بعد بھی درس ہوتا۔ مغرب کے بعد تلقین ہوتی، اور اسی وقت لوگ داخلِ سلسلہ ہوتے۔ اشراق کی نماز کے بعد چاشت تک درس اور مریدین کی تلقین کا وقت تھا۔ مقررہ اوقات میں عورتوں کی مجلس میں زنان خانہ میں وعظ و پند نیز تلقین اور رُوحانی تربیت ہوتی۔ عام مجالس کے اوقات کے علاوہ باقی اوقات میں ملاقات کرانے اور نمبروار طالبین کو تربیت و ہدایاتِ روحانی کے لئے پیش کرنے کے واسطے حاجی محمد عاشور بخاری مامور تھے۔ ہر ایک کو حاضری کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ چند خصوصی خدّام اور صاحبزادگان مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح زنان خانہ میں صاحبزادیاں واسطہ ہوتی تھیں۔ خانقاہ میں اس کا بھی انتظام تھا کہ جو حضرات اہل و عیال سمیت زیارت یا سلوک طریقت کے لئے حاضر ہوں، ان کو علیحدہ قیام گاہ دے دی جائے، اور ان سب کا کھانا قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے تاکہ بال بچّوں کے ساتھ مِل جُل کر کھانا کھائیں۔

تعلیمات و نظریات ظاہری شریعت کی پابندی، سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع، بدعتوں سے اجتناب جو حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تعلیمات کا طرۂ امتیاز بلکہ حضرت مجدّد صاحب کی حیاتِ مقدّس کا نصب العین تھا۔ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کی پاک زندگی بھی اسی مقدّس مقصد کے لئے وقف تھی۔

حضرت مجدّد صاحب کے مکتوب کی طرح آپ کے مکتوبات بھی انہیں اُمور کی تعلیم سے پُر ہیں۔ آپ کے ایک مکتوب کے ایک حصّہ کا ترجمہ[1] درجِ ذیل ہے۔

اے برادر! ناجنس اور مخالف کی صحبت سے احتراز کرو۔ بدعتیوں کی مجالست سے دُور بھاگو۔ یحییٰ معاذ رازی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔ تین آدمیوں کی صُحبت سے بچو۔ عالم غافل۔ درویش مُداہن[2]۔ جاہل صوفی۔ جو شخص شیخ طریقت کی مسند پر بیٹھتا ہے اور سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند اور زیورِ شرع سے آراستہ نہیں ہے، اُس سے دُور رہو۔ ہرگز ہرگز اس کے پاس مت جاوٴ، بلکہ اس شہر میں بھی نہ رہو۔ بہت ممکن ہے کچھ عرصہ بعد رفتہ رفتہ دل میں اس کی جانب میلان پیدا ہو جائے۔ جس سے مذہبی کاروبار میں رخنہ پڑ جائے۔ ایسا شخص پیشوا بننے کا اہل نہیں۔ یہ چُھپا ہوا چور ہے یہ شیطان کا ایجنٹ ہے۔ اس سے کتنی ہی کرامتیں کتنے ہی خوارق عادات دیکھو، اور اس کو دنیا سے کتنا ہی بے تعلق پاوٴ، مگر اس سے اور اس کی صحبت سے اتنا دُور بھاگو، جتنا شیر سے۔

سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:

تمام راستے بند ہیں، صرف ایک راستہ کُھلا ہے۔ وہ اس شخص کیلئے جو سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے۔ نیز فرماتے ہیں:

جس نے قرآن پاک کو حفظ نہیں کیا۔ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں لکھا پڑھا، اس کی پیروی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ کارخانۂ اسلام کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کی بنیاد پر قائم ہے۔

نیز ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] ماخوذ از حالات مشائخ نقشبند از ص۳۴۰ تا ص۳۴۲۔ [2] "مداہن"۔ جو خلافِ شرع معاملات میں[3] نرمی سے کام لے۔ ان کی تردید نہ کرے ۱۲ [3] عالمگیر کا بھائی داراشکوہ اس خاندان کا دشمن تھا حضرت خواجہ معصوم کی اس تحریر کو پڑھ کر داراشکوہ کو پہچان لو تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی (محمد میاں)۔

وہ سردار جو خدا کے مقرّب ہیں، جو سابق کہلانے کے مستحق ہیں، وہ کتاب و سُنّت کے پابند ہیں۔ یہی لوگ حقیقت میں صوفی ہیں۔ یہی شریعت وطریقت کے عالم باعمل ہیں۔ یہی انبیاء علیہم السّلام کے وارث ہیں۔ یہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور اخلاق کے متّبع ہیں۔ خداوندِ عالم ان حضرات کی برکتیں ہمیں عنایت فرمائے۔

نیز حضرت جنید بغدادی ارشاد فرماتے ہیں: جو شخص آدابِ نبوی میں سُست اور سُننِ مصطفوی (علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام) کا تارک ہو، ہرگز ہرگز اس کو عارف مت سمجھو۔ ترکِ دنیا، گوشہ نشینی، خلوت گزینی اور اس کے خوارقِ عادات کے فریفتہ اس کے زہد، توکّل اور معارفِ توحید کے شیفتہ مت بنو۔ کیونکہ یہودی، نصرانی، جوگی اور برہمن جیسے فرقِ باطلہ بھی ان اُمور میں شریک ہیں۔

حضرت ابو عمر نجید رضؓ کا ارشاد ہے:

جو حالت علمِ صحیح کا نتیجہ نہ ہو، وہ خواہ کتنی ہی عظیم الشّان ہو، مگر وہ خطرناک ہے۔ اُس کے نفع سے نقصان زیادہ ہے۔

آپ سے تصوّف کی حقیقت دریافت کی گئی۔ فرمایا۔ الصبر تحت الامر والنھی۔ یعنی خداوندی احکام کے ماتحت استقلال وصبر۔

امورِ شریعت کا مدار اتباعِ شریعت پر ہے۔ معاملۂ نجات اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے۔ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر زہد، توکّل اور تبتّل غیر مقبول ہے۔ اور حضرت رسالت پناہ کے توسل کے بغیر ذکر وشغل، ذوق وشوق اکارت ہے۔ خوارق وعادات کا تعلق، گرسنگی، تہی شکمی اور اسی قسم کی مشق وریاضت سے ہے۔ معرفتِ الٰہی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

آدابِ نبوی (مستحبات) میں سُستی کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ سُنّتوں پر عمل کی

توفیق اس کو نہ ہوگی۔ اور جو سُنّتوں سے محروم ہو، فرائض سے محرومی اس کی سزا ہوگی۔ اور جو ادائے فرائض میں سُست ہو، لامحالہ معرفتِ الٰہی سے محروم رہے گا یہی نکتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

المعاصی تزید الکفر۔ گناہ کفر کو بڑھا دیتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ سے بادشاہِ وقت نے کہا۔ فلاں صاحب ہوا میں اُڑتے ہیں۔

شیخ: کوّے اور مکھی بھی ہوا میں اُڑتے ہیں۔

سلطان: فلاں شخص ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچ جاتا ہے۔

شیخ: شیطان ایک سانس میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے۔

بہر حال اس قسم کی چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ مرد وہ ہے کہ مخلوقِ خُدا سے مِل جُل کر رہے، خرید و فروخت کرے، لوگوں کے مجمع میں شریک ہو، بیوی بچوں کی پرورش کرے اور ان تمام دنیاوی علائق کے باوجود ایک لمحہ بھی خدا سے غافل نہ رہے۔

اہل اللہ کے مقتدا، حضرت رودباری سے ایک ایسے شخص کے متعلّق دریافت کیا گیا، جو مزامیر اور غنا سُنتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میرے لئے جائز ہے کیونکہ میں اس درجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ اختلافِ حالات[1] سے میرے اُوپر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

حضرت موصوف نے جواب دیا۔ بیشک وہ ایسے درجہ پر پہنچ گیا ہے مگر یہ درجہ جہنّم کا ہے۔

ابوسلیمان درّانی فرماتے ہیں۔ بسا اوقات میرے دل میں نکات و لطائف کا تصوّر آتا ہے۔ مگر میں ان کو اسی وقت قبول کرتا ہوں جب دو شاہد اس کی تصدیق کر دیں۔

---

[1] تعجب ہے یہ شخص کس قدر گستاخ ہے۔ کیا اس کا نفسِ امارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے بھی زیادہ مطمئن اور اصلاح پذیر ہو چکا ہے؟ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرام فرمائیں اور یہ شخص اپنے لئے حلال کہے۔ کیا یہ انتہائی گستاخی نہیں؟

یعنی کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حدیث شریف میں ہے۔ اصحاب بدعت دوزخ کے کتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے، بدعتی کا معبود اور مولا شیطان ہوتا ہے۔

تعلیمِ جہاد حضرت مجدّد صاحب نے سلاطین اور اُمراء کو پابندِ شرع بنایا۔ حضرت خواجہ معصوم ان کو مجاہدِ اسلام بناتے ہیں۔ وہ جدال و قتال جو ملک گیری کے لئے ہوگیا تھا، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں وہ شعائرِ اسلام کے قیام کے لئے ہونے لگا۔ ایامِ شاہزادگی میں شاہجہاں نے عالمگیر کو بلخ کی مہم پر مامور[1] فرمایا تھا۔ اس موقعہ پر حضرت خواجہ نے جو مکتوب عالمگیر کو تحریر فرمایا۔ وہ ہر ایک مسلمان کے لئے سبق آموز ہے۔ ہم ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اصل جہاد اپنے نفس کو مارنا ہے نفس کشی کے بعد جہاد بالسّیف اُسی وقت معتبر ہوگا، جب کہ اپنی اغراض سے پاک ہو کر صرف احکامِ ربّانی کی تعمیل کے لئے ہو۔

ارشاد ہوتا ہے۔ خوشا وقت و خوشا حال کہ اس عظیم الشّان مہم کے لئے کمرِ ہمت چُستی کے ساتھ کس لی ہے، اور شوق و حُسنِ نیّت کے ساتھ ایک دُور دراز سفر اختیار کیا ہے۔ جس کا نتیجہ لامحالہ خیر و برکت ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جنّت میں سو درجے ہیں۔ سب سے اُوپر کا درجہ مجاہدین فی سبیل اللہ کیلئے ہے۔ ہر دو درجوں میں زمین سے آسمان تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری شریف)

ارشاد ہوا۔ راہِ خدا میں ایک ساعت توقف کرنا، مکۂ معظمہ میں حجرِ اسود کے پاس شب قدر میں بیدار رہنے سے بہتر ہے (بیہقی و ابنِ حبان فی صحیحہ)۔

چونکہ حرم پاک مکۂ معظمہ میں ایک شب قدر کا قیام دس لاکھ ماہ کی شب بیداریوں کی برابر ہے۔ لہٰذا علماء نے نتیجہ نکالا ہے کہ جہاد کے موقعہ پر ایک ساعت توقف دس لاکھ

---

[1] چنانچہ نظامت کے زمانہ میں دو مرتبہ قندھار وغیرہ پر حملہ کیا۔ ۱۲

ماہ کی شب بیداریوں سے افضل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص جہاد کے موقعہ پر بوقت شب پہرہ پر جاگ رہا ہے تو اس کی حفاظت میں جس قدر لوگ روزے یا نمازیں ادا کر رہے ہیں، اُن سب کی برابر اُس کو ثواب مِل رہا ہے۔ (رواہ الطبرانی باسناد جید)

علمار کرام نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ کسی حاکم کے علاقہ حکومت میں جس قدر لوگ امن اور اطمینان سے خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان سب کی برابر اس حاکم عادل کو ثواب ملتا ہے جو اُن سب کا محافظ بنا ہوا ہے۔

افسوس یہ فقیر ناکارہ بظاہر صورت مختلف عوائق وموانع کے باعث جہاد فی سبیل اللہ کی دولتِ بے پایاں سے محروم ہے۔ یالیتنی کنت معھم فافوز فوزًا عظیمًا۔

لیکن باطنی طور پر دُعا اور توجہ کے لحاظ سے (جو فقرار کا خاص کام ہے) اس فقیر ناکارہ کو اپنا رفیق اور اپنا ممد ومعاون تصوّر فرماتے رہیں۔

ہم جیسے گوشہ نشین فقرار اگر سالہا سال ریاضتیں کریں اور چِلّے کھینچیں تو ثوابِ جہاد کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

موقعۂ جہاد پر جو طاعت اور عبادت ہوتی ہے، گوشہ نشینی کی طاعت وعبادت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ موقعۂ جہاد کی ذکر وتسبیح کا ثواب دوسرا۔ نماز کا مرتبہ جُدا۔ صدقات ونفقات کی شان بہت بالا۔ اور بیماریوں کی فضیلت علیحدہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ وہ شخص مبارک ہے جو موقعۂ جہاد پر ذکرِ خدا بھی کثرت سے کرے۔ اس شخص کو ہر کلمہ کے عوض میں ستّر ہزار حسنات کا ثواب ملے گا۔ ہر ایک حسنہ کا دس گُنا ثواب۔ اور خدا کے یہاں اس سے بھی زیادہ ثواب کا امکان ہے۔ (طبرانی) نیز ارشاد ہے میری اس مسجد (مسجدِ نبوی) میں نماز کا ثواب دس ہزار گُنا ہے اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ گُنا، اور میدانِ جہاد میں بیس لاکھ گُنا۔ (ابوالشیخ وابنِ حبان)

نیز ارشاد ہے۔ میدانِ جہاد کی نماز پانچ سو نماز، اور ایک دینار یا درہم کا صدقہ سات سو گُنا ہوتا ہے۔

نیز ارشاد ہے کہ جو شخص مجاہد فی سبیل اللہ کی امداد کرے اور اس کے پیچھے اُس کے گھر والوں کا خیال رکھے تو قیامت کے روز وہ سایۂ خداوندی میں ہوگا حالانکہ اُس دن کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا (احمد و بیہقی)۔ اسی طرح فضائلِ جہاد کے متعلق چند حدیثیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

یہ خدمت اور یہ مہم جس کی طرف آپ متوجہ ہیں، بلاشبہ فی سبیل اللہ ہے کیونکہ اخرج ابوذر و ذہبی عن ابنِ عبّاس رضی اللہ عنہما مرفوعًا یکون فی اٰخر الزمان قوم یُسَمُّون الرافضیۃ یرفضون الاسلام فاقتلوھم فانھم مشرکون۔

واخرج الدار قطنی عن علیؓ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلّم سیأتی من بعدی قوم لھم نبزًا یقال لھم رافضیہ فان ادرکتھم فاقتلھم فانّھم مشرکون قال قلت یا رسول اللہ ما العلامۃ فیھم قال یفرطونک بما لیس فیک ویطعنون علی السّلف واخرجہ عن طریق اٰخر نحوہ وکذٰلک من طریق اٰخر و فلہ فیہ ینتحلون عنّا اھل البیت ولیسوا کذٰلک۔ و اٰیۃ ذٰلک انھم یسبّون ابابکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما۔

جہادِ اکبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اپنے نفس سے دشمنی رکھو کیونکہ اُس نے تمہاری دشمنی کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

تصدیقِ قلبی اور اقرارِ لسانی کے باوجود انسان کا نفسِ امّارہ کفر و کفار پر مصر ہے۔ احکامِ آسمانی کی طرف مایل اور اوامر الٰہیہ کے لئے منقاد نہیں ہوتا۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ ہر کوئی اس کا مطیع و فرمانبردار ہو۔ غرور و تکبّر اس کی سرشت میں ہے

اور "اَنَا رَبُّکُم" کی آواز اس کی فطرت سے بلند ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس کی دشمنی پسندیدہ اور عند اللہ مقبول ہے، اور شریعتِ غرّا کی تعمیل کرتے ہوئے نفسِ امّارہ کی مخالفت "جہادِ اکبر" ہے۔ دنیاوی دشمنوں کے ساتھ جہاد کا اتّفاق گاہے گاہے ہوتا ہے۔ مگر اس اندرونی دشمن کے ساتھ جہاد ہر وقت اور ہر ساعت رہتا ہے۔

ارحم الراحمین کی انتہائی رحمت و رافت ہے کہ سلسلۂ اعتقادات میں حصولِ نجات کے لئے صرف تصدیقِ قلبی کو کافی قرار دیا۔ اور یہ ضروری نہیں رکھا کہ یہ تصدیق جُملہ وساوس وخطرات سے پاک ہو کر درجۂ یقین تک پہنچ جائے۔

چشم دارم کہ دہد اشک مرا حُسنِ قبول
بہ آنکہ دُر ساختہ است قطرۂ بارانی را

البتہ خدا کے کچھ بندے بیشک اس درجۂ کمال تک پہنچ جاتے ہیں کہ اُن کا وہ سرکش اور نفسِ امّارہ اپنی سرکشی اور امارگی سے عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ احکامِ الٰہی کا مطیع ہو جاتا ہے کیونکہ مخالفت کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور وہ امرِ الٰہی پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا نام "نفسِ مطمئنہ" ہوتا ہے۔ یہ خدا کی بارگاہ میں درجۂ قبول و پسندیدگی حاصل کر لیتا ہے۔

آیہ کریمہ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ[1] (الآیۃ) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ایمانِ کامل اور اسلامِ حقیقی اسی مقام پر حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایمان زوال وخلل سے محفوظ رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ خداوندا میں ایسا ایمان چاہتا ہوں جس کے بعد کفر نہ ہو۔

آیہ کریمہ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ۔

---

[1] یعنی ایسے نفس سے موت کے وقت کہا جاتا ہے کہ "اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف واپس چل درانحالیکہ تُو خدا سے راضی ہے اور خدا کے نزدیک پسندیدہ (قرآن حکیم)

نیز خداوندِ عالم کا ارشاد ہے۔ جو خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لائے وہی ہیں خدا کی بارگاہ میں صدّیق اور شہداء (قرآن حکیم)۔

نیز رسول اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا، جبتک اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہو جائیں۔ اس قسم کی آیات و احادیث میں یہی ایمان کامل[1] مراد ہے۔

صوفیاء کرام کا حقیقی مطمحِ نظر اور اصل مقصود اسی ایمانِ کامل کو حاصل کرنا ہے اور اس سے پیشتر سرسری تصدیقِ قلبی کی بِنا پر جو ایمان حاصل ہوتا ہے اس کو ایمانِ مجازی کہتے ہیں۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد جو اس ایمانِ کامل سے پہلے ہوتے ہیں، وہ گویا صورتِ عمل اور (قالب) ہیں حقیقت اور (روح) یہ ایمان ہے کیونکہ جب تک نفسِ امّارہ اپنی سرکشی پر باقی ہے، حقیقی عمل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ اعمال کی حقیقت اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب کہ نفسِ امّارہ اپنی سرکشی سے مجبور ہو کر درجہ اطمینان حاصل کرلیتا ہے۔ درجاتِ جنّت، دیدارِ الٰہی، قربِ خداوندی وغیرہ کے مراتب کا تفاوت اسی ایمان کے تفاوتِ درجات پر موقوف ہوتا ہے۔ دریا اور قطرہ میں بہت تفاوت ہوتا ہے

---

[1] اصطلاحاً اس کو اِیمَانٌ دُوْنَ اِیمَانٍ کہتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔ نیز ارشاد ہوا۔ وہ مومن نہیں کہ اپنا پیٹ تو بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہے۔ یا ارشاد ہوا۔ مومن وہ ہے کہ تمام آدمی اس کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ اسی کے بموجب کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ بھی ہے۔ یعنی ایک کفر حقیقی جو عقیدہ قلبی کے فقدان پر ہوتا ہے۔ دوسرا وہ کفر جو عملاً ہو اعتقاداً نہ ہو۔ مثلاً ارشاد نبوی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُس سے قتال کرنا کفر ہے یا ارشاد ہوا۔ جو شخص قصداً نماز چھوڑ دے، کافر ہو گیا۔ یعنی عملاً نہ حقیقتاً۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (ودونك هذا فانه احسن واجود وقد تلقيت من بعض اساتذتی رحمهم الله) محمد میاں۔

مگر تاہم ایک جنس اور ایک حقیقت ہے۔ مگر جو تفاوت جنّت اور اخروی نعمتوں کے مراتب میں ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی باہمی نسبت بہت دُور کی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک حقیقت ہے اور ایک صورت۔ حقیقت کو صورت سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

آخر میں دیدارِ خداوندی عام مسلمانوں کو بھی حاصل ہوگا اور مقربین کو بھی۔ مگر ان دونوں میں اتنا تفاوت ہے کہ ان دونوں کے آپس میں کوئی نسبت قائم کرنی دشوار اور مشکل ہے۔

یہ صورت اور حقیقت دونوں شریعتِ مطہرہ کے دائرہ میں داخل ہیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سُنن اور آپ کے معنوی انوار سے ماخوذ ہیں۔ ایک صورتِ شریعت ہے، دوسری حقیقتِ شریعت۔

لہٰذا معدنِ جُملہ کمالات شریعتِ غرّا ہے۔ کوئی کمال ایسا نہیں جس کے لئے شریعتِ حقّہ کے ماسوا کسی اور کی ضرورت ہو۔

معرفتِ خداوندی جس پر کمالات کا مدار ہے۔ نیز معرفتِ خداوندی کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ درجۂ فنا حاصل ہو اور نفسِ انسانی مطمئن ہو جائے۔

پس اہلِ بصیرت عقلاء کا فرض ہے کہ اپنے نصب العین اور حاصلِ زندگی پر پوری طرح غور کریں۔ جو اس دولت سے بہرور ہو جائے، اس کو مبارک باد اور ہزاروں تحسین و آفریں۔ بلاشبہ اُس نے اپنی پیدائش کے مقصود کو حاصل کر لیا اور نعمتِ خداوندی اس پر مکمل ہو گئی۔ اور اگر یہ دولت حاصل نہیں ہوئی تو ضروری ہے کہ اس کی جستجو میں مشغول رہے۔ جہاں اُس کا سراغ معلوم ہو، اس کی طرف دوڑے اور اس کو حاصل کرنے کی جدّو جہد کرے۔

ترسم کہ یار با ما نا آشنا بماند   تا دامن قیامت ایں غم بماند

(مکتوب ۶۴ مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم جلد اوّل)[116]

اس مکتوبِ گرامی یا اس قسم کی تلقینات کا عالمگیر پر کیا اثر ہوا۔ اس کا اندازہ سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے ہو گا جو اس حصّہ کے آخر میں درج ہوں گے (انشاء اللہ)۔

حج بیت اللہ برادرِ بزرگ حضرت خواجہ احمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ہمراہ زیارت بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں اور مقاماتِ مقدسہ کے قیام میں جن برکات، کرامات اور خوارق کا ظہور ہوا۔ وہ آپ کی سوانح سے متعلق کتابوں میں درج ہیں۔ یہ حقیر تصنیف ذکرِ کرامات و خوارق کی متحمل نہیں۔

البتہ اس مبارک سفر میں دو چیزیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) شاہجہاں زندہ تھا۔ اس کی اولاد میں تختِ سلطنت کے لئے کش مکش شروع تھی۔ داراشکوہ اس خاندان کا دشمن تھا۔ عالمگیر اس خاندان کا حلقہ بگوش۔

ہر ایک منزل پر جوق جوق مسلمان آتے اور داخلِ سلسلہ ہوتے۔ حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ حدود ہندوستان میں یہ مبارک سفر عالمگیر کی عام حمایت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ خود عالمگیر نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ کسی منزل پر خود حاضرِ خدمت ہوا، اور بارہ ہزار اشرفیاں نذر کیں۔

حالات مشائخ نقشبند میں تحریر ہے:

حضرت نے اس کو بشارتِ سلطنت دی۔ اس نے عرض کیا کہ مجھ کو آپ لکھ بھی دیں چنانچہ حضرت نے اُن کو لکھ بھی دیا۔ فوقع کما قال"۔

یہ معلوم نہیں کہ تحریر کے الفاظ کیا تھے۔ مگر ظاہر ہے اس قسم کی تحریر حضرت مجدد کے متوسلین کے لئے کیا اثر رکھ سکتی تھی۔ بالخصوص جبکہ عمائدین و اراکینِ دولت اور بعنوانِ دیگر حکومت کا داہنا بازو اس خاندان کا حلقہ بگوش تھا۔ اور اس کی عظیم الشان خدمات اور ان کے بہترین نتائج اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ ان سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا۔

آئندہ آپ پڑھیں گے کہ جب عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلہ پر علمِ استقلال بلند کیا،

تو اُمرا، دولت، داراشکوہ کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر عالمگیر کی حمایت کرنے لگے حتّیٰ کہ عالمگیر جب آگرہ پہنچا تو شاہجہاں کے تمام معتمد اُمرا نے شاہجہاں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اُمرا، دولت جو ہمیشہ شاہجہاں کی وفاداری میں پیش پیش رہے۔ جب وہ آج حقِ نمک کی رعایت سے چشم پوشی کرنے لگے تو شاہجہاں نے قلعہ کی کنجیاں عالمگیر کے پاس بھیج دیں اور جو مکتوب روانہ کیا، اس کے ایک فقرہ کا ترجمہ یہ ہے:

"واقعہ حیرت افزا ہے جو مجھے نصیب ہؤا۔ اقبال کسی طرح یاوری نہیں کرتا کار ہاتھ سے اور ہاتھ کار سے ایسا گذر گیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔"

عالمگیر کی بہن "گوہر آرا"[1] کہا کرتی تھی۔ میرے بھائی اورنگ زیب نے بارہ ہزار اشرفیوں میں سلطنت خریدی ہے۔

(۲) حضرت خواجہ معصوم مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی دولتوں سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں۔ روانگی کا قصد ہے۔ سامانِ سفر تیار ہو چکا ہے۔ آخری زیارت کے لئے حرم اطہر میں حاضر ہوئے ہیں۔ الم مفارقت سے گریہ جاری ہے۔ انتہائی تضرّع کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں اپنی تمنّائیں پیش کر رہے ہیں۔ بارگاہِ رسالت سے بھی رُوحانی برکات کا فیضان ہو رہا ہے۔ یکایک کوئی شخص آکر خبر دیتا ہے:

"ہندوستان میں داراشکوہ مالکِ تخت و تاج ہو گیا۔"

خواجہ معصوم کا قلب مبارک متفکّر ہوتا ہے کہ داراشکوہ شریعتِ غرّا کا دشمن ہے خانوادۂ مجدّدی سے خاص طور پر پرخاش رکھتا ہے۔ آپ نے دوسری درخواستوں کے ساتھ

---

[1] عالمگیر کے تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن جہاں آرا جس سے شاہجہاں کو بہت زیادہ انسیت تھی۔ اس کا خطاب بادشاہ بیگم اور بیگم صاحبہ تھا۔ آگرہ کی جامع مسجد اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کو دارا سے بہت زیادہ انسیت تھی۔ دوسری بہن روشن آرا بیگم جو عالمگیر سے صرف ۱۴ ماہ بڑی تھی۔ اس کو عالمگیر سے بہت انسیت تھی۔ تیسری گوہر آرا بیگم جس کی ولادت میں ماں (ممتاز محل) کا انتقال ہو گیا۔ بظاہر روشن آرا بیگم کے بجائے روشن آرا لکھا گیا ہے۔ گوہر آرا عالمگیر سے ۱۳ سال چھوٹی تھی۔

اس پریشانی کو بھی بارگاہِ رسالت میں پیش کیا۔

فوراً محسوس ہوّا کہ رسالت پناہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک میں تلوار برہنہ لئے ہوئے جلوہ فرما ہیں۔ اور ارشاد فرما رہے ہیں :

"جو اس خاندان کا دشمن وہ ہمارا دشمن۔ اور جو ہمارا دشمن اُس کے لئے قہرِ الٰہی کی یہ تلوار کافی ہے"۔

حضرت خواجہ مراقبہ سے فارغ ہوئے۔ خدّام کو اطلاع دی کہ "داراشکوہ مارا گیا"۔

ہندوستان پہنچے تو داراشکوہ قتل ہو چکا تھا، اور سلطنتِ عالمگیر کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

کوئی وجہ نہیں کہ عالمگیر کو موقعہ شناس ریاکار کہا جائے۔ بلا شبہ اس کی فطرت سلیم تھی۔ مذہب پرست باپ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ مذہب پرست امراء اور ارکانِ دولت کا مجمع اس کو میسّر آیا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ ساری فضا حضرت مجدّد صاحب کی مخلصانہ جدّ و جہد کا نتیجہ تھی۔ قدرتی طور پر عالمگیر کو حضرت مجدّد صاحب اور ان کے جانشینوں کا معتقد ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے مخلصانہ عقیدت قائم کی۔ وہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت ہوّا۔ یہ حُسنِ اتّفاق تھا کہ اس کے یہ مخلصانہ جذبات حصولِ سلطنت کے لئے بھی کارآمد ثابت ہوئے۔ لامحالہ اُس کے خلوص اور عقیدت مندی میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ اب اُس نے باقاعدہ مراحلِ سُلوک طے کرنے کا قصد کیا۔ حضرت خواجہ شیخ محمد سعید صاحب کو تکلیف دی۔ اصرار کے بعد تشریف لائے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس کے بعد خود حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب سے تشریف آوری کی درخواست کی۔ مگر آپ کا تختِ سلطنت پرانا بوریا، اور ایوانِ شاہی خانقاہِ معلےٰ کی جھونپڑیاں تھیں۔ آپ دہلی کے لال قلعہ کو کب پسند فرما سکتے تھے۔ ہزار درخواستیں کیں۔ بے انتہا اصرار کیا، مگر کامیاب نہ ہوّا۔ بالآخر التجا کی کہ کسی خلیفہ کو مامور فرما دیا جائے، جو میرے

پاس تشریف فرما ہو کر روحانیات کی تلقین و اصلاح فرماویں۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے چھوٹے فرزند حضرت مولانا سیف الدّین صاحب اس خدمت پر مامور ہوئے۔ (باقی حالات آئندہ ان دونوں کے حالات کے سلسلہ میں بیان کئے جائیں گے)۔

وفات حضرت خواجہ محمد معصوم کو وجع المفاصل کا عارضہ تھا۔ اواخر ۱۰۷۸ھ میں اس نے شدّت اختیار کی۔ بہت علاج کئے، کچھ فائدہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر حضرت خواجہ نے فرمایا۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوگی۔ حکیمِ مطلق نے دوا کا اثر زائل فرمادیا ہے۔

مرض بڑھتا گیا۔ اُمیدِ زیست منقطع ہونے لگی۔ آپ کے اثاثہ میں قابل قدر اور محبوب چیز آپ کا کتب خانہ تھا۔ محرم ۱۰۷۹ھ میں آپ نے جملہ احباب کو بُلایا کتب خانہ صاحبزادوں پر تقسیم کر دیا۔ حاضرین سے اپنی تقصیرات کی معافی چاہی اور وصیّت فرمائی، قرآن شریف، حدیث، اجماع اور اقوالِ مجتہدین پر عمل کرو۔ اتباعِ سنّت میں اپنی طاقت صرف کردو۔ فقرارِ خلافِ شرع سے پرہیز رکھو۔ آخر ماہ صفر میں ایک تقریب سے بہت بڑا مجمع ہوا۔ حضرت نے عفوِ تقصیرات اور اسی وصیّت کا مکرّر اعادہ فرمایا۔ نیز فرمایا کہ طبیعت چاہتی ہے کہ ماہِ ربیع الاوّل میں رسالت پناہ، قبلۂ رُشد و ہدایت، رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوں۔

اس کے بعد حضرت پر مرض کا غلبہ ہوا۔ کسرِ نفس، خشیہ اور تواضع کا یہ عالم تھا، کہ آپ نے قرب و جوار کے تمام بزرگوں کو لکھ کر بھیجا:

"فقیر محمد معصوم از دنیا میرود۔ باید کہ بدعاء خیریت خاتمہ ممدو معاون باشند۔"

سیّد مرزا نامی ایک بزرگ نے جواب میں لکھا:

در ہر پیر زن مے زد پیمبر — کہ اے زن در دو عالم یاد آور
یقین میداں کہ شیران شکاری — دریں راہ خواستند از مور یاری

۸ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ جمعہ کا دن تھا۔ آپ نماز جمعہ کے لئے مسجد جامع میں

تشریف لے گئے"۔ شوقِ نماز کا یہ جذبہ تھا، ورنہ طاقت ختم ہو چکی تھی۔ آپ نے وہیں اندازہ کر لیا اور فرمایا "توقع نہیں کہ کل اس وقت تک دنیا میں رہوں گا"۔

۹ ربیع الاوّل کا آفتاب طلوع ہوا۔ تو آپ اطمینان و سکون کے ساتھ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مصلّٰی پر مراقبہ میں مشغول تھے۔

ایک حیرت انگیز روحانی طاقت تھی جو ادائے عبادت و معمولات کیلئے انجکشنوں کا کام دیتی رہی۔ مراقبہ سے فراغت کے بعد نوافلِ اشراق ادا کئے۔ پھر بستر پر تشریف لائے۔ سانس ٹوٹ گیا مگر لب مبارک متحرک تھے۔ کان لگا کر سنا گیا تو سورۂ یٰسین کی تلاوت ہو رہی تھی۔

۷۲ سال دنیا میں قیام فرما کر ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ روز شنبہ بوقت دوپہر روحِ معصوم نے مستقرِ اعلیٰ کا رخ کیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط

حضرت شاہ محمدؐ یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں۔ ولادت باسعادت ۱۰۲۴ھ میں ہوئی۔

ولادت سے قبل حضرت مجدد صاحب کو الہام ہوا تھا انا نبشرك بغلام اسمہٗ یحییٰ[1]۔ یہی آپ کی وجہ تسمیہ ہے۔

شاہ کا خطاب حضرت مجدد صاحب خانقاہ معلّٰی میں رونق افروز ہیں۔ حضرت شاہ سکندر[2]

---

[1] ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے۔ [2] ناظرین کرام حضرت شاہ سکندر صاحب کو بھولے نہ ہوں گے۔ آپ حضرت شاہ کمال کیتھلی کے پوتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے شیخ کامل ہیں۔ آپ نے ہی سلسلۂ قادریہ کا خرقہ اپنے دادا کے ایما کے بموجب حضرت مجدد صاحب کو دیا تھا جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔

صاحب قادری قدس اللہ سرہ العزیز تشریف لاتے ہیں۔ حضرت مجدّد صاحب کے فرزندانِ گرامی کی ہمّتِ عالی اور بہترین استعداد و قابلیت مُسلّم ہو چکی ہے۔ ہر صاحبِ کمال چاہتا ہے کہ اپنے کمالات، کا حصّہ ان کو دے اور سلسلۂ خیر کو اپنے سے وابستہ کرے۔

چنانچہ حضرت شاہ سکندر صاحب فرماتے ہیں۔ میاں شیخ احمد! اپنا کوئی بیٹا ہمیں بھی دے دو، جو ہماری طرح دانا اور دیوانہ ہو۔

حضرت مجدّد صاحب فوراً اس صغیر سن بچہ کو پیش کر دیتے ہیں۔ حضرت شاہ سکندر صاحب نے نوعمر یحییٰ کو آغوش میں لیا۔ اپنی نسبتِ خاصہ عطا فرمائی، اور فرمایا۔ یہ بچہ ہمارا ہے۔ آج سے اسے "شاہ" کہا کرنا۔

شیخ محمّد یحییٰ کو شاہ محمد یحییٰ بنا کہ حضرت شاہ سکندر صاحب تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت مجدّد صاحب بہت مسرور تھے۔ فرماتے تھے "سبحان اللہ! محمد یحییٰ صغیر سنی سے مقبول اولیاء اللہ ہو گئے"

تعلیم و تربیت شاہ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ کی بلندیٔ استعداد کا اندازہ لڑکپن سے ہی ہوتا تھا۔ حضرت مجدّد صاحب نے بعض مقامات و کمالات کی بشارت بھی دی تھی۔ مگر آپ کو افسوس تھا کہ میں عمر کا آخری دورہ طے کر رہا ہوں۔ بظاہر محمد یحییٰ کی تعلیم و تربیت نہیں کر سکوں گا۔

چنانچہ حضرت شاہ یحییٰ نے ابھی قرآن ہی حفظ کیا تھا۔ آپ کی عمر ابھی صرف ۹ سال تھی کہ حضرت مجدد صاحب نے اس دارِ فانی کو وداع فرما دیا۔

حضرت مجدّد صاحب کی وفات کے بعد برادرانِ گرامی نے تعلیم و تربیت کی نگرانی فرمائی۔ بیشتر علومِ نقلیہ و عقلیہ کا درس خود دیا۔ بیس سال کی عمر میں آپ تحصیلِ عُلوم سے فارغ ہوئے۔ سُلوکِ باطن و مقاماتِ طریقۂ احمدیہ کی تحصیل کی طرف توجّہ کی۔ جس کے دو بڑے بھائی اپنے وقت کے قطب اور وتد ہوں، سُلوکِ باطن اُس کے گھر کی چیز ہے۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں مراحل و مقاماتِ سلوک طے فرما کر خود بھی

شیخ وقت ہو گئے اور ارشاد و تلقین کے فرائض انجام دینے لگے۔

حضرت خواجہ محمد معصوم کو آپ سے زیادہ تعلق تھا۔ اورنگ زیب آپ سے بہت زیادہ مانوس اور آپ کا بہت زیادہ معتقد تھا۔ بہت سے دیہات اور املاک حضرت شاہ صاحب کی نذر کئے۔ چنانچہ سرہند میں مثل مشہور ہو گئی۔ اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْمِلْکُ لِیَحْییٰ۔

آپ نے دو مرتبہ حج بیت اللہ ادا کیا۔ ۱۰۹۶ھ میں ۷۲ سال کی عمر پاکر اس دارِ ناپائیدار سے کوچ فرمایا۔ حضرت مجدّد صاحب کے قبّہ کی برابر جانب مغرب مدفون ہوئے۔[1]

حضرت خواجہ سیّد آدم صاحب بنوری قدس اللہ سرہ العزیز

حسینی سیّد ہیں۔ آپ کی نانی اگرچہ سیّدہ تھیں مگر چونکہ افغانستان کی رہنے والی تھیں، ان کو افغانی سمجھا جاتا تھا۔

وطنِ اصلی قصبہ مودہ تھا لیکن سرہند کے قریب قصبہ "بنور" میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ والد ماجد نے خواب میں دیکھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ سینۂ مبارک پر دستِ مبارک پھیرا۔ کوئی چیز نکال کر والد صاحب کو مرحمت فرمائی۔ اور حکم فرمایا کہ کھاؤ۔ والد صاحب نے کھالی۔ اُسی شب استقرارِ حمل ہوا۔

حضرت آدم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا وجود فخرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسی عطیۂ مبارک سے ہے۔

آپ مادر زاد ولی تھے لیکن تعلیم ظاہری نہیں حاصل کی تھی۔ ایک روز ایک

---

(۱) حالات مشائخ نقشبند ص۲۹۵ و ص۲۹۶۔

آواز سُنی۔ "آدم تم نے قرآن شریف کیوں نہیں پڑھا" حضرت آدم نے ہاتف غیبی کے جواب میں عرض کیا۔ خداوندا تو قادرِ مطلق ہے، اگر چاہے تو اسی وقت حافظِ قرآن کر سکتا ہے۔ چنانچہ فی الفور حفظِ قرآن شریف کی دولت عطا ہو گئی۔ اُسی کے بعد عُلوم ظاہری کی تکمیل کی۔

کسبِ معاش کے لئے ابتداءً عہد شباب میں آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ جب جذبۂ عشق نے متوالا کیا تو ملازمت چھوڑ دی، حضرت مجدّد صاحب کے خلیفہ حضرت حاجی خضر رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ مجدّدیہ میں داخل ہو گئے۔ مگر لطفِ الٰہی اور فضلِ خداوندی سے تھوڑے ہی دنوں میں وہ حالات اور مقامات پیش آئے جن کی رہنمائی شیخ کے احاطۂ تکمیل سے خارج تھی۔

حضرت شیخ حاجی خضر رحمہ اللہ نے ان کو حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں بھیج دیا۔ اب ایک گوہرِ عالی ماہر ترین جوہری کی نظرِ انتخاب سے سرفراز ہوا۔ تھوڑے عرصہ میں مراتب تکمیل حاصل کر کے خرقۂ خلافت زیبِ تن کیا۔ اور شیخ کامل کے مقصودِ اعظم اور نصب العین مقدّس کی تکمیل میں مشغول ہو گیا۔

قادری، چشتی، سہروردی، شطاری اور مداری سلسلوں میں اجازتِ تلقین حاصل کی۔ دُنیا نے آپ کو خلیفۃ الزّمانی اور قطب الاقطاب تسلیم کیا۔ مولانا بدرالدین صاحب مصنّف کتاب "الحضرات" تحریر فرماتے ہیں:

پابندیٔ سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مخالفتِ بدعات، طریقۂ مجدّدیہ کا خاص امتیاز ہے۔ حضرت آدم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اس امتیازِ مخصوص نرالی شان کے مالک تھے۔ آپ کی توجہ مُوجّہ کی برکت سے ہزاروں طالبانِ حق درجۂ ولایت پر پہنچے۔ آپ کی خانقاہ عالی جاہ میں ایک ہزار طالبانِ طریقت سے زیادہ کا اجتماع رہتا۔ حضرت شیخ کا لنگر اُن کے دو وقتہ طعام کا متکفّل تھا (خزینۃ الاصفیاء)۔

حضرت شیخ کے خاص مقرّبین میں سے ایک صاحب شیخ محمد صاحب ہیں۔

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قحط ہوا۔ غلّہ گراں ہوگیا۔ مصارفِ خانقاہ میں دشواری ہوئی۔ خدّامِ خانقاہ نے حضرت شیخ سے ضرورت کا اظہار کیا۔ ایک مٹکا جس میں کچھ غلّہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اونچی جگہ رکھ دو، اس کا منہ بند کر دو۔ اس کی تلی میں سوراخ کر دو، اور بقدرِ ضرورت اس کی تلی کے سوراخ میں سے لیتے رہو۔ انشاءاللہ برکت ہوگی۔

چھ۶ ماہ متواتر غلّہ اسی طرح لیا جاتا رہا، اور صرف ہوتا رہا۔ چھ۶ ماہ کے بعد زمانۂ قحط ختم ہوگیا۔ غلّہ کی افراط ہوگئی۔ مٹکے کا منہ کھولا گیا تو اس میں جتنا غلّہ پہلے تھا اتنا ہی اب بھی تھا (تذکرہ آدمیہ بحوالہ خزینۃ الاصفیاء)۔

حضرت حق جل مجدہ نے آپ کو سلسلۂ طریقت میں ایک مخصوص طریقہ مرحمت فرمایا۔ طریقہ احسنیہ نقشبندیہ اس کا نام ہوا۔

اتّباعِ سُنّت کی برکت تھی کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ جو آپ کے طریقہ میں داخل ہوگا، مرحوم و مغفور ہوگا۔ قیامت کو عَلَم سبز اور ظلِ محمدی آپ کو عنایت ہوگا۔ آپ کے متوسلین اس کے زیر سایہ آرام سے ہوں گے۔

آپ کی مجلس نمائش و شہرت سے پاک، ثروت اور دولت سے بے نیاز، اَمرِ بالمعروف اور نہی عن المنکر کی درس گاہ تھی۔ اُمراء دولت سے گفتگو اور ملاقات کے وقت آپ کی بے نیازی نمایاں طور پر کار فرما ہوتی۔ بڑے بڑے اُمراء آپ سے کلام کرتے وقت مرعوب ہو جاتے۔ آپ گفتگو بہت کم کرتے۔ آپ کا کلام ہمیشہ پند آمیز ہوتا تھا رسمی تکلّفات سے قطعاً معرّا اور مبرّا۔

آپ کے مریدین کی تعداد چار لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔

آپ کے کمالات و کرامات احاطۂ تحریر سے بالا ہیں۔

مُلّا بدرالدّین صاحب سرہندی نے (جو حضرت سیّد آدم صاحب کے پیر بھائی تھے) مناقبِ اولیاء میں، حاجی محمّد امین بدخشی خلیفہ حضرت مجدّد صاحب نے مناقبِ الحضرات

میں، علاوہ ازیں تذکرہ آدمیہ، تذکرۃ الاولیار، سنوات الاتقیار، روضۃ السّلام، تذکرۃ الاصفیار، خزینۃ الاصفیار وغیرہ میں آپ کے کمالات و مناقب درج ہیں۔ من شاء فلیراجع الیہا۔

شاہجہاں اور حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز

شعبان ۱۰۵۲ھ میں شاہجہاں کشمیر وغیرہ کے دورہ سے فارغ ہو کر لاہور پہنچا۔

۷ شعبان ۱۰۵۲ھ کو شالامار[1] باغ کا معائنہ فرمایا۔

اس سے صرف ایک سال پیشتر کا واقعہ تھا کہ وہی قلعہ کانگڑھ جس کو جہانگیر نے فتح کیا تھا، جگت سنگھ اور اس کے بیٹے راج روپ نے حیلہ حوالہ کر کے اُس علاقہ کی تعلّق داری حاصل کی، اور پھر بادشاہ سے بغاوت کر بیٹھا۔

تاراگڑھ کا مشہور اور نہایت مستحکم قلعہ جس کو شاہجہاں نے اسی لئے مسمار کرا دیا تھا کہ باغیوں کی پناہ گاہ نہ بن سکے۔ جگت سنگھ نے اس کو دوبارہ تعمیر کر کے سامانِ حفاظت مستحکم کر لیا۔ آٹھ دس ماہ کی جدّ و جہد کے بعد جگت سنگھ کو شکست ہوئی۔ اُس نے معافی کی درخواست بارگاہ شاہجہاں میں پیش کی۔ جو منظور ہوئی اور اُس کو خلعت و منصب عطا ہوا۔ کسی دوسری جگہ کا گورنر بنا دیا گیا۔

قندھار، بلخ، بخارا کا علاقہ شاہجہاں اور شاہ ایران کی فوجوں کا رزم گاہ رہا۔

---

[1] ۱۰۵۰ھ ۱۲ جلوس میں شالامار باغ کی تیاری کا حکم ہوا چنانچہ خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ پانچ روز میں تیار ہوا۔ چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس باغ کے تین طبقے ہیں۔ اُوپر کے طبقہ کا نام فرح بخش، دوسرے درجہ کا نام فیض بخش رکھا گیا۔ یہ باغ اب بھی موجود ہے۔ وسط باغ میں ایک نہر ہے۔ باغ کا پہلا طبقہ دوسرے طبقہ سے تقریباً ستّر فٹ اونچا ہے۔ اسی طرح دوسرا طبقہ تیسرے طبقہ سے پھاٹک نہایت عالیشان ہے۔ اور خاص وصف یہ ہے کہ پھاٹک کی چھت پر کھڑے ہو کر جب نہر پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو تینوں طبقوں کی نہر کی سطح بالکل مساوی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۲

اوزبک اور قزلباش، شاہجہانی لشکر کو آئے دن پریشان کرتے رہتے تھے۔ محرم ۱۰۵۲ھ میں جب شاہِ ایران کی طرف سے بہت زیادہ تیاری کی اطلاع پہنچی تو شاہزادہ داراشکوہ کو شاہی فوج کے تیس ہزار سوار، سات ہزار سوار توپ خانہ اور صوبائی افواج کے پچیس ہزار سوار اور تقریباً ایک لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ شاہ ایران کے مقابلہ کیلئے بھیجا گیا۔ مقابلہ نہایت سخت تھا۔ مگر شاہجہاں کا یہ اقبال تھا کہ شاہ صفی شاہ ایران کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ شاہ عباس ثانی تخت نشین ہوا۔

یہ حادثہ نہایت مبارک تھا۔ داراشکوہ نے درخواست بھیجی کہ اگر اجازت ہو تو خراسان کی طرف کُوچ کر کے اس علاقہ کو مسخر کیا جائے۔ مگر اس بلند ہمت اور عالی حوصلہ بادشاہ نے جواب دیا:

> ایک لڑکے کی سلطنت پر جس کا باپ ابھی مرا ہو، اور اس کی سلطنت نے استحکام نہ پایا ہو، مہم کرنا سلاطینِ نیک سیرت کے رویہ کے مخالف ہے۔ لہٰذا تم خود مع لشکر جلد حضور میں حاضر ہو۔ اُس فرزند عزیز کے دیدار کی فرحت ہفت اقلیم کی تسخیر سے زیادہ ہے[۱]۔

بہرحال اس وقت یعنی شاہجہاں کے قیامِ لاہور (از ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ تا ۲۲ شعبان ۱۰۵۲ھ) میں اگرچہ جگت سنگھ اور شاہ ایران دونوں کی طرف سے اطمینان تھا۔ مگر یہ یقین تھا کہ چھپی ہوئی چنگاریاں دونوں جگہ موجود ہیں۔ بالخصوص شاہ ایران کی طرف سے اطمینان کرنے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ چنانچہ پانچ چھ سال بعد اسی نوجوان بادشاہ نے قندھار پر اچانک حملہ کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ پھر بار بار کی کوشش کے باوجود، نہ شاہجہاں اس قلعہ کو واپس لے سکا نہ عالمگیر۔

اسی دوران میں حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز لاہور تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ افغانوں اور سادات کی جماعت دس ہزار کے قریب تھی۔ خانقاہ معلّٰی اچھا خاصا

---

[۱] تاریخ ہندوستان ص ۲۸۸ تا ص ۳۰۲

شہر بن جاتی تھی۔ پرچہ نویسوں نے اس کی اطلاع شاہجہاں کو دی۔ ارکینِ دولت نے اس علاقہ میں بالخصوص مذکورہ بالا حالات کے ہوتے ہوئے اس قدر اجتماع کو تشویش کی کی نگاہ سے دیکھا۔ مشیرانِ شاہی کے مشورہ سے بادشاہ نے وزیر "سعد اللہ خاں"[1] کو حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجا۔

---

[1] سعد اللہ لاہور کا باشندہ۔ علوم نقلی و عقلی میں اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا۔ حافظ قرآن، نیک اور پرہیزگار۔ شیخ سعد اللہ لاہوری کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے بعد علامی سعد اللہ کے نام سے تاریخ میں شہرت حاصل کی۔ ابتداءً بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کچھ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ علامی سعد اللہ کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ واپس چلے گئے۔ پھر ۱۰۵۰ھ میں موسومی خاں صدر کو حکم ہوا کہ سعد اللہ خاں کو بھیج دیں۔ اس وقت بادشاہ نے مناسب وظیفہ مقرر کیا۔ خلعت اور اسپ عنایت فرمایا۔

بادشاہ کی مردم شناس اور قدردان بصیرت نے صرف تین روز بعد وظیفہ کی بجائے اس کو منصب مرحمت فرمایا۔ اور پھر جوہر شناس بادشاہ کی قدر دانی نے صرف چار سال کے عرصہ میں وزارتِ عظمیٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا۔ ساتویں سال ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار۔ دو اسپہ و سہ اسپہ اور دو کروڑ روپیہ انعام سے سربلندی حاصل کی۔ بادشاہ کے مزاج میں اس قدر دخل پیدا کر لیا کہ نہ صرف متعلقاتِ وزارت بلکہ امورِ ذاتی میں بھی بادشاہ اسی کے صلاح و مشورہ پر عمل کرتا۔ انتہا یہ کہ دارا شکوہ اپنی تمام محبوبیت اور تقرب کے باوجود اس پر حسد کرنے لگا لیکن بجائے نقصان پہنچانے کے خود اپنے متعلق شاہجہاں کا یہ خیال قائم کرا دیا کہ "دارا دشمنِ نیکو کاراں واقع شد"۔ ۱۰۶۶ھ میں عارضہ فالج میں مبتلا ہوا۔ بادشاہ نے شاہی اطباء سے علاج کرایا۔ متعدد بار مزاج پرسی کے لئے مکان پر گیا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ اواخر ماہ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۶ھ (دس سو چھیاسٹھ) میں انتقال ہو گیا۔ شاہجہاں کو اس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا (اور تاریخِ ہندوستان کے الفاظ میں) بے اختیار زار زار رو دیا۔

سعد اللہ خاں عقل و فہم، تدبّر اور بصیرت کے باوجود رحم دل اور انصاف پسند واقع ہوا تھا۔ وہ غرباء اور مساکین کا بہت زیادہ طرف دار تھا۔ اس کا اصول یہ تھا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

وزیر اعظم خانقاہِ آدمیہ میں حاضر ہوئے۔ مگر حضرت شیخ نے نہ صرف یہ کہ اپنے طرز کے بموجب استغنا، اور بے نیازی سے گفتگو کی بلکہ نامناسب باتوں پر تنبیہ اور ترکِ دنیا کی فہمائش بھی فرمائی۔ علّامہ سعد اللہ کتنے ہی نیک نفس اور پاک باز سہی، مگر بہر حال شاہجہاں جیسے کامیاب شہنشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس استغنار کا ان پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ پٹھانوں کے اس غیر معمولی ہجوم سے جو تشویش پیدا ہوئی تھی، وہ جاتی رہی اور اسی تشویش کا اظہار دربار میں پہنچ کر شاہجہاں سے کر دیا۔

شاہجہاں نے مدبّرانہ طور پر حضرت شیخ کے پاس کہلا بھیجا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جائیں۔ حضرت حافظ سیّد عبد اللہ صاحب شیخ آدم بنوری کے خلیفہ ہیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی کے والد ماجد حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب کے پیر و مرشد۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کے واسطے سے اس واقع کی تفصیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ کثرتِ محاصل ترقیٔ دولت کا سبب نہیں بلکہ رعایا پروری، باشندگانِ ملک کی خوشنودی و خوش حالی، ترقیٔ دولت کی بنیاد ہے۔ بادشاہ اور وزیر کی یہی حسن نیّت تھی، کہ ہندوستان دولت اور خوش حالی کی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اُس کے رحم و کرم اور جوہر شناسی کے سامنے ہندو مسلمان کی تفریق نہیں تھی۔ رگناتھ اُسی کا پروردہ تھا جس کو بادشاہ نے اسکی وفات کے بعد مدار المہام بنایا اور رائے رایان کا خطاب دیا ۱۲ (تاریخ ہندوستان ص۲۸۸ و ص۲۶۶ و ص۲۶۹ جلد ۷)

مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی اور علامی سعد اللہ میں ابتدار سے یگانگت تھی۔ حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے استاد مولانا کمال کشمیری سے دونوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایک مرتبہ حضرت اُستاد نے فرمایا۔ بادشاہ کے وزیر کو یہاں بُلاؤ۔ طلباء کو تعجب ہوا۔ حضرت اُستاد نے فرمایا کہ یہی سعد اللہ جو اس وقت خستہ حالت میں ہے، وزیر اعظم ہوگا۔ شیخ آدم بھی اُسی استاد کے شاگرد تھے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ علّامی سعد اللہ اور شیخ آدم میں لڑکپن سے چشمک تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس طرح بیان فرمائی ہے کہ حضرت حافظ سیّد عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ آدم کی شہرت بہت زیادہ ہوئی تو شاہجہاں نے علّامہ سعداللہ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو بھیجا کہ حضرت شیخ آدم سے ملاقات کریں۔ جب یہ دونوں ارکانِ دولت، حضرت شیخ کی قیام گاہ پر پہنچے تو حضرت شیخ مراقبہ میں مشغول تھے کافی دیر دروازہ پر انتظار کرتے رہے۔ جب مراقبہ سے فارغ ہوئے تو یہ دونوں صاحب زاویۂ شیخ میں داخل ہوئے۔ حضرت شیخ نے ان کی رسمی تعظیم کچھ بھی ادا نہ کی علامہ سعداللہ نے فوراً اعتراض کر دیا کہ میں دنیادار ہوں، میری تعظیم ضروری نہیں۔ مگر مولانا عبدالحکیم صاحب ایک عالم ہیں، ان کی تعظیم تو کرنی ضروری تھی۔ حضرت شیخ نے فرمایا احادیث میں ہے کہ علماء کرام دین کے امانت دار اُسی وقت تک ہیں جب تک بادشاہوں سے اختلاط نہ کریں۔ اور بادشاہوں سے اختلاط کے بعد وہ ڈاکو ہو جاتے ہیں۔ پھر علّامہ سعداللہ نے دریافت کیا۔ نسب شما چیست؟ حضرت شیخ نے جواب دیا۔ سیّد ہوں مگر چونکہ ننہالی سلسلہ میں افغانوں سے رشتہ ہے، اس لئے افغان مشہور ہو گیا ہوں۔ علامہ سعداللہ نے پھر دریافت کیا۔ ہم نے سُنا ہے کہ آپ علمِ لدنی رکھتے ہیں۔ جواب ملا۔ بیشک والحمدللہ۔ اس کے بعد دونوں صاحب واپس چلے آئے اور شاہجہاں سے کہا معمولی فقیر ہے مگر متکبر ہے۔ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے۔ افغان ہے خود کو سیّد کہتا ہے۔ اس کے باوجود افغانی اس کے بہت معتقد ہیں۔ خطرہ ہے کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ شاہجہاں نے متأثر ہو کر روانگیٔ حجاز کا حکم صادر کر دیا۔ حضرت شیخ فوراً روانہ ہو کر سورت پہنچے۔ وہاں کا حاکم حضرت شیخ کا معتقد تھا۔ اس سے فرمایا۔ تمہاری خدمت یہی ہے کہ ہمارے لئے فوراً جہاز مہیا کر دو۔ حضرت شیخ کی روانگی کے بعد شاہجہاں نے خواب دیکھا کہ حکومتِ شاہجہاں کا بقاء اسی وقت تک ہے، جب تک شیخ آدم ہندوستان میں ہیں۔ خواب سے متوحش ہو کر شاہجہاں نے حاکمِ سورت کے پاس حضرت شیخ کو روک لینے کا حکم بھیجا۔ مگر حضرت شیخ روانہ ہو چکے تھے (انفاس العارفین ص ۱۳ و ۱۴)۔

بہر حال حضرت شیخ کو خود زیارتِ بیت اللہ کی تمنّا تھی۔ بہترین موقعہ میسّر آ گیا۔

خدا شرّے بر انگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ طیّبہ حاضر ہوئے، اپنے نانا جان کی برکات کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ زیارت روضہ سیّد المرسلین کے بعد واپسی کا قصد کیا۔ اجازت کے لئے روضۂ انور پر حاضر ہوئے۔ لیکن ایک عجیب و غریب واقعہ حضرت شیخ اور آپ کے رفقاء نے مشاہدہ کیا۔

مرقدِ اطہر سے دو دست مبارک ظاہر ہوئے۔ حضرت شیخ نے بہزار شوق آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ بوسہ دیا۔

پھر حضرت شیخ کو بارگاہِ رسالت سے بشارت دی گئی۔

یا ولدی انت فی جواری۔ فرزندِ من! تم میرے جوار میں رہو۔

حضرت شیخ نے اس مژدہ کے بعد ہندوستان کا خیال ہی ترک کر دیا۔

مصافحہ کا یہ معاملہ حاضرین نے بھی دیکھا تھا۔ بطور مکاشفہ یہ بھی بتایا گیا، کہ جو شخص شیخ آدم سے مصافحہ کرے گا وہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کر لے گا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرنے والا مغفور ہو گا۔

اس بشارت یا اس قیاس نے یہاں تک شہرت پائی کہ عوام الناس کی بھیڑ کے باعث حضرت شیخ کو مصافحہ کے لئے خاص انتظام کرانا پڑا۔

وفات قیامِ مدینہ طیّبہ کا عزم کئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ۱۳ر شوال ۱۰۵۳ھ (تیرہ شوال سنہ دس سو ترپن ھ) کو مدینہ طیّبہ میں وفات ہو گئی جنّت البقیع میں حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک کے قریب دفن کیا گیا۔

حضرت ذی النورین کے روضہ مبارک کا سایہ ہما پایہ، شیخ آدم کے مزار معدن انوار پر پڑتا رہتا ہے۔ زہے قسمت۔

اولاد چار لڑکے، دو لڑکیاں۔

بڑے صاحبزادے سید غلام محمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز وطن میں رہے۔ شیخ محمد اولیاء، شیخ محمد علیئی اور دونوں صاحبزادیاں ہمراہ تھیں۔ چوتھے صاحبزادے سید محمد محسن ۱۰۵۲ھ میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ جب کہ حضرت شیخ آدم حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔

شیخ حامد لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ (ایک ہزار چوّن)۔ شیخ نور محمد پشاوری، متوفی ۱۰۵۹ھ (ایک ہزار اُنسٹھ)۔ شیخ ابوالفتح متوفی ۱۰۶۶ھ (ایک ہزار چھیاسٹھ)۔ شیخ محمد سلطان پوری متوفی ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار پچھتّر)۔ میر سید علیم اللہ متوفی ۱۰۸۱ھ (ایک ہزار اکیاسی)۔ شیخ محمد اقبالی متوفی ۱۰۸۶ھ (ایک ہزار چھیاسی)۔ شیخ سعدی یلغاری متوفی ۱۱۰۸ھ (گیارہ سو آٹھ)۔ حضرت شیخ آدم کے مشہور خلفاء ہیں جن سے دنیا نے بہت زیادہ فیض حاصل کیا، اور جن کے اسماء گرامی صفحاتِ تاریخ میں نمایاں ہیں۔

قطبِ پنجاب شیخ محمد طاہر لاہوری

قادری و نقشبندی مجدّدی قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت مجدّد صاحب کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں۔ تحصیلِ علوم کے بعد سب سے پہلے حضرت شاہ سکندر ابن حضرت شاہ کمال کیتھلی قدس اللہ سرہما سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ ایک عرصہ تک شیخ عبدالاحد والد ماجد حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

پھر حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے درجۂ تکمیل حاصل کیا۔

حضرت خواجہ احمد سعید و خواجہ محمد معصوم صاحبزادگان حضرت مجدّد صاحب کی تعلیم و تدریس آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ کی زندگی کا ایک عجیب و غریب

واقعہ درجِ ذیل ہے۔

حضرت مجدّد صاحب کے حلقۂ تلقین میں سالکان طریقت کا اجتماع ہے۔ یکایک حضرت مجدّد صاحب کے چہرہ مبارک سے آثارِ کبیدگی ظاہر ہوتے ہیں اور نہایت افسوس کے ساتھ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

مجھے بتایا گیا ہے کہ حاضرین میں سے ایک شخص طوقِ کفر اپنی گردن میں ڈالے گا۔ میں اس کی پیشانی پر ھوالکافر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

حاضرینِ مجلس لرزہ براندام ہو گئے۔ پانچ چھ ماہ بعد دیکھا جاتا ہے کہ یہی شیخ طاہر ایک عورت کافرہ کے عشق میں مبتلا، زنّارِ ارتداد گردن میں آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ صاحبزادگان اور جملہ متوسلینِ حضرت مجدد کو بہت افسوس ہوا۔ دعا کے لئے حضرت مجدّد صاحب سے استدعا کی گئی۔

حضرت مجدّد صاحب نے جواب دیا۔

"ہرچہ شدنی بود شد کہ در لوحِ محفوظ بحقِ او ہمیں مکتوب بود"۔

لیکن متوسلین حضرت مجدّد صاحب اور بالخصوص ہر دو صاحبزادگان پھر بھی استدعا اور اصرار کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت مجدّد صاحب نے مکرّر دعا فرمائی۔

"الٰہی حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی فرمودہ است کہ ہیچ کس را بر قضاءِ[1] مبرم دستِ قدرت نیست مگر مرا چوں یکے از دوستانِ خود را

---

[1] حدیث شریف میں وارد ہوا ہے لا یرد القضاء الا الدعاء۔ قضاء الٰہی کو صرف دعا ہی پلٹ سکتی ہے۔ حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے مکتوب ۲۱۷ جلد ۱ ص ۲۲۳ و ص ۲۲۴ پر قضا کے مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ قضا کی دو قسمیں ہیں، قضاءِ مبرم اور قضاءِ غیر مبرم، یا قضاءِ معلق۔ قضاءِ غیر مبرم میں تبدیلی اور محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب۔ قضاءِ مبرم میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر جب حضرت غوث اعظم کی دعا سے اُس میں بھی تبدیلی ہوئی تو حضرت غوث اعظم نے فرمایا کہ اُمت میں میرے سوا کسی کو یہ دسترس (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ایں مرتبہ عالی کرامت فرمودی، من ہم امید وارم کہ بواسطہ من از شیخ
طاہر ایں بلاء ازلی بگردد۔"

دعاء مجدّدی کا اثر ہوا۔ داعیہ صداقت طلبی نے کفر عشق پر غلبہ پایا۔ گویا شیخ طاہر خواب سے بیدار ہوئے۔ چنانچہ فوراً افتان خیزاں بارگاہ مجدّدی میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔ عشق مجازی کا ردّعمل عشق حقیقی تھا۔ جس سے شیخ طاہر کو تھوڑے عرصہ میں یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ بقول صاحبِ خزینۃ الاصفیاء،

"اکثر اوقات دیر الہام مے شد کہ اے طاہر بگو" قدمی علی رتبۃ جمیع اولیاء
اللہ تعالےٰ" لیکن وے از فرطِ ادب نمے گفت وعرض کرد۔ یارب ایں
درجہ معلےٰ و رتبہ عالی بحضرت غوث اعظم سزاوار ست۔ مرا ہمیں بس ست
کہ یکے از کمترین مریداں و پیروان جناب غوثیہ باشم[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حاصل نہیں۔ حضرت مجدّد صاحب کو ابتداء میں معلوم ہوا کہ شیخ طاہر کا کفر قضا مبرم ہے جس میں تبدیلی نہ ہوگی۔ چنانچہ آپ نے اپنی دعاء میں حضرت غوث اعظم کی دعا کا حوالہ دیا۔ مگر خداوندِ عالم کا یہ خاص فضل تھا کہ حضرت مجدّد صاحب کی دُعا قبول ہوئی، اور آپ پر بھی واضح کر دیا گیا کہ قضاء مبرم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کارپردازانِ قضاو قدر اس کو مبرم سمجھتے ہیں مگر علمِ الٰہی میں وہ معلق ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ علمِ الٰہی میں مبرم ہی ہو۔ حضرت غوث اعظم یا حضرت مجدّد صاحب کی دعا جس معاملہ میں قبول ہوئی وہ مبرم مشروط تھا۔ اور آخری قسم یعنی جو قضا کہ عنداللہ مبرم ہو، اس میں تبدیلی کسی صورت سے بھی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے مایبدل القول لدیّ وما انا بظلّام للعبید۔ قضا کی انہی متفرق قسموں کے باعث اولیاء اللہ کے مکاشفات میں بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ عارف میں اوقات قضاء مشروط کو قضاء مبرم سمجھ لیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ذاتی مکاشفات میں اگرچہ اس غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر وحی جو من جانب اللہ ہوتی ہے، اس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ قال اللہ تعالےٰ لایاتیہ الباطل۔ الآیۃ ۱۲۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۸ جلد ا۔

بہر حال مجدّدی انوار سے دامن پُر کرنے کے بعد حضرت مجدّد صاحب کا حکم ہُوا کہ لاہور میں جاکر خدمات انجام دیں۔ تعمیلِ ارشاد کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔ مگر تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ بار بار رُک جاتے اور خیال کرتے کہ یہ ذمّہ داری میری برداشت سے باہر ہے۔ مگر کچھ ہاتفِ غیبی کی بشارت اور اس سے زیادہ حضرت شیخ کے حکم نے آپ کو لاہور پہنچا دیا۔ جہاں کچھ طالبانِ سُلوک نے فوراً ہی آپ سے بیعت کر لی، اور اس طرح سلسلۂ تلقین جاری ہو گیا[1]۔ رفتہ رفتہ حلقۂ ارادت میں ہزاروں[2] بندگانِ خدا داخل ہوئے۔

مولانا محمد الدّین صاحب فوقؔ ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور تحریر فرماتے ہیں:

شیخ طاہر بندگی نے مزنگ کے قریب آکر قیام کیا۔ چونکہ علومِ ظاہری و باطنی میں صاحبِ کمال تھے، اس لئے ایک مدرسہ بھی جاری کیا جہاں فقہ، حدیث و تفسیر طلبہ کو مفت پڑھایا جاتا تھا۔ مگر افسوس آپ کی وفات کے بعد مدرسہ جاری نہ رہ سکا۔

آپ کے فقر و تصوّف اور اس مدرسہ کی وجہ سے یہاں عالیشان بستی قائم ہو گئی تھی جس کا نام "میانی" اس وجہ سے مشہور ہو گیا تھا کہ پنجابی زبان میں "میانا" مُلّا اور مولوی کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک قیمتی کتب خانہ بھی تھا۔ جب سکھوں نے مزنگ کو لُوٹا تو میانی کو بھی تباہ کیا گیا (تاریخ لاہور مصنفہ رائے کنہیا لال لاہور) میں لکھا ہے، کہ غارت گروں نے ہزاروں کتابیں "بے کار جنس" سمجھ کر باہر پھینک دیں اور چونکہ اس محلّہ سے جہاں درویش اور عالم لوگ رہتے تھے، ان کو کچھ نہ مل سکا، اس لئے غصّہ کے مارے

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۸ جلد ۱۔ [2] ان ہزاروں میں مندرجہ ذیل چار حضرات خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ۱: شیخ ابو محمد قادری نقشبندی لاہوری۔ مزار مبارک بمقام لاہور۔ ۲: سیّد صوفی۔ آپ کا مزار دہلی میں ہے۔ ۳: شیخ مکھن مست کہ "مدام سرمست جام عشق بود" اپنی خبر نہیں اور جس پر نظر توجّہ ڈالی، درجہ ولایت کو پہنچ گیا۔ ان کا مدفن بھی لاہور میں بیرون موری دروازہ واقع ہے۔ ۴: شیخ ابو القاسم نقشبندی۔ آپ زیارتِ حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے۔ واپسی پر بمقام جدہ وفات ہو گئی۔ وہیں آپ کا مزار اقدس ہے (خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل)۔

محلہ کو آگ لگا دی اور بالکل خاکستر کر دیا۔

ان کے مدرسہ کی عمارت ۱۸۸۴ء تک کسی قدر موجود تھی۔ محلہ میانی کی ویرانی کے بعد لوگوں نے اس کو قبرستان بنالیا جو آج تک بطور قبرستان ہی چلا آتا ہے[1]۔

منجملہ دیگر سلسلوں کے سلسلہ عالیہ قادریہ کا آپ پر بہت زیادہ غلبہ تھا اور اپنے زمانہ میں اس سلسلہ کے تمام مشائخ پر فوقیت رکھتے تھے۔ حتٰی کہ جب حضرت شیخ آدم کو آپ کی برتری کا علم ہوا تو اپنے حلقۂ ارشاد کو چھوڑ کر نسبتِ قادریہ حاصل کرنے کے لئے پاپیادہ بنور سے حضرت شیخ طاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نسبتِ قادریہ کا فیض کامل حاصل کیا۔

شیخ طاہر بہت زیادہ مرتاض، جفاکش، صابر اور قانع تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ذکر و شغل، مریدوں کی تلقین اور شب بیداری میں ہمیشہ سرگرم رہتے۔ اغنیاء اور دولت مندوں کی آمد کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

آپ خود ہی اپنے ہاتھ سے فقہ اور حدیث کی کتابیں لکھتے، اُن پر حاشیہ تحریر فرماتے، اور ان کو فروخت کرتے۔ یہی آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔

خطۂ پنجاب کی قطبیت آپ کے سپرد فرمائی گئی۔ اہلِ پنجاب آپ کے نام کے ساتھ "بندگی" کا لفظ بھی تعظیماً لگاتے ہیں۔ بروز پنجشنبہ بوقت چاشت محرم الحرام ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) بعمر ۵۶ (چھپن سال) آپ نے رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات لفظ بدر غم ہے، نیز آہ معرفت مُرد (۱۰۴۰) - مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

حضرت میر محمد نعمان قدس اللہ سرہ العزیز

آپ کو حضرت مجدد صاحب کے خلفاء میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مانا جاتا ہے۔

آپ کی ولادت ۹۷۷ھ (نو سو ستتر ھ) میں بمقام بدخشاں ہوئی۔ والد صاحب

---

[1] تذکرۃ العلماء والمشائخ صفحہ ۳۰ و ۳۱

کا اسمِ گرامی سید شمس[1] الدین یحییٰ عرف میر بزرگ۔

ولادت سے قبل والد ماجد نے حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ (ابو حنیفہ امام اعظم، رحمۃ اللہ علیہ) کو خواب میں دیکھا۔ آپ ایک لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ جو بہت بزرگ ہوگا، اور اس کے لئے اپنا نام عنایت فرما رہے ہیں۔ چنانچہ والد ماجد نے یہی نام تجویز کیا۔

آپ کو ابتدا سے مراحلِ سلوک طے کرنے کا شوق تھا اور اسی غور و فکر میں عموماً رہتے تھے۔ ایامِ شباب میں آپ نے حضرت عبید اللہ بلخی عشقی کے ہاتھ پر توبہ کی۔ پھر ہندوستان تشریف لاکر ایک عرصہ تک شیخِ کامل کی جستجو میں مشائخ و علماء ہند سے ملتے رہے۔ آخر میں حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضری کی نوبت آئی، اور آپ اسی بارگاہ ہو گئے۔

اہل و عیال آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت خواجہ نے آپ کے قیام کا انتظام کیا۔ ذریعۂ معاش کچھ نہ تھا۔ نہایت عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ حضرت خواجہ ان کی پرداخت فرماتے اور شریک حال رکھتے۔ ایک مرتبہ کسی حاکم نے حضرت خواجہ سے متوسلین کے نام پوچھے جو خانقاہ میں حاضر رہتے اور فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ ان حضرات کے لئے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

حضرت خواجہ نے جملہ حاضرین خانقاہ کے نام بتا دیئے مگر صاحب موصوف کا نام نہیں بتایا۔ حالانکہ یہ سب سے زیادہ عیال دار اور ضرورت مند تھے۔ حضرت خواجہ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا۔ فرمایا۔ میر محمد نعمان میرے بدن کا جزو ہیں۔

میر محمد نعمان صاحب کو جب اس خصوصیت کا علم ہوا تو خود ہی فرماتے ہیں۔

بر قصہا فرستم ، دا امید ہا بستم

حضرت میر صاحب عسرت و تنگ دستی کے باوجود ہمیشہ مسرور و فرحاں رہتے

---

[1] مقدمہ مکتوبات جلد سوم صک

رنج و راحت سے گویا تاثر مفقود تھا۔ زحمت کو رحمت جانتے اور نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے۔

حضرت مجدّد صاحب سے رابطہ حضرت خواجہ نے جب کارخانۂ ارشاد و تلقین حضرت مجدّد صاحب کے حوالہ فرمایا تو ان کو بھی ہدایت ہوئی کہ حضرت مجدّد صاحب سے استفادہ کریں۔ آپ نے عرض کیا۔ خادم کی تمنّا تھی کہ حضور کی بارگاہ عالیجاہ کے سوا کسی اور کا دست نگر نہ ہوتا۔

حضرت خواجہ نے کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا۔ میاں شیخ احمد تو وہ آفتاب ہے کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گُم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کامل عقیدت مندی کے ساتھ حضرت میر نعمانؒ، حضرت مجدّد صاحب سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن حضرت مجدّد صاحب نے آپ کو حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر رہنے ہی کی ہدایت فرمائی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت خواجہ کی وفات ہو گئی۔ تو حضرت میر نعمان نے حضرت مجدّد صاحب سے مزید توجّہ کی درخواست کی اور تحریر فرمایا :

"میرے پاس اس کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں کہ میں آلِ رسول ہوں"۔

اس تحریر نے توجّہات مجدّدیہ کے دروازے کھول دیئے۔ بالآخر حضرت مجدّد صاحب کے محبوب ترین خلیفہ ہوئے۔

حضرت مجدّد صاحب کے تعلّق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مکتوبات کی جلد ثالث کو میر صاحب کے اسم گرامی سے مسجل فرمایا اور وجہ یہ فرمائی کہ "بہتر از شما[1] کہ خواہد بود"۔ پھر تعلیم طریقہ اور اصلاح خلق اللہ کے لئے آپ کو دکن بھیجا۔

مکتوبات شریف میں بہت کافی مکاتیب آپ کے نام ہیں۔ جن میں سُلوک کے دقیق ترین نکتے حل کئے گئے ہیں جن سے مکتوب الیہ کی اعلیٰ قابلیت اور استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] تم سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ۲۵۶

حضرتِ مجدّد صاحب کے بعد صاحبزادگان گرامی کا بھی حضرت میر صاحب سے بہت گہرا تعلق رہا۔ مکتوبات خواجہ محمد معصوم میں بلشتر مکاتیب حضرتِ میر صاحب کے نام ہی ہیں۔ حضرت میر صاحب کے ظرف عالی اور شوق کامل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ مجھ کو ایک مقام کے حاصل ہونے کی آرزو تھی۔ اسی اثناء میں رات کے وقت برہان پور کی جامع مسجد میں چبوترہ کے اُوپر سے گر پڑا۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ جیسے ہی مَیں گرا، اُس مقام کا انکشاف ہو گیا۔ مجھے اس گرنے پر رنج کے بجائے مسرّت ہوئی۔ مَیں نے اسی خوشی میں حلوا تقسیم کیا۔ ۱۸ صفر ۱۰۶۰ھ (دس سو ساٹھ) کو آپ کی وفات ہوئی۔ مزار مقدس آگرہ میں ہے۔[1]

تاریخِ ولادت: میر[2] والاجاہ نعمان متقی
۱۰۵۸

حضرت خواجہ ہاشم کشمی قدس اللہ سرہ العزیز

تکمیلِ طریقت کے شوق میں ہندوستان آئے۔ اوّلاً حضرت میر محمد نعمان صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں برہان پور (جنوبی ہند) حاضر ہو کر شرفِ بیعت حاصل کیا۔ پھر چونکہ جوان قابل تھے، حضرت مجدّد صاحب نے تربیت کے لئے انتخاب فرما کر اپنے پاس طلب فرمالیا۔ چنانچہ آپ نے درجۂ خلافت حاصل کیا اور پھر بارگاہِ مجدّدی سے دکن کی تبلیغ و اصلاح کے لئے مامور ہوئے۔ بے شمار خلقِ خدا آپ سے مستفیض ہوئی۔ زبدۃ المقامات آپ ہی کی تصنیف ہے۔ برہان پور میں آپ کی وفات ہوئی۔ وہیں آپ کی آرام گاہ ہے۔

---

[1] مکتوبات جلد ۳ صد ۴ [2] صاحب سیر آپ کی وفات ۱۰۵۱ھ میں بتاتے ہیں (خزینۃ الاصفیا)

حضرت شیخ بدیع الدّین سہارنپوری قدس اللہ سرہ العزیز

آپ نے توضیح و تلویح بھی حضرت مجدّد صاحب سے ہی پڑھی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں آزاد طبع تھے۔ حضرت مجدّد صاحب کی شفقت نے آپ کو سلوک کی طرف متوجّہ کیا۔ تھوڑے عرصہ میں منصبِ خلافت حاصل کر لیا۔ تو وطن پہنچ کر اصلاح و ارشاد میں مشغول رہنے کی ہدایت فرمائی۔

پھر آگرہ پہنچ کر اصلاح و تبلیغ کا حکم ہوا۔ وہاں آپ نے لشکریوں کی بھی اصلاح فرمائی۔ لیکن کچھ کج طبع لوگوں نے اغراضِ مشئومہ کے باعث حضرت پر ناجائز نکتہ چینیاں کر کے فتنہ کھڑا کر دیا۔ حضرت نے بہت کافی مقابلہ فرمایا۔ آخر میں آپ سہارنپور تشریف لے آئے۔ یہیں آپ کی وفات ہوئی۔

حضرت مولانا بدر الدّین صاحب قدس اللہ سرہٗ

دولت خانہ سرہند۔ پندرہ سال کی عمر میں حضرت مجدّد صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ علومِ ظاہری کی تعلیم کے ساتھ ملکاتِ باطنیہ کی اصلاح و ذکر و شغل بھی شروع کر دیا، اور حالات اور واردات کا ظہور ہونے لگا۔

حضرت مجدّد صاحب کمسن مولانا بدر الدین صاحب کو اپنے عیال میں شمار فرماتے عقیدت مندی اور اس کے برکات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شب میں آپ بارہ مرتبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

حضرات القدس آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس کی پہلی جلد میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت خواجہ باقی باللہ تک اکابر کے حالات ہیں۔

دوسری جلد میں حضرت مجدّد صاحب اور صاحبزادگان عالی شان و خلفاء نامدار کے حالات درج ہیں۔

حاجی خضر روغانی قدس سرہ | متوفی ۱۰۵۰ھ (ایک ہزار پچاس ھ) اوّلاً حضرت شیخ عبدالاحد والد ماجد حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ پھر حضرت مجدّد صاحب سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آخر میں زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے اور ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ قصبہ بہلول پور کے رہنے والے تھے جو سرہند کے مضافات میں ہے یہیں وفات ہوئی یہیں مزار مبارک ہے[1]۔

شیخ عبدالحیّ قدس سرہ العزیز | متوفی ۱۰۷۰ھ (ایک ہزار ستّر ھ)۔ خلفاء حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز میں ہیں۔ ذوق و شوق، جذب و استغراق، اتباعِ سنّت اور پابندیٔ شریعت میں بے نظیر تھے۔ کرامات میں مشہور۔ مکتوبات شریف کے ایک حصّہ کو جمع کرنے کا شرف حاصل کیا[2]۔

مولانا عبدالواحد لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز | کثیر المراقبہ، کثیر العبادات، اور کثیر العلم تھے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ارشاد سے حضرت مجدّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تربیت حاصل کی۔ بعد تکمیل لاہور میں قیام فرما کر لوگوں کو اپنے علم و فضل سے فیض پہنچایا۔ نماز کے عاشق تھے اور سنّت و شریعت کے اجراء میں کمال سرگرم۔ نماز میں ایک مرتبہ ایسا ذوق ہوا کہ حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کشمی سے دریافت کیا۔ جنّت میں نماز ہوگی؟ انہوں نے فرمایا۔ جنّت دار العمل نہیں، دار الجزاء ہے، اس لئے وہاں نماز کہاں؟ آپ نے سرد آہ کھینچی اور فرمایا۔ بغیر نماز وہاں کیا لُطف آئے گا۔ اس مولویانہ اور صوفیانہ زندگی کے ساتھ کسبِ حلال کا سلسلہ بلند پیمانہ پر جاری تھا۔ تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مالِ تجارت لے کر بخارا تشریف لے گئے۔ کسی مسجد میں نماز عشاء کے بعد نوافل میں مشغول ہو گئے۔ خادم مسجد نے کہا۔ مسجد کا دروازہ بند ہونے والا ہے، نفل گھر جا کر پڑھو۔ آپ تشریف لے آئے۔ رات کو حضرت خواجہ نے خادم مسجد کو تنبیہ فرمائی کہ وہ ہندی سوداگر درویش صفت ہمارا دوست ہے۔ اس سے جا کر معذرت کرو

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۹۔ [2] ایضاً ص ۶۳۷

چنانچہ وہ دوڑا آیا، اور معذرت چاہی۔ مکاتیب شریف میں چند مکاتیب آپ کے نام ہیں[1]۔

خلفاء کرام کے خلفاء اور نبیرگان حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ اسرارہم

حضرت شیخ عبدالاحد صاحب وحدت عُرف شاہ گُل قدس سرہٗ

آپ حضرت خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید صاحب فرزند ثانی حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ اسرارہم کے فرزند ہیں۔ سن ولادت با سعادت ۱۰۴۹ھ (دس سو انچاس) تاریخی نام شیخ عبدالاحد جیو ۱۰۴۹۔ مقام ولادت سرہند شریف۔

حضرت خازن الرحمۃ کو آپ سے بہت زیادہ انسیت تھی اور آپ کو "گُل" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ گُل آپ کا عُرف ہوگیا۔

فطری سعادت اور پھر خانوادۂ تجدید و ولایت کی فرزندی کے اقتضاء کے بموجب آپ عہدِ طفولیت سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔

اپنے خاندان کے طریقہ کے مطابق سولہ سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل سے فراغت حاصل کرلی۔ اسی عمر میں والد صاحب کی رفاقت میں سفر حج کی دولت میسّر آئی۔ آپ نے حالاتِ سفر و مکاشفات حرمین شریفین کے متعلّق عربی زبان میں سفرنامہ تحریر فرمایا جس کی فصاحت و بلاغت حیرت انگیز مانی گئی۔

والد صاحب کی وفات کے وقت آپ سن مبارک کی اکیسویں گردش پوری فرما رہے تھے۔ مگر سُلوک و طریقت کے مراحل آخری حد تک طے فرما چکے تھے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد عمِ محترم حضرت خواجہ محمد معصوم سے استفادہ کیا۔ ان دونوں بھائیوں (خواجہ محمد سعید صاحب و خواجہ محمد معصوم صاحب) کے

---

[1] تذکرۃ العلماء والمشائخ ص۱۳۱ ۱۲

طریقہ، تربیت اور مناسبتوں میں بہت تفاوت تھا۔ آپ ان دونوں نسبتوں کے لئے "مجمع البحرین" تھے۔

آپ کے کمالات، کرامتوں اور بشارتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ سوانح نگار حضرات نے کافی خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر "کراماتِ اولیاء حق" کے عقیدہ کے باوجود اس کتاب کا دامن اس دریائے بے پایاں کے احاطہ سے قاصر ہے۔

احترامِ اکابر بہت بڑی سعادت ہے اور تمام سعادتوں کا زینہ۔ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب بڑے بھائی کی تعظیم یہاں تک کرتے تھے کہ آپ کی سواری کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جبتک بڑے بھائی کی خدمت میں بیر پیش نہ کر دیتے، اپنے گھر کی بیری کے بیر نہیں تناول کرتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالاحد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنے عمِ محترم اور شیخِ طریقت حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کی خالی مسند کی جانب بھی کبھی پُشت نہ کرتے تھے۔

اکلِ حلال کے بغیر رُوحانی کمالات کے دروازے نہیں کُھلتے۔ مستجاب الدّعا ہونے کے لئے اکلِ حلال شرطِ اوّل ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت موصوف کے احتیاط کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ آپ کا ایک مرید حاضر خدمت ہؤا۔ تو آپ نے فرمایا۔ تم سے بُو آتی ہے شاید تم نے حرام کھایا ہے۔

مرید نے عرض کیا۔ حرام سے پورا پرہیز کرتا ہوں۔ البتہ ایک شخص کے ساتھ ایک دنیا دار کے گھر دعوت میں چلا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ تین روزے رکھو۔ اس کے بعد توجہ کے لئے آنا۔

سرہند کے حاکم نے ایک مرتبہ عوام پر کچھ زیادتی کی۔ جس سے حضرت شیخ کو ملال ہؤا۔ اسی ہفتہ وہ عتابِ سلطانی میں ماخوذ ہو گیا۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے افعال سے توبہ کی اور دُعا کی التجا کی۔ حضرت نے اس کی بشارت دی کہ فلاں روز

بادشاہ تمہارا قصور معاف کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حاکم مذکور نے ایک باغ اور کچھ اور تحفے خدمتِ شیخ میں پیش کئے۔ مگر وہ سب واپس کر دیئے گئے۔ کیونکہ مال مشکوک تھا۔

شاہزادی زیب النساء کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔

صبر و تحمّل، عفو و درگذر اور حسنِ اخلاق مومنِ کامل کے مفہوم کا جزوِ اعظم ہے۔ مگر ولی اللہ کا صبر، گستاخی کرنے والے کے لئے سامانِ ہلاکت ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے حضرت موصوف کے رُو برو آپ کی شان میں ناشائستہ کلمات کہے۔ آپ نے صبر فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے حاضرین میں سے کسی سے فرمایا اس کے طمانچہ مار دو۔ اس نے توقف کیا۔ وہ عورت دفعتہً گر ی اور مر گئی۔

آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ تمہاری سُستی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ جب اس عورت نے ناشائستہ کلمات کہے اور مَیں نے صبر کیا۔ تو مَیں نے دیکھا کہ غیرتِ الٰہی انتقام کے لئے حرکت میں آئی۔ مَیں چاہتا تھا کہ میری جانب سے بدلہ ہو جائے تاکہ غیرتِ الٰہی کا قہر فرو ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ مر گئی۔

ملہ۔ صحیح السند حدیث ہے کہ مرض الوفات میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوا کی طرف راغب نہ تھے۔ حاضرین نے زبردستی منہ میں دوا ڈال دی۔ آپ نے حکم فرمایا کہ حضرت عباسؓ کے سوا جتنے موجود ہیں، اُن سب کے منہ میں دوا ڈالو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ (ترمذی وغیرہ)

عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے اپنی تصنیف "رحلت مصطفوی" میں اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالتِ مرض کا ہذیان قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موقعہ شناس صحابہؓ اور صحابیات نے اس کی تعمیل کیوں کی۔ اصل وجہ اس کی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص کیفیت کے باعث جو شانِ رسالت کے شایاں در پیش تھی، دوا سے انکار فرمایا تھا۔ ان حضرات نے اس کو مریض کی طبعی نفرت سمجھا لیکن یہ گستاخی تھی، جس کا انجام خطرناک ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقامی عمل فرما کر اس گستاخی کے مضرت رساں اثر کو ختم فرمایا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اس واقعہ میں شریک تھے مگر چونکہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تخلّص وحدت | آپ کی طبع مبارک نہایت موزوں اور رنگین واقع ہوئی تھی۔ اشعار سے آپ شوق فرماتے تھے۔ وحدت تخلّص تھا۔ آپ کا ایک شعر ہے ؎

خانہ زیں ست دنیا عیشِ او پا در رکاب

شہسوار ست آنکہ زینجا زود دامن چید و رفت

وفات | ۲۷ ر ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ (گیارہ سو چھبیس) بروز جمعہ بعارضہ حبسِ بول و درد مثانہ اٹھتر ۷۸ سال عمر پاکر انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے مشرقی جانب میں آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت شیخ محمد صبغۃ اللہ قدس سرہ

فرزند اکبر حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ۔ ولادت ۱۰۳۰ھ (ایک ہزار تیس ھ) بزمانۂ حیات حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ) بمقام سرہند۔

دادا نے صبغۃ اللہ نام تجویز فرمایا، کیونکہ للّٰہیت کی بُو ابتداءِ طفولیت میں آنے لگی تھی۔ والد ماجد سے علومِ ظاہری اور باطنی کی تحصیل کی۔ ورع و تقویٰ، علم و فضل میں آپ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ حضرت خواجہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رشتۂ پدری نہ ہوتا تو میں صبغۃ اللہ کی تعظیم کیا کرتا۔ حافظہ اس قدر تیز تھا کہ چالیس روز میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ تحصیلِ کمالات کے بعد کابل کی قطبیت آپ کے سپرد ہوئی، اور اصلاح وارشاد کے لئے والد ماجد نے آپ کو کابل بھیجا۔ جہاں بے شمار خلقِ خدا نے آپ سے استفاضۂ برکات کیا۔

نوّے ۹۰ سال آپ نے عمر پائی۔ اٹھ ربیع الاوّل روز جمعہ ۱۱۲۰ھ (گیارہ سو بیس ھ) تاریخ وفات ہے۔ مزار مبارک سرہند شریف۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ چچا تھے، اس قسم کی زبردستی ان کی جانب سے گستاخی نہیں تھی (ہکذا افادنا سیدنا الاستاذ العلامہ انور شاہ کشمیری المحدث قدس اللہ سرہ العزیز)۔

حضرت حجۃ اللہ محمد نقشبند قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند ثانی اور خلیفۂ جلیل القدر حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ اسرارہم۔ سنہ ولادت ۱۰۳۴ھ (دس سو چونتیس ھ) بمقام سرہند شریف۔

خاندانی صلاحیت سے بہت کافی حصہ حاصل کیا تھا۔ تحصیلِ علوم کے بعد جب طریقت کے مراحل طے فرمانے شروع کئے تو والد ماجد اور پیر مرشد کو اپنے حالات سے اطلاع دی۔ والد ماجد نے تحریر فرمایا:

"از علو مرتبۂ ایں اسرار چہ بیان نماید کہ از حیطۂ درک عقل و تصویر خیال بیروں ست"۔

جب ابتدا میں یہ حالت ہو تو انتہا میں کیا ہوگا۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

۹ محرم الحرام ۱۱۱۵ھ (گیارہ سو پندرہ ہجری) شب جمعہ بعمر اسّی ۸۰ سال آپ دارِ دنیا سے رخصت ہوئے۔ مزار والد ماجد کے جانب شمال میں آپ دفن ہوئے۔

حضرت خواجہ محمد عبید اللہ، مروج الشریعت قدس اللہ سرہ العزیز

فرزندِ سوم و خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ اسرارہم۔ ولادت باسعادت یکم شعبان ۱۰۳۷ھ (دس سو سینتیس ہجری) بمقام سرہند شریف۔

ایّامِ طفولیّت سے آثار ولایت و ہدایت ناصیہ مبارک سے ظاہر تھے۔ والدین کو ساری اولاد میں آپ سے بہت زیادہ انسیت تھی۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رح آپ کو "میاں حضرت" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ایک ماہ میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا۔

سات سال کا سن تھا کہ مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی تشریف لائے۔ آپ نے

امتحاناً فرمایا۔ گویائی زبان کی صفت ہے۔ دل ایک پارچۂ گوشت ہے۔ وہ کس طرح ذکر کر سکتا ہے؟

ہفت سالہ طفل نے جواب دیا۔ زبان بھی پارچۂ گوشت ہے جس قادرِ مطلق نے زبان کو گویائی عطا فرمائی، وہی قلب کو قوّتِ ذکر عطا فرماتا ہے۔

مولانا نے فرمایا۔ نبیرۂ مجدّد کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

علم، عمل اور تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ سلوکِ باطن والد ماجد سے حاصل کیا۔ درجۂ قطبیت پر فائز ہوئے۔ عروۃ الوثقٰی فرمایا کرتے تھے۔ تم مراتب عروج و نزول میں میرے رفیق رہتے ہو۔ انگشتِ شہادت اور درمیانی انگشت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے، تم میرے پیچھے اس طرح رہتے ہو جیسے انگشتِ شہادت بیچ کی اُنگلی کے پیچھے اور ساتھ ساتھ۔

آپ کی صحبت کثیر البرکت تھی۔ آپ کے حلقہ میں خلقت کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی۔ اصلاح و تلقین پابندیٔ شریعت کے باعث آپ کا خطاب "مُرَوِّجُ الشریعت" ہُوا۔ ۱۹ ربیع الاوّل ۱۰۸۳ھ (دس سو تراسی ہجری) یوم جمعہ دہلی سے سرہند واپس ہوتے ہوئے بمقام سنہالکہ آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا نماز کا وقت باقی ہے؟

وقت باقی تھا مگر علالت کے باعث وضو کی قدرت نہ تھی۔ آپ نے تیمّم فرمایا۔ پھر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ السّلام علیکم یا رسول اللہ۔ اس کے بعد نماز کی نیّت باندھی۔ اور جب پیشانی فرش پر تھی، رُوح القدس نے عرش بریں کی جانب پرواز کیا۔

حضرت خواجہ محمّد اشرف قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند چہارم و خلیفہ راشد حضرت عروۃ الوثقٰی۔ ولادت ۱۰۴۸ھ (دس سو اڑتالیس ہجری)۔ وفات ۱۱۱۷ھ (گیارہ سو سترہ ہجری)

عالم باعمل، زاہد و متّقی۔ مجدّدی خصوصیات کے حامل۔ علوم ظاہری میں علومِ باطنی کی طرح یکتا۔ تفسیر، حدیث، کلام اور معقولات کی بہت سی کتابوں پر حاشیہ تحریر

فرمایا۔ آپ کا آخری کلام تھا:

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل

محیّ السّنّت حضرت شیخ سیف الدّین قدس اللہ سرہ العزیز

مُرشد سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

صاحبزادہ پنجم و خلیفہ ارشد حضرت عروۃ الوثقٰی قدس اللہ سرہ العزیز۔ ولادت باسعادت ۱۰۴۹ھ (دس سو انچاس ہجری) بمقام سرہند۔

عمِ محترم خواجہ محمد سعید قدس اللہ سرہ العزیز "خازن الرحمۃ" نے آپ کی ولادت کے وقت ہاتف کی بشارت سُنی۔ سلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا۔

حافظہ نہایت قوی تھا۔ دماغ سنجیدہ، طبیعت سلیس، صلاحیت اور استعداد نہایت اعلیٰ، فطرت نہایت سلیم۔ انتہا یہ کہ گیارہ سال کی عمر میں والد ماجد نے "فنارِ قلب" کی بشارت دے دی۔ علومِ ظاہری میں کمال حاصل کیا۔ اتّباعِ سُنّت اور شریعتِ مطہرہ کی ترویج و اشاعت میں اس قدر غلو تھا کہ دنیا نے آپ کو "محی السنّۃ" کا خطاب دیا۔

عہدِ شباب کا پُر کیف دَور، محبوب بے چون و بے کیف کے عشق و محبت کی سرمستیوں سے معمور رہا۔

اتّباعِ شریعت ان حضرات کی گھٹّی میں پڑی تھی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مجاہدات ترکہ میں حاصل کئے تھے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ سلطان عالمگیر نظامتِ ملتان کے زمانہ میں عروۃ الوثقٰی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ ۱۰۷۰ھ میں جب کہ وہ پورے ہندوستان کا شہنشاہ ہو چکا تھا۔ اُس نے خازنِ رحمۃ حضرت خواجہ محمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو دہلی

۱؎ خزینۃ الاصفیاء صلا ۶۴۶ جلد اوّل۔

تشریف لانے کی دعوت دی۔

مگر حضرت "خازن الرحمۃ" کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ آپ بیمار ہو کر دہلی سے واپس ہوئے، اور راستہ ہی میں رحمتِ خداوندی سے ابدی پیوستگی حاصل کر لی۔

اس کے بعد سلطان موصوف حضرت عروۃ الوثقیٰ کی خدمت میں تشریف آوری کی درخواستیں اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہے۔

مگر حضرت عروۃ الوثقیٰ نے والد ماجد کی وصیّت کے بموجب ٹوٹی جھونپڑی کو قصرِ سُلطانی اور پُرانی چٹائی کو تختِ طاؤس قرار دے لیا تھا۔

جب سلطان کو اس درخواست میں ناکامی ہوئی تو کسی خلیفہ کے متعلق التجا کی جو دہلی رہ کر بادشاہ کی رُوحانی تربیت کرے۔

رُوحانیات کے نباض حاذق "حضرت عروۃ الوثقیٰ" نے اسی نوجوان صالح اور شیخِ کامل کو سُلطان کی تربیت کے لئے مامور[1] فرمایا۔

قلعۂ معلّٰی کے پھاٹک کے دونوں طرف دو ہاتھیوں[2] کے مجسّمے تھے۔ جن پر فیلبان بھی سوار تھے۔ آپ جیسے ہی قلعہ کے سامنے پہنچے، پہلی ہدایت یہ صادر فرمائی کہ ان ہاتھیوں کو توڑوا دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، اس کے بعد داخلہ ہُوا۔

ایک روز بادشاہ نے آپ کو حیات[3] بخش باغ کی سیر کی تکلیف دی۔ جواہر اور

---

[1] اگرچہ حضرت مولانا سیف الدّین صاحب کے دہلی تشریف لے جانے اور واپسی کی تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا مگر یہ ظاہر ہے کہ ۱۰۷۹ھ سال وفات حضرت خواجہ محمد معصوم سے چند سال پیشتر آپ دہلی تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے وقت مولانا سیف الدین صاحب کی عمر ۳۰ تیس سال تھی جبکہ آپ سلطان کی رُوحانی تربیت سے فارغ ہو کر والد ماجد کی خدمت میں واپس تشریف لا چکے تھے۔ اس لئے اندازہ یہ ہے کہ چوبیس پچیس سال کی عمر میں آپ کے یہ خدمت سپرد ہوئی تھی [2] قلعہ کے ایک پھاٹک پر دو ہاتھی اب بھی بنے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ دوبارہ بنوائے گئے ہیں۔ [3] شاہجہاں نے قلعہ کے ساتھ یہ باغ بنوایا تھا۔ اس کے وسط میں ایک حوض تھا ساٹھ گز لانبا (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

موتیوں کی آنکھوں والی سونے کی مچھلیاں اس حوض میں تیر رہی تھیں۔ حکم صادر ہوا، مچھلیوں کو توڑ دو۔ سونے کو اس کے مصرف میں صرف کرو۔ ورنہ میں باغ کی سیر نہ کروں گا۔

عالمگیر جیسے زاہد متقشف کو ایسے ہی شیخ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ حضرت عروۃ الوثقیٰ کی طرح ان کے فرستادہ خلیفہ کا بھی گرویدہ ہو گیا، اور حضرت عروۃ الوثقےٰ کی خدمت میں اس حسنِ انتخاب پر شکریہ کا خط لکھا۔

عالمگیر جیسے بیدار مغز اور خوددار بادشاہ کا چوبیس[1] پچیس سالہ نوجوان کے سامنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ساٹھ گز چوڑا۔ بیچ میں ۴۹ اور کناروں پر چاروں طرف ایک سو بارہ فوارے چاندی کے لگے ہوئے تھے جو ہر وقت چلتے رہتے تھے۔ اس حوض کے چاروں طرف سنگ سرخ کی نہر چھ گز کے عرض میں بہتی تھی اور ہر ہر سمت میں تیس تیس فوارے چاندی کے ہر وقت چلتے رہتے تھے سر سید احمد صاحب اس باغ کی مذکورہ بالا تعریف و توصیف کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ان فواروں کا نام بھی نہیں رہا۔ البتہ جس جگہ فوّارے تھے وہاں ایک چھید باقی رہ گیا ہے ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

اس باغ میں بہادر شاہ بادشاہ حال نے ظفر محل بنایا ہے ۱۲۔ (آثار الصنادید)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] افسوس ہم بھول گئے۔ اسلامی تاریخ ہمارے سامنے نوجوانوں ہی کو پیش کرتی ہے جنہوں نے آغاز شباب کے لہو و لعب اور جوانی کی بے پناہ امنگوں کو اسلامی خدمات پر قربان کیا اور اسلام نے اُن کے ایثار کو لبیک کہتے ہوئے عظمت و جلالت کی بلند چوٹی پر اُن کو پہنچا دیا۔ حضرت عتاب بن اسید کی عمر ۱۸ سال تھی جب کہ نو مفتوحہ مکہ معظمہ کا اُن کو حاکم بنایا گیا جس میں ابوسفیان اور حکیم بن حزام جیسے جرنیل آج بھی اپنی عظمت و ہیبت کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے جگر گوشہ حضرت اسامہ بن زید رضؓ کی عمر ۱۷ سال تھی جب آپ کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کا افسر اعلیٰ بنایا جس کو شام پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ایک مجاہد کی حیثیت سے شریک تھے۔ وہ ہندوستان کا فاتح اوّل جس نے عربی نسلوں کے لئے ہندوستان کا راستہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

زانوئے ادب طے کرنا بادشاہ کے کمال اخلاص اور نوجوان کے کمال استعداد کا بیّن ثبوت ہے۔

بادشاہ کے مکتوب شکریہ کے جواب میں حضرت عروۃ الوثقیٰؒ کے مکتوبِ گرامی کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

الحمد للہ و المنۃ کہ فقیر زادہ منظور نظر ہوا، اور اس کی صحبت سے مقصود حاصل ہوگیا۔ جناب نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر (جو کہ فقیر زادہ کا شیوہ ہے) شکریہ ادا فرمایا۔ میں نے حضرت حق جلّ مجدہٗ کا شکریہ ادا کیا، اور آپ کے لئے ترقّیِ مراتب کی دُعا کی۔ کیسی بڑی نعمت ہے، کہ شاہانہ طمطراق اور سلطانی حشمت و دبدبہ کے باوجود کلمۂ حق قبولیت حاصل کرے، اور ایک فقیر زادہ کی بات اثر انداز ہو۔

حضرت مولانا سیف الدّین صاحب کی رُوحانی تربیت نے سلطان عالمگیر کو سالکِ طریقت بنا دیا۔ حضرت موصوف سلطان کی رُوحانی کیفیات سے والد ماجد کو اطلاع دیتے رہے۔ مولانا موصوف کے جواب میں حضرت عروۃ الوثقیٰؒ کے مکتوب ۲۲۰ (دو سو بیس) جلد ثالث سے سلطان کی رُوحانی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

لطائف رُوحانی (رُوحانی قویٰ اور ملکات) میں ذکرِ الٰہی کے اثر و سرایت سلطان ذکر اور رابطہ کا حصول، خطرات و وساوس کی کمی، کلمۂ حق کی مقبولیت، بعض منکر اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صاف کیا۔ یعنی محمد ابن قاسم صرف ۱۸ سال کی عمر لے کر ہندوستان آیا تھا۔ جہاں ڈھائی سالہ حکومت میں دو شہر آباد کر گیا اور عربی عدل و انصاف کا وہ سکّہ بٹھا گیا کہ اس کے مفتوحہ ممالک میں آج بھی مسلمانوں کی ۷۵ اور ۸۰ فی صدی کی اکثریت ہے، اور ہمارے من چلے اکبر کی عمر صرف ۱۸ سال تھی جبکہ اُس نے تمام مقابلین اور مخالفین کو شکست دے کر اکبر اعظم" یا اکبر دی گریٹ" کا غیر فانی لقب حاصل کیا۔ اور خود عالمگیر کی عمر سترہ سال تھی کہ دکن جیسے پرآشوب صوبہ کا اس کو گورنر بنایا گیا۔ مگر افسوس آج ہم کیا سے کیا ہوگئے۔

ناجائز اُمور کی منسوخیت اور طلب وجستجو کے لوازم کا ظہور وغیرہ وغیرہ یعنی بادشاہ دین پناہ کے جو حالات آپ نے تحریر فرمائے ہیں، اُن پر خدائے بالا و برتر کا شکریہ ادا کیا۔ درحقیقت طبقۂ سلاطین میں اس قسم کے حالات عنقا و ناپید ہیں الخ

اسی طرح مکتوب ۲۳۲ جلد ثالث، مکتوب ۲۴۲ جلد ثالث میں بادشاہ کے حالات پر مسرّت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

جس کا مرید بادشاہ ہو، اس کی قبولیت کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اُمراء، وزراء اور محلاتِ شاہی کے تمام خواص سلسلۂ عالیہ میں داخل ہوگئے۔

سپرد شدہ خدمت کی تکمیل کے بعد حضرت سیف الدّین والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب کی وفات ہوگئی۔ رحمہ اللہ۔ تب آپ کا حلقۂ تلقین وارشاد مستقل طور پر قائم ہوگیا۔

آپ پر وجد وشوق کا ایک خاص کیف ہر وقت طاری رہتا۔ مجلس عالی میں جب آپ بیٹھتے تو اس طرح کہ گویا کوئی عاشق انتظارِ معشوق میں بیٹھا ہے۔ جب کسی کی زبان سے محبوبِ حقیقی کا نامِ نامی اللہ صادر ہوتا تو آپ پر وجد طاری ہوجاتا۔ بسا اوقات بے اختیار ہوکر مُرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے۔

ایک شب کو حجرہ کی چھت پر آپ نماز تہجّد کی تیاری کر رہے تھے کہیں سے بانسری کی آواز کانوں میں پڑگئی۔ آپ پر وجد طاری ہوگیا۔ حتّٰی کہ سرمستی اور مدہوشی میں چھت سے نیچے گر گئے۔ دستِ مبارک پر بہت چوٹ آئی۔

جب ہوش آیا تو فرمانے لگے:

"ترکِ سماع[1] مارا بے درد میگویند۔ بیدرد ایشاں اند کہ باستماع سماع صبر مے کنند۔"

حضرت موصوف کے ایک مرید ایک مرتبہ کہیں محفل سماع میں پہنچ گئے۔ ایک ہی

---

[1] ہمیں ترکِ سماع کے باعث بے درد کہتے ہیں۔ بے درد وہ ہیں جو سماع سُن کر صبر کرتے ہیں۔

شعر کان میں پڑا تھا کہ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ دل پھٹ گیا اور واصل بحق ہوئے۔

حضرت سیف قدس اللہ سرہ العزیز نے سُنا تو فرمایا :

"سماع مہلک دردمنداں ست۔ لہٰذا علماء دین سماع را حرام تصوّر کردہ اند۔"[1]

آپ کے اسی دردِ دل کا اثر تھا کہ جو آپ کی مجلس میں ایک مرتبہ حاضر ہوتا، اگر نابکار ہوتا، تائب ہو جاتا۔ نیکوکار ہوتا تو واصل مولےٰ ہو جاتا۔

یہ آپ کے دردِ دل کا حال ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اتباعِ سُنّت، اور پابندیٔ شریعت میں آپ کا تقشف اور زہد و تقویٰ پہلے بیان ہو چکا۔ غلام سرور چشتی فرماتے ہیں :

"از صحبتِ اہلِ دنیا بغایت احتراز داشتے و با متموّلاں نخوردے۔"[2]

لیکن اس احتیاط اور تقویٰ کے باوجود خدا کی دین کا یہ حال تھا کہ :

حضرت شیخ کے دسترخوان پر روزانہ اوسطاً چار سو مہمان اور درویش حاضر رہتے، اور پھر ہر ایک کی فرمائش کے بموجب مہمان خانۂ حضرت شیخ سے کھانا تیار ہوتا تھا۔

اور اس تمام تنعم و خوش خوراکی کے باوجود "سالکان بمقامات بلند و کراماتِ ارجمند مے رسیدند۔"[3]

ایک مرتبہ کسی صاحب نے غذا میں کمی کرنی شروع کی۔ حضرت شیخ کو معلوم ہوا تو فرمایا۔ اس طریقۂ عالیہ کی بنیاد کم خوری پر نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے پابندیٔ شریعت، اتباعِ

---

[1] منشا یہ ہے کہ جو حضرات واقعی اہلِ دل اور دردمند ہیں، اُن کے لئے سماع مہلک ہے۔ لہٰذا خودکشی کے مرادف ہوا، جو کہ حرام ہے۔ اور جو لوگ اہل دل نہیں، اُن کے لئے لہو ولعب اور تماشہ ہے لہو ولعب اور بالخصوص مذہب کے پیرایہ میں نہ صرف حرام بلکہ مذہب کے حق میں سخت ترین توہین ہے معاذاللہ۔ [2] اہلِ دنیا کی صحبت سے حد درجہ احتراز کرتے۔ یہاں تک کہ دولت مندوں کے ساتھ (ایک دسترخوان پر) کھانا نہ کھاتے تھے۔ [3] خزینۃ الاصفیاء ص۶۴۲ جلد اوّل۔

سُنّت اور دوام وقوفِ قلبی (یعنی ہر وقت قلبی طور پر یادِ خدا اور اس کی عظمتؔ و جلال کے تصوّر) پر اس طریقہ کی بُنیاد قائم فرمائی ہے۔

گرسنگی اور چلّہ کشی وغیرہ مجاہدات کا ثمرہ، خرقِ عادات اور کشف و تصرفات ہیں۔ ہمیں یہ چیز مطلوب نہیں۔ دوام ذکر، دوام توجہ الی اللہ، اتباعِ سُنّت اور کثرتِ انوار و برکاتِ خداوندی ہمیں مطلوب ہیں۔[1]

بڑے بھائی مولانا حجۃ اللہ صاحب نقشبند حج کو تشریف لے جانے لگے۔ آپ نے حضرت شیخ سیف الدین صاحب سے فرمایا:

زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ میرے بچّوں پر نظرِ عنایت رکھنا۔ حضرت سیف نے فرمایا۔ غالباً آپ ہی کو یہ خدمت انجام دینی پڑے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی ابھی حضرت حجۃ اللہ سفر سے واپس نہ ہوئے تھے کہ حضرت سیف کی وفات ہوگئی۔

آپ کا معمول تھا کہ ظہر اور عصر کے درمیان مستورات کو احادیث سُنایا کرتے تھے۔ ایک روز وقت سے پہلے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مستورات نے عرض کیا۔ ابھی وقت باقی ہے۔ فرمایا اب محمد اعظم سے سُننا (بڑے صاحبزادے) ایسا ہی ہوا کہ حضرت سیف علیل ہوگئے، اور ۲۶ جمادی الاوّل ۱۰۹۶ھ (ایک ہزار چھیانوے) میں بعمر ۴۷ سال اس دارِ فانی سے رختِ سفر باندھ لیا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ محمد صدیق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند ششم و خلیفہ حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز۔

ولادتِ مسعود ۱۰۵۹ھ (ایک ہزار اُنسٹھ) بمقام سرہند شریف۔

دوسرے بھائیوں کی طرح حفظِ قرآن شریف کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر میں علومِ ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہوگئے۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۷ جلد اوّل۔

گیارہ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے "رویا رصادقہ" میں مشرف ہوئے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے "ولایتِ احمدی" کی بشارت دی۔

والد ماجد کی حسنِ تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ابھی عمرِ مبارک صرف ۱۸ سال تھی، کہ یہ بشارت صادق ہوگئی۔

بیس ۲۰ سال کی عمر میں جب کہ آپ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے، والد ماجد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ نے تمام عمر خلفِ ہونہار کی طرح باپ اور دادا کے نصب العین کی تکمیل میں صرف کر دی۔

آپ حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً) کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ایک عرصہ تک ان مقدس شہروں کی خاک پاک کو طوطیائے چشم بناتے رہے اور اہلِ حرمین کو اپنا گرویدہ بنا کر فیضانِ طریقت میں سرگرم رہے۔ پھر واپس تشریف لائے۔ اور خدمتِ اصلاح و ارشاد میں مشغول ہوگئے۔ فرخ سیر نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ زمرۂ مریدین میں داخل ہوا۔ مگر

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

۵۔ جمادی الثانیہ ۱۱۳۰ھ (گیارہ سو تیس ہجری) تاریخ رحلت ہے سرہند شریف جائے دفن۔

حضرت خواجہ کلاں اور خواجہ خورد

خانوادۂ نقشبندیہ کے پیش رو حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے فرزندانِ ارجمند ہیں۔ خواجہ کلاں کا اسمِ گرامی عبید اللہ ہے۔ پیدائش یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ (ایک ہزار دس ہجری)۔

۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو یعنی صرف چار ماہ بعد حضرت خواجہ باقی باللہ کی دوسری زوجہ سے حضرت خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ نے رخت ہستی سے گذرگاہِ دنیا کو رونق بخشی۔

تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں نونہالوں کے سرپرست بارِ زندگی سے سبکدوش ہوئے

کا ارادہ کرنے لگے۔ چنانچہ خلیفۂ اعظم حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے فرمایا:

اُمید حیات کم ماند، از احوال اطفال خبردار باید بود۔

پنجم جمادی الاُخری ۱۰۱۲ھ (ایک ہزار بارہ) کو سلسلۂ نقشبندیہ کے اس شجرِ طوبےٰ نے اپنی جگہ دوسروں کے حوالہ کی۔ دونوں بچے مجدد الف ثانی کی تربیت میں آئے جن کو وُہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ کے حکم سے اُن کی زندگی ہی میں توجہ دے چکے تھے۔ سنِ تمیز کو پہنچ کر دونوں صاحبزادوں نے فضائلِ صوری و معنوی کی دوات حاصل کی۔ خواجہ کلاں نے تذکرۂ مشائخ تالیف فرمایا۔ جس میں تقریباً ایک لاکھ بیت تھے۔ اور پھر ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۴ھ (ایک ہزار چوہتر) کو بارِ تکلیف سے سُبک بار ہو گئے۔

حضرت خواجہ خورد، صورت و سیرت میں پدرِ بزرگوار سے پوری مشابہت رکھتے تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ پوری مستعدی سے عُلوم نقلی و عقلی حاصل کئے۔ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ حضرت مجدد صاحب کے آغوشِ عطوفت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ چند کتابوں کے حواشی مرتّب فرمائے، اور پھر بڑے بھائی سے تقریباً ایک سال بعد والد صاحب کی وفات کی تاریخ یعنی پنجم جمادی الاُخریٰ ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار پچھتر ہجری) کو جامِ فنا نوش جاں فرمایا۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ز جامِ دہر مۓ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ خورد نے آخر عمر میں مجھ سے فرمایا تھا کہ رشتۂ فرزندی کا لحاظ کر کے مجھے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کی برابر نہ دفن کیا جائے بلکہ اُس جگہ دفن کیا جائے جہاں جوتے نکالے جاتے ہیں، مَیں اسی جگہ کے لائق ہوں۔

مَیں نے عرض کیا کہ دفن کرنے کے متعلق مجھے کیا اختیار۔ یہ کام آپ کے وارثوں کا ہو گا۔ فرمایا تم کہہ دینا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں "گفتم کہ وصیتِ خواجہ ایں ست، گوش نہ کردند۔"[1]

---

[1] انفاس العارفین ص۱۹

تحریکِ مہدویت

سیّد محمد مہدی جونپوری۔ شیخ عبداللہ نیازی۔ شیخ علائی
رحمہُمُ اللہُ تعالےٰ

مجدّد الف ثانی اور آپ کے خلفاء نے جن اُبھرے ہوئے فتنوں کو دبایا جن خرابیوں کی اصلاح کی اور دین وملّت کی جس پژمردگی کو شادابی سے بدلا، اُن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

لیکن اسی موسمِ خزاں کی ایک بادِ سموم وہ بھی تھی جس کو تحریک مہدویت یا فتنۂ مہدویت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابتدا ء میں یہ تحریک ممکن ہے گلشنِ اسلام کی بادِ نسیم بھی ہو، مگر دسویں صدی کے وسط میں اہلِ زمانہ کی مسموم طبائع، اور زمانہ کی زہریلی فضا نے یقیناً اس کو بادِ سموم بنا دیا تھا۔ حضرت مجدّد صاحب کی عمومی دعوت "اتّباعِ سُنّت" اور "تمسک بظاہر الشریعت" میں اگرچہ تمام ہی فتنوں کی اصلاح آجاتی ہے "کُلّ الصید فی جوف الفرا" مگر خصوصی طور پر اس تحریک کی مخالفت کے لئے اس اولوالعزم مجدّد کی ہمّت عالی بظاہر متوجہ نہیں ہوئی، اور اس کا سبب بظاہر یہ بھی تھا کہ خود اکبر اور اس کے اعوان و انصار اس تحریک کے مخالف تھے۔

بساطِ سیاست کا صرف ایک مہرہ "خان خاناں" کچھ دنوں کے لئے اس تحریک کے الجھاؤ میں پھنس گیا تھا۔ اُسی کو حضرت مجدّد صاحب نے نکال لیا۔ لہٰذا حضرت مجدّد صاحب کے سوانح اور حالات بیان کرتے ہوئے اس تحریک کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اجمالی اشارات کے بغیر دورِ مجدّدی کو ختم کر دینا بھی یقیناً ایک کوتاہی ہوگا، جس کو عمداً گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں دورِ مجدّدی کے سلسلہ میں جب کہ شیخ علی متقی اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا ذکر ان اوراق میں بیان کیا جائے گا۔ تو ضروری ہے کہ ان کے مدِمقابل فرقہ مہدویہ کے بانی اور شیوخ کا بھی کچھ تذکرہ آجائے۔

اس تحریک کو بیان کرنے کے لئے ہمیں حضرت مجدد کے زمانۂ پیدائش سے بھی ایک سو برس پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ مگر اس کو نظر انداز کر دینے میں جو کوتاہی ہوگی، اس کی تلافی کیلئے اس رجعتِ قہقری میں خرابی نہیں معلوم ہوتی۔

بانیٔ مہدویت | یہ عجیب بات ہے کہ تحریکِ مہدویت کا جس کو بانی کہا جاتا ہے بقول محققین وہ اس تحریک کا ذمہ دار نہ تھا۔

سید محمد جونپوری کو مہدی کہا گیا۔ اُن کے نام پر ایک فرقہ پیدا ہوا، اور پھر اُس نے وہ عقائد اور خیالات پیش کئے، جن کو علماء ملّت نے متفقہ طور پر غلط قرار دیا۔

سید محمد کے متعلق ابوالفضل کی تحریر ہے:

پور سید ادیبی ست۔ از فراوان روحانیت فیض گرفتہ۔ و بر صوری و معنوی علم چیرہ دست از شورمدگی دعوئے مہدویت کرد و بسیارے مردم برو گرویدند۔ بسا خوارق ازو برگذارند، و سرچشمۂ مہدویت او، از جونپور بگجرات شد و سلطان محمود کلاں بہ بنائش برخاست، واز تنگ چشمی زمانیاں بہندنیارست۔ بود و باش ایران نمود، و در فرہ درگذشتت، و ہمانجا آسود۔ (ص ۱۷۲ آئین اکبری جلد سوم)

دورِ حاضر کے علامہ فرید اور محقق وحید، مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں فرماتے ہیں:

سید محمد جونپور کے رہنے والے تھے، ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔

ان کے اشد شدید مخالف بھی معترف ہیں کہ علومِ رسمیہ کے ساتھ زہد و درویشی اور ورع و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

شیخ علی متقی (جو سیّد کے معاصر اور سخت مخالف ہیں اور ان کے رد میں رسالہ لکھا ہے) تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشف اور استغراق و انہماکِ باطنی میں گذرا۔ سات سال تک یہ حال رہا کہ پے درپے روزہ رکھتے، اور تن تنہا ایک گوشہ میں پڑے رہتے۔ اسی اثنار میں ان پہ ایک سانحہ وارد ہوا، اور معلوم ہوا ـــ کہ "انت المھدی" کی صدا آ رہی ہے۔ برسوں تک مُتأمّل رہے اور جب پے درپے یہی معاملہ پیش آیا تو اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا۔ نویں صدی کا وہ زمانہ جو اکبر سے پہلے گذرا ہندوستان میں سخت بدامنی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ روز بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، اور کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی جو احکامِ شرع کے قیام و اجرار کی ذمہ دار ہوتی۔ علمار حقانی بہت کم اور علمار دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دُنیا طلبی اور مکر و زور کی گرم بازاری تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔

یہ حال دیکھ کر سیّد موصوف نے احیار شریعت اور قیامِ امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا کہ اب نہ کسی مجاہدہ کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔

سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ۔ اور احکامِ شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لڑا دو۔

عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطینِ وقت نے ان سے بیعت کی۔

ان لوگوں کے طور و طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے، اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائصِ ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشقِ الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی اُلفتوں کو ایمان کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ کر راہِ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر، فقیر، اعلیٰ، ادنیٰ

سب ایک ہی حال میں بستے، اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی سے کام نہ رکھتے تھے۔

ایک حکم یہ تھا کہ پہلی منزل ہجرت کی ہے۔ جو اس راہ میں قدم رکھے، سب سے پہلے چاہیئے کہ قیدِ وطن سے آزاد ہو اور گھر بار چھوڑ کر اپنے برادرانِ وطن کا ساتھی بن جائے۔

دوسری منزل ترکِ مال کی ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ پس، مال کسی ایک فردِ واحد کا نہیں ہو سکتا، جس کے پاس جو کچھ ہو، اپنے رفیقانِ طریقت میں بانٹ دے۔

تیسری منزل ترکِ جان کی ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ پس ہر وقت راہِ حق میں سربکف رہو، اور اعداءِ شریعت و حق، اگر فرقان و میزان سے نہ جھکیں تو قوّتِ حدید سے کام لو۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ جتنی باتیں تھیں حق تھیں۔ آگے چل کر نادان معتقدوں نے اُن کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

ترکِ جاں و ترکِ مال و ترکِ سر در طریقِ عشق اوّل منزل ست

یہ تمام حالات ان موافقین و مخالفین سب نے لکھے ہیں۔ مثلاً مخالفین میں شیخ علی متّقی، شیخ ابنِ حجر مکّی، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی اور شیخ اسعد مکّی وغیرہم۔

اور موافقین میں خود اُن کے معتقدین مثلاً اخوند میر، شیخ دلاور، شہاب الدّین، میاں قاسم، اور صاحبِ شواہد و مطلع الولایۃ وغیرہم۔

لیکن معتقدین نے ان امور پر قوانینِ شرع کا رنگ چڑھا دیا۔ مثلاً سیّد محمد نے تکمیلِ انقطاع و ایثار و محبّت کے لئے مال تقسیم کر دینے کا حکم تھا۔

معتقدین نے اس کو یہاں تک بڑھا دیا کہ جب مال پر سب کا حق ہے تو پھر ورثہ اور ترکہ کیسا۔ عزیز و اقارب کو بھی کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ اور پھر اس کو قانونِ توریث کے مقابلہ

میں ایک قانونِ شرعی سمجھا۔ مخالفین نے اس کا ردّ کیا کہ یہ شریعت سے انحراف ہے۔ اور حکمِ توریث کو کہ نصِ قطعی سے ثابت ہے باطل کرتا ہے۔ اور پھر تکفیر و تضلیل کے لئے اس کو حجّت ٹھہرایا۔ اس طرح موافق اور مخالف دونوں اصلیّت سے دُور جا پڑے۔ (تذکرہ ص۲۶ تا ص۲۹ جلد ۱) الغرض اس قسم کے مسائل میں ردّ و قدح یہاں تک بڑھی، کہ علماء سُوء اور مشائخ دنیا پرست کا تو کہنا ہی کیا، جو لوگ صداقت پسند تھے، ان میں سے بھی بعض غلط فہمیوں میں مُبتلا ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی۔ پہلے تضلیل و تکفیر کا سلسلہ چلا، پھر قتل و سلب تک نوبت پہنچی۔

مخالفت کا بڑا سبب یہ ہُوا کہ یہ لوگ اعلانِ حق میں بڑے ہی بیباک اور سخت تھے، اور سب سے زیادہ علماء دنیا کو اُن کی ہوا پرستیوں اور غفلتوں پر سرزنش کرتے تھے۔ جب مخالفت کا بہت زور ہُوا تو سیّد محمد صاحب گجرات چلے گئے۔ سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا۔ لیکن علماء نے وہاں بھی مخالفت کی مجبوراً حجاز و عرب کا رُخ کیا۔ وہاں سے ایران گئے۔ سلطان اسمٰعیل صفوی کا زمانہ تھا۔ اُس نے ہجوم خلائق دیکھا تو نکل جانے کا حکم دیا۔ ہندوستان کی طرف دوبارہ آ رہے تھے کہ فراہ میں انتقال ہو گیا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی ۹۱۱ھ (نو سو گیارہ) کے واقعات میں لکھتے ہیں:

> دریں سال میر سیّد محمد جونپوری قدس اللہ سرہ اعاظم اولیاء کبار کہ دعوائے مہدویت از سر بر زدہ بود۔ ہنگامِ مراجعت از مکہ معظمہ بہ ہند در بلدہ فراہ داعیِ اجل لبّیک فرمود۔ قاضی حسین زرگر قندھاری کہ فقیر او را دادِ میر را ملازمت کردہ بود۔ ایں تاریخ یافتہ:
>
> گفتا کہ برد ——— زشیخ کن استفسار

سیّد صاحب موصوف کے متعلق مُلّا عبدالقادر جیسے نقّاد کے الفاظ یہ ہیں، اور لُطف یہ ہے کہ مُلّا صاحب کے ہم عصر مولانا عبدالحق صاحب محدّث تحریر فرماتے ہیں:

> در اعتقاد سیّد محمد جونپوری بر کمالیکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم داشت و رسید سیّد محمد را نیز بود - فرق ہمیں ست کہ آنجا باصالت بود، و ایں جا بہ تبعیت - و بہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد (تذکرہ ص ۳۰) -

مصنف "تذکرہ" تحریر فرماتے ہیں :

لیکن شیخ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ سید صاحب موصوف نے یہ باتیں خود کہیں یا اُن کے مریدین کا استنباط اور پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے - خود سید موصوف نے کوئی کتاب نہیں لکھی - "اُم العقائد" جو اُن کی جانب منسوب ہے وہ بھی اُن کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے - صاحب "ہدیہ مہدویہ" نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں اور ان میں بلاشبہ اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں - لیکن قطع نظر وسعتِ میدانِ تاویل کے ان کا انتساب خود سید محمد کی جانب مشکوک و محل نظر ہے (تذکرہ ص ۳۰) -

بر تقدیر صحت انتساب مولانا ابوالکلام آزاد ان کلمات کو حالت سُکر و جذب کے شطحیات پر محمول کرنے کی سفارش کرتے ہیں -

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم — جنید و شبلی و عطار ہم مست

لالہ ساغر گیر و نرگس مست بر ما نام فسق

داوری خواہم مگر یا رب کرا داور کنم؟

مولانا آزاد نے بطور فیصلہ بڑی اچھی بات فرمائی ہے -

بڑی دقّت ان لوگوں کو معانی کی فراوانی و وسعت اور الفاظ کی تنگنائی و نامساعدت سے پیش آتی ہے - ناچار ہنگامِ تعبیر و بیان جو الفاظ سامنے آجاتے ہیں، انہیں سے کام لینا پڑتا ہے - نافہموں کے لئے وہ الفاظ فتنہ بن جاتے ہیں - مقلدین اور معتقدین اُن کو حجت گردانتے ہیں، اور منکرین و متعصبین آلہ انکار و تکفیر - لیکن اربابِ حق و اقتصاد یا تو اُن کی تاویل کرتے ہیں یا ان کے معاملہ کو عالم السرائر کے حوالہ کر دیتے ہیں - البتہ عمل و اعتقاد ہر حال میں احکامِ شریعت و ظواہر نصوص کتاب و سنّت پر ہے - اور ان کے سوا کوئی نہیں جو

معیارِ حق و باطل اور حجۃ و برہان ہو (تذکرہ ص۳۳)

چنانچہ اکثر اہل اللہ اور علماء حق کی نسبت منقول ہے کہ سیّد محمد جونپوری اور ان کی جماعت سے حسنِ ظن رکھتے تھے، یا اَقلاً ان کے بارے میں توقف اور سکوت کو کام میں لاتے تھے۔

حضرت شیخ داؤد جہنی وال اور مولانا جمال الدین کی رائے چند صفحات کے بعد ملاحظہ سے گذرے گی۔[1] شیخ وجیہ الدین گجراتی جو اس وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور جن کا ترجمہ اخبار الاخیار اور مآثر الکرام میں موجود ہے، اُن کے سامنے جب سیّد موصوف اور ان کے بعض اتباع[2] کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا، تو دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جو جماعت دُنیا کو چھوڑ کر وقفِ حق پرستی ہے۔ میرا قلم اُس کی مخالفت میں نہیں اُٹھ سکتا۔ شیخ علی متقی نے اگرچہ فرقہ مہدویہ کے غلو اور محدثات کی ردّ میں رسالہ لکھا، لیکن خود سیّد صاحب موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کف لسان اولیٰ ہے۔

شیخ بڈھا دانا پوری کہ اس عہد کے استاذ الاساتذہ تھے، اور سیّد رفیع الدین محدّث کہ بہ یک واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے، شیخ عبدالقادر بدایونی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "با مہدویہ حسنِ ظن داشتند"۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا قول شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سیّد محمد "عالمِ حق" اور "واصل باللہ" تھے۔ بعض خواطر اور واردات اُن پر ایسے گذرے کہ اُن کے درک و فہم میں درماندہ و عاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ انہوں نے دانستہ غلط دعویٰ کیا ہو۔

حضرت مجدد صاحب اور مرزا مظہر جانجاناں سے بھی ایسا ہی منقول ہے (تذکرہ ص۴۰ جلد ۱)۔

---

[1] چند صفحات بعد اس کتاب میں بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ [2] یعنی وہ حضرات جو سیّد صاحب کی شطحیات کو جزوِ دین نہیں تسلیم کرتے تھے۔ البتہ جو لوگ خلافِ شرع اُمور اور کلمات کو جزوِ دین بنالیں اُن کے زندقہ اور کفر و الحاد میں کس کو تامّل ہو سکتا ہے۔

صاحبِ تذکرہ فرماتے ہیں :

میرا خیال یہ ہے کہ سیّد محمدؒ اپنے اس دعوے میں سچّے تھے کہ مَیں مہدی ہوں ، اور ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی وہ یقیناً ایک مہدی ہی کے ظہور ہی کی مقتضی اور منتظر تھی۔ نہ کہ ایک مضلّ اور دجّال کی۔ البتہ غلطی یہ ہوئی کہ لفظ مہدی کو انہوں نے مہدی آخر الزماں سمجھ لیا۔ کیونکہ شہرت و انتظار عام طور پر اسی مہدی کی نسبت ہے، اور جب لفظ مہدی بولا جاتا ہے تو سب سے پہلے ذہن اسی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ رائے بھی اس صورت میں ہے جب کہ خود اُن کی نسبت مہدی آخر الزماں ہونے کا مدعی ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ اُن کے قلب پر جو وارد گذرا ہو، وہ صرف یہ ہو کہ "انت المهدی" یعنی تُو ہدایت یافتہ ہے۔ اور اسی کا انہوں نے اظہار کیا ہو اور معتقدین نے شہرتِ عام کی بنا پر مہدی آخر الزماں سمجھ کر تمام علامات و آثار مرویّہ کو اُن پر چسپاں کرنا شروع کر دیا ہو۔ (تذکرہ۔ حاشیہ ص۴۰ و ۴۱)۔

خاکسار کاتب الحروف کے خیال میں یہ دعوے زلّۃ اور لغزش سے کسی حال میں بھی خالی نہیں۔ لغوی معنی کا لحاظ کیا جائے تو سیّد محمدؒ ہی کی کیا تخصیص ہے، ہر ایک کفر و جہل گمراہی اور ضلالت کے مقابلہ میں مسلمان کا قلبی اذعان و یقین اور رُوحانی اطمینان و سکون یہی ہونا چاہیئے کہ انا المهدی "مَیں ہی ہوں ہدایت یافتہ"۔

اور صرف ایک آواز غیبی نہیں، بلکہ ربّ العالمین اور معبود برحق کی مخلوقات کے ہر ایک ذرہ کی یہی آواز اس کے گوشِ دل میں پڑنی چاہیئے کہ "انت المهدی" اور بلاشبہ اگر اس کا دامنِ عقیدت ایمان بالغیب کی دولت سے پُر ہے، اقامۃ الصلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے عملی گلدستوں سے وہ آراستہ ہے، انبیاء سابقین اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی پیش فرمودہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے تو کلامِ الٰہی کی سب سے بڑی سورت کی سب سے پہلی آیت اس کے ہدایت یافتہ اور مفلح و کامیاب ہونے کی بشارت دے رہی ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

لیکن کیا اس کو یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ اہلِ اسلام کے سامنے اپنی مہدویت کا اعلان کرتے ہوئے اُن کو اس کے تسلیم کرنے کی دعوت دے۔

لفظ مہدی، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک خاص اصطلاح یا خاص لقب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

وہی حدیث جو مہدی کے متعلق پیشین گوئی ہے، خاص خاص علامتوں کو بیان کر کے اُس کی تشخیص اور تعیین کرتی ہے۔ مثلاً عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کی شدید جنگ ہوگی۔ قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا ہوگا۔ یہ مہدی خزائن اور دفائنِ کعبہ کو تقسیم کرے گا۔ کامیاب جہاد کا علمبردار ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب کوئی سید یا شیخ ان تمام علامتوں کو نظر انداز کر کے اس پیشین گوئی کے صرف لفظ مہدی کو منتخب کرے تو کیا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ والی مثال اس پر چسپاں نہ ہوگی؟

اور کیا کسی متبع سُنّت کی ہمت ہو سکتی ہے کہ فرامینِ نبوّت (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام) کے مقابلہ پر اس قسم کی جرأت کرے۔

اور اگر وہ کسی غیبی بشارت کی بنا پر بھی ایسی بات کہہ رہا ہے تو مسلمانوں کو اور خود اُس کو فیصلہ کرنا ہے کہ اُس کی بشارت کا اعتبار ہوگا یا صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش فرمودہ بشارت کا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۔

وغیرہ جیسی ازلی اور ابدی تصدیقات، اس تہی دامان وحی والہام کے پاس ہیں، یا رب العالمین کے اُس کامل و مکمّل بندے کے پاس جس کو شاہد و مبشّر بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔

بحث کی جاتی ہے کہ لغوی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے کسی لفظ کے اطلاق میں کیا خرابی ہے؟

لیکن جب ایک رکیک ترین، اور تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور نظامِ حکومت

میں جس میں بہتر سے بہتر خدمت اور زیادہ سے زیادہ جاں نثاری اور جاں سپاری کے معاوضہ میں چند الفاظ دیدیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ہز ہائی نس، ہز ایکسیلینسی، نائٹ، سر، وغیرہ تو یہ جائز نہیں ہوتا کہ الفاظ کو ہر شخص استعمال کرنے لگے، اور بلاشبہ بہت بڑی مکّاری، عیاری، بغاوت اور جعل سازی ہوگی کہ بارگاہِ شہنشاہیت کا راندہ اور خارج شدہ یا وہ گمنام حقیر اور فقیر بے نوا جو بارگاہِ شہنشاہی کا رُخ بھی نہ کر سکتا ہو، اپنے متعلق "ہز ایکسیلینسی" کا دعویٰ کر کے عام باشندگانِ مُلک سے اسی اعزاز و توقیر، اسی اطاعت اور فرماں برداری کا خواہاں ہو، جو کسی ہز ایکسیلینسی کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ تو اب آپ غور فرمایئے کہ اُس شخص کی چال بازی، مکّاری اور دغا بازی کس درجہ مستحقِ لعنت ہوگی جو اُس مقدس، محکم، ازلی اور ابدی نظام کے کسی خطاب[1] کو جس کے ساتھ دنیاوی اور اُخروی عظمتیں اور سعادتیں پیوست ہیں اور جس کے ہر ایک شوشہ کے ساتھ غیر فانی نعمتوں کے غیر منقطع سلسلے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، خود سے اپنے لئے اختیار کرے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ (قرآن حکیم)

بلاشبہ یہ جعل، یہ تصنّع، یہ اختراع اُس اعلیٰ اور اقدس نظام کے حق میں انتہائی دیدہ دلیری، انتہائی گستاخی اور غیر قابلِ عفو جسارت ہے۔

یہی سبب ہے کہ احادیثِ نبویہ میں ہر ایسے شخص کو دجّال یعنی جعلساز اور سازشی قرار دیا گیا، جو اپنے لئے لفظ نبی کا اطلاق کرے۔ اگرچہ معنی کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں بھی گنجائش نکل سکتی تھی۔

لفظ مہدی اگرچہ لفظ نبی کے لحاظ سے بہت ادنیٰ ہے۔ لفظ نبی کا اطلاق کفر اور اسلام کا معیار بن جاتا ہے۔ کیونکہ بلا تفریق و تقسیم ہر ایک برحق نبی پر ایمان واجب ہے۔

---

[1] باری تعالیٰ عزّ اسمہ کے مخصوص اسماء مثلاً رحمٰن، صمد، عالم الغیب وغیرہ کی بھی یہی شان ہے اور یہی سبب ہے کہ علماء اور فقہاء شریعت نے کسی انسان کے لئے ان الفاظ کا اطلاق ناجائز حرام اور بعض صورتوں میں کفر قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں عفی عنہ

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ط اور لفظ مہدی یہ معیاری حیثیت یقیناً نہیں رکھتا۔ مگر تاہم غیر مستحق اور غیر جائز ادعا کا ارتکاب ہے۔

حضرت مجدد صاحب کا وسیع اور فصیح ظرف اس لحاظ سے بھی قابلِ صد ستائش و مستحق ہزار تحسین ہے کہ ہر ایک کارخانۂ عجیب و غریب کے مشاہدہ و ملاحظہ کے باوجود آپ کا پائے استقامت اس حد سے آگے نہیں بڑھا جو سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بشارتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام نے قائم فرمادی تھی۔

شیخ عبداللہ نیازی اور شیخ علائی اس جملہ معترضہ کے بعد ہم پھر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سید محمد جونپوری کے انتقال کے بعد اُن کی جماعت اور زیادہ پھلی پھُولی، اور بڑے بڑے اہل اللہ اس میں داخل ہوئے۔ ازانجملہ شیخ عبداللہ نیازی اور اُن کے مُرید شیخ علائی رحمہما اللہ تھے، جنھوں نے بیانہ میں قیام کیا، اور اپنے علمِ حق اور اخلاص و ایثار کی تاثیر سے سینکڑوں جانبازوں اور حق پرستوں کو معتقد و مرید بنالیا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ اور نجات الرشید میں اور نظام الدین ہروی نے طبقات میں ان لوگوں کے مفصّل حالات لکھے ہیں۔ مگر زیادہ تفصیل تذکرہ الواصلین میں بضمن حالات حضرت شیخ داؤد ملتی ہے۔

شیخ عبداللہ نیازی اُس زمانہ کے ایک مشہور پیر طریقت اور شیخ سلیم چشتی کے سربرآوردہ خلفاء میں سے تھے۔ لیکن بعد کو مہدوی ہوگئے اور مشیخت و زہد فروشی کا تمام کاروبار تاراج کرکے درویشی و نامرادی کی وضع اختیار کرلی۔

در خرمنِ صد زاہد و عاقل زند آتش
آں داغ کہ ما بر دل دیوانہ نہادیم

بیانہ میں شہر سے باہر ایک ویران باغ تھا۔ وہیں مٹی کا جھونپڑا بنا لیا اور مقیم

لہ تذکرہ ص۴۲ تا ۴۹ و ص۵۳ تا ۵۶ بحذف و اختصار۔

ہو گئے۔ اپنے ہاتھ سے پانی بھرتے۔ مٹکے سر پہ اٹھا کرلے جاتے۔ پیاسوں کو پانی پلاتے اور نمازیوں کو وضو کرا دیتے۔ بوڑھے آدمیوں کو دیکھتے کہ بھاری بوجھ اُٹھائے جا رہے ہیں تو اُن سے چھین کر خود اُٹھا لیتے اور کوسوں دوڑتے ہوئے ساتھ چلے جاتے۔

یا سُبک رُوحانی کن آمیزش کہ ماندی چوں تو راہ

بارِ غم بر دوشِ دل منزل بمنزل مے برند

نماز کا وقت آتا تو لکڑہاروں اور سقّوں کو جمع کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ کسی پیشہ ور کو دیکھتے کہ عذرِ معاش سے نماز میں شریک نہیں ہوتا، تو اپنی کمائی اس کو دے دیتے، اور منّت و زاری کے ساتھ کہتے کہ جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھو۔ وہ پڑھ لیتا تو ایسے خوش ہوتے گویا دنیا جہان کی بادشاہت اُس نے دے دی۔

روز بروز یہ حالت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ عشقِ خالق اور خدمتِ خلق کے سوا اور کسی سے واسطہ نہیں رہا۔

دو عالم از اثرِ شعلۂ جمالش سوخت

بجز متاعِ محبّت کہ در پناہِ من ست

اسی زمانے میں اطرافِ بہار کے ایک عالی خاندان پیرزادے شیخ علائی تھے کہ علم و فضلِ ظاہری کے ساتھ مشیخت، و طریقت کی شہرت و شوکت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور یکتائی کے دعوے اور بے ہمتائی کے غرور میں ایسے مہیب تھے کہ علم و فضل کی بڑی بڑی سرکش گردنوں کو اُن کے سامنے بے اختیار جھک جانا پڑتا تھا۔ مدّتوں طرح طرح کی سخت ریاضتیں کی تھیں۔ عوام و خواص میں اُن کے مجاہدات کی دھوم تھی۔ بایں ہمہ نفس پرستی کا یہ حال تھا کہ فقیری کے سجادے پر فرعونیت کا تاج پہن کر بیٹھے تھے، اور جس عالم و صوفی کی طرف لوگوں کو ذرا بھی مائل پاتے تھے، فوراً اپنے مریدوں کی فوج لے کر چڑھ دوڑتے تھے۔ کبھی بحث و مناظرہ کے زور سے، کبھی سوء

اعتقاد کے الزام سے، کبھی اور کوئی حیلہ و بہانہ کرکے اس طرح ذلیل و رسوا کر دیتے کہ غریب شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔

ایک دنیادار فاسق اور دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ یہ اپنی ہوا پرستیوں کو اعترافِ فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے، اور دوسرا دین داری اور احتسابِ شرعی کی ظاہر فریبی سے۔

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم عاشقی ہم ننگ و عارے پردہ ست

شیخ علائی کا خاندان بھی عرصہ سے بیانہ میں مقیم تھا۔ قضارا ایک دن شیخ نیازی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کا طور طریق دیکھا تو اور ہی عالم نظر آیا۔ اور پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے۔ اپنے مریدوں سے کہا۔ خدا پرستی کی اصلی راہ یہ ہے۔ آج تک جو کچھ ہم کرتے رہے، وہ خدا پرستی کے نام سے نفس پروری اور بُت پرستی تھی۔ میں تو اس فقیرِ بے نوا کا ساتھ دیتا ہوں۔ جس کو اللہ کی طلب ہو میرا ساتھ دے۔

آں دل کہ رم نبودے از خُوبرو جواں

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

شیخ نیازی سے پوچھا کہ طالبِ حق کی راہ کیا ہے۔ کہا کہ اپنا سب کچھ لُٹا دو اور متاعِ عجز و شکستگی اور سرمایۂ نامرادی و خود فروشی کے سوا کچھ باقی نہ چھوڑو۔

دع نفسک ثم تعال ؂

عشقِ بستان و خویشتن فروش کہ ازیں خُوب تر تجارت نیست۔

اس کے بعد شیخ کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ آبا و اجداد کے سجادہ مشیخت و مسندِ علم کو مع اُن کے تمام ساز و سامان، غرور و پندار کے تاراج کرکے شیخ نیازی کے ساتھ ہو لئے۔ سامان و اسبابِ دُنیوی میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ یا تو دیرینیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے سامنے کسی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ یا اب خاکساری اور بینوائی کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں بھی عار نہ تھا۔

جن جن لوگوں سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک ایک کے پاس جاکر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں۔

رفتہ رفتہ سختی بکشان عشق کی ایک بڑی جماعت شریکِ حال ہو گئی۔ لوگ گھر بار لُٹاتے اور اُن کے ساتھ آآکر شریک ہو جاتے۔

یہ لوگ بیابہ سے باہر اسی ویران باغ میں رہتے تھے۔ زن و فرزند، خویش و بیگانہ، خانہ و وطن کسی چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ کچھ لوگ دن کو نکل جاتے۔ محنت مزدوری کرتے۔ جو کچھ ملتا، اس میں سے دسواں حصہ راہِ خدا میں صرف کر دیتے۔ باقی لے کر شام کو آتے۔ ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مِل جُل کر کھا لیتے اور اپنے عشق میں مست رہتے۔ کچھ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کی راہ لیتے۔ بیماروں کی تیمار داری کرتے۔ کمزوروں اور معذوروں کی روٹی پکا دیتے۔ بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لا دیتے۔ دو شخصوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے تو منّتیں کر کے صلح صفائی کرا دیتے۔ نہ مانتے تو کہتے کہ ہم کو مار ڈالو مگر آپس میں میل ملاپ کر لو۔

استغناء اور قناعت کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن گذر جاتے اور کچھ میسّر نہ آتا، لیکن دِلوں کی بے فکری اور چہروں کی خوش حالی دیکھ کر گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر اُٹھے ہیں یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔

بھوک کا بہت غلبہ ہوتا تو نماز شروع کر دیتے۔ اور سلام پھیر کر اُٹھتے تو شہنشاہوں کی بے نیازی چہروں سے ٹپکتی۔

ساتھ ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ حال تھا کہ ہر فرد ہمیشہ مسلح رہتا، اور جب کبھی کسی فعل منکر کو دیکھتا تو فلیغیرہ بیدہ پر عمل کر کے حکماً روک دیتا۔

اس پر صبر و ثبات کا یہ حال تھا کہ ملامتیں سُنتے، گالیاں کھاتے، فاقے کرتے، زخمی ہوتے، مگر اپنے کام سے باز نہ آتے۔ وہ کہتے کہ گالیوں میں ہمیں وہ مزا ملتا ہے جو تم کو دعاؤں میں نہیں ملتا۔

ان کی جماعت کے ایک شخص کو سات مرتبہ جلا وطن کیا گیا۔ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا کہ ایک بار اور کر دیکھو۔

صبح و شام سب ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے اور شیخ علائی قرآن حکیم کی تفسیر بیان کرتے۔ دل کے عشق اور باطن کے سوز و گداز نے اُن کے بیان میں کچھ ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ زبان سے الفاظ تیر و نشتر بن کر نکلتے اور سننے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ کیسا ہی سیاہ باطن اور سنگ دل کیوں نہ ہوتا، لیکن اُن کی زبان سے ایک آیت قرآنی کا وعظ سُن کر ایسا خود رفتہ ہو جاتا کہ وہیں کھڑے کھڑے اپنا تمام گھر بار لٹا دیتا۔

مُلّا بدایونی لکھتے ہیں:

شیخ علائی را نفس گیرائی مؤثر چناں بود کہ در وقتِ تفسیرِ قرآن از و ہر کسے کہ مے شنید، اکثرے خود دست از کار و بارِ دنیوی باز داشتہ آں صحبت اختیار مے کردند و ترکِ خانماں و عیال و اطفال نمودہ و بر شدّتِ فقر و فاقہ صبر کردہ دیگر پیرامون کسب و کارِ خویش نمے گشتند۔ (جلد اوّل ص۳۹۷)۔

اسی کے قریب طبقاتِ اکبری میں ہے:

ہر روز در وقتِ نماز تفسیر قرآن مجید بنوعے مے گفت کہ ہر کس کہ در مجلسِ او حاضر مے بود اصلاً پئے کارِ خود نمے رفت و ترکِ اہل و عیال کردہ داخل دائرہ مہدویہ مے گشت، یا از معاصی تائب شدہ مریدے گردید و اگر گشت و زراعت یا تجارت میکرد، یک دہ صرفِ راہِ خدائے نمود (ص۲۳۷)۔

مُلّا بدایونی ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں کہ شیخ نیازی کی صحبت اختیار کرتے ہی فہم و تدبر قرآن کی ایک نئی راہ[1] اُن پر کُھل گئی تھی۔

---

[1] بالکل صحیح ہے۔ اب تک جس قدر پڑھتے پڑھاتے رہے تھے، بیضاوی اور بغوی کی ورق گردانی تھی یا غرورِ نفس کا بے ہودہ لاف و گزاف۔ اس سے قرآن کی حقیقت کب کُھل سکتی ہے۔ اس کیلئے تو جبرئیلِ عشق کے فیضان اور دلِ دردمند کے الہام کی ضرورت ہے۔ شیخ نیازی کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

معانی قرآن و نکات و دقائق و حقائقِ آں بآسانی برو مکشوف گشت۔

تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں خاندان اس گروہ میں داخل ہو گئے۔ تمام گجرات و مالوہ و دکن میں ہر طرف اسی جماعت کا غلغلہ تھا۔ دین داری و پرہیزگاری کا جوش اس طرح پھیلا کہ شہروں میں نماز کے وقت سناٹا چھا جاتا اور مسجدوں کے سوا کہیں آدمی نظر نہ پڑتا۔

مُلّا عبد القادر بدایونی نے بچپن میں شیخ علائی کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ حج کے ارادہ سے نکلے تو سات سو خاندان ساتھ تھے۔ میرے والد پشاور گئے اور وہاں شیخ کی زیارت کی۔ ایک ایسے گروہ کو بھلا علماءِ دُنیا اور فقہاء سو رکب چین سے بیٹھنے دے سکتے تھے۔ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا ہے مگر مصلحینِ اُمّت اور عشاقِ حق کے لئے امن و انصاف کہاں؟ ؎

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جُرمم ہمیں کہ عاشق روئے نوشتہ ایم

۹۵۶ھ (نو سو چھپن) میں جب سلیم شاہ آگرہ میں مسند نشین ہوا اور مخدوم الملک مُلّا عبد اللہ سلطان پوری (متوفی ۹۹۰ھ) کی شیخ الاسلامی کا دور دورہ ہوا، تو مُلّا موصوف نے اس جماعت کے قتل و اذیت پر کمر باندھی۔ عوام[1] کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں۔ اور سلیم شاہ کو یہ بات سوجھائی کہ جب سید محمد مہدی ہوئے، تو تمہاری حکومت کہاں باقی رہی۔ روایتوں میں آیا ہے کہ مہدی موعود تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔ یہ لوگ مہدی کے پیرو ہیں تو کم از کم ہندوستان پر تو قبضہ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہوں گے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) صحبت نے اسی بند دروازے کو کھول دیا۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں۔ ۱۲ منہ

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] وہی عوام جو آج بھی کسی کو اپنی مزعوماتِ باطلہ، رسوماتِ قبیحہ اور رواجاتِ مہلکہ کا مخالف پاتے ہیں تو وہ خود ہی یا اپنے جیسے کسی مولوی نما سے اس کے متعلق وہابیت وغیرہ کا فتوٰی صادر کرا دیتے ہیں۔ محمد میاں

مخدوم الملک ایں معنی با قبح وجوہ خاطر نشین سلیم شاہ نمودہ کہ ایں مرد دعوئے مہدویت مے کند، و مہدی بادشاہ تمام روئے زمین خواہد شد وتمام لشکر تو بایں گردیدہ است و احتمال خلل در ملک است (طبقاتِ اکبری ۲۳۸)

حالانکہ شیخ علائی اور نیازی خود مدعیِ مہدویت نہ تھے بلکہ سید محمد کو مہدی کہتے تھے اور اُن تمام روایات کی تاویل کرتے تھے جن میں مہدی کی بادشاہت وغیرہ کا ذکر ہے۔ بنیاد اُن کے عقیدہ کی یہ تھی کہ مہدی اور اس کی جماعت اپنے علم و فعل سے احیاء شریعت کرے گی۔ حکمرانی اُس کے لئے ضروری نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تاویل صحیح نہ تھی۔ روایاتِ مشہورہ کے الفاظ اور تصریحات احادیث اس کے بالکل مخالف ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس تاویل کے اعتقاد سے وہ جماعت خود ہی حکومت سے دست بردار ہوگئی تھی۔ پھر اُس کی نسبت یہ الزام کیسا صریح اتہام تھا۔ لیکن چونکہ بغیر سیاسی خطرہ کے سلیم شاہ برانگیختہ نہیں ہو سکتا تھا اسلئے مخدوم الملک وغیرہ نے اسی سُنّت قدیمہ علماء سوء کو اختیار کیا اور سلیم شاہ کہ ایک سادہ لوح افغان تھا فوراً آمادۂ مخالفت ہوگیا۔

منتخب التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم الملک نے شیخ کے واجب القتل ہونے کے مقدمات یوں ترتیب دیئے تھے۔

ایں مبتدع دعوئے مہدویت میکند۔ و مہدی خود بادشاہ روئے زمین خواہد شد و چوں سر خروج دارد، واجب القتل ست (جلد اوّل صفحہ ۴۰۰)۔

بعد کے حالات بہت طولانی ہیں۔ مختصر یہ کہ مخدوم الملک نے سلیم شاہ سے فرمان جاری کرا کے شیخ علائی کو آگرہ طلب کرایا۔ اور اکثر مشاہیر علماء عہد مثلاً سید رفیع الدین محدث، شیخ ابوالفتح تھانیسری بھی بحث و مباحثہ کے لئے طلب کئے گئے۔ شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو پھٹے پُرانے کپڑوں اور فقیرانہ و نامرادانہ وضع و صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال جماعت تھی۔ لیکن کبر و علوِ حق کا یہ حال تھا کہ صرف

سلام مسنون کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور تمام دربار پر اس حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی گویا مغرور انسانوں کی جگہ پتھروں کا ڈھیر ہے۔ یہ خود داری سلیم شاہ پر بہت گراں گذری۔ بحث شروع ہوئی تو سب سے پہلے شیخ علائی نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور اُن کی تفسیر کا وعظ شروع کر دیا کہ :

جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد

بدایونی لکھتے ہیں کہ وعظ کا مضمون زیادہ تر مذمّتِ دنیا، حالاتِ آخرت، اہانتِ علماء دُنیا اور فرائض اُمراء و سلاطین پر مشتمل تھا، اور کچھ ایسا پُر تاثیر اور درد انگیز طرز بیان تھا کہ ادھر شیخ کی زبان سے الفاظ نکل رہے تھے، اُدھر تمام مجمع کی سنگ دلی موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ خود سلیم شاہ اور اس کے اُمراء کا یہ حال ہؤا کہ باوجود کمال قساوت قلبی و حق فراموشی کے ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

سرشکِ گرم کی حدت کو پوچھو مرے دامن سے اپنی آستیں سے

یہ حال دیکھ کر سلیم شاہ کا خیال پلٹ گیا اور بے اختیار ہو کر شیخ کی نہایت تعظیم و تکریم بجا لایا۔ پوچھا کہ باوجود ان کمالات و فضائل کے کیا سبب ہے کہ لوگ تمہارے مخالف ہیں؟ بھلا شیخ علائی اس کا کیا جواب دیتے۔

دل را کہ تو مقیّد زندانِ حسرت ست
جُز عرضِ عشق ہیچ گناہے دِگر نبود

حکم دیا کہ شیخ کے لئے طعام خاصہ سے کھانا بھیجا جائے لیکن شیخ نے نہیں کھایا۔ اور فرمایا :

"طعامِ تو حقِ مسلمانان ست کہ بخلاف شرع زیادہ از حقِ خود متصرف شدہ"[1]

دوسرے دن مباحثہ ہؤا۔ تمام علماء دربار ایک طرف اور یہ درویشِ بے نوا

---

[1] تمہارا کھانا تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ تم اپنے واجبی حصّہ سے زیادہ خلافِ شرع اپنے تصرّف میں لا رہے ہو۔

ایک طرف تھا۔ لیکن جو شخص زبان کھولتا تھا، چند منٹوں میں ذلیل و رسوا ہو کر لاجواب ہو جاتا تھا۔ مخدوم الملک کو تو بات تک کرنے نہ دی۔ بار بار اس کو مخاطب کر کے کہتا۔ "تو از علماء دنیائی[1] و دزد دینی و مرتکب چندیں نامشروعائی بمشابہ کہ از دائرہ عدالت خارج افتادہ، ہنوز آواز سرود و ساز[2] از خانۂ تو علانیہ مے شنوند (منتخب التواریخ ج ۱ صفحہ ۴۰۹)

مباحثہ کا رنگ دیکھ کر سلیم شاہ کو یقین ہو گیا کہ تمام علماء بلاوجہ ایک درویش حق پرست کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تاہم مجبور تھا، رعایا انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اور معاملہ مذہبی تھا جس میں خود دخل دے نہیں سکتا تھا۔

ساتھ ہی روز خبریں اُڑنے لگیں کہ آج فلاں سردار، شیخ کا مرید ہو گیا۔ اور کل فلاں امیر نے اُن کا وعظ سُن کر گھر بار لُٹا دیا۔ آخر الامر سلیم شاہ نے صرف حکمِ جلاوطنی پر کفایت کی، اور شیخ کو دکن چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے اِنَّ ارض اللہ واسعۃٌ پڑھا اور دکن کی راہ لی۔

لیکن صرف اتنی ہی سزا سے علماء دنیا کی خون آشام پیاس کب بجھنے والی تھی؟ چند دنوں کے بعد موقع پا کر اُبھارا، اور طرح طرح کے اشتعال انگیز قصّے سُنا کر شیخ علائی کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ بڑا جرم شیخ علائی کا یہ تھا کہ جہاں جاتا ہے، ایک دُنیا اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ دکن کی طرف جلاوطن کر کے بھیجا تو وہاں بھی بہار خاں حاکمِ ہنڈیہ اور اطرافِ دکن کے ہزارہا آدمی معتقد و مرید ہو گئے۔ بالآخر شیخ علائی کو دوبارہ آگرہ طلب کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلیم شاہ نے علماء دار الحکومت خصوصاً مخدوم الملک کی خود غرضیوں اور حسد و عناد کو اس بارے میں محسوس کر لیا تھا، اور سمجھ چکا تھا کہ ان لوگوں کی رائے

---

[1] تو دنیا پرست عالم اور دین کا چور ہے۔ چند نامشروع اور ناجائز اُمور پر تیرا عمل ہے حتّٰی کہ دائرہ عدالت سے تو خارج ہو چکا (یعنی تو فاسق و فاجر ہے) اب تک گانے بجانے کی آواز علانیہ تیرے مکان سے سُنی جاتی ہے۔ [2] یہ رقص و سرود بھی جس کو چشتیت کی چادر اُوڑھائی جاتی تھی اس قسم کے سینکڑوں مظلوموں کے خونِ ناحق کا سبب بنا۔

بے لاگ نہیں ہے۔ اس لئے اس مرتبہ شیخ کو شیخ بڈھا[1] بہاری کے پاس بھجوایا کہ مشاہیر علماء وقت سے تھے اور لکھا کہ جو فیصلہ آپ کا ہو، اُسی پر عمل کیا جائے۔

بدایونی لکھتے ہیں کہ پہلے تو شیخ بڈھا نے ایک حق پرستانہ تحریر لکھی جس کا مضمون یہ تھا کہ مسندِ مہدویت موقوف علیہ ایمان و اسلام نہیں۔ تعیین علاماتِ مہدی میں مختلف روائتیں وارد اور سخت اختلاف واقع ہے۔ صرف اتنی سی بات پر ایک عالمِ حق کی تکفیر و تعزیر جائز نہیں۔ لیکن افسوس کہ بعد کو دنیا پرستی مانع آئی۔ اُن کے لڑکوں نے سمجھایا کہ آج کل مخدوم الملک کی شیخ الاسلامی ہے، اس کے خلاف رائے دینا ٹھیک نہیں۔ اگر اُس نے سلیم شاہ سے کہہ کر تم کو اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے آگرہ طلب کرایا، تو اس بڑھاپے میں بے کار سفر کی زحمت اُٹھاؤ گے۔ یہ بات شیخ بڈھا کے دل پر اثر کر گئی اور پہلی تحریر چاک کر کے دوسرا مراسلہ اس مضمون کا بھیج دیا:

"مخدوم الملک امروز از علماء محققین ست۔ سخن سخن او، و فتوٰے فتوٰے اوست"۔

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر   کہیں پرسش دادخواہاں نہیں

سلیم شاہ کے دل پر شیخ علائی کی حق پرستی کا زخم لگ چکا تھا مگر خود عالم نہ تھا

---

[1] شیخ بڈھا اُس زمانہ کے اکابر علماء میں تسلیم کئے جاتے تھے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ شیر شاہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ اور ارشاد قاضی پر ایک عمدہ شرح بھی آپ نے لکھی تھی۔ بایں ہمہ حال یہ تھا کہ جب شیخ علائی شاہی حراست میں اُن کے مکان پر پہنچے تو "از اندرونِ خانہ آوازِ سرود و ساز شنیدند و بعضے مکارہ طبعی و شرعی دیگر نیز کہ ذکر آں اسمجاتے صریح دارد، در مجلس او دیدند بے اختیار امر معروف و نہی مے کردند"۔ (تذکرہ ص۱۶) ۔مولانا ابوالکلام آزاد اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ کاش شیخ بڈھا علم نہ پڑھتے، ارشاد قاضی کی شرح نہ لکھتے، جنگل میں لکڑیاں کاٹتے اور سر پر اُٹھا کر بازاروں میں بیچتے مگر حق گوئی سے زبان نہ روکتے، تو ہزار درجہ اس مولویت و مشیخت اور شرح نویسی کی زندگی سے اللہ کے نزدیک محبوب و مقرب ہوتے سہ

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے   اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیئے

چاہتا تھا کہ اگر ایک عالمِ حق گو کا سہارا بھی مِل جائے تو شیخ کو علماء سوء کے پنجے سے چھڑا لے۔ لیکن افسوس کہ سب نفس و دُنیا کے پجاری نکلے۔

جب شیخ بڈھانے بھی مخدوم الملک کی تائید کی تو بالکل مجبور ہوگیا اور شیخ کا معاملہ مخدوم الملک کے حوالہ کر دیا۔ شیخ علائی اس وقت سخت بیمار تھے۔ گلے میں ایک بہت بڑا زخم تھا، اور بہار تک سفر کرنے کی زحمت نے نیم جاں کر دیا تھا۔ مخدوم الملک نے حکم دیا کہ کوڑے لگوائے جائیں۔ جلّاد نے تیسری ضرب لگائی تھی کہ اس شہیدِ حق کی رُوح پرواز کر گئی۔

فِی مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ۔ مُلّا عبد القادر بدایونی نے ذَاکِرِ اللہ اور سقاھم ربّھم شرابًا طھورًا سے تاریخ وفات نکالی، کہ ۹۵۷ھ (نو سو ستاون سال ہجری) ہے۔

بجرمِ عشق اگر کشتی مرا ممنون احسانم
گناہ زاہدِ بے درد یا رب چیست حیرانم

افسوس مرنے کے بعد بھی ظالموں کو تسکین نہ ہوئی اور اس فنا فی الحق کی نعش کے ساتھ وہ سُلوک کیا گیا جو بدر و اُحد کے مقتول کفّار کے ساتھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر نعش کو چِروایا گیا، اور اس کے ٹکڑوں کی تمام لشکر میں تشہیر کی۔ پھر حکم کیا کہ دفن نہ کیا جائے، اور اس غرض سے پہرہ بٹھا دیا گیا۔

شیخ عبداللہ نیازی کا سانحہ

یہ سرگذشت تو شیخ علائی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اُن کے پیر حضرت شیخ عبداللہ نیازی کا واقعہ بھی اس سے کم درد انگیز اور عبرت خیز نہیں۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ جب شیخ علائی دکن کی جانب جلا وطن کر دیئے گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد سلیم شاہ سرحدی افغانوں کی سازش کا حال سُن کر پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ جب بیانہ کے قریب شاہی لشکر پہنچا تو مخدوم الملک نے کہ پیوستہ و کمر بستہ خاصانِ حق کی اذیّت و ہلاکت کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے، موقع کو غنیمت

سمجھا اور سلیم شاہ سے کہا:

"از فتنۂ صغیر کہ عبارت از شیخ علائی باشد، خلاصی یافتیم اما فتنۂ عظیم هنوز برپاست۔"

سلیم شاہ نے پوچھا۔ وہ کون؟ کہا۔ شیخ عبداللہ نیازی کہ یہیں بیانہ میں مقیم ہے اور شیخ علائی کا پیر ہے۔

سلیم شاہ نے میاں بھرو لوحانی، حاکمِ بیانہ کو حکم بھیجا کہ فوراً شیخ کو حاضر لشکر کرو۔ میاں بھرو، شیخ کا مرید تھا۔ اُس نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ آپ یہاں سے راتوں رات نکل جائیں۔ مَیں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ لیکن شیخ نے کہا۔

"ارادۂ خداوندی در حال و استقبال و آنجا و اینجا مساوی ست، تاہر چہ مقدرست خواہد رسید"۔

مجبوراً شیخ کو ہمراہ لیا اور لشکر شاہی میں پہنچے۔ سلیم شاہ سوار کوچ کے لئے تیار کھڑا تھا۔ شیخ عبداللہ سامنے پہنچے تو بے باکانہ گردن اُٹھائے جا کھڑے ہوئے ــــ اور السلام علیکم کہا۔ میاں بھرو نے کہ کسی طرح سلیم شاہ کے غیض و غضب سے ان کو بچانا چاہتا تھا، گردن پکڑ کر جُھکا دی اور کہا۔ "بادشاہوں کو یوں نہیں، یوں سلام کرتے ہیں۔ اس پر شیخ نے گرج کر کہا۔ جو سلام کہ سُنّت ہے اور صحابہؓ اللہ کے رسول کے سامنے کیا کرتے تھے، یہی ہے۔ اس کے سوا مَیں اور کوئی سلام نہیں جانتا۔ سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر اشارہ کیا، اور لشکریوں نے لاٹھیوں، کوڑوں، مُکّوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب تک ہوش رہا یہ آیتِ قرآنی وردِ زبان تھی۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

سلیم شاہ نے جب شیخ کو یہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ کیا کہتا ہے مخدوم الملک نے کہا۔ "شمارا و مارا کافر مے گوید"۔ اِس پر اُس کو اور زیادہ طیش آیا اور جب تک

موت کا یقین نہ ہو گیا، برابر زدو کوب کا حکم دیتا رہا۔

جا نیست ہر آئینہ خواہد رفتن   اندر غمِ عشق تو رود او لے تر

مخدوم الملک | وہی عبداللہ انصاری ہیں جنہوں نے اسی شیخ الاسلامی کے زمانہ میں اتنا سونا جمع کیا تھا کہ کنجیوں کا شمار بھی نہ تھا۔ اور صرف گھر کے صندوق ہی نہیں بلکہ ان کے مرنے کے بعد جب حویلی کی تفتیش ہوئی تھی تو جن قبروں میں خاندان والوں کے مزارات بتائے جاتے تھے، اُن میں سونے کی اینٹیں بھی مدفون تھیں۔ ادائیگی زکوٰۃ تو آپ کے لئے بہت دشوار تھی لیکن اس فرض سے سبک دوش ہونا بھی آپ کے علم وفضل کا تقاضہ تھا جس کے لئے آپ کی ذکاوت نے یہ جدت پیدا کی تھی کہ ہر گیارھویں مہینے میاں بیوی کو، اور پھر آپ کی بیوی آپ کو یہ دولت عطا کر دیتی تھی۔

پھر عہدِ اکبری میں یہی مخدوم الملک تھے جو دنیا ہی میں شکنجۂ مکافات و پاداشِ عمل میں جکڑے گئے۔ ابو الفضل اور فیضی کے والد مُلّا مبارک ناگوری بھی ان کی دست درازیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ جب دربارِ اکبری میں مُلّا مبارک کو رسوخ حاصل ہوا تو پیشوائی اور شیخ الاسلامی تو ایک طرف عزت اور آبرو سے بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے۔ یا تو یہ حال تھا کہ ان کے قلمِ شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کر دیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندی اور شیخ ابو الفضل جیسے نوخیز بھری مجلس میں اُن کے فسق و فجور کا فیصلہ کرنے لگے، اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔

شیخ عبدالنّبی دنیا پرستی میں ان کے رقیب تھے۔ آپس میں خُوب خُوب ایک دوسرے کے برخلاف پمفلٹ بازی ہوتی رہی۔ اکبر نے مجبور ہو کر ان دونوں کو زبردستی حج کے لئے بھیج دیا۔ تین سال تک حجاز مقدس میں رہے، وہاں بھی یہی گندگی اُچھالتے رہے۔ پھر واپس آئے تو بقول صاحب خزینۃ الاصفیاء اکبر نے اُن کو زہر دلوا کر مروا دیا۔ لیکن سالِ وفات خزینۃ الاصفیاء میں ایک ہزار چھ (۱۰۰۶) تحریر کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مُلّا عبد القادر

بدایونی سنہ نوسو نوّے ۹۹۰ کے حالات میں لکھتے ہیں :

مخدوم الملک در احمد آباد درگذشت۔ قاضی علی از فتح پور بجہت تحقیق اموال او نامزد شدہ بہ لاہور آمد و چنداں خزائن و دفائن پدید گشت کہ قطل شمار آنرا بہ کلید دہم نتواں کشاد۔ از انجملہ چند صندوق خشت طلاء از گور خانۂ مخدوم الملک کہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود ظاہر شدہ آنچہ بیش مردم ماند عدد آں جز آفریدگار کس نہ داند و آں ہمہ خشتہا با کتب دے کہ نیز بحکم خشت داشت داخل خزانۂ عامرہ گردید (جلد دوم ص۳۱۱)

مے کشیدم مے و سجادۂ تقویٰ بردوش
آہ اگر خلق شود آگاہ ازیں تزویرم

معاصرین کرام

الف : حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی اصلاحی خدمات کے ابتداء یعنی سنہ۱۰۰۰ھ (ایک ہزار) سے حضرت محمد صدیق صاحب فرزند اصغر حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کی وفات یعنی سنہ۱۰۳۰ھ تک جن علماء و مشائخ ہند نے اس دارِ فانی کی کشاکش سے دامن چھوڑ کر دعوتِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے۔

ب : بہت سی کتابیں ہیں جن سے ان حضرات کے حالات سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ صرف علماء اور مشائخ کے حالات موضوعِ کتاب نہیں۔ اُن کے شاندار کارنامے موضوعِ کتاب ہیں۔ لہٰذا اس عنوان کے ماتحت صرف اُنہیں حضرات کا تذکرہ ہوگا جن کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے رہا۔ یا کم از کم درس و تدریس کے ذریعہ سے اشاعتِ علم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کی۔

ج : بیشک بہت سے واجب الاحترام مخلص ہیں جن کی خاموش خدمتیں عظیم الشّان نتائج کا تخم تھیں۔ مگر افسوس وہ خدمات صفحاتِ تاریخ پر نہ آسکیں یا اُن

صفحاتِ تاریخ تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ ایسے حضرات کے لئے یہ باب تکملہ کا محتاج رہے گا۔

د : بلاشبہ خانقاہوں کا قیام بھی عظیم الشان خدمت تھی ۔ الف ثانی سے پیشتر یہی خانقاہیں اشاعتِ اسلام اور اصلاح و ارشاد کا مرکز تھیں، مگر الف ثانی کے انقلاب نے خانقاہوں کی سعادت مدارس کو عطا کر دی۔

ه : مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی وغیرہ چند حضرات کے تذکرے حاشیوں میں آچکے ہیں اُن کا اعادہ نہ ہوگا۔

شیخ علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز

ابن حسام الدین، ابن عبدالملک ابن قاضی خاں[1] ۔ المتقی، القادری، الشاذلی المدنی چشتی رحمہ اللہ[2] وطن جون پور۔ جائے ولادت برہان پور، سنہ ولادت آٹھ سو پچاسی ھ[3] والد صاحب شاہ باجن چشتی برہان پوری رحمۃ اللہ سے بیعت تھے۔ صاحبزادہ کی عمر ۷، ۸ سال تھی۔ اُن کو بھی شاہ صاحب سے ہی بیعت کرا دیا۔ کچھ دنوں بعد والد صاحب کی وفات ہو گئی۔

سلوک و طریقت | شیخ علی نے تحصیلِ علوم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں سرکاری ملازمت انجام دی۔ مگر پھر جذبۂ طریقت نے دُنیا اور سامانِ دنیا کو نظرِ شیخ میں حقیر کر دیا۔ ترکِ ملازمت کر کے شاہ باجن صاحب کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت شیخ عبدالحکیم کی خدمت

---

[1] یوسف نام۔ زاد بوم ظفر آباد۔ مرید خلیفہ شیخ حسن طاہر کہ لقب وے کمال الحق ست و مرید حاجی حامد شد کہ خلیفہ شیخ حسام الدین مانک پوری ست، علم ظاہر و باطن اندوخت و پیراد در زندگی خلفاء خود را بدو حوالہ کردہ بود، و ہنگامِ فرو شدن پور خود عبدالعزیز را بدو بسپرد پانزدہم صفر نہصد از آشوب گاہ گیتی برکنار شد۔ (آئین اکبری جلد سوم ص ۱۷۵) [2] اخبار الاخیار ص ۲۴۹ ۔ [3] اخبار الاخیار ص ۲۵۸ ۔

میں حاضر ہوئے۔ خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ حسام الدّین متقی ملتانی (متوفی سنہ ۹۶۰ھ۔ نو سو ساٹھ) کی خدمت میں ملتان حاضر ہو کر فیوض و برکات حاصل کئے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو کر شیخ ابوالحسن[1] بکری کے فیوض و برکات سے دامانِ طلب پُر کیا۔ پھر شیخ محمد بن محمد بن محمد سخاوی سے سلسلہ قادریہ اور شاذلیہ کا خرقہ خلافت حاصل کیا۔ نیز اسی طرح دیگر اکابر سے دوسرے طریقوں کے خرقہائے خلافت حاصل کئے۔ اور پھر مکّہ معظمہ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔

تصنیف تالیف آپ کا زہد و تقویٰ علم سے، اور علم زہد و تقویٰ سے بڑھا ہوا ہے آپ کسی ایک ملک یا سلسلہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ پوری اُمّتِ محمّدیہ (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام) کے مصنفین میں بلند پایہ شمار کئے جاتے ہیں۔

شیخ جلال الدّین سیوطی کی مشہور کتاب ہے "جمع الجوامع"۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے احادیث جمع کی ہیں اور اس کے متعلق شیخ جلال الدّین کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام قولی اور فعلی احادیث اس میں جمع کر دی ہیں۔ حضرت شیخ علی نے اس کو ابواب فقیہ کی ترتیب پر مرتب کیا۔ پھر نظر ثانی فرمائی اور مکرّر احادیث حذف کر کے ان کو انتخاب کے طور پر مرتب کیا۔

شیخ ابوالحسن بکری فرمایا کرتے تھے۔ شیخ جلال الدّین[2] سیوطی کا تمام مسلمانوں پر احسان ہے اور علی متقی کا شیخ جلال الدّین پر۔

شیخ متقی کی گراں قدر تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔

ان تصانیف پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان نے کس طرح ان کو مرتب کیا۔ مکّہ معظمہ کے جلیل القدر اور مشہور و معروف بلند پایہ عالم شیخ ابن حجر (مصنف صواعق محرقہ) پہلے استاد تھے، پھر شاگرد کہلانے لگے۔ حلقۂ ارادت میں

---

[1] بالاجماع از اولیاء، زماں خود بود (اخبار الاخیار ص ۲۵) قطب الاقطاب وقت خود بود (خزینۃ الاصفیار ص ۳۹ ج ۱)

[2] للسیوطی منہ علی العالمین وللمتقی منہ علیہ (ماثر الکرام ص ۱۹۳ ج ۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۴)

داخل ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ع

اِنّ ھٰذا من اعاجیب الزمن

اسی طرح حجاز مقدّس کے تمام علماء اور مشائخ آپ کے عقیدتمند ہوئے۔

اکلِ حلال توکّل وقناعت قیامِ ملتان اور اس کے بعد سفرِ حجاز وغیرہ میں آپ کے پاس دو تھیلے رہتے تھے۔ ایک تھیلہ میں کتابیں، اور دوسرے تھیلہ میں آٹا، دال، نمک مرچ، تیل اور تھوڑی سی لکڑیاں (جو خود جنگل سے فراہم کی ہوئی تھیں) آپ کسی مسجد میں کبھی قیام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کرایہ پر مکان لے کر اُس کو اقامت گاہ بناتے۔ اپنا تمام کام خود کرتے۔ حتّٰی کہ خود ہی کھانا پکاتے۔ ضرورت کے وقت کسی دوسرے سے کام کراتے تو معاوضہ دے کر۔

ذریعہ معاش کتابوں کی کتابت تھی۔ اپنے قلم سے کتابیں لکھ کر فروخت کرتے۔ اُمراء اور اغنیاء کے نذرانوں اور اُن کے تحائف سے نفرت تھی۔ اُن سے قرض لینا بھی گوارا نہ تھا۔ کبھی کبھی نذرانہ قبول فرمالیتے تھے مگر اس وقت جب کسی غریب کی جانب سے اور اس کے کسب حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا، اور اس رقم کو عموماً اداء قرض میں صرف کرتے تھے۔

سلاطینِ ترکیہ کے کسی وزیر نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ حضرت شیخ ایک مرتبہ میرے مکان پر تشریف لاکر ماحضر تناول فرمائیں۔ حضرت شیخ امراء کے دروازوں کو اپنے لئے گویا حرام تصوّر فرماتے تھے۔ انکار فرماتے رہے۔ مگر جب وزیر صاحب کا اصرار بہت زیادہ بڑھا۔ اور حضرت شیخ کے مخصوص خدام نے بھی سفارش کی تو وزیر صاحب کی درخواست قبول فرمالی۔ مگر تین شرطیں طے کرلیں۔ جہاں چاہوں گا بیٹھ جاؤں گا۔ جو چاہوں گا کھاؤں گا، اور جب چاہوں گا اُٹھ کر چلا آؤں گا۔

وزیر صاحب نے تشریف آوری کو بہر صورت غنیمت سمجھا۔ شرطیں منظور کرلیں۔ حضرت شیخ تشریف لے گئے۔ تو شاہانہ قالینوں اور غالیچوں کو چھوڑ کر دروازہ

کے قریب[1] بیٹھ گئے۔ کھانا چُنا گیا، تو اپنی جھولی میں سے روٹی نکال کر کھانی شروع[2] کر دی اور جب کھانے سے فراغت ہوگئی تو السلام علیکم فرمایا اور روانہ ہوگئے۔

مکّہ معظمہ سے ایک مرتبہ آپ گجرات تشریف لائے۔ خلقِ خدا کی گرویدگی کا یہ عالم ہوا کہ پروانوں کی طرح آپ پر قربان ہوتی تھی۔ مجبوراً آپ کو دروازہ بند کرکے بیٹھنا پڑتا تھا۔ سلطان محمود والئے گجرات کو آپ کی زیارت کا شوق ہوا۔ حاضری کی اجازت چاہی، منظور نہ ہوئی۔

قاضی عبداللہ سندھی جو اس زمانہ میں مع اہل وعیال نقل وطن کرکے گجرات ہی چلے آئے تھے، ایک پرہیزگار عالم تھے اور حضرت شیخ سے تعلقاتِ یگانگت رکھتے تھے، قاضی صاحب نے اصرار کیا کہ درخواست منظور فرمائی جائے۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔ سلطان کی وضع میں کچھ خلافِ شرع چیزیں داخل ہیں۔ یہ مجھ سے ممکن نہ ہوگا کہ میں خلافِ شرع چیز کو دیکھوں اور خاموش رہوں۔

قاضی صاحب نے فرمایا۔ آپ اسی شرط پر اجازت دے دیں۔ سلطان نے شرط منظور کی، حاضر خدمت ہوا۔ واپس جاکر ایک کروڑ تنگہ (جو گجراتی سکّہ تھا) بطور ہدیہ خدمت میں بھیجا۔ حضرت شیخ نے تمام رقم قاضی عبداللہ صاحب کو دے دی کہ یہ آپ کے واسطہ سے ہی آئی ہے۔ آپ ہی کو مبارک ہو۔

اس کے بعد سلطان محمود گجراتی اکثر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا۔ آپ جو بات خلافِ شرع دیکھتے، اُس کو تنبیہ فرماتے اور یہ سعادت مند سلطان اس کو منظور کرتا۔

---

[1] تاریخ واقدی میں ہے کہ شام کی فوجوں سے جو خیمے مالِ غنیمت میں صحابۂ کرام کو حاصل ہوتے تھے، یہ مجاہدین اسلام سردیوں میں بارش کے وقت اپنے ٹوٹے پھوٹے خیموں میں بسر کرتے تھے، یا بارش میں بھیگتے رہتے تھے۔ مگر ان خیموں میں سر نہ چھپاتے تھے کہ یہ ظلم کے پیسے سے بنائے گئے ہیں۔ محمد میاں عفی عنہ۔ [2] جبکہ کسی شخص کی آمدنی میں غیر طیب مال کی آمیزش ہو تو اگرچہ فتویٰ یہ ہے کہ اس کی دعوت منظور کی جاسکتی ہے اور اس کے یہاں کھانا کھایا جاسکتا ہے مگر تقویٰ یہ ہے کہ اس سے اجتناب کرے۔ (اربعین غزالی)۔

سُلطان کو وہم کا مرض تھا۔ حضرت شیخ نے ایک مرتبہ آفتابہ میں پانی گرم کر کے اپنی ٹوپی کو تین مرتبہ دھویا۔ اُس کے بعد چوتھی مرتبہ دھو کر اُس کا دھوون بادشاہ کو دیا اور فرمایا :

بابا محمود ! یہ پانی شریعتِ مطہرہ میں پاک ہے، اس میں وہم اور وسوسہ شیطانی فعل ہے۔ آپ اس کو پی جائیے۔ سلطان نے پی لیا۔ فوراً مرضِ وہم کافور ہو گیا۔

آپ کا بیشتر وقت درس و تدریس، کتابیں لکھنے اور نایاب کتابوں کے نقل کرنے اور نقل کرانے میں خرچ ہوتا۔ خدمت خلق کا یہاں تک شوق تھا کہ طلبہ کے لئے دوات اور روشنائی خود ہی تیار فرما دیتے، اور خود ہی نقل کر کر کے اُن کیلئے کتابیں فراہم کرتے۔ آپ درس کے وقت معمولاً روشنائی گھوٹتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے۔ ہاتھ کو بھی اپنے کام سے خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ اتّباعِ سنّت کی حرص تھی۔ ہمیشہ با وضو رہتے۔ ہر مرتبہ وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھتے۔ آخری عمر میں ضعف اور مرض کے باعث چلنا پھرنا دشوار تھا۔ مگر معمولات میں تفاوت نہ آتا تھا۔ رات کو دس بارہ مرتبہ پیشاب کی ضرورت ہوتی۔ ہر مرتبہ وضو کرتے اور کم از کم دوگانہ وضو ضرور ادا کرتے۔ رحمہم اللہ۔

آپ کا مقولہ تھا کہ مال حلال ضائع نہیں ہوتا۔ اور تمثیل میں اپنے واقعات بیان کیا کرتے۔

خیال ہوا کہ قبرستانِ معلّٰے میں قبر کی جگہ مخصوص کرلیں۔ چنانچہ جگہ منتخب ہو گئی۔ مگر پھر خیال آیا کہ قبرستان عام مسلمانوں کی جگہ ہے۔ اس میں قبل از وقت تخصیص مسلمانوں پر ایک قسم کی تنگی ہے۔ لہٰذا اس انتخاب کو منسوخ کرا دیا۔

وفات سے دس بارہ سال بعد لحد مبارک کھولنے کا اتّفاق ہوا۔ دیکھا گیا کہ نعش مبارک بدستور ہے۔ دوم جمادی الاولےٰ ۹۷۵ھ (نو سو پچھتر) بوقت سحر راہ گزار عالمِ جاوید ہوئے۔

شیخ عبدالوہاب المتقی القادری الشاذلی آپ کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ آپ کو ممالک اسلامیہ نے قطب وقت تسلیم کیا۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدثؒ نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ ہی کے واسطہ سے شیخ علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات جمع کئے ہیں۔ جن کو تفصیل کے ساتھ زبدۃ الاخبار میں جمع کیا۔ اور انہیں کا خلاصہ سطور بالا میں درج کیا گیا۔

شیخ داؤد چونی وال یا شیخ داؤد کرمانی۔ چھنی وال لاہور سے جنوب میں تقریباً چالیس کوس کے فاصلہ پر "چونی" یا "چھنی" ایک قصبہ تھا۔ اُسی کی نسبت سے آپ کو چونی وال کہتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد سیّد فتح اللہ عرب سے ہندوستان تشریف لائے۔ ملتان میں قیام فرمایا۔ اور شیخ داؤد ابھی دورِ طفولیت ہی طے کر رہے تھے کہ دنیا سے رخت سفر باندھا۔ بڑے بھائی شیخ رحمت اللہ اسی نونہال "داؤد" کو لاہور لے آئے۔ عارف نامی مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس اللہ سرہ العزیز کے شاگرد رشید مولانا "اسمعیل آچہ" سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر مخدوم شیخ حامد الحسنی جیلانی (معروف شیخ حامد گنج بخش متوفی ۹۷۶ھ) سے سلسلۂ قادریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ بلند پایہ، عالی حوصلہ، صاف گو شیخ و مرشد ہوئے۔ اہل دنیا سے ہمیشہ علیحدہ رہے۔ سلیم شاہ (سالم شاہ پسر شیر شاہ سوری متوفی ۹۶۰ھ) نے آپ کو بلایا، تو آپ نے کہلا بھیجا کہ دعاء غائبانہ ہی کافی ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۲۸ جلد ۱)۔

آپ پر حالتِ نماز میں خاص کیف طاری ہوتا تھا۔ بسا اوقات تمام رات سجدہ ہی میں گزار دیتے۔ کبھی ساری رات رکوع ہی میں ختم ہو جاتی اور کبھی ایک ہی رکعت کے قیام میں سپیدۂ صبح طلوع ہو جاتا۔ مجلس میں آپ ایسے بیٹھتے جیسے کسی محبوب کی آمد کا انتظار ہو۔ پھر ذوق و شوق کی حالت پیدا ہوتی اور سلسلۂ تقریر جاری ہو جاتا۔ جس میں سینکڑوں نکات اور حقائق کی گوہر افشانی ہوتی۔

مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری جن کا ذکر مبارک اُوپر گذرا، آپ سے بھی

عناد رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

سبب اس کا یہ تھا کہ شیخ موصوف پر میر محمد جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منکشف ہوا تھا کہ وہ کبار اولیاء اللہ اور صاحبِ مدارج و مقاماتِ عالیہ میں سے ہیں اور اُن کے احوال و مقامات کے متعلق لوگوں کو بوجہ قصورِ فہم دھوکا ہوا ہے، جو علماء وقت ان کی تکفیر و تضلیل کے درپے ہیں، سخت غلطی کر رہے ہیں۔

یہ بات بعض علماءِ دربار پر سخت گراں گذری کیونکہ وہ برابر طائفہ مہدویہ کے قتل و تعزیر میں کوشاں رہتے تھے۔

جب بعہد سلیم شاہ، مخدوم الملک مولانا عبداللہ کے ایما و سعی سے شیخ عبداللہ نیازی اور ان کی جماعت کے فقراء مبتلائے محن ہوئے تو حضرت شیخ نے فرمایا، کہ ان مظلوموں کا خون عنقریب رنگ لائے گا۔ اور افغانیوں کی حکومت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہے گی۔ یہ بات مشہور ہوئی تو معاندین نے حضرت شیخ کو بھی مہدویت سے متہم کیا اور بہت کلفت و تعب کا باعث ہوئے (حالانکہ پیش آئے واقعات کو دیکھتے ہوئے ایک مومن کی صحیح فراست تھی۔ جس کا ظہور صرف چار سال بعد ہو گیا۔ جبکہ ۹۶۳ھ میں ہمایوں نے دوبارہ اپنی حکومت قائم کرلی۔ سلیم شاہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا جس کو کوئی حکیم تشخیص نہ کر سکتا تھا۔ اسی میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ پھر اُس کا لڑکا فیروز قتل ہوا اور ہمیشہ کے لئے یہ نسل منقطع ہو گئی)۔ آپ کے خلفاء میں مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی بڑے پایہ کے عالم اور محدّث تھے۔

حضرت داؤد کے متعلق جب اربابِ غرض نے فتنہ برپا کرنا چاہا تو حضرت شیخ بہلول نے ایک کتاب تحریر کی اور اس میں دلائل و شواہد قاطع سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد جونپوری کی ولایت حق ہے لیکن ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے اور ہماری جماعت کو اس اعتقادِ باطل سے متہم کرنا مخالفین کا عناد اور منکرین کی شقاوت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اگرچہ اربابِ حق و صلاح کو اطمینان بہم پہنچا۔ لیکن

معاندین کا خلاف اور عناد اور بڑھ گیا۔ بایں ہمہ حق تعالیٰ حافظ و ناصر تھے، اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ اور بالآخر تمام مخالفین کو شرمساری اور خواری نصیب ہوئی۔

بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں مخدوم الملک نے بعض اکابر اہل اللہ کو طرح طرح کے فتنے اُٹھا کر قتل کرایا، تو ان کی طرف بھی مخالفانہ عزم سے متوجہ ہوئے۔ اور گوالیار سے سلیم شاہ کا پیغام بھجوا کر طلب کرایا۔ یہ تنہا ایک دو خادموں کو لے کر روانہ ہوئے۔ اور گوالیار سے باہر ملاقات ہوئی۔ لیکن شیخ کو دیکھ کر اور اُن کی باتیں سُن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا "ازیں روئے دروغ نیاید"۔ شیخ نے چند کلمے نصائح کے فرمائے۔ اور عزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیئے گئے۔

بدایونی نے واضح طور پر نہیں لکھا کہ مخدوم الملک نے اُن پر بظاہر الزام کیا لگایا تھا، اور طلب کرنے کی وجہ کیا قرار دی تھی؛ ملاقات کی گفت و شنید لکھتے ہوئے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:

"بعد از حرف و حکایت پرسیدند کہ تقریب طلبِ فقراء منقطع چہ بود۔ مخدوم الملک گفتہ کہ مریدانِ شمارا شنیدم کہ در وقت ذکر گفتن یاداوُد یا داوُد مے گویند"۔

"جواب دادند۔ مگر اشتباہ در سماع رفتہ باشد۔ والّا ایں جماعت ظاہر یا ودود، یا ودود گفتہ باشند"۔ (جلد سوم صـ۳۳)

۹۸۲ھ (نوسو بیاسی ہجری) میں شیخ داوُد نے وفات پائی۔ شیر گڑھ متصل قصبہ چونی میں آپ کا مزار پُر انوار ہے۔

---

[۱] اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد شیخ داوُد نے دریافت کیا۔ گوشہ نشین، تارک الدنیا فقراء کو کس غرض سے طلب کیا گیا؟ مخدوم الملک نے کہا کہ تمہارے مریدوں کے متعلق سُنا ہے کہ ذکر کے وقت یا داوُد، یا داوُد کہتے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا۔ سُننے والے کو دھوکا ہوا ہے وہ بظاہر یا ودودُ، یا ودودُ کہتے ہوں گے۔

شاہ ابواسحاق قادری لاہوری متوفی ۹۸۵ھ (نوسو پچاسی)، شاہ ابوالمعالی کرمانی برادر زادہ شاہ داؤد کرمانی موصوف متوفی ۱۰۲۴ھ (ایک ہزار چوبیس) اور مولانا جمال الدّین عرف شیخ بہلول دہلوی جیسے جلیل الشان مشائخ آپ کے خلفاء ہیں۔

شیخ محمّد بن طاہر پٹنی قدس سرہ

وطن اصلی پٹن، علاقہ گجرات۔ بوہرہ قوم سے تھے۔ خداوند عالم نے دولتِ علم سے بہرور فرمایا۔ تحصیلِ علوم کے بعد حرمین شریفین کا رُخ کیا۔ وہاں کے علماء اور فضلاء سے استفادہ کیا۔ بالخصوص حضرت علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں خصوصیت حاصل کی۔ علم و عمل، رُوحی و قلبی برکتوں سے دامن پُر کر کے وطن واپس تشریف لائے اور اصلاحِ قوم کا بیڑہ اُٹھایا۔ انتہا یہ کہ اسی میں شہید ہو گئے۔

آپ کی مفید ترین تصانیف نے اُمّت اسلامیہ کو ممنونِ احسان کیا۔

مجمع البحار آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں اُن لغات و محاورات کی تشریح کی ہے جو احادیث مقدسہ میں وارد ہیں۔ لغوی تشریح کے ضمن میں شرح احادیث کے متعلق بھی قابلِ قدر نکات بیان فرما دیئے ہیں۔ بلاشبہ یہ تصنیف خُدّامِ حدیثِ نبوی پر احسانِ عظیم ہے۔ اسی طرح اسماء رجال کے سلسلہ میں "مغنی" نہایت مفید اور درحقیقت "مغنی" (بے نیاز کر دینے والی) ہے۔

میر[1] علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں کہ شیخ ابنِ طاہر کے ہم قوم بوہرے مدعی مہدویت "سیّد محمد جونپوری" کے مقلّد تھے۔

شیخ محمد ابن طاہر نے اپنے اُستاد علی متقی کی طرح اس فرقہ کی اصلاح و تردید کیلئے کمرِ ہمت کسی۔ اور عہد کر لیا کہ جب تک اس قوم کی پیشانی سے اس بدعت کا داغ نہ مٹاؤنگا سر پر دستار نہ باندھوں گا۔ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے جب گجرات فتح کیا تو پٹن پہنچ کر

---

[1] مآثر الکرام جلد اول ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔

شیخ سے ملاقات کی۔ خود اپنے ہاتھ سے شیخ کے سر پر دستار باندھی، اور کہا۔ دستار اُتار دینے کا علم ہمیں ہوا۔ آپ کے منشاء کے بموجب دین متین کی نصرت کو ہم نے ضروری سمجھا۔

اُس وقت خانِ اعظم "مرزا عزیز کوکہ" کو گجرات کا گورنر بنا کر اکبر بادشاہ واپس چلا آیا۔ خانِ اعظم خود کٹر مذہبی شخص تھا۔ پہلے پڑھ چکے ہو کہ وہ اکبر سے بھی اس کی لامذہبی کی بنا پر بگڑ بیٹھا تھا۔ خانِ اعظم کی امداد سے حضرت شیخ کو اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی۔ مگر پھر عبدالرحیم خانخانان کو گورنر بنا دیا گیا۔

عبدالرحیم خانخاناں اگرچہ بعد میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے اور پھر حضرت مجدّد صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مگر اس وقت وہ اس فرقہ کے حامی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُن کے اعتماد پر فرقہ مہدویہ نے پھر سر اُٹھایا۔ حضرت شیخ طاہر نے پھر دستار اُتار لی اور آگرہ پہنچ کر اکبر بادشاہ سے شکایت کا قصد کیا۔ شیخ وجیہ الدین علوی نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا۔ مگر آپ نہیں رُکے، اور روانہ ہو گئے۔ اسی گمراہ فرقہ کے کچھ آدمی آپ کے پیچھے لگ گئے اور جب حضرت شیخ اُجین اور سارنگ کے درمیان تھے، آپ کو شہید کر دیا گیا۔ شہادتِ طاہر کا سنہ نو سو چھیاسی[1] ہے۔

شیخ وجیہ الدّین گجراتی علوی قدس سرہ العزیز

علمِ ظاہر و باطن کے دانا، و ماہر "چانپانیر" صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہیں علم حاصل کیا۔

---

[1] مآثر الکرام جلد اوّل ص ۱۹۶۔ آخر میں درج ہے۔ اما شیخ محمد طاہر باتفاق جمہور از قوم بوہرہ بود و کلام شیخ عبدالحق دہلوی در اخبار الاخیار ہم تصریح میکند و صدیقی بعضے میگویند بہ اعتبارِ نسب از جانبِ مادر بود و بعضے مے گویند از جہت اعتقاد بود کہ چوں شیعہ خود را حیدری مے گویند او خود را صدیقی خواند۔

بیضاوی شریف، ہدایہ، شرح وقایہ، شرح عقائد، شرح چغمینی وغیرہ کے حواشی لکھے۔ ۹۹۸ھ (نوسو اٹھانوے) میں وفات پائی۔[1]

لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا تاریخ وفات ہے۔ خواب گاہ احمد آباد۔[2]

شیخ جلال الدین تھانیسری کابلی

جائے پیدائش بلخ۔ سنہ پیدائش آٹھ سو چورانوے ہجری۔ فاروقی النسل ہیں سات سال کی عمر میں حافظ ہو گئے۔ سترہ سال کی عمر میں مسندِ درس کو رونق بخشی۔ حضرت شیخ عبدالقدوس[3] گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے جلیل القدر خلیفہ اور اپنے زمانہ کے مشہور ترین عالم، زاہد، متقی اور شیخ کامل ہیں۔ پچانوے ۹۵ سال کی طویل عمر حاصل کی۔

---

[1] مآثر الکرام جلد اول ص۱۹۶۔ [2] ایضاً۔ [3] شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ متوفی ۹۴۵ھ (نوسو پینتالیس ہجری) مشائخ چشت میں بلند پایہ اور مشہور و معروف شیخ ہیں اور حضرت شیخ احمد عبدالحق رودولوی متوفی ۸۳۶ھ (آٹھ سو چھتیس) کے پوتے حضرت شیخ محمد بن شیخ عارف سے بیعت تھے مگر براہ راست شیخ احمد عبدالحق کے معتقد اور عاشق تھے اور انہیں کی روحانیت سے فیوض و کمالات حاصل کئے۔ شیخ احمد عبدالحق رودولوی حضرت شیخ جلال الدین پانی پتی متوفی ۷۶۵ھ (سات سو پینسٹھ) کے شہرۂ آفاق خلیفہ ہیں۔ شیخ عبدالقدوس قدس اللہ سرہ العزیز کے کئی لڑکے تھے۔ بقول صاحب اخبار الاخیار ہمہ عالم متعبد۔ متلبس بلباس مشائخ۔ شیخ عبدالقدوس کے ایک پوتا کا نام عبدالنبی تھا جن کا تذکرہ حالات اکبر کے سلسلہ میں گذرا۔ شیخ عبدالنبی سماع کے مخالف تھے والد نے جواز سماع پر رسالہ لکھا۔ شیخ عبدالنبی نے اس کی مخالفت میں رسالہ لکھا باپ بیٹوں میں خوب بحث چلی۔ اکبر بادشاہ ابتداء میں شیخ عبدالنبی کا یہاں تک معتقد تھا کہ شیخ کی جوتیاں سیدھی کیں۔ چنانچہ شیخ کو امور شرعیہ کا صدرِ اعظم بنا دیا مگر شیخ عبدالنبی کو جلیل الشان منصب راست نہ آیا طبیعت میں غرور پیدا ہو گیا۔ علماء اور مشائخ کی تحقیر کرنے لگے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کی نظر سے بھی گر گئے۔ پھر گرفتار ہو کر ۹۹۲ھ (نوسو بانوے) میں انتقال کر گئے۔ رحمہم اللہ و غفر ہم۔ حضرت شیخ رکن الدین اور شیخ عبدالکبیر بالامیز متوفی ۹۴۷ھ (نوسو سینتالیس) حضرت شیخ عبدالقدوس کے صاحبزادگان میں خاص مرتبہ اور شہرت کے مالک ہیں (اخبار الاخیار و خزینۃ الاصفیاء وغیرہ)۔

مگر "از اوّل عمر تا آخر بطاعت و عبادت و درس و وعظ و ذکر و سماع و ذوق و حالت گذرانید بر حفظ آداب و نوافل و رعایت اوراد و اوقات تا آخر حیات مستقیم بود۔"

اراضی ہندوستان کے متعلق آپ کے زمانہ میں بحث چھلی۔ چند علماء نے فتویٰ دیا کہ سلطان کو یہ جائز نہیں کہ کوئی قطعہ اراضی کسی شخص کو بخش دے۔ اگر سلطان نے ایسا کیا تو یہ شخص اُس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ اس زمین کی خرید و فروخت اس شخص کے لئے جائز ہوگی۔

بہت سے اغراض پرست اس فتوے سے فائدہ اُٹھا کر حکام سے ساز باز کر کے اس قسم کی اراضی کی بیع کو باطل، اور ان کے واپس کئے جانے کا مطالبہ کرنے لگے۔

ان علماء کے پیش نظر بظاہر یہ تھا کہ مسلمان فاتحین نے ہندوستان فتح کر کے اُس کی اراضی کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا۔ یا قدیم باشندگان ہی کو بدستور مالک قرار دے کر ان پر خراج مقرر کر دیا ہے۔ بہر حال یہ اراضی اُن مجاہدین کی ہیں جو فتح میں شریک تھے یا اُن ہندوؤں کی ہیں جو پہلے سے باشندگانِ مُلک تھے اور اب بھی اُن کو اپنی اراضی اور املاک پر بدستور قابض اور متصرّف رکھا گیا۔ سُلطان کو کسی صورت میں بھی حق نہیں پہنچتا، کہ وہ کسی قسم کی اراضی کسی کو ہبہ کر دے۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں فقہ احناف کے بموجب واقعی امام یا سلطان کو حق نہیں کہ بلا مرضی مالک اور بغیر عوض اُن اراضی کو کسی دوسرے شخص کو دیدے۔ مگر ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچیں۔

علاوہ ازیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جائز ہی نہیں کہ سلطان مفتوحہ علاقہ کو اُس کے قدیم غیر مسلم باشندوں کی مِلک میں باقی رکھے اور جب کہ یہ مسئلہ احناف اور شوافع میں اختلافی ہے تو سلطان یا قاضی کے لئے جائز ہے کہ ضرورت اور مصالح کے بموجب مسلک شافعی پر حکم نافذ کرے۔

حضرت مولانا جلال الدّین صاحب نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، اور اس میں ان تمام حالات کی تفصیل کر کے فقہاء احناف کے اقوال کی توضیح اور تفصیل فرمائی، اور آپ نے فتویٰ دیا کہ اگر کسی زمین کے متعلق واقعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ مسلمان فاتح نے جب اُس کو فتح کیا تو وہ فلاں شخص کے حصہ میں لگائی گئی تھی اور وہ بدستور اسی طرح اب تک باقی ہے تو لامحالہ یہ زمین اُسی شخص کے وارثوں کی ہوگی اور اس زمین پر بادشاہ کا تصرّف جائز نہ ہوگا۔ نیز اس زمین پر عشر واجب ہوگا، اگر شرائط عشر موجود ہوں۔ ورنہ خراج۔ لیکن وہ اراضی جن کے متعلق یہ ثبوت نہیں ملتا وہ ملک حکومت ہیں۔

یہ اعتراض تھا کہ مسلمان فاتحین نے اراضی ہند فتح کر کے اُن کے قدیم مالکوں ہی کو برقرار رکھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض فاتح اوّل نے مفتوحہ اقوام کو ان کی اراضی واپس کر کے انہیں کو قابض اور متصرّف باقی رکھا تو جب کہ اس صورت کے جواز اور عدمِ جواز میں شوافع اور احناف کا اختلاف ہے تو سلطان وقت کو جائز ہے کہ ضرورت اور مصلحت کے بموجب مسلک شافعی پر عمل کرتے ہوئے اس شکل کو منسوخ کر دے اور اس قسم کی اراضی کو مِلکِ حکومت قرار دے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انتقالِ اراضی کی ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں کہ کسی زمین کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فاتح اوّل[1] کے وقت یہ اسی قوم کے قبضہ اور تصرّف میں تھی جس کے قبضہ میں آج ہے۔ کیونکہ ہم رات دن دیکھ رہے ہیں کہ ایک قوم دوسری پر غالب آکر اس کے املاک پر قبضہ کر لیتی ہے۔ جن ریاستوں پر آج چوہان اور ٹوڈر قابض ہیں، کچھ دنوں پہلے یہ ان لوگوں کی حکومت میں تھیں جو آج رعایا ہیں لہٰذا اراضی ہند کو ان زمینوں کی حیثیت دی جائے گی جن کے اصلی مالک معلوم نہ ہو سکیں۔ ایسی اراضی مِلکِ حکومت مانی جاتی ہیں۔ سلطان بحیثیت تولیتِ عمومی ان پر متصرف ہوتا ہے، اور اُس کے لئے حق ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی اراضی کا کسی کو

---

[1] یعنی جس فاتح نے اس ملک کو فتح کر کے دار السلام بنایا۔ واللہ اعلم

مالک بنادے۔

مولانا موصوف کا یہ مفصّل فتویٰ[1] سولہ 16 صفحات میں ہے تفصیل کے لئے اصل کا مطالعہ فرمایا جاوے۔ مولانا موصوف نے اپنے اُستاد کا بھی یہی مسلک بتایا ہے نیز مولانا الہداد[2] جونپوری اور شیخ طیّب قدس اللہ سرہما کے فتاوے تصدیق میں پیش

---

[1] جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے کتب خانہ میں سے یہ رسالہ دستیاب ہوگیا ہے۔ جو ستر سال پیشتر یعنی شعبان المعظم ۱۳۰۳ھ (تیرہ سو تین ہجری) میں احمد حسن خاں کے اہتمام سے مطبع احمدی واقع مدرسہ کہنہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلی میں طبع ہوا تھا ۱۲ "تحقیق اراضی ہند" اس رسالہ کا نام ہے۔

[2] ذات والاصفاتش بمقتضائے اسمِ خود موہبت ربانی و عطیہ یزدانی بود۔ مفتاح خزائن قال و مصباح مجالسِ حال۔ تلمیذ مولانا عبداللہ تلبنی (المتوفی ۹۲۲ھ نوصد و بست دو) و مرید راجی حامد شہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ نوصد و یک۔ عمر گرامی را بیشتر بہ تدریس و تصنیف صرف ساخت و در تصانیف رائقہ و توالیف فائقہ پرداخت مثل شرح ہدایہ و بہ فقہ در چند مجلد (شرح بزدوی و حواشی بر حواشی ہندیہ و حاشیہ تفسیر مدارک)۔ (مآثر الکرام ص۱۹۲ جلد ا) عقل سال انتقال آنجناب، گفت مصباح بہشت اللہ داد ۹۲۳ (نوصد و بست و سہ)

ایک خاص لطیفہ یہ ہے کہ اسی صدی میں پانچ اللہ داد اور گذرے ہیں۔ ۱: مولانا الہ داد لکھنوی۔ جن کا تذکرہ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کیا ہے کہ نہایت ذہین، ذکی اور دانشمند تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور عربیت میں ماہر۔ نحو میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام قطبی تھا۔ ایک اور رسالہ آپ کی تصنیف تھا جس میں جدول کی طرح چودہ سطریں طول میں تھیں اور چودہ عرض میں۔ اور اس چودہ سطری رسالہ سے چودہ علوم کے مسائل و احکام برآمد کیے جاسکتے تھے۔ نیز ایک اور رسالہ قبطون نام تھا جو مقاماتِ حریری کے طرز پر لکھا تھا۔ مُلّا عبدالقادر نے یہ دونوں رسالے دیکھے تھے۔ ۲: مولانا الہ داد سلطان پوری۔ اصل وطن بنودہ از مضافات سندیلہ۔ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں صوبہ پنجاب کی صدارت پر، پھر الہ آباد میں منصب قضا پر مامور ہوئے کشف الغمہ اور منہاج الدین آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ سنہ ایک ہزار چھ میں وفات ہوئی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

فرماتے ہیں۔ (ص۹ رسالہ تحقیق اراضی ہند)۔

حضرت مولانا کے اس فتوے کو علماء نے تسلیم کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے فتاویٰ میں دو جگہ اس فتوے کا حوالہ دیا ہے۔

نیز حضرت علامہ استاذ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری محدّث دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنی تقریر[1] میں مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا فتویٰ اسی مضمون کا نقل فرمایا ہے۔

چونکہ سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھے، لہٰذا وجد و سماع سے خاص تعلّق تھا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ جناب کے ایک صاحبزادے کی وفات ہوگئی۔ جب تک اس حادثہ کا دل پر اثر رہا، محفلِ سماع میں شریک نہیں ہوئے کہ اُس پاک درد میں اس مادی درد کی آمیزش نہ ہو جائے۔

شیخ عبدالقدوس قُدِّس سرہ العزیز کے اکثر مکتوب آپ ہی کے نام ہیں اور خود ان کے مکتوبات بھی ہیں ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۰ھ (نوسو اسی) میں دردِ دنیا سے نجات پاکر ہم کنارِ رحمت حق ہوئے۔ رحمہ اللہ (انجار الاخیار ص۲۷۷ وغیرہ)۔

شیخ بابا داؤد کشمیری متوفی ۱۰۰۱ھ | شیخ حسین خوارزمی متوفی ۹۳۷ھ کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ شیخ محمد شریف کبروی سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ۹۹۹ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۳: مولانا الہ داد لنگر خانی لاہوری۔ لنگر خان لاہور کا ایک محلہ تھا۔ آپ عالم، زاہد اور متقی تھے۔ ہمیشہ قناعت و توکّل سے زندگی بسر کی۔ کسی حاکم یا امیر کے پاس نہیں گئے۔

۴: مولانا الہ داد امروہی، جو اکبری افواج میں ملازم رہے۔ ۹۹۰ھ (نوسو نوے ہجری) میں انتقال ہوا۔ امروہہ میں دفن ہوئے۔ (تذکرہ علماء ہند ص۲۶)۔ ان کے علاوہ پانچویں قاضی الہ داد بلگرامی ہیں جن کی وفات ۱۰۰۱ھ (ایک ہزار ایک) میں ہوئی۔ (مآثر ص۲۲۸ جلد۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] و ذکر مولانا محمد اعلیٰ التھانوی رحمہ اللہ فی رسالۃ لہ ان اراضی الہند لیست بعشریۃ ولا خراجیۃ بل اراضی المحوزہ ای اراضی بیت المال والمملکۃ۔ واللہ اعلم العرف الشذی ص۲۸۶ باب ماجاء فی زکوۃ العسل۔

(نو سو ننانوے ہجری) میں خوارزم سے کشمیر میں آکر امیر کبیر سید علی[1] ہمدانی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ آپ کے کمالات نے چند روز میں آپ کو مرجع خواص و عوام بنا دیا۔

یہی زمانہ تھا کہ مرزا "یادگار گل" اکبر بادشاہ کے مقابلہ پر انقلابی تحریک پھیلا رہا تھا اکبر بادشاہ بد عقیدہ اور بد اعمال تھا مگر علماء نے اس کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا تھا نہ اُس کے مقابلہ پر بغاوت کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ بابا موصوف نے "مرزا یادگار گل" کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا۔ مرزا یادگار نے حضرت شیخ کو راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر زہر دلوا دیا۔ بابا جی شہید ہو کر اسی خانقاہ میں مصروفِ استراحت ہو گئے۔ لیکن چند دنوں بعد یادگار گل بھی بے یار و مددگار رہ گئے۔ شاہی فوج کے کچھ سپاہیوں نے اُس کا بدن ایک جنگل میں سر سے جُدا دیکھا، اور بروایت دیگر یادگار ہی کے خواص نے یادگار کا پتہ دے دیا، جب کہ وہ تنہا تھا۔ سپاہیوں نے تنِ گل کو بارِ سر سے سبک بار کر کے یہ خونی تحفہ دربارِ اکبر میں پیش کر دیا۔ حضرت بابا کی ایک عبرت آموز حکایت صفحاتِ تاریخ میں زیبِ نگارش ہے۔

چند شیعہ ایک زندہ نوجوان کا جنازہ بنا کر حضرت بابا کے پاس نماز پڑھوانے لائے۔ اگر منصوبے کے بموجب عین نماز کی حالت میں یہ جنازہ اُٹھ کر بھاگ جاتا تو یقیناً تاریخ کا ایک مذاقیہ پارٹ ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ جیسے ہی حضرت شیخ نے نماز جنازہ کی تکبیر کہی، ملک الموت سے مذاق کرنے والا یہ گستاخ نقال "غیرتِ الٰہی کی گرفت میں آکر متاعِ

---

[1] شیخ کامل، عالم باعمل، صاحبِ تصانیف مثل شرح فصوص الحکم وغیرہ تین مرتبہ دنیا کی سیاحت کی، اور ہزاروں مشائخ اور اولیاء اللہ سے فیوض حاصل کئے۔ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں چار سو اولیاء اللہ کے اجتماع سے سعادت اندوز ہوئے۔ آخر میں کشمیر کو نزول گاہ بنایا۔ سلطان علاؤ الدین کے نام پر محلہ علاؤ الدین پورہ تھا وہاں قیام کیا۔ شاہ کشمیر سلطان شہاب الدین نے نذرِ عقیدت پیش کی۔ فسق و فجور سے تائب ہوا۔ اس کا بھائی سلطان قطب الدین بیشتر حاضر خدمت رہتا کشمیر اور اطرافِ کشمیر میں بے شمار خلق اللہ کو ہدایت وارشاد کی دولتوں سے مالا مال کیا۔ ۷۸۶ھ (سات سو چھیاسی) میں وفات ہوئی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تاریخ وفات ہے۔

زندگی فنا کر بیٹھا۔ (خزینۃ الاصفیاء ص۳۳۱ جلد۲)۔

شیخ یعقوب صوفی کشمیری والد ماجد کا اسمِ گرامی خواجہ حسن عاصمی جو سلطنتِ کشمیر کے جلیل القدر رکن تھے۔ سالِ ولادت ۹۰۸ھ (نو سو آٹھ)۔ دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ مولانا عبدالرحمٰن عارف جامی، عرف مولانا جامی کے شاگرد رشید مولانا محمد سے عُلومِ ظاہری کی تکمیل کی، اور پیش گاہِ استاذ سے جامی ثانی کا خطاب حاصل کیا۔ پھر ریاضت وعبادت میں مشغول ہوئے۔ حضرت امیر کبیر سیّد علی ہمدانی کی روحانیت سے اویسی نسبت حاصل ہوئی۔ پھر شیخ کمال الدین حسینی خوارزمی کی خدمت میں ارادت وبیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ مگر شیخ کمال نے حضرت حسین خوارزمی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا جو سمرقند میں قیام فرما تھے۔ شیخ یعقوب جب سمرقند پہنچ کر خانقاہ شیخ کے دروازہ پر پہنچے تو شیخ نے دروازہ سے شیخ یعقوب کا استقبال کیا۔ پھر ارادت وبیعت سے مشرف فرماکر مطبخ کے لئے لکڑیاں چُننے کی خدمت سپرد کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں درجۂ کمال حاصل کرکے خرقۂ خلافت سے فائز المرام ہوئے۔ پھر وطنِ اصلی کشمیر میں تشریف لاکر سلسلۂ ارشاد جاری کردیا۔ سالکین وطالبین جوق جوق حاضرِ خدمت ہوکر فیوض وبرکات سے دامن بھرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری کا شوق پیدا ہوا۔ سمرقند پہنچے اور حضرت شیخ کی رفاقت میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں مشہد مقدس پہنچے۔

اُس زمانہ میں شاہ طہماسپ صفوی کا دور دورہ تھا، جو کٹر شیعہ تھا، اور اگرچہ اُس نے اپنی مخصوص اغراض کی بناء پر افغانیوں کی حکومت ہندوستان سے ختم کرنے کے لئے ہمایوں کی امداد کی تھی مگر خود اپنے ملک میں اہلِ سُنّت کو تلوار کے گھاٹ اُتار رہا تھا۔

حضرت شیخ یعقوب، شاہ موصوف کے پاس پہنچے۔ ظاہری افہام وتفہیم اور روحانی تاثیرات سے اس کو اتنا مرعوب کیا کہ وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوا، اور حضرت شیخ کا احترام دل میں بیٹھ گیا۔ مشہد پاک سے بغداد پہنچے اور شیخ المحدثین ابنِ حجر سے استفادہ کیا۔ شیخ سلیم چشتی

بھی اُس زمانہ میں وہیں قیام فرماتے۔ اُن سے سلسلۂ چشتیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر دوسرے ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے کشمیر واپس ہوئے۔ خطۂ کشمیر اُس زمانہ میں براہِ راست سلطنتِ مغلیہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ یہاں کے حکمران شیعہ تھے، اور یہ خطہ شیعہ سُنّی اختلافات اور تنازعات کا لالہ زار بنا ہوا تھا۔

اسی دوران[1] کا یہ واقعہ تھا کہ یوسف ثانی شیعہ نے محض مذہبی تعصب کی بنا پر قاضی حبیب پر جو سُنّی اور حنفی المذہب تھے، قاتلانہ حملہ کیا۔ اگرچہ قاضی حبیب صرف زخمی ہوئے مگر حنفیوں میں اس حرکت سے بہت زیادہ اشتعال پیدا ہو گیا۔

مُلّا یوسف اور مُلّا فیروز وغیرہ حنفی علماء اور مفتی تھے۔ سُنّی مسلمانوں کی زمامِ قیادت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ان حضرات نے مطالبہ کیا کہ اگرچہ قصاص کے طور پر اس شیعہ کو قتل نہیں کیا جا سکتا مگر تنبیہ اور تعزیر کے طور پر ضروری ہے کہ اُس کو قتل کرا دیا جائے۔

حسین شاہ جو اس زمانہ میں کشمیر کا بادشاہ تھا، اگرچہ شیعہ تھا۔ مگر عام شورش سے مرعوب ہو گیا اور یوسف کو سنگسار کرا دیا۔

مرزا مقیم، اکبری دربار کا امیر تھا۔ شیعی مذہب رکھتا تھا۔ بحیثیت سفیر کشمیر میں مقیم تھا۔ اُس کو یوسف کی سنگساری ناگوار گذری اور اُس نے حسین شاہ کو مجبور کیا۔ کہ یوسف کے قتلِ ناحق کا انتقام لے۔ چنانچہ مُلّا یوسف، مُلّا فیروز اور بہت سے حنفی علماء کو بری طرح قتل کرایا۔ پھر اُن کے پیروں میں رسیاں بندھوا کر ان کی نعشیں گلیوں اور بازاروں میں گھسٹوائیں۔

جب اکبر بادشاہ کو مرزا مقیم کی اس حرکت کی اطلاع ملی تو اُس نے مفتی صاحبان کے قتلِ ناحق کی پاداش میں مرزا مقیم کو قتل کرا دیا۔

غرض اس قسم کی شورشیں آئے دن کشمیر میں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ شیخ یعقوب صوفی جب کشمیر پہنچے تو انقلابی تحریک کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اور "بظاہر و باطن متوجہ شدہ

---

[1] یعنی ۹۸۶ھ۔ تاریخ ہندوستان ص۱۴۲ جلد ۵۔

سعی و امداد بلیغ بکار بردہ خطّہ کشمیر را تفویض اکبر بادشاہ کرد"۔[1]

اس سلسلہ میں شیخ یعقوب کی جلیل الشان خدمات کا تذکرہ کتب تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ۹۹۴ھ میں اکبری افواج نے کشمیر کو فتح کر لیا۔

۹۹۹ھ میں کشمیر کا آخری بادشاہ یعقوب[2] خاں گرفتار ہو گیا جو چار پانچ سال تک روپوش رہ کر شورش کرتا رہا تھا۔

بہرحال جب شیخ یعقوب کشمیر کی مہم سے فارغ ہوئے تو پھر زیارتِ حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوگئے۔ ایک سال بعد وطن واپس تشریف لائے اور حدیث تفسیر اور فقہ کی بہت سی کتابیں اپنے ہمراہ لا کر کشمیر میں رائج کیں۔

آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔ بخاری شریف کی شرح لکھی۔ توضیح تلویح کا حاشیہ لکھا۔ قرآن پاک کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھی۔ ان کے علاوہ مختلف فنون میں بہت سی تصانیف تحریر فرمائیں۔ مگر آج اُن کے نام بھی معلوم ہونے مشکل ہیں۔

بارہ ذی قعدہ شب پنج شنبہ بعد نماز عشاء ۱۰۰۳ھ (ایک ہزار تین) میں راہ گزارِ عالمِ بقاء ہوئے۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی[3]

یہی ہیں وہ گھر کے بھیدی جنہوں نے اکبر بادشاہ کے پوست کندہ حالات طشت از بام کئے۔ جامع فنون و فضائل، امامِ اقران و اماثل تھے۔ شیخ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، جلد ۱ صفحہ ۳۴۰۔ [2] یعقوب خاں چک، والیٔ اخیر کشمیر کہ بتعصب مذہب رافضیہ دشمن اہل سُنّت شد۔ ۱۲۔ (خزینۃ الاصفیاء، جلد ۱ صفحہ ۳۴۰)۔ [3] ماخوذ از مآثرالکرام صفحہ ۲۳۹ تا صفحہ ۲۴۰ جلد ۱۔

مبارکؒ ناگوری اور دیگر فضلاء عصر سے کسب کمال کیا۔ علمی فضیلت کے ساتھ ذوقِ نظم، انشاء عربی و فارسی کا سلیقہ بہترین تھا۔ ہندی نجوم، حساب، نغمہ اور ہندی راگ وغیرہ میں بھی کافی دسترس تھی۔ قناعت، راستی اور درستی میں آپ کی زندگی ممتاز تھی۔

اپنے زمانہ کے اکثر مشائخ اور علماء سے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک دربارِ اکبری کے منصب دار "حسین[2] خاں" کے ساتھ رہے۔ پھر جلال خان قورچی کے وسیلہ اور

---

[1] شیخ مبارک بن شیخ خضر مشہور عالم ہیں۔ فنونِ عقلیہ کی مہارت میں یکتا روزگار تھے۔ پانچویں پشت میں ان کے مورث یمن سے روانہ ہو کر بلاد و ممالک کی سیاحت اور عجائب قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے نویں صدی میں سیوستان سندھ کے مضافات میں قصبہ ایل میں فروکش ہوئے۔ چوتھی پشت میں شیخ خضر نے سندھ سے رخت غربت باندھا اور قصبہ ناگور میں قیام کیا۔ جوانی میں احمد آباد کا رُخ کیا۔ وہاں خطیب ابو الفضل گازرونی اور دیگر اکابر سے کمالات حاصل کئے۔ ۹۵۰ھ میں شہر آگرہ کی جانب مراجعت کی۔ پچاس سال تک یہاں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ قابلِ یادگار کمال یہ تھا کہ پانسو ضخیم کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کیں۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے مگر قوتِ حفظ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نابینائی کے زمانہ میں تفسیر کی کتاب منبع عیون المعانی لکھوائی۔ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ مُلا مبارک تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا رہتا تھا۔ بہرحال علومِ ظاہری میں باکمال تھے۔ اگرچہ اکبری فتنہ کے بانیٔ اوّل بھی آپ ہی تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ رحمہ اللہ عفا عنہ۔ [2] مُلا عبد القادر کا مربّی ہے۔ مُلا عبد القادر لکھتے ہیں کہ بہت بڑا باہمت، بہادر، پابندِ مذہب، رحم دل اور سخی تھا۔ اس کا خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو ڈیڑھ لاکھ کا مقروض تھا۔ مگر قرض خواہوں سے اس کا سلوک ایسا عمدہ رہتا تھا کہ انہوں نے تمام رقم معاف کر دی اور دستاویزیں پاک کر ڈالیں۔ صفر ۹۶۵ھ میں لاہور کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے نام کے ساتھ "ٹکریہ" کا لفظ بھی لگایا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گورنری لاہور کے زمانہ میں ایک لمبی داڑھی والا ہندو آیا۔ وہ اس کو مسلمان سمجھ کر تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا جب معلوم ہوا کہ ہندو ہے تو اُس نے حکم دیا کہ جب کوئی ہندو ملنے آئے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

میر فتح اللہ[1] کی سفارش اور تعریف و توصیف کے بعد سے اکبر بادشاہ کی پیش امامی کے منصب پر معین ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو ایک لکڑی زرد کپڑے کی مونڈھے پر ڈال کر آئے۔ پھر حکم دیا کہ پالان پر سوار ہوں، زین پر سوار نہ ہوں۔ جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ چارپائی پر نہ سوتا تھا۔ گھوڑے خریدتا اور تقسیم کر دیتا۔ عموماً اس کے اصطبل میں ایک گھوڑا رہتا، کبھی اس کو بھی بخش دیتا تھا۔ شب بیدار تہجد اور جماعت کا پابند تھا۔ وہ ابتداء میں بہرام خاں کا ملازم تھا۔ پھر بہرام خاں کی شکست کے بعد اکبر کا ملازم ہوگیا۔ سہ ہزاری منصب حاصل کیا مگر عموماً بادشاہ سے مخالفت رہی۔ شہادت کا شوقین تھا۔ جنگ کے وقت پہلے شہادت کی دعا کرتا، پھر فتح کی۔ ایک جنگ میں ایک ہندو کی گولی سے زخمی ہوا۔ پھر شاہی عتاب میں آگرہ بھیجا گیا۔ اس زخم کے صدمہ سے آگرہ میں ہی انتقال ہوگیا رحمہ اللہ۔ اس کا بیٹا یوسف خاں حکومتِ جہانگیر کا رکن ہوا۔ ۱۲ منہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] میر فتح اللہ شیرازی حکمتِ علمی اور نظری میں یکتائے روزگار تھے۔ خواجہ جمال الدین محمود، مولانا کمال الدین شیروانی، مولانا کرد اور میر غیاث الدین منصور شیرازی وغیرہ سے علومِ ظاہری میں کسبِ کمال کیا۔ عادل شاہ بیجاپوری نے ہزاروں التجاؤں سے آپ کو شیراز سے دکن بلایا اور اپنا وکیلِ مطلق بنا دیا۔ ۹۹۱ھ (نو سو اکیانوے) کے آخر میں اکبر بادشاہ نے اپنے پاس طلب کر لیا۔ خانخاناں اور حکیم ابو الفتح کو استقبال کے لئے مامور کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شاہی اعتماد یہاں تک حاصل کیا کہ صدارتِ کُل کا منصب تفویض ہوا۔ ۹۹۳ھ (نو سو ترانوے) میں امین الملک کا خطاب دیا گیا اور راجہ ٹوڈرمل کو حکم ہوا کہ مہماتِ ملکی میں میر صاحب سے مشورہ کیا کریں۔ آپ کی حُسنِ خدمات کی بنا پر اسی سال عضد الدولہ کا خطاب مرحمت ہوا۔ حسنِ تدبیر اور عمدگیٔ خدمات کی بناء پر اکبر کی نظر میں بہت زیادہ وقعت حاصل کی۔ ۹۹۷ھ (نو سو ستانویں) میں جب کہ اکبر بادشاہ سیرِ کشمیر سے واپس آ رہا تھا، ماندوجان میں میر صاحب کا انتقال ہوگیا۔

اوّلاً میر سید علی ہمدانی کے مکان میں دفن کیا گیا تھا۔ پھر اکبر بادشاہ نے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

چالیس سال تک ابوالفضل اور فیضی کے مصاحب رہے۔ لیکن جب ان دونوں کے حالات کی خرابی حد سے تجاوز کر گئی تو جامِ محبت بھی چکنا چور ہوگیا، اور جب قسم کھا کر اپنی تاریخ، صداقت اور دیانت کے ساتھ حالات لکھنے شروع کئے تو کوئی تعلق بھی صحیح تنقید پر اثر انداز نہ ہوسکا۔ فیضی کے حالات لکھتے وقت ایک طرف چالیس سالہ دوستانہ تعلّقات تھے، اور دوسری طرف حق و صداقت۔ مجبوراً معذرت کرنی پڑی کہ:

چہ[1] تواں کرد حق دین و حفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق ست۔ الحبّ للہ و البغض للہ۔ ہر چند سنین اربعین تمام در مصاحبتِ او گذشت امابعد تغیّر اوضاع و فسادِ مزاج آں نسبت بہ مرور خصوص در مرضِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہاں سے منتقل کراکر کوہِ سلیمان کی چوٹی پر دفن کر دیا جو نہایت دل کشا مقام ہے۔ میر صاحب کی وفات پر بادشاہ نے کہا۔ میر، وکیل و حکیم و طبیب و نجم بابود۔ فیضی کا شعر ہے:۔

شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پُر نم شُد
سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطون عالم شُد

آپ کثیر التصانیف ہیں۔ تہذیب المنطق پر علامہ دوانی کے حاشیہ کا تکملہ آپ کے خامہ کا رہینِ منّت ہے۔ پھر اس حاشیہ پر ایک اور حاشیہ تحریر فرمایا۔ نیز علماء متأخرین مثلاً محقق دوانی، میر صدرالدینؒ میر غیاث الدین منصور، مرزا جان میر کی تصانیف ہندوستان میں لاکر ادارہائے درس میں اُن کو داخل کرنا آپ کا کارنامہ ہے (مآثرالکرام ص۲۳۷ جلد ا)۔ آپ نے ایک چکّی ایجاد کی تھی جو خود بخود چلتی تھی۔ نیز ایک بندوق آپ نے ایجاد کی تھی جو بارہ فیر کرتی تھی۔ نیز ایک آئینہ ایجاد کیا تھا جس میں دُور اور پاس کی عجیب عجیب چیزیں نظر آتی تھیں۔ (تذکرہ علماء ہند ص۱۶۰)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کیا کروں حقوقِ دین کی پاسداری تمام حقوق سے بلند و بالا ہے۔ الحب للہ والبغض للہ (خدا کے لئے ہے محبت اور اسی کے لئے ہے بغض)۔ ہر چند پورے چالیس سال اس کی (فیضی کی) صحبت میں گذرے مگر حالات کی تبدیلی اور اس کے مذاق کے بگڑ جانے سے (خصوصاً مرض الموت میں) وہ تمام تعلق ختم

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

موت مرتفع شد وصحبت بہ نفاق انجامید - از یک دیگر خلاص یافتیم وما ہمہ متوجہ درگاہیم کہ ہمہ داوریہا[1] بہ آنجا بہ فیصل رسد - "الاخلاء یومئذٍ بعضھم لبعضٍ عدو الا المتقین"۔

آپ کی راست مزاجی کا پُرشوکت شاہد یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے چالیس سالہ حالات لکھتے وقت شہنشاہی ہیبت و جلال نے راست گوئی اور تنقید پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ڈالا اور نہ دولت و ثروت کا وہ عفریت جس نے مُلّا مبارک، ابوالفضل، فیضی اور حضرت شیخ عبدالقدوس کے پوتے شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری جیسے علم و فضل کے پہلوانوں کو پچھاڑ دیا تھا، مُلّا صاحب کے زہد و تقویٰ کے قدمِ راسخ کو ڈگمگا سکا۔ فرحمہ اللہ ورضی عنہ - مُلّا صاحب شیخ حاتم سنبھلی[2] سے بیعت تھے - اور شیخ داؤد جھنی سے بھی خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ۱۰۰۴ھ (ایک ہزار چار) میں جانِ عزیز جان آفریں کے حوالہ کی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہو گیا - دوستی کا انجام نفاق ہوا - ایک نے دوسرے سے رہائی پالی (حقیقت یہ ہے کہ) ہم سب اُس درگاہ کی طرف رُخ کئے ہوئے ہیں، جہاں تمام ہی معاملے جُدا جُدا ہو جائیں گے - اُس روز پرہیزگاروں کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] داوری، حکومت، قصد، معاملہ، خصومت، جنگ، شکایت، محاکمہ ۱۲ غیاث اللغات

[2] شہر سُنْبَھَل (سا مضموم لام مفتوح نون ساکن) علاقہ ملتان کے رہنے والے - صاحب ارشاد و ہدایت، عالمِ متبحر، حضرت مولانا عزیز اللہ صاحب سکندر لودھی کے زمانہ میں وطن اصلی سے ہجرت کر کے سنبھل تشریف لائے عرصہ دراز تک سلسلہ تدریس سے تشنگانِ علوم کو سیراب کیا - نوسو چھتہ ہجری میں آپ نے وفات پائی - شیخ حاتم سنبھلی مولانا عزیز اللہ صاحب کے رشید ترین شاگرد اور مرید ہیں - اپنے زمانہ میں علوم ظاہری میں یکتا اور بے نظیر ہونے کے باوجود اعلیٰ درجہ کے مرتاض، صالح اور متقی تھے - کہتے ہیں کہ شرح مفتاح اور مطول کو بسم اللہ کی ب سے تمت کی تا تک چالیس بار پڑھایا - دوسری کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال تھا ۹۶۸ھ (نوسو اڑسٹھ ہجری) میں وفات پائی - (تذکرہ علماء ہند ردیف حاء وعین)۔

مولانا جمال الدّین دہلوی[1] عرف شیخ بہلول دہلوی۔ عہدِ اکبری کے مشاہیر علماء، اصحابِ سلوک و طریقت میں سے تھے۔ سلوک و طریقت کی تکمیل شیخ محمد داؤد چھنی وال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کی تھی، اور علومِ معقول و منقول میں سیّد رفیع الدین[2] سلامی الشیرازی کے شاگرد تھے۔

---

[1] سیر الاصفیاء، مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی و تذکیر الطالبین بتذکرۃ الصلحاء والواصلین، وغیرہ بحوالہ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ تنبیہ: شیخ بہلول دہلوی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلۂ نسب کے ایک مورثِ اعلیٰ ہیں۔ (تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ ص۱)۔ [2] سیّد رفیع الدین شیرازی نویں صدی کے اعاظم محدّثین اور کملاء روزگار سے ہیں اور بہ یک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ حافظ ابنِ حجر عسقلانی تک پہنچتا ہے۔ وہ حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد ہیں اور حافظ سخاوی حافظ عسقلانی کے۔

معقولات کی تحصیل خود علّامہ جلال الدّین دوانی سے کی تھی۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے (ص۲۴۴) کہ ان کا خاندان شیراز میں اس درجہ محترم تھا کہ علّامہ دوانی خود اُن کے مکان پر آکر درس دیتے تھے۔

حافظ سخاوی نے ملاقات سے پہلے اپنی پچاس کتابوں کی تحریری اسناد بھیج دیں تھیں اور لکھا تھا کہ آپ جیسے صاحبِ کمال کے لئے درس و تلقین ضروری نہیں۔ لیکن ان کے شوقِ علم نے اس پر قناعت نہ کی۔ خود قاہرہ پہنچے اور عرصہ تک حافظ موصوف کی خدمت میں رہے۔ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع میں ان کا مفصّل ترجمہ لکھا ہے۔ اخبار الاخیار۔ روضۃ العلماء، منتخب التواریخ وغیرہ میں بھی ان کے حالات ملتے ہیں۔

سکندر لودھی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور سلطان کی عقیدت و ارادت اس طرح دامن گیر ہوئی کہ یہیں مقیم ہو گئے۔ سلطان سکندر سے لے کر سلیم شاہ تک، تمام شاہانِ ہند ان کے خدمت گذار رہے بڑے بڑے علماء وقت نے فنِ حدیث میں ان کی شاگردی کی۔

شاہ عبدالحق کے عہد سے پہلے ان اطراف میں فنِ حدیث کے درس و تدریس کا جس قدر چرچا ہُوا، وہ انہی کے قیامِ ہندوستان کا فیضان تھا۔

ہمایوں کو جب شیر شاہ سے شکست ہوئی اور آگرہ آیا تو سیّد موصوف کے مکان (البقیہ بر صفحہ آئندہ)

مولانا جمال الدین دہلی میں رہتے تھے اور درس علومِ نقلیہ میں اُستاذ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ علی الخصوص علوم دینیہ کی تدریس میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و طریقت کا سلسلہ بھی اُن سے قائم و جاری تھا۔ دُور دُور سے لوگ آکر فیض یاب ہوتے۔ مولانا رفیع الدین محدّث کے بعد آپ ہی محدّثین کے طرز پر صحاح کی تعلیم دیتے تھے۔ طلبا، دوسری جگہوں سے فراغت حاصل کرکے ان کی خدمت میں پہنچتے اور علمِ حدیث میں استفادہ کرتے۔

آپ کے مرشد حضرت شیخ داؤد کرمانی قدس اللہ سرہ العزیز پر جب مہدویت کا الزام لگایا گیا تو آپ نے ایک رسالہ تحریر فرماکر حقیقت کو واشگاف کیا۔ (جیسا کہ شیخ داؤد کرمانی کے حالات میں حیطہ تحریر میں آچکا)

پھر جب مُلّا مبارک کے خاندان کو دربارِ اکبری میں عروج ہوا۔ اور بارگاہِ شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی۔ تو ہندوستان سے قطع تعلّق کرکے مکّہ معظمہ چلے گئے۔ اس سفر کا سبب تذکرۃ الواصلین میں یہ لکھا ہے کہ "جب ۹۸۷ھ میں بعض علماء عصر نے اکبر کے امامِ وقت ہونے کا محضر تیار کیا اور تمام علماء دارالحکومت نے اس پر مہریں کیں تو وہ محضر دہلی میں بھی آیا۔ مولانا جمال الدین صاحب سے بھی تصدیق و تسجیل کے لئے کہا گیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس قدر ہو چکا ہے، کافی ہے۔ ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو تمام علماء ہند سے استصواب کر لیا جائے۔"

اس کے بعد جب علماء مشرق نے بادشاہ کے خلاف فتویٰ دیا اور لکھا کہ اکبر شریعت سے منحرف ہو گیا ہے تو بعض علماء دہلی کی نسبت دربار حکومت کو شُبہ ہوا کہ علماء مشرق سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پر جاکر طالب دُعا ہوا۔ تذکرۃ الواقعات میں ہے کہ ایران جانے کا مشورہ سیّد موصوف ہی نے دیا تھا۔ مُلّا مبارک اور شیخ عبدالنبی کے معرکوں میں یہ مُلّا مبارک کے مددگار رہے اور انہیں کی اعانت اور یاری سے مُلّا موصوف کو آگرہ میں رہنا نصیب ہوا۔ سال وفات ۹۵۴ھ (نوسو چوّن) ہے (تذکرہ صلا)۔

نامہ و پیام رکھتے ہیں - انہیں میں مولانا موصوف بھی تھے۔

جب حالات روز بروز مخدوش ہونے لگے تو آپ نے حج کا ارادہ کیا، اور اپنے تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت ساتھ لے کر مکّہ معظمہ چلے گئے۔

چند سال بعد خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش[1] حج کے لئے گئے۔ ان کو مولانا جمال سے نہایت درجہ حُسنِ اعتقاد تھا۔ سخت اصرار و التجا کر کے اپنے ساتھ ہندوستان واپس لے آئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ دہلی پہنچنے سے چند ماہ بعد انتقال کر گئے۔ گویا قضا کو اسی کا انتظار تھا۔

آخر گِل اپنی صرفِ درِ مے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ ناصر الملک میر محمد خاں خانخاناں اور خانِ اعظم کوکلتاش کو حضرت شیخ جمال الدّین صاحب سے بہت عقیدت تھی۔ بارہا انہوں نے چاہا کہ مال و جاہ دنیوی میں سے کچھ قبول کریں۔ لیکن ہمیشہ انکار کیا اور فرمایا کہ گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں دل نہ ویران ہو جائے۔ عرفی نے کیا خُوب کہا ہے ؎

من از فریبِ عمارت گدا شدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

مولانا جمال الدّین کے متعلق بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

علمِ حدیث را خوب ورزیدہ، در صحبتِ اہلِ فقر و غنا رسیدہ۔ مدّتِ مدیدست کہ لذّتِ آں وادی دریافتہ، و توفیقِ استقامت و استدامت، بداں رفیقِ اوگشتہ۔ با اہلِ دنیا کارے ندارد۔ و بافادہ و افاضۂ طلاب علم مشغول ست۔ (جلد ۳ صـ ۱۱۳)۔

---

[1] خانِ اعظم دربارِ اکبری کے مذہبی تساہل سے بگڑ کر سنہ ایک ہزار ہجری میں مکّہ معظمہ گئے اور ایک ہزار دو میں واپس آئے۔ شیخ کی واپسی انہیں کے ساتھ ہوئی۔ ۱۲

حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدّث آپ کے ہمعصر ہیں آپ تحریر فرماتے ہیں:

جامع میان علمِ شریعت وطریقت - از اول فطرۃ برنشاۃ عبادت و تقوٰے وصلاح برآمدہ - وبرعصمتِ ذاتی نشوء نما یافتہ بعد تحصیل علمِ دینی بہ تہذیب اخلاق وتبدیلِ صفات موفق شد - الحق دریں زماں در زمرۂ علماء وفضلاء ایں چنیں مردم در سلوک ایں طریق و رسوخ قدم و اتباعِ سُنّت حضرت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم قادر وعزیز الوجود[۱] اند - فطوبٰے لہٗ رحمہ اللہ -

مولانا شیخ منوّر[۲] قدس اللہ سرہ العزیز | جائے پیدائش لاہور - مولانا ابو اسحاق[۳] لاہوری کے قابل اور نامور شاگردوں میں سے ہیں - باوجود علم کا کیڑا ہونے کے آپکی قوّتِ ہاضمہ بہت مشہور تھی - مشارق الانوار (حدیث) اور بدیع البیان کی شرحیں لکھیں - جب آپ کے علم وفضل کی شہرت ہوئی تو اکبر نے اعزاز واحترام کے ساتھ آپ کو طلب کیا، اور مجمع البلدان کے فارسی ترجمہ پر آپ کو مامور کر دیا - جس کو آپ نے مُلّا احمد ٹھٹوی اور قاسم بیگ کی مدد سے پورا کیا - یہ حکومت اکبر کا ابتدائی دَور تھا لیکن جب اُس نے اور اُس کے مشیرانِ کار علماء نے راہِ استقامت سے انحراف کیا حتّٰی کہ فیضی جیسے علماء مستِ شراب ہوتے، اور اکبر ان مفتیانِ کرام کو شراب میں مدہوش دیکھ کر کہا کرتا:

درد در پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
حافظ قرابہ کش شُد و مفتی پیالہ نوش

---

[۱] تذکرہ ص۲۸ جلد ا - [۲] تذکرۃ العلماء والمشائخ - [۳] مولانا محمد اسحاق خلیفہ شیخ داؤد چونی دال - بڑے پایہ کے عالم اور شیخ وقت تھے - حضرت داؤد کرمانی کے برادر زادہ شاہ ابوالمعالی متوفی ۱۰۲۴ھ کے ساتھ بہت زیادہ یگانگت تھی - ذکر وشغل، عبادت اور سلوک طریقت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر الحُبّ لِلّٰہ کا نمونہ پیش کرتے - نوسو پچاسی ہجری میں وفات ہوئی (خزینۃ الاصفیاء ص۱۳۳ جلد ا) -

تو مولانا منوّر نے اس مجلس سے انحراف کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالفضل کے ایماء سے دربار سے نکالے گئے اور پھر قلعہ گوالیار میں قید کر دیئے گئے۔ جہاں سنہ دس سو گیارہ ہجری میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ رحمہ اللہ

میراں محمد شاہؒ بخاری عرف موج دریا رحمہ اللہ سادات بخارا میں عظیم المرتبت شیخ مقتدار وقت اور سلسلہ سہروردیہ کے مرشد کامل تھے۔ ابتدار میں بمقام "اوچ" سکونت پذیر تھے۔ جب جلال الدین اکبر بادشاہ قلعہ چتوڑ گڑھ کی تسخیر میں مصروف تھا۔ اس نے سید صاحب موصوف کو رُوحانی توجہات اور باطنی نصرت و دُعا کے لئے چتوڑ گڑھ بُلایا۔ سید صاحب کے اقبال سے قلعہ فتح ہوگیا۔ تو اکبر نے خوش ہو کر آپ کو پرگنہ بٹار اور کچھ مواضعات لاہور کے اطراف میں عطا کر دیئے۔ اس کے بعد سید صاحب نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی اور حکم دیا کہ تین جگہ عام لنگر خانے جاری کر دیئے جائیں۔ ایک لاہور میں جہاں سید صاحب کی خانقاہ تھی اور دو لنگر خانے جاگیر کے مناسب مقامات پر۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی پنجابی نے آپ کی مجلس میں کہہ دیا۔ "سید سُنی نہیں کاٹھ دی کنی نہیں" یعنی جس طرح لکڑی کی ہنڈیا نہیں ہو سکتی، اہل سنّت والجماعت میں سید بھی نہیں ہو سکتے۔ پھر کہا کہ پہلے زمانہ میں سید ایسے ہوا کرتے تھے کہ اگر آگ میں کُود جاتے تو ایک بال بھی نہیں جلتا تھا، اب ایسے سید کہاں؟ سید صاحب کو یہ سُن کر جلال آگیا۔ آپ نے لکڑی کی ہنڈیا منگائی، اور اپنے دونوں پیروں کو پھیلا کر اُن کا چُولہا بنایا، اور ہنڈیا میں چاول ڈال کر پیروں کے چولہے پر رکھ دی اور آگ جلا دی۔ حتیٰ کہ چاول پک گئے۔ منکر سادات اس زندہ کرامت کو دیکھ کر نادم ہوا۔

آپ کے دو محل تھے اور اُن سے تین فرزند تھے۔ سید صفی الدّین، سید بہاؤ الدّین، سید شہاب الدّین عرف شہاب الدّین تہرا۔ یہ تینوں صاحبزادگان اپنے زمانہ میں اولیاء اللہ ہوئے۔ حضرت میراں محمد شاہ کا سنہ ولادت نوسو چالیس (۹۴۰ھ) اور سال وفات

لہ خزینۃ الاصفیاء صلہ۹ جلد دوم۔

دس سو تیرہ (۱۳۰۰ھ) ہے رحمہم اللہ۔

مُلّا قطب الدّین[1] شہید سہالوی نوَّرَ مضجعہٗ

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے الفاظ میں :

"امامِ اساتذہ و مقتدار جہابذہ است۔ معدنِ عقلیات و مخزن نقلیات"۔

سہالی مضافات لکھنؤ میں ایک قصبہ تھا۔ مُلّا صاحب اسی قصبہ کے انصاری شیوخ میں سے ہیں۔ مُلّا عبد السّلام[2] جہہ دیوہ کے شاگرد ہیں۔

---

[1] مآثرالکرام ص۲۰۹ و ص۲۱۰۔ [2] ایک ہی زمانہ میں دو مُلّا عبد السّلام، صاحبِ کمال اور شہرۂ آفاق ہیں ان دونوں کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی کی تحریر درجِ ذیل ہے :

مُلّا عبد السّلام ساکن دیوہ (دیوہ از مضافات صوبہ اودھ) اضاف علوم را سماعربیت در سرزمین مولد خود تحصیل کرد۔ قائدِ قسمت او را بہ لاہور آورد، در ظل رافت مُلّا عبد السّلام لاہوری رسانید ہر چہ خواندہ بود بخدمت مُلّا تصحیح نمود و قدم بر قدم اُستاد گذاشت۔ و چنانچہ اتحادِ اسمی متحقق بود۔ نسبت فضیلت نیز برتبۂ مساوات بہم رساند۔ چندے بدانش آموزی مستفیدان گذرانید۔ آخر ملازمت صاحبِ قران شاہجہاں دریافت و چندے بہ منصب افتاءِ عسکر مامور گردید و در کبرسن دست ازیں منصب باز داشتہ در دار السلطنت لاہور رنگ اثر داریخت۔ و تشنہ کامانِ علوم را بہ کوثر افادہ سیراب مے ساخت۔ و حاشیہ بر تفسیر بیضاوی در سلک تحریر کشید۔ (مآثر ص۲۳۶ جلد ا)۔

مُلّا عبد السّلام لاہوری معدنِ عقلیات و نقلیات بود۔ فنون ادب و فقہ و اصول را نیکو می دانست، علم از امیر فتح اللہ شیرازی وغیرہ فراگرفت و قریب شصت سال درس گفت و جمعے کثیر را بپایۂ فضیلت برسانید و حاشیہ بر تفسیر بیضاوی تعلیق نمود۔ و قریب نودہ ۹۰ سال عمر یافت۔ میگفت سخنانِ بسیار بر کتب متداولہ داشتم ارباب استعداد عرض کردم و در معرض قبول افتاد۔ اما از کثرتِ اشغالِ درس فرصتِ تحریر نیافتم۔ الحال کہ ضعف قویٰ مستولی گشت و قوتِ حافظہ رو بہ انحطاط آورد ہمہ از خاطر برآمدہ۔ بر فقدان ایں صور ذہنی تاسف مے نمود۔ در سن سبع و ثلاثین والف کتاب زندگانی برہم نہاد (مآثرالکرام ص۲۳۶ جلد ا)۔

عرصہ دراز تک انجمنِ درس کو رونق بخشی اور اربابِ تحصیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ علماء ہند کے سلسلۂ اساتذہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

قصبہ سہالی میں شیوخ کے دو خاندان عثمانی اور انصاری، زمیندار تھے۔ اور زمینداری کے معاملات میں آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ عثمانی شیوخ نے ایک قریب کے موضع کے خان صاحبان سے موافقت کرکے مُلّا صاحب پر شب خون مارا۔ مُلّا صاحب کو شربتِ شہادت نوش جاں کرایا، اور آپ کے کتب خانہ کو نذرِ آتش کر دیا۔ اُس میں آپ کی تصانیف بھی نذرِ آتش ہو گئیں، جن میں آپ کا وہ گراں قدر حاشیہ بھی تھا، جو علامہ دوانی کی شرح عقائد پر آپ نے تحریر فرمایا تھا۔ ۱۰۱۳ھ (دس سو تیرہ ہجری) سالِ شہادت ہے۔

مولانا کمال کاشمیریؒ [1] متوفی ۱۰۱۷ھ (ایک ہزار سترہ)۔ علومِ ظاہری اور کمالاتِ باطنی میں اسم بامسمیٰ تھے۔ سیالکوٹ، اور لاہور میں عرصہ تک آپ کا درس جاری رہا۔ حضرت مجدّد صاحب اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامی سعد اللہ آپ کے مشہور تلامذہ ہیں۔ رحمہم اللہ۔

شاہ شمس الدین قادری لاہوری حضرت شیخ منوّر کے پیر بھائی ہیں یعنی حضرت شیخ ابو اسحاق لاہوری کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ عالم، عامل، عارف کامل، علمِ شریعت و طریقت میں فرد و یگانہ تھے۔ سماع اور کشف و کرامت سے قطعاً علیحدہ رہتے۔ لاہور میں آپ کا بہت اعزاز تھا، اور ہزاروں بندگانِ خدا نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ جہانگیر بادشاہ آپ کا معتقد تھا۔ عاجز اور بے وسیلہ حاجت مندوں کے لئے آپ سفارش فرماتے اور جہانگیر اُس کو قبول کرتا۔ سنہ ایک ہزار اکیس میں آپ کی وفات ہوئی۔ [2]

شیخ احمد شوریانی دولت کدہ قصور (پنجاب) خویشگی اور شوریانی افغانوں میں سب سے پہلے بزرگ ہیں جو علومِ ظاہری اور کمالاتِ باطنی کے حامل ہوئے۔ اپنے زمانہ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۱۲۸۔ [2] خزینۃ الاصفیاء ص ۲۵۵ جلد ا۔

کے جلیل القدر عالم اور عظیم المرتبت شیخ ہیں۔ جو مسائل بڑے بڑے علماء سے حل نہ ہوتے تھے، آپ اُن کا برجستہ جواب نہایت آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔ حضرت مجدّد صاحب اور شیخ عبدالحق صاحب دہلوی سے معاصرانہ تعلّقات تھے۔ تالیف و تصنیف سے اجتناب کرتے تھے، کہ ہم سے پہلے بزرگوں کی تصانیف بہت کافی ہیں۔ صرف ایک رسالہ "سوالاتِ احمدی" ردِّ ملاحدہ و زنادقہ میں تصنیف فرمایا۔ ۱۰۳۰ھ (ایک ہزار تیس ہجری) میں وفات[1] پائی۔

خواجہ نظام الدّین بلخی[2] تھانیسری ہندوستان کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں صاحب تصرفات ظاہری و جامع کمالات صوری و معنوی۔ حنفی مذہب اور چشتی و صابری مسلک۔ فاروقی النسل۔ حضرت مولانا جلال الدّین تھانیسری کے برادر زادہ، داماد، خلیفہ اور جانشین و صاحبِ سجادہ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے رسمی طور پر تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بلکہ لدُنّی علوم سے آپ کو عالمِ ہمہ داں کر دیا گیا تھا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

آپ نے بہت سی کتابیں تفسیر، حدیث اور تصوّف وغیرہ میں تصنیف کیں۔ علاوہ کیمیا، سیمیا، ہیمیا، لیمیا علوم وغیرہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ میں ایک خاص مشرب کے موجد ہیں۔ جب آپ کے تقدّس اور کمالات کی شہرت ہوئی تو شاہزادہ سلیم (جو بعد میں شاہ جہانگیر ہوا) آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس کو سلطنت کی بشارت دی۔ بادشاہ ہونے کے بعد اُس کے بڑے لڑکے "خسرو" نے بغاوت کی۔

خسرو حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی نصرت کا طالب ہوا۔ آپ نے اس کو ارادۂ بغاوت سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر وہ کاربند نہ ہوا۔ اور خواجہ کی بجائے جوگی بیاس کی پناہ لی۔ خواجہ صاحب کے حاسدین نے شاہزادہ کی

---

[1] خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۴۵۸ جلد ۱۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۶۳ جلد ۱

آمد کو خواجہ صاحب کی سازش کی دلیل گردان کر بادشاہ سے خواجہ صاحب کی شکایت کردی، اور خواجہ صاحب کی پختہ سُنّیت بظاہر شکایت میں رنگ آمیزی کا سبب بن گئی۔ بادشاہ نے خواجہ صاحب کی جلاوطنی کا حکم صادر کردیا۔

حضرت خواجہ ہندوستان سے حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہوگئے اور وہاں چند سال قیام کرکے اپنے آبائی وطن "بلخ" میں تشریف لے گئے۔

قیامِ حرمین کے دوران میں آپ نے لمعات کی دو شرحیں "مکّی" اور "مدنی" تحریر کیں۔ بلخ میں آپ کے ارشاد و اصلاح کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ سات سو حضرات نے آپ کی تربیت سے درجاتِ طریقت کی تکمیل کی۔

امام قلی خاں ازبک بلخ کا حکمران تھا، وہ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیا۔ آپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر خود غرض مُلّانوں کو رشک ہوا۔ انہوں نے آپ کے برخلاف پراپیگنڈہ شروع کردیا کہ جمعہ کی نماز میں جامع مسجد میں حاضر نہیں ہوتے۔ اور اپنی خانقاہ میں علیحدہ جمعہ قائم کرکے "تفریق بین المسلمین" کا سبب ہورہے ہیں۔ اس پراپیگنڈے سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، اور اُس نے حضرت خواجہ سے حاضری جامع مسجد کی فرمائش کی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا۔ جامع مسجد کا امام رافضی ہے اُس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اس الزام سے شہر میں عام ہیجان ہوگیا۔ ہزاروں آدمیوں نے عہد کرلیا کہ حضرت خواجہ اور بادشاہ دونوں کو نذرِ شمشیر کردینا چاہیئے۔

بلوائیوں کا ہجوم شاہی محلّات کی طرف روانہ ہوگیا۔ بادشاہ اس اچانک ہنگامہ سے گھبرا کر حضرت شیخ کی خانقاہ میں بھاگ آیا اور شیخ سے التجا کی کہ ہنگامہ فرو کرنے کی صورت پیدا کریں۔

حضرت خواجہ نے بادشاہ کو تسکین دی، اور فرمایا۔ ابھی ہنگامہ فرو ہوجائے گا۔ بادشاہ ابھی خانقاہ میں تھا کہ تقریباً دس ہزار بلوائیوں کے ہجوم نے خانقاہ کا محاصرہ کرلیا۔ امام جامع مسجد تلوار سونت کر حضرت خواجہ کے سامنے آیا اور نہایت سختی سے

کہا۔ "تو ہی کہتا ہے کہ امام جامع مسجد رافضی ہے۔ اب اس بہتان کی سزا چکھ۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا۔ بیشک تو رافضی ہے۔ اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے موزے نکلواؤ اور دیکھو کہ ان میں اس نے کیا رکھ رکھا ہے۔

بادشاہ اٹھا۔ امام کے موزے اتارے۔ دیکھا تو کاغذ کے دو پرزے رکھے ہوئے تھے جن پر سیدنا و سید المسلمین حضرت صدیق اکبر خلیفۂ اوّل اور حضرت عمر فاروق خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسماء گرامی درج ہیں۔

برافروختہ ہجوم نے جب امام کی یہ خباثت دیکھی تو حضرت خواجہ کی بجائے امام کو قتل کر ڈالا۔ بادشاہ کی عقیدت اور حضرت خواجہ کے عروج میں اور اضافہ ہوا۔ اہلِ بلخ نے آپ کی بہت سی کرامتوں کا مشاہدہ کیا۔

ہشتم ماہ رجب روز جمعہ ۱۰۳۶ھ (ایک ہزار چھتیس) کو دستِ اجل نے کتابِ زندگی کا آخری ورق پلٹ دیا۔

آپ کی اولاد امجاد میں خواجہ محمد سعید اور خواجہ عبد الحق ہندوستان تشریف لائے۔ خواجہ محمد سعید نے تھانیسر میں اور خواجہ عبد الحق نے کرنال میں سکونت اختیار کی۔ سینکڑوں خلفاء میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی درجِ کتب تاریخ ہیں

خواجہ ابو سعید[1] گنگوہی۔ شیخ حسین بھویری۔ شیخ ولی محمد نارنولی۔ شیخ پائندہ

---

[1] خلف رشید حضرت نور الدین خلف حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز آپ کے فیوض و برکات بھی بہت زیادہ ہیں۔ شیخ محمد صادق گنگوہی اور شیخ محمد ابراہیم ساکن سیدپورہ متصل گنگوہ۔ شیخ ابراہیم سہارن پوری۔ شیخ خواجہ پانی پتی شیخ محب اللہ الہ آبادی آپ کے (شیخ ابوسعیدؒ) کے جلیل القدر خلفاء ہیں (خزینہ ص۲۷۲ جلد۱)۔ شیخ محمد صادق خلف شیخ فتح اللہ، حضرت شیخ ابو سعید قدس اللہ سرہ العزیز کے برادر زادہ ہیں۔ آپ کی وفات ۱۸ محرم ۱۰۵۸ھ (ایک ہزار اٹھاون) میں ہوئی۔ مزار پُر انوار گنگوہ میں ہے۔ آپ کے فرزند ارجمند شیخ داؤد، فرزند دوم شیخ محمد۔ نیز شیخ ابراہیم مراد آبادی، شیخ عبد السبحان سہارنپوری، شیخ عبد الجلیل الہ آبادی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بنوری۔ سیّد الہ بخش لاہوری بھکروی۔ شیخ عبدالکریم لاہوری (موضع نوکوٹ متصل لاہور مزار ہے)۔ شیخ الہ داد لاہوری۔ شیخ دوست محمد لاہوری۔ شیخ مصطفیٰ۔ شیخ عبدالفتاح اندری۔ شیخ عبدالرحمٰن کشمیری۔ سیّد قاسم برہانپوری۔ قاضی عبدالحئی ولد قاضی سالم، و شیخ صادق برہان پوری۔ شیخ فتحی و شیخ اسمٰعیل اکبرآبادی کے پیر و مرشد شیخ جان اللہ لاہوری (مزار اندرون باغ نہال سنگھ)۔

شیخ عبداللہ[1] بھٹی ابن سیّد عمر بن سیّد حسین جبلی قدس اللہ اسرار ہم بارہ واسطوں سے غوث الثقلین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ والد ماجد سے ہی خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ شیخ سلیم چشتی فتحپوری کے ہمراہ زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ واپس ہو کر اجمیر شریف میں چلہ کشی کی پھر اپنے وطن بھٹہ[2] (بھٹ متصل سہارن پور) میں آکر خدمت، وارشاد خلق اللہ میں مصروف ہو گئے۔ ایک مرتبہ کسی نے جہانگیر بادشاہ سے حضرت کی شکایت کر دی۔ جہانگیر نے سیّد صاحب کو طلب کر لیا۔ جب سیّد صاحب دربار میں پیش کئے گئے، آپ نے کچھ پڑھ کر سنگ ریزوں پر دم کیا۔ جہانگیر نے غصّہ میں دریافت کیا۔ یہ کیا حرکت؟

حضرت سیّد صاحب: دفع بلیات کے لئے دُعا پڑھی ہے۔

شیخ کے بے ساختہ جواب سے بادشاہ خوش ہو گیا۔ انعام واکرام کے ساتھ سیّد صاحب کو واپس کیا۔

سو سال سے زیادہ عمر ہوئی۔ دس ربیع الاوّل ۱۰۳۷ھ (ایک ہزار سینتیس) یوم جمعہ کو سطرِ زندگی پر قلمِ تنسیخ کھینچ دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شیخ جمال کاچھو، شیخ مبارک اور شیخ یوسف کابلی۔ شیخ محمد صادق کے خلفاء صاحب اخترام میں (خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۴۲۷ جلد ۱)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مآثر الکرام صفحہ ۲۷ جلد ۱۔ [2] بھٹ کھنجا در نیز بھٹہ۔ سرکار سہارن پور صوبہ دہلی۔ (آئین اکبری صفحہ ۲۷ و صفحہ ۲۸ جلد ۲)۔

شیخ پیر میرٹھی شطاری سلسلۂ شطاریہ کے جلیل القدر شیخ تھے۔ نور الدین جہانگیر بادشاہ کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ ۱۰۴۲ھ (ایک ہزار بیالیس) میں وفات ہوئی۔[1]

شیخ محمد میر[2] عرف میاں میر بالا پیر قادری لاہوری رحمہ اللہ

والد صاحب کا نام قاضی سائندہ ابن قاضی قلندر۔ والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ بنت قاضی قادن، فاروقی النسل ہیں۔ ۹۵۷ھ (نو سو ستاون) میں سیستان میں ولادت ہوئی۔ والدہ ماجدہ (حضرت فاطمہ) سلسلۂ قادریہ میں مراتب طریقت کی تکمیل کر چکی تھیں۔ صاحبِ نسبت تھیں۔ شیخ محمد عمر کا ساتواں دَور پورا کر رہے تھے کہ والد ماجد نے دورِ زندگی ختم کر دیا۔ والدہ محترمہ نے جسمانی اور روحانی تربیت کی۔ اسی کی برکت تھی کہ بارہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی، اور سلوکِ طریقت کی طرف ہمہ تن متوجّہ ہو گئے۔

جاذبۂ عشقِ حقیقی نے صحرا نوردی کی دعوت دی۔ والدہ ماجدہ سے اجازت حاصل کر کے "کوہِ سیوستان" پر حضرت شیخ خضر قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خرقۂ خلافت حاصل کر کے حضرت شیخ کے ارشاد کی تعمیل میں ارشادِ خلق اللہ کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔

عمر[3] مبارک اُس وقت ۲۸ سال تھی ۹۸۵ھ کا دَور اور اکبر بادشاہ کا عہدِ حکومت تھا۔ لاہور پہنچ کر زہد و ریاضت میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ:

"گاہے بشب خواب نہ کردے و تمام شب در یک نفس گذرانیدے و بعد یک ہفتہ افطارے کرد و چوں حالتِ استغراق زیادہ ترے شد

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۴۷۔ [2] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول از ص ۱۵۴ تا ص ۱۶۰۔ و تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۳۸ تا ص ۴۱۔ [3] خزینۃ الاصفیاء میں ہے۔ در عمر بست و پنج سالگی اور لاہور رسید۔ (جلد ۱ ص ۱۵۴)

تا یک ماہ اتفاقِ خوردن طعام نمے افتاد"۔[1]

آپ کے علم و فضل اور آپ کے زہد و تقدیس کی وجہ سے ہر وقت آپ کے پاس علماء، فضلاء اور صوفی منش بزرگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔

حضرت مُلّا شاہ بدخشانی، مُلّا خواجہ بہاری[2] اور میاں نتھا لاہوری[3] آپ کے مریدوں اور شاگردوں میں ممتاز تھے۔

داراشکوہ جو مُلّا شاہ بدخشانی کا مرید تھا، آپ کا بہت زیادہ ادب کرتا تھا۔ اُس کی ایک خورد سال بہن آپ کو وضو کرایا کرتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے آپ سے ملاقاتیں کی ہیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک اور مُلّا عبدالحمید لاہوری نے اپنے شاہجہاں نامہ میں اکثر جگہ حضرت میاں میر کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر ایک جگہ لکھتا ہے:

شیخ محمد میر لاہوری عرف میاں میر سے اُن کے علم و فضل اور اُن کی بزرگی و

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صـ۱۵۴۔ [2] فقہ، حدیث و تفسیر کے بہترین عالم تھے۔ حاجی پور کے باشندہ تھے۔ ۱۰۶۰ھ (ایک ہزار ساٹھ) میں وفات پائی (خزینہ جلد ۱ صـ۱۶۸)۔ ایک مرتبہ شاہجہاں ان سے ملاقات کے لئے آیا، تو آپ خبر پاتے ہی اپنے جھونپڑے سے غائب ہو گئے بادشاہ نے انتظار کیا۔ جب نہ آئے تو بادشاہ چلے گئے اور کہہ گئے کہ مُلّا صاحب سے کہہ دینا "طاقتِ مہماں نداشت خانہ بہ مہماں گذاشت۔ جب مُلّا صاحب کو یہ پیغام پہنچا تو کہا، کہ میں قصداً غیر حاضر ہو گیا تھا، ورنہ عام لوگ میری داڑھی کے بال بھی نہ چھوڑتے۔ اگلے روز بادشاہ نے دربارِ عام کیا۔ اسمیں مُلّا صاحب بھی تشریف لائے۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا تو وہ خود اُٹھ کر مُلّا صاحب کے پاس آیا اور دیر تک تنہائی میں باتیں کرتا رہا (تذکرۃ العلماء والمشائخ صـ۳۵)

[3] میاں نتھا از قوم پراچہ کنجد کش۔ حضرت میاں میر کے چہیتے خلیفہ۔ ۱۰۲۷ھ (ایک ہزار ستائیس) میں وفات ہو گئی۔ حضرت میاں میر نے با چشمِ پُر نم ارشاد فرمایا۔ رونقِ فقیر خانہ میاں نتھا برد۔ پھر مرتے وقت حضرت میاں میر نے وصیّت فرمائی کہ میاں نتھا کے برابر دفن کیا جائے۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صـ۱۵۲)۔

پرہیزگاری کی وجہ سے ملاقات کی بڑی خواہش تھی۔ لیکن میں اس زمانہ میں آگرہ میں تھا اور حالات اس قسم کے تھے کہ لاہور نہیں جا سکتا تھا لہٰذا میں نے اپنی حکومت کے چودھویں سال اُن کو آگرہ آنے کی دعوت دی جسے انہوں نے نہایت مہربانی سے منظور کر لیا۔

جہانگیر حضرت میاں میر سے ملاقات کے بعد اُن کے اخلاق اور اُن کی وسیع معلومات کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "روحانی پاکیزگی اور صفائے قلب میں یہ بزرگ اپنے زمانہ میں لاثانی ہیں۔ میں اکثر اُن کے پاس جایا کرتا اور وہ مجھے دینی و دنیوی نہایت باریک نکات بتایا کرتے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں اُن کو نقد روپیہ بطور نذر پیش کروں۔ چونکہ ایسی چیزوں کی اُنہیں خواہش نہ تھی، اس لئے مجھے جرأت نہ ہو سکی۔ آخر میں نے نماز پڑھنے کے لئے سفید ہرن کے چمڑے کا مصلیٰ آپکی خدمت میں پیش کیا، اور آپ نے قبول فرما لیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد آپ لاہور چلے گئے۔

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ حضرت میاں میر ایک مقدس بزرگ ہیں جہاں دیدہ کار آزمودہ، نہایت کم گو۔ ایک مرتبہ شاہجہاں بادشاہ لاہور آکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ میاں صاحب نذر و نیاز منظور نہیں کرتے۔ اس لئے ایک تسبیح اور سفید کپڑے کی ایک دستار میاں صاحب کی خدمت میں پیش کی، اور بے شمار دعائیں حاصل کیں۔

داراشکوہ سکینۃ الاولیاء میں جہانگیر اور حضرت میاں میر کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے۔ حضرت میاں میر کی باتوں سے جہانگیر اتنا متاثر ہوا کہ تخت چھوڑ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ میاں صاحب نے فرمایا۔ شاہانِ عالم خدا کی طرف سے مخلوق کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ اگر تم تخت چھوڑ دوگے تو خدا کے

ان احکام کی تعمیل سے قاصر سمجھے[1] جاؤ گے جن کی ادائیگی ایک بادشاہ کی حیثیت سے تم پر واجب و فرض ہے۔ بادشاہ شیخ کے کلام سے خوش[2] ہوا۔ اور کہنے لگا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد فرمائیے۔ مَیں اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ شیخ نے فرمایا۔ ایک چیز کی درخواست ہے اگر منظور ہو، اور وہ یہ کہ مجھے دوبارہ حاضری کی تکلیف نہ دی جائے۔

بادشاہ نے ان سے خط و کتابت جاری رکھی اور اپنے دستخطِ خاص سے اُن کی خدمت میں عریضے لکھتا رہا۔ چنانچہ وہ خطوط دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں نقل کئے ہیں۔ ایک عریضہ حسب ذیل ہے۔

بعد از عرض و نیاز مخلص حقیقی بتمام اخلاص بموقف مے رساند کہ ؎

قالب ایں جا و جاں در کوئے دوست

خلق را وہمے کہ جاں در قالب دوست

خدا آں روز آرد کہ دولتِ قدمبوس حاصل کنم۔

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ مَیں نے صرف دو صوفی ایسے دیکھے ہیں جو علمِ الٰہیات کے ماہر ہیں۔ ایک میاں میرؒ دوسرے محمد فضل اللہ بہاری۔

شاہجہاں اپنے دورانِ حکومت میں دو دفعہ حضرت میاں میر کے پاس آیا۔ ایک دفعہ کشمیر جاتے ہوئے، دوسری دفعہ کشمیر سے واپسی پر۔

---

[1] شرعی لحاظ سے یہ مفہوم تصدیق طلب ہے۔ [2] کیوں نہ ہوتا مطلب کے موافق بات تھی۔ مگر مجدد صاحب ترکِ سجدہ پر مستحقِ سزا تھے۔ یہی تفاوت ہے جس نے شیخ احمد کو الف ثانی کا مجدد قرار دیا آسان ہے خلافِ شرع امور پر چشم پوشی کر کے اپنے تقدس کا سکہ جما لینا۔ مگر مشکل ہے اور بہت مشکل ہے کلمہ حق ادا کر کے اصلاح کرنا۔ (محمد میاں عفی عنہ)۔ عزلت گزینی اچھی چیز ہے مگر خلق اللہ سے مل کر ان کی اصلاح اور ان کی بدخلقیوں کے مقابلہ میں صبر و تحمل وارثانِ انبیاء علیہم السّلام کا وظیفہ ہے۔

ساٹھ سال تک آپ زینت افزا، لاہور رہے ۔ ۷، ربیع الاوّل بروز سہ شنبہ بعد نماز ظہر ۱۰۴۵ھ (ایک ہزار پینتالیس) میں اٹھاسی سال کی عمر پاکر دفترِ ہستی کو طے کر دیا۔

آپ تمام عمر مجرّد رہے ۔ آپ کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں ۔

میاں قاضی، قاضی عثمان، قاضی طاہر، قاضی محمد، بی بی بادی، بی بی جمال، بی بی جمال ولیہ، اپنے زمانہ کی رابعہ تھیں ۔ ایک ہزار انچاس ۱۰۴۹ میں وفات پائی ۔ ان کی اولاد ہی میاں میر کی سجادہ نشین ہوتی چلی آتی ہے ۔

خواجہ خاوند عُرف حضرت ایشاں

ولی مادر زاد ۔ قطبِ ارشاد ۔ صاحبِ حال وقال ۔ جامع کمال ظاہری و باطنی مظہرِ جمالِ صوری و معنوی ۔ طریقہ عالیہ نقشبندیہ میں رُتبہ عالی رکھتے تھے ۔ والد صاحب کا اسمِ گرامی میر سید محمد شریف ہے جو خواجہ علاؤالدین عطار کی اولاد میں پانچویں پُشت میں ہیں ۔

خواجہ علاؤالدین عطار ساداتِ خوارزم میں سے ہیں ۔ آپ کا سلسلۂ نسب ایک جانب سے خواجہ فریدالدین عطّار تک پہنچتا ہے ۔

خواجہ علاؤالدین عطار حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس اللہ سرہم العزیز کے خلیفۂ برحق ہیں ۔ خواجہ خاوند بظاہر حضرت خواجہ ابو اسحاق کے خلفاء میں سے تھے ۔ مگر آپ کو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے اویسی نسبت حاصل تھی ۔

ایّامِ طفولیت بخارا میں گذارے، پھر بخارا سے وخش اور وہاں سے ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں کابل تشریف لائے ۔ کابل سے کشمیر رونق افروز ہوئے ۔ اور ایک عرصہ تک کشمیر میں قیام فرما کر خلقِ خدا کو مستفید فرمایا ۔ اور بظاہر کشمیر کے انقلاب میں اکبری افواج کی امداد اور اعانت فرمائی ۔ جس کے باعث اکبر بادشاہ آپ کا بہت اعزاز کرتا تھا ۔

لہ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۳ جلد ۱

کشمیر سے ہندوستان تشریف لائے۔ لاہور، دہلی اور آگرہ میں اکثر قیام رہا شاہی خاندان کی مستورات تک آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھیں۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں آپ کا شاہی خاندانوں میں کافی رسوخ رہا۔

بارہا آپ سے کرامتوں کا ظہور ہؤا۔ بخارا، وخش، کابل، کشمیر میں اصلاحی تحریکات کے باعث آپ کو مقامی حکام سے اکثر مقابلہ کرنا پڑا، اور یہی مقابلہ ان مقالات کا سبب ہوتا رہا۔

آپ کے چھ فرزند مشہور ہیں۔

فرزندانِ گرامی ۱: خواجہ تاج الدین خاوند۔ جو جامع علم وعمل تھے اور تمام عمر کسی کبیرہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ۲: خواجہ خاوند احمد، جو والد ماجد کے بعد جانشین ہوئے۔ ۳: خواجہ خاوند محمد۔ ۴: خواجہ خاوند معین الدین۔ جامع کتاب رضوانی۔ یہ تمام علوم دینیہ میں حضرت عبدالحق محدث دہلوی کے شاگردِ رشید تھے۔ ۵: خواجہ خاوند قاسم۔ ۶: خواجہ بہاؤالدین خاوند۔ جو والد صاحب کی وفات کے بعد منصب شاہی سے استعفیٰ دے کر والد صاحب کے مزار پر گوشہ نشین اور مجاور ہوگئے۔ تقریباً سو سال کی عمر پا کر بارہ شعبان ۱۰۵۲ھ (ایک ہزار باون) کو رحلت کی۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی نبیرہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ اسرارہم (خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری بلخی) کے خلیفہ ہیں۔ علم و عمل میں شہرہ آفاق، سلسلہ چشتیہ کے عظیم الشان شیخ۔ وطن اصلی صدر پور[۲] تھا۔ الہ آباد میں قیام فرمایا۔ وہی آپ کا مرکز ارشاد و اصلاح رہا۔ وہیں زندگی گذار کر ۹ رجب ۱۰۵۸ھ (ایک ہزار اٹھاون) کو غروب آفتاب کے وقت یہ آفتابِ رشد وہدیٰ[۱]

---

[۱] تذکرہ علماء ہند ص۱۷۵ و خزینۃ الاصفیاء ص۴۲۰ ج ۱۔ ایک دوسرے بزرگ شیخ محب اللہ اکبر آبادی یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ کا سنہ وفات بھی وہی ہے جو حضرت محب اللہ الہ آبادی کا یعنی ۱۰۵۸ھ۔

[۲] وطن اصلی او قصبہ صدر پور توابع خیر آباد من مضافات اودھ (تذکرہ علماء ہند ص۱۷۵)۔

غروب ہوگیا۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کے واسطہ سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علمِ تصوّف میں آپ اپنے زمانہ کے امام تھے اور صاحب تذکرہ کے الفاظ میں "مے سزد کہ شیخ محی الدّین بن عربی را شیخ اکبر دوے را شیخ کبیر گویند"۔

آپ کی مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

شرح فصوص عربی۔ شرح فصوص فارسی۔ رسالہ ہفت احکام۔ رسالہ غایۃ الغایات۔ مغالیط عامہ۔ سر الخواص۔ عبادۃ الخواص۔ طریق الخواص۔ عبادۃ اخص الخواص۔ مناظر اخص الخواص۔ رسالہ توبہ سہ رکنی۔ رسالہ وجودِ مطلق وغیرہ۔

دائرہ شاہ محبّ اللہ الہ آباد، آپ کے سجادہ نشینوں کا اب تک مرکز ہے۔ قاضی گیاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی، میر سید محمّدی فیاضی امروہی آپ کے مشہور خلفاء ہیں۔

شیخ محمد افضل و مُلّا محمود[۱] جونپوری | تلمیذ رشید شیخ محمد افضل جونپوری حکمت و فلسفہ کے بہترین ماہر، ۱۷ سال کی عمر میں تکمیلِ علوم کے بعد حلقۂ درس کو رونق زینت بخشنے لگے۔ فلسفہ میں شمسِ بازغہ اور بلاغت میں فرائد آپ کی مشہور اور مقبول تصانیف ہیں شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ میں آپ کا بہت اعزاز ہوا۔

آپ کو رصد بنانے کا شوق تھا۔ بادشاہ سے اس کے لئے امداد مانگی مگر چونکہ اس زمانہ میں بلخ و بخارا کی جنگ درپیش تھی، بادشاہ اس طرف متوجہ نہ ہوسکا۔

شاہزادہ محمد شجاع آپ ہی کا شاگرد تھا۔

۹ ربیع الاوّل ۱۰۶۲ھ (ایک ہزار باسٹھ) میں آپ کا انتقال ہوا شیخ محمد افضل جونپوری ابھی زندہ تھے۔ آپ کو اپنے شاگردِ رشید کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے

---

[۱] مآثر الکرام ص۲۰۲ جلد ۱

بعد آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ انتہا یہ کہ چالیسویں روز حضرت استاد کا بھی وصال ہو گیا۔ کسی نے خوب تاریخ کہی۔

ز محمود و افضل بگو آہ۔ آہ

۱۰۶۲

قاضی محمد اسلم[۱] و مرزا زاہد ہروی کابلی

مولانا خواجہ کوہی خراسان کے مشہور بزرگ اور شیخ طریقت تھے۔ قاضی محمد اسلم انہیں کی اولاد میں تھے۔ سلطنتِ جہانگیری کے آغاز میں تحصیلِ علم کے ارادہ سے لاہور پہنچے۔ یہاں حضرت شیخ بہلول قدس اللہ سرہٗ کا حلقۂ درس تشنگانِ علوم کیلئے چشمۂ حیواں بنا ہوا تھا۔ تحصیلِ علوم کے بعد اکبر آباد (آگرہ) پہنچے۔ محفلِ جہانگیری میں باریاب ہوئے۔ اور چونکہ میر کلاں[۲] سے (جو جہانگیر کے اُستاد رہ چکے تھے) قرابت

---

[۱] مآثر الکرام ص۲۰۸ تا ص۲۰۹۔ انفاس العارفین ص۳۳۔ [۲] میر کلاں حضرت خواجہ کوہی کے نواسہ تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے تحصیلِ علم کے بعد میر جمال الدین محدث اور سید میرک شاہ سے حدیث شریف کی سند حاصل کی اور حرمین شریفین کی زیارت سے سعادت اندوز ہوئے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے بہت سے اکابر کی زیارت و صحبت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ جلال الدین اکبر بادشاہ نے آپ کا بہت اعزاز و اکرام کیا اور شاہزادہ سلیم کی تعلیم کے لئے آپ کو مامور فرمایا۔

حدیث و فقہ و قرأت کے مشہور عالم مُلّا علی قاری نے حدیث شریف کی سند آپ سے حاصل کی۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

ثم انی قرأت بعض احادیث المشکوٰۃ علی مبنع بحر العرفان مولانا الشہیر میر کلاں وہو اقرأ علی زبدۃ المحققین وعمدۃ المدققین میرک شاہ وہو علی والدہ السید السند مولانا جمال الدین المحدث صاحب روضۃ الاحباب وہو علی عمہ السید اصیل الدین الشیرازی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ایک سو سال کی عمر پاکر ۹۸۳ھ (نو سو تراسی) میں متوجہ دار البقاء ہوئے (مآثر الکرام ص۲۰۷ ج۱)

کا تعلق تھا، بارگاہِ شاہی میں آپ مقبول ہوئے۔ آپ کو کابل کا قاضی بنا کر بھیج دیا گیا۔

آپ نے نہایت دیانت داری اور خوش اسلوبی سے فرائضِ قضا انجام دیئے اور آپ کے زہد و تقویٰ نے عام شہرت اختیار کر لی۔

ایک عرصہ کے بعد جہانگیر نے آپ کو کابل سے واپس بُلا کر فوجی عدالت کا منصبِ قضا سپرد کر دیا۔

جہانگیر کے بعد صاحبِ قرآن ثانی شاہجہاں بادشاہ نے آپ کو اسی عہدہ پر بحال رکھا۔ مزید برآں ایک ہزاری منصب عطا فرمایا۔ آپ نے تیس سال تک اس منصب کی خدمات کمال دیانت سے انجام دیں اور ہمیشہ منظورِ نظر خسروانی رہے۔

سنہ ایک ہزار باون میں شاہجہاں نے خوش ہو کر آپ کو سونے سے تُلوایا۔

۱۰۶۰ھ (ایک ہزار ساٹھ ہجری) میں ایک روز افواج اور گھوڑوں کا شاہی معائنہ ہو رہا تھا۔ ایک چابک سوار ایک گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے قاضی صاحب کے پاس سے گذرا۔ قاضی صاحب اس سے بچنا چاہتے تھے کہ پَیر پھسلا اور آپ گِر گئے۔ بدن میں ضربِ شدید آئی۔ تقریباً چار ماہ تک صاحبِ فراش رہے۔ اس کے بعد اگرچہ صحت اچھی ہو گئی۔ مگر ابھی کام کرنے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ آپ نے کابل جانے کی اجازت چاہی۔

قدر شناس بادشاہ نے کابل جانے کی اجازت دی اور سابق منصب کو بحال رکھتے ہوئے کابل کی سرکاری جاگیر اور دس ہزار نقد عطا فرمایا۔ لیکن ابھی کابل نہ پہنچے پائے تھے کہ لاہور میں اوائل ۱۰۶۱ھ (ایک ہزار اکسٹھ) میں انتقال ہو گیا۔ اور وہیں آپ مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ۔

مرزا زاہد آپ کے فرزند ارجمند ہیں۔ ہرات میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور مُلّا محمد فاضل[1] وغیرہ علماء عصر سے علوم مروّجہ کی تکمیل کی۔ اور صرف

[1] مُلّا محمد فاضل بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے شباب میں اوّل کابل پہنچے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تیرہ سال کی عمر میں سفر فراغت حاصل کرلی، اور پھر اپنے علم وفن میں یکتاء روزگار ہوئے۔
ابتداء رمضان ۱۰۶۴ھ (ایک ہزار چونسٹھ) میں شاہجہاں کی جانب سے
کابل کی واقعہ نویسی پر مامور ہوئے۔ پھر اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار
پچھتر) میں اُردوئے معلّٰی (لشکرِ شاہی) کا محتسب بنا دیا۔ اس زمانہ میں آپ کا
قیام اکبر آباد میں رہا، اور اسی زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مُلّا محمد صادق حلوائی کی شاگردی کی۔ پھر توران میں پہنچ کر مُلّا مرزا جان
شیرازی کے فیضِ صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اور مرزا جان کے تلمیذ رشید مُلّا یوسف سے فنونِ حکمت و
فلسفہ کی تکمیل کی۔ پھر لاہور پہنچ کر مُلّا جمال لاہوری سے جو عربیت میں یکتاء زمانہ تھے، تفسیر و اصول
پڑھے۔ (انفاس العارفین)۔ علومِ عقلیہ ونقلیہ میں کامل ومکمّل ہو کر شاہجہاں بادشاہ کے پاس پہنچے اور
مطالبہ کیا کہ "ملک العلماء" کا منصب اور خطاب مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس
عہدہ اور منصب پر فائز تھے۔ شاہجہاں نے کہا۔ آپ دونوں صاحب مناظرہ کرلیں۔ جس کو زیادہ
قابل سمجھوں گا اُس کو "ملک العلماء" بنا دوں گا۔ مُلّا محمد فاضل صاحب نے بذاتِ خود مولانا عبدالحکیم صاحب
سے مناظرہ کرنے میں اپنی ہتک سمجھی۔ فرمایا کہ میرا کوئی شاگرد مولانا سے مناظرہ کرے گا۔ یہ کہہ کر دربار
شاہی سے رخصت ہوئے۔ اور سیدھے ہرات پہنچے۔ وہاں مرزا زاہد اپنے والد سے صَرف پڑھا
کرتے تھے۔ مُلّا فاضل نے اُن کو ذکی اور ذہین سمجھ کر اُن کے والد صاحب سے اجازت چاہی کہ
وہ خود ان کو تعلیم دیں۔ چنانچہ بہت تھوڑے عرصے میں مرزا زاہد کو عالم وفاضل کرکے اپنی ہمراہ
دربارِ شاہجہاں میں لائے۔ اور فرمایا۔ یہ میرا شاگرد حاضر ہے جو مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرہ کریگا
مولانا سیالکوٹی نے پہلی نظر میں تاڑ لیا کہ مرزا زاہد صاحب صَرف میں کچے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ہی فرمایا
اس بچہ سے صَرف کے صیغوں کے سوا اور کیا پوچھ سکتا ہوں اور پھر شافیہ کی ایک عبارت کا مطلب
پوچھ لیا۔ وہ عبارت مرزا زاہد کے ذہن میں نہ تھی۔ فرمایا کتاب دیکھ لوں۔ مولانا عبدالحکیم صاحب نے
فوراً فرمایا۔ "ابھی تک کتاب کی ضرورت ہے"۔ الغرض مُلّا فاضل اس مرتبہ بھی شکست کھا کر بے نیل و
مرام واپس ہوگئے۔ (ملفوظات عزیزیہ ص۸۳)۔

والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہ نے آپ سے منطق و فلسفہ کی تمام کتابیں پڑھیں۔ جس زمانہ میں شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ شرح مواقف پڑھتے تھے، مرزا صاحب نے شرح مواقف کا مشہور حاشیہ تحریر فرمایا۔ شرح تہذیب علّامہ دوانی اور رسالہ تصوّر و تصدیق مُلّا قطب الدّین رازی کے حواشی آپ کی مشہور تصانیف ہیں جو ہندوستان، بخارا، کابل وغیرہ کے عربی مدارس میں داخل درس ہیں اور ایک عرصہ تک ان کتابوں کو اتنی اہمیّت حاصل رہی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جبتک مرزا زاہد کی کسی کتاب پر حاشیہ نہ رکھتا ہو۔ کتبِ مذکورہ کے علاوہ شرح تجرید اور اشراقیوں کی کتاب "ہیاکل النّور" پر بھی مرزا صاحب کے حواشی ہیں۔

ایک عرصہ کے بعد آپ کو کابل کی صدارت تفویض ہوئی۔ پھر تمام منصبوں سے استعفاء دے کر گوشہ نشینی اختیار کی، اور تدوین و ترویجِ علوم کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

مرزا از مشرب صافی صوفیہ نیز بہرۂ تمام داشتہ اند۔ وصحبت یکے از اکابر ایں طریقہ دریافتہ[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مرزا صاحب کی فقہی قابلیت پر تنقید فرماتے ہیں:

مرزا زاہد را دخل در فقہ کم بود۔ امیرے شرح وقایہ مے خواند بے حضورِ جد بزرگوار (شاہ عبدالرحیمؒ) سبق نمے فرمود[2]۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے جس سے مرزا صاحب کی دیانتداری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] انفاس العارفین ص۲۴۴۔ [2] ملفوظاتِ عزیزیہ ص۸۲ بظاہر قضا اور احتساب کیلئے علیحدہ دستور العمل تھا جس کا محفوظ کر لینا کافی ہوتا تھا۔

مرزا زاہد نے رمضان شریف میں اپنے شاگرد رشید شاہ عبدالرحیم صاحب کی دعوت کی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں۔ میں مرزا صاحب کے مکان پر پہنچا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ ایک کباب فروش حاضر ہوا، اور کباب کا پورا خوان مرزا صاحب کے سامنے رکھ دیا کہ حضور کی نیاز ہے۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔

عزیز من! میں تمہارا پیر نہیں، اُستاد نہیں، نیاز کیسی۔ بظاہر کوئی اور غرض ہے، اس کو بیان کرو۔

کباب فروش نے پہلے تو یہی کہا کہ کوئی غرض نہیں، مگر جب زیادہ اصرار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس کی دوکان لبِ سڑک ہے، اور قاضی صاحب کے پیادے اُس کو وہاں سے اُٹھوانا چاہتے ہیں۔

بہر حال مرزا صاحب نے اس کی تسکین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ کل کسی متدین پیادہ کو بھیجوں گا جو تحقیق کر کے صحیح فیصلہ کر دے گا۔ اب آپ جائیے۔

کباب فروش! حضور افطار کا وقت قریب آگیا ہے۔ اب میں یہ کباب کہاں لے جاؤں۔ فروخت کا وقت بھی نہیں رہا۔ میں نے تو یہ آپ کے لئے ہی بنائے تھے۔ آپ ہی منظور فرمالیں۔

مرزا صاحب نے اپنے بچوں کے معلّم کو فرمایا کہ ان کبابوں کی قیمت طے کر کے مکان میں بھجوا دو اور قیمت ان کے حوالہ کرو۔ چنانچہ معلّم صاحب نے کباب فروش کو علیحدہ لے کر قیمت دریافت کی۔ کباب والے نے صرف آٹھ آنے مانگے۔ معلّم صاحب نے آٹھ آنے حوالہ کر دیئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں۔ میں نے معلّم صاحب سے کہا کہ یہ مال بہت زیادہ کا ہے۔ آٹھ آنے میں بھی اُس نے خوشامد میں دیا ہے۔ رشوت سے تو اب بھی خالی نہیں۔

میری یہ گفتگو مرزا صاحب نے سُن لی اور فوراً کباب فروش کو بُلوا کر دریافت

فرمایا۔ ان کبابوں پر کیا صرف ہوا ہے اور تمہاری محنت کتنی ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ بہرحال جب حساب کیا گیا تو ان کبابوں کی قیمت ساڑھے تین روپے ہوتی تھی۔ مرزا صاحب نے یہی قیمت اس کو دلوائی۔ اس کے بعد معلّم صاحب کو بُلا کر بہت ڈانٹا، اور فرمایا۔ تم چاہتے ہو، ہم روزہ حرام مال سے افطار کریں۔ یہ کونسی عقل مندی ہے اور کیا خیر خواہی ہے؟[1]

۱۱۱۱ھ (ایک ہزار ایک سو گیارہ) میں اس قاضی زاہد منش نے دنیاء فانی سے کوچ کیا[2]۔ رحمہ اللہ

میر سیّد طیّب بلگرامی قدس اللہ سرّہٗ

خلف رشید و صاحبِ سجادہ میر عبدالواحد بلگرامی[3]۔ ولادت روز یک شنبہ،

---

[1] انفاس العارفین ص۳۳ - [2] ماثر الکرام ص۲۰۶ جلد ۱ - [3] قصبہ بلگرام (مضافات لکھنؤ) گذشتہ صدیوں میں اہلِ علم اور اربابِ فضل رہا ہے۔ میر عبدالواحد اسی قصبہ کے سادات کرام میں ہیں مُلّا عبدالقادر بدایونی کے ہم عصر اور دوست ہیں۔ اس خاندان کا پورا تذکرہ مآثر الامرا، میں میر غلام علی آزاد نے (جو اسی سلسلہ شریف کی ایک شاخ ہیں) کیا ہے۔ آپ ذکی الطبع عالم، پاک باطن بزرگ اور صاحبِ تصانیف تھے۔ سلوک و عقائد میں آپ کی ایک کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ یعنی سنابل۔ اس کتاب کے متعلق شاہ کلیم اللہ چشتی کا مکاشفہ ہے کہ یہ کتاب بارگاہِ رسالت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں قبول ہوئی۔

آپ کو فن تصوّف سے اس قدر شغف تھا کہ آپ نے نحو کی مشہور کتاب کافیہ کو بھی تصوّف کی کتاب قرار دے کر اربابِ تصوّف کی زبان میں مبحث غیر متصرف تک اس کی شرح لکھی۔ اس کی تھوڑی سی عبارت درجِ ذیل ہے۔

الکلمۃ لفظ، اے ملفوظۃ علی ألسنتنا ومحفوظۃ لقلوبنا و بواطننا یعنی کلمہ توحید در مرتبہ اقرار بر زبانہا، ما ملفوظ است۔ و در مرتبہ تصدیق دلہا، مارا محفوظ، و در مرتبہ احوالِ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مقدار یک و نیم پاس نہم ربیع الاوّل ۹۸۶ھ (نو سو چھیاسی)۔

سیّد میر غلام علی آزاد بلگرامی کے الفاظ ہیں:

وے ذاتِ مقدّسے ست کہ اگر ثقلین باد ناز کندرے زیبد و اگر زمین و

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) باطنہا ماز و محفوظ۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اکتفا بذکر مرتبہ اقرار کرد و در معطوف محفوظ فرو گذاشت بحکم آنکہ حکم کردن بر اسلام و سبب جریان تکالیف احکام منوط و مربوط بمرتبہ اقرار است زقرینہ حذف محذوف از عبارت مصنف است کہ مے گوید۔ وضع لمعنی مفرد نہادہ شدہ است یعنی لازم گردانیدہ شدہ است قبولِ آں کلمۂ توحید بر رقاب و نواصی بجہت تحصیل معنی کہ فرد مجرد ست، از کفر و نفاق و معاصی۔ پس لفظ مفرد قرینہ حذف ست۔ زیراکہ افراد سہ مرتبہ دارد افراد از کفر و افراد از نفاق و افراد از معاصی فالافراد من الکفر فی مرتبۃ الاقرار والافراد من النفاق فی رتبۃ التصدیق و الافراد من المعاصی فی رتبۃ الاحوال لان من لقی ربہ تعالیٰ منہ حدا یبدل اللہ سیاتہ حسنات وآں کلمہ توحید سہ نوع ست یکے اسم چہ اقرار و تصدیق فقط اسمِ توحید و صورت اوست و فعل دوم فعل توحید و عمل اوست وآں دریافتِ احوال ست و حرف و سیوم حرف توحید ست و ایں توحیدِ عظمیٰ است کہ از استعدادِ انسانی بطرف ست۔ و از علامات آں ہر دو توحید مذکور بے نشاں و بے کیف کہ علامۃ الحرف خلوہ عن علامات الاسم والفعل انتہیٰ

علامہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں۔ مَیں نے کافیہ کی دو شرحیں اور بھی دیکھی ہیں جو حقائق کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ایک عربی زبان میں ہے۔ اس کے مصنف کا نام میر ابوالبقاء ہے۔ بظاہر وہ میر عبدالواحد کے معاصر ہیں۔ اور دوسری شرح فارسی زبان میں ہے۔ اُس کے مصنّف مُلّا موہن بہاری جو میر عبدالواحد سے متأخر ہیں معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے حقائقِ تصوّف کو ذہن میں پیوست کرنے کے لئے عجیب و غریب طرز تصنیف اختیار کیا تھا۔

بہرحال میر عبدالواحد کے علم و فضل زہد اور تقویٰ کی شہرت جب اکبر بادشاہ تک پہنچی اُس نے اپنے کسی معتمد کو بھیج کر میر صاحب کو طلب فرمایا۔ پورا پورا اعزاز و اکرام کیا اور پانچ سو بیگہ زمین بطور سیوغال مدد معاش (انعام) میر صاحب کو عنایت کی۔ سو سال سے زیادہ عمر پاکر شب جمعہ سوم ماہ رمضان ۱۰۱۷ھ (ایک ہزار سترہ) میں انتقال فرمایا۔ اناللہ۔ (مآثر جلد ا)۔

زمان برخود مالندے شاید۔

صاحب مرآۃ المبتدئین جو سید صاحب کے معاصر ہیں، فرماتے ہیں:

فی زمانہ قیامِ عالم اور برکت بنی آدم آپ کی ذات سے ہے قطبیت ابدالیت غوثیت یا اوتادیت غرض جو مرتبہ بھی ممکن ہو، وہ اُن کی ذات میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ عبادات کی یہ کثرت کہ گویا حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سینکڑوں کرامتوں کو ہمراہ لے کر ظہور فرما ہیں۔ ابتدار شعور سے آخر تک کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ائمہ سلف کی زیارت کرنی ہو تو سید طیب کی زیارت کافی ہے وغیرہ ذلک (مرآۃ المبتدئین)۔

میر صاحب نے صوری اور معنوی کمالات اپنے والد صاحب سے حاصل کئے اور وفات کے بعد والد صاحب کی خلافت وسجادہ نشینی کا حق کما حقّہٗ ادا فرماتے ہوئے سینکڑوں طالبانِ طریقت کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔

آپ اتباعِ سُنّت کے حریص تھے۔ تمام حرکات وسکنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل وشمائل آپ کے پیشِ نظر رہتے۔

معنوی تربیت کے ساتھ آپ علومِ ظاہری کی تدریس پورے انہماک سے جاری رکھتے۔ آپ نے ہدایہ اور تفسیر بیضاوی جیسی فقہ اور تفسیر کی انتہائی کتابوں کے حواشی تحریر فرمائے۔ (مگر افسوس طبع نہ ہوسکے) حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدّث دہلوی حضرت میر صاحب کے مخلص دوست تھے اور آپ کے علم وفضل کے اس قدر گرویدہ کہ دوستانہ بے تکلفی کے بجائے آپ کا بہت زیادہ احترام کرتے۔ سادہ نام لینے کے بجائے شیخ طیب کہا کرتے تھے۔ اپنے آخری زمانہ میں حضرت شیخ عبدالحق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز درس دے رہے تھے۔ ایک مشکل عبارت خود حضرت کے لئے موجب تامّل ہوگئی۔ آپ نے فرمایا۔ اگر اس وقت شیخ طیب ہوتے تو اس عبارت کو حل کر دیتے۔ حُسنِ اتّفاق سے سید صاحب اُسی وقت بلگرام سے دہلی رونق افروز ہوئے۔

شیخ عبدالحق صاحب کے لئے اس سے زیادہ مسرّت اور کیا ہوسکتی تھی - فوراً وہ عبارت سامنے رکھی گئی - میر سید طیّب نے کتاب ہاتھ میں لی - کسی قدر تامّل فرمایا اور پھر اُسی عبارت ایسی طرح پڑھ دیا کہ تقریر و بیان کے بغیر ہی اُس کا مطلب صاف ہوگیا۔

مولانا نور الحق صاحب خلف حضرت مولانا عبدالحق صاحب اُس زمانہ میں آگرہ میں عہدۂ قضار پر فائز تھے - حضرت شیخ عبدالحق صاحب نے سیّد صاحب سے دریافت کیا - آپ کس راستہ سے تشریف لائے ہیں ؟

سیّد صاحب : براہ آگرہ۔

حضرت شیخ : کیا وہاں نُور الحق سے ملاقات ہوئی ؟

سیّد صاحب : موانع سفر کے باعث ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔

حضرت شیخ : غالباً ایک مانع یہ بھی تھا کہ نُور الحق نے منصبِ قضار قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ نے اپنے صاحبزادہ کی تحسین و توصیف فرمائی - حتّٰی کہ ارشاد فرمایا۔

اگرچہ میرا لڑکا، میرا شاگرد اور میرا مرید ہے - لیکن اگر اس کو اپنے اُستاذ اور اپنے پیر کی عظمت دوں، تب بھی بجا ہے۔

حضرت سیّد صاحب شیخ کے سامنے سے اس طرح اُٹھے کہ گویا کپڑے اُتارنے کیلئے جا رہے ہیں اور خاموشی کے ساتھ باہر تشریف لاکر سیدھے آگرہ پہنچے - مولانا نور الحق صاحب سے ملاقات کی - حضرت شیخ عبدالحق صاحب اس غیبوبت سے متردّد رہے - اور جب واپسی پر پورا واقعہ معلوم ہُوا، تو حضرت سیّد صاحب کے عزم و ہمّت، جذبہ طلبِ حق و جستجو اہلِ حق اور آپ کے حُسنِ اخلاق سے بہت زیادہ متأثر ہوئے۔

بہر حال حضرت سیّد صاحب علم و فضل، زہد و تقویٰ اور کمالاتِ صوری و معنوی میں مقتدار زمانہ تھے - پنجم ماہ رجب ۱۰۶۴ھ (ایک ہزار چونسٹھ) کو جلوہ افروز

انجمنِ قدس ہوئے۔[1]

شیخ عبدالرشید جونپوری عرف شمس الحق قدس اللہ سرہ

از کبار اولیاء، و اعاظم ست شاگرد شیخ فضل اللہ جونپوری و مرید پدر خود شیخ مصطفٰے قدس اللہ اسرارہم۔

ابتداء میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اس کے بعد اس سلسلہ کو چھوڑ کر کتبِ تصوّف کے مطالعہ میں تمام وقت صرف کرنے لگے۔ شیخ محی الدّین ابنِ عربی کی تصانیف میں جن عبارتوں پر علماء شریعت کا اعتراض ہے اُن کی توضیح و تشریح کی۔

شاہجہاں بادشاہ نے آپ سے ملاقات کرنی چاہی۔ اپنے ایک مصاحبِ خاص کو منشورِ طلب حوالہ کر کے شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ مگر حضرت شیخ نے گنجِ عزلت سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔

فنِ مناظرہ میں رشیدیہ (جو عام طور پر داخلِ درس ہے)، تصوّف میں زاد السالکین (شرح اسرار الخلوۃ مصنفہ شیخ ابنِ عربی قدس سرہ) رسالہ محکوم (متعلق شرح بعض مواضع کلام ابنِ عربی) حواشی متفرقہ بر شرح مختصر عضدی۔ حواشی فارسی بر کافیہ۔ اور اوراد و وظائف میں مقصود الطالبین آپ کی تصانیف ہیں۔ شاعر تھے۔ شمسی تخلص تھا۔ سُنّتِ صبح پڑھ کر فرض کا تحریمہ کیا تھا کہ داعیِ حق کو لبیکِ اجابت کہہ ڈالی۔ سنہ وفات ۱۰۸۳ھ (ایک ہزار تراسی)۔

مُلّا شاہ بدخشانی

اصلی نام شاہ محمد۔ کنیت اخوند۔ لقب لسان اللہ۔ والد ماجد کا نام مُلّا عبدی۔

---

[1] مآثر الکرام ص۲۰۳ جلد ۱۔ مولانا غلام سرور صاحب چشتی نے سنہ وفات ۱۰۵۵ھ (ایک ہزار پچپن لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جائے ولادت موضع اوکسان۔ ضلع روستاق علاقہ بدخشاں۔ طلب حق کیلئے صغر سنی میں وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ کشمیر پہنچے۔ تین سال رہ کر ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں حضرت میاں میر بالا پیر کے حالات سُنے۔ اُن سے ملاقات کرنے کیلئے لاہور کا قصد کیا۔ مگر رفقار سفر نے مہلت نہ دی۔ مجبوراً آگرہ پہنچ گئے۔ جستجوئے شیخ کیلئے یہ سفر تھا جو ناکامی پر ختم ہوا۔ آگرہ سے نا اُمید ہو کر لاہور واپس پہنچے۔ حضرت میاں میر کے اوصاف و کمالات نے دل میں گھر کر لیا۔ دستِ بعیت دراز کیا اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ریاضت، مجاہدہ اور ترکِ دنیا میں حضرت میاں میر کے تمام مریدوں میں سب سے ممتاز تھے۔

کبھی کوئی غلام یا خدمت گار اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ کبھی مکان میں ہنڈیا نہیں پکی۔ کبھی چراغ نہیں جلایا۔ تجرد اور تفرد میں ساری زندگی گذار دی۔ حبسِ نفس میں کافی ملکہ حاصل کیا تھا۔ ساری رات میں صرف ایک سانس لیتے تھے۔ سات سال اسی طرح گذارے کہ پوری رات حبسِ دم کرتے ہوئے ذکر خفی کرتے رہتے۔ پوری رات میں صرف ایک سانس لیتے اور عشار کی وضو سے صبح کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ تمام عمر گاہے چشمش بخواب آشنا نشد۔ پھر اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ گاہے حاجتِ غسل لاحق حال وے نگردید۔

فرمایا کرتے تھے کہ احتلام یا مجامعت سے غسل واجب ہوتا ہے۔ میرے یہاں نہ نیند ہے نہ بیوی۔

علومِ ظاہری میں بھی کافی دستگاہ رکھتے۔ شعر و سخن سے بھی شوق تھا۔ چنانچہ آپ کا ایک دیوان ہے "دیوانِ مُلّا شاہ"۔

سلسلۂ قادریہ میں مراحلِ طریقت طے کر کے حضرت شیخ کی خدمت سے رخصت ہو کر گلگشت کشمیر کو وطن بنایا۔ آپ کے متقشفانہ کمالات نے بہت جلد خلقِ خدا کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا۔ مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہوا۔ حتیٰ کہ شاہزادہ داراشکوہ

بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوا۔

مدحِ صحابہ اور تبرا جس کو زمانۂ حاضر کی پیداوار سمجھا جاتا ہے کم از کم چار سو برس سے ہندوستان کو آماجگاہِ حوادث بنائے ہوئے ہے۔

مُلّا صاحب کو مدحِ صحابہ سے خاص شغف تھا۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح برسرِ مجلس فرمایا کرتے تھے۔ شیعی صاحبان بحث و تکرار کے لئے آپ کے پاس آتے مگر خداوندِ عالم نے آپ کو تسخیر کا یہ ملکہ عنایت فرمایا تھا، کہ جو رافضی آپ سے دوچار ہوتا، تائب ہو جاتا۔ اور سید الابرار (صلی اللہ علیہ وسلم) اصحابِ کبار اور حضرت غوثِ اعظم (رضی اللہ عنہم) کی زیارت حسِّ ظاہر سے کرتا۔ اس طرح سینکڑوں ہزاروں روافض کو تائب کر کے حلقۂ اہلِ سُنّت میں داخل کیا۔

نظریۂ وحدۃ الوجود مُلّا صاحب کا خاص مسلک تھا۔ اسی کی دوسری تعبیر ہمہ اوست ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انا الحق اور سبحانی وغیرہ الفاظ آسانی سے کہے جا سکتے ہیں۔ شاہزادہ دارا شکوہ اور مُلّا صاحب کے دوسرے خلیفہ شیخ ولی[1] عرف ولی رام ان تینوں کے دیوان، دیوان مُلّا شاہ[1]، دیوان دارا شکوہ[2]، دیوان ولی[3]، اسی نظریہ کی تلبیس آمیز اور گمراہ کن تعبیرات سے پُر ہیں۔ کفر و اسلام میں تمیز کا اُٹھ جانا غیر کو معبود سمجھ لینا، احترامِ معبود کے واجبی درجہ کا ساقط ہو جانا، فرائض اور واجبات سے خود کو آزاد سمجھ لینا، جو الحاد، زندقہ اور لادینی کے بنیادی امور ہیں وہ کتنا ہی اُونچا نظریہ سہی مگر عوامی سطح پر اس نظریہ کے عمومی نتائج ہیں چنانچہ دارا شکوہ کے جو عقائد و خیالات ہو گئے تھے، وہ آئندہ درج کئے جائیں گے (انشاء اللہ تعالےٰ) یہاں صرف یہ کہ مُلّا شاہ کے پیر میاں میر کو دارا شکوہ "باری تعالےٰ" کہا کرتا تھا۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] بعد ترک امیر الامرائی و مصاحبت شاہانِ چغتائی بخدمت آنحضرت آمد۔ و اندک زمانہ یگانۂ وقت گشت۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۱۷۹۔

چوں ایشاں در کوہ پایۂ نواحی قصبہ باری عزلت گزیدہ بودند من ایشاں را حضرت باری تعالیٰ مے گفتم[1] (معاذ اللہ)[2]۔

خود مُلّا شاہ نے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی کی ایسی تفسیر کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نماز ہی معاف کر دی تفسیر کے الفاظ یہ ہیں :

ای کسانیکہ ایمانِ حقیقی آوردہ اید، نزدیک نماز نشوید در حالاتِ سکر و مستی۔ مقید سکر حالت بلند تر ست از نماز گذاراں ..... اگر مستی مجازی ست، قرب نماز ممنوع ست تا نماز ملوّث نشود دریں صورت عزّت نماز ست و اگر سکرِ حقیقی ست باز ہم قربِ نماز ممنوع ست،[3] دریں صورت عزّت سکر ست مصلّی نماند نماز کے خواند۔[4]

مُلّا شاہ کے پیر حضرت میاں میر نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ الخ کے متعلق بتایا ہے کہ :

در حق خاصان ست۔ ختم ست بر دلہائے ایشاں کہ در دلِ ایشاں غیر نیاید، و چشمِ ایشاں غیر نہ بیند، و گوش ایشاں غیر نشود و

---

[1] حسنات العارفین ص۳۰ بحوالہ مقدمہ رقعاتِ عالمگیر ص۳۵۶۔ [2] اگرچہ توجیہ ممکن ہے، کیونکہ باری سے مراد اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ قصبہ باری مراد ہے مگر حضرت اور تعالیٰ کا اضافہ کر کے اشتباہ پیدا کر دیا کہ جس سے یہ ایک کفریہ کلمہ ہو گیا جس کو شریعت قطعاً ناجائز قرار دیتی ہے [3] ممنوع کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ سکرِ حقیقی کی حالت میں اگر مجذوبانہ کیفیت پیدا ہو گئی تو اس بنا پر کہ عقل و حواسِ ظاہری معطل ہو گئے ہیں، نماز ساقط ہو جائے گی۔ مگر اس بنا پر نہیں کہ سکرِ حقیقی کا احترام ہے بلکہ اس بنا پر کہ نظر شریعت میں جنون کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اسی لئے سالک کا مرتبہ مجذوب سے بدرجہا بلند ہے۔ [4] حسنات العارفین ص۳۲ بحوالہ مقدمہ ص۳۷۳۔

مرا ایشاں را لذت و حلاوت بسیار است ازاں کفر۔[1]

مُلّا شاہ کا ایک مشہور شعر ہے جس پر علماء کشمیر نے کفر کا فتویٰ بھی دیا تھا اور شاہجہاں بادشاہ سے شکایت بھی کی تھی۔

پنجہ در پنجۂ خدا دارم من چہ پروائے مصطفٰے دارم[2]

(معاذاللہ)

شاہجہاں کے آخری دورِ حکومت میں مُلّا شاہ کا انتقال ہوگیا۔ سالِ وفات ۱۰۶۹ھ (ایک ہزار انہتر)۔

شیخ محمد اسمٰعیل مدرّس سہروردی لاہوری

عرف میاں کلاں یا میاں وڈا قدس اللہ سرہ

خلف الرشید فتح اللہ بن سرفراز۔ قوم کھوکھر۔ ساکن موضع چنبھ۔ جو لبِ دریا چناب پر آباد تھا۔ ۹۹۵ھ (نوسو پچانوے) میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے بعد والد ماجد اس موضع سے منتقل ہوکر موضع لنگر مخدوم میں سکونت پذیر ہوگئے اور جب کہ اس فرزند ارجمند کی عمر پانچ سال ہوئی تو پدر مشفق نے اس بچہ کو مخدوم عبدالکریم قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پیش کردیا۔

مخدوم صاحب سلسلۂ سہروردیہ کے شیخ کامل تھے۔

حضرت مخدوم نے اس نونہال کی تربیت شروع فرمائی اور جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو درویشانِ خانقاہ کے لئے آٹا پیسنے کی خدمت سپرد کردی۔

---

[1] ایضاً۔ کفر کے معنی بھی عجیب وغریب ہیں۔ یعنی ایسی عبارت سے انکار کرنا جس میں غیراللہ کا تصوّر آتا رہے۔ یہ معنے عجیب اس لئے ہیں کہ شریعت کے خلاف ایجادِ بندہ ہیں۔ [2] تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۳۵۔ [3] خزینۃ الاصفیاء ص ۱۷۴ جلد ۱۔ [4] خزینۃ الاصفیاء ص ۱۰۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۲۴ میں آپ کا عرف میاں وڈا بتایا ہے۔

یہ دوازدہ سالہ بچہ وقت مقررّہ پر مقررّہ آٹا مطبخ میں پہنچا دیتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز تاخیر ہو گئی۔ جب حضرت مخدوم کو معلوم ہوا تو آپ نے کسی درویش کو چکّی خانہ میں دریافتِ حال کے لئے بھیجا۔ درویش نے دیکھا کہ میاں اسمٰعیل مشغولِ مراقبہ ہیں اور چکّی خود بخود چل رہی ہے۔ درویش صاحب نے عجیب و غریب حالت کی اطلاع فوراً حضرت مخدوم کو پہنچائی۔ جب مخدوم صاحب نے اپنے پروردہ نونہال کی یہ حالت خود آکر مشاہدہ فرمائی تو بہت خوش ہوئے، اور میاں اسمٰعیل اور ان کی چکّی کو بدستور چھوڑ کر واپس تشریف لائے۔ جب میاں اسمٰعیل نے مراقبہ سے سر اُٹھایا تو گھبرا کر اُٹھے اور آٹا مطبخ میں پہنچا کر حضرت مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مخدوم صاحب نے آج سے یہ خدمت ان سے موقوف فرما دی کہ آپ کے مشاغلِ عالیہ میں حرج ہوتا ہے۔ میاں اسمٰعیل مراحلِ سُلوک طے کرنے کے بعد دوسروں کو راستہ بتانے کے لئے حضرت مخدوم کے حکم سے خدمتِ مخدومہ سے رخصت ہوئے اور تقریباً دس کوس کے فاصلہ پر دریائے چناب کے کنارے ایک شیشم کے درخت کے نیچے قیام فرمایا۔

ایک سو چالیس سعادت مندانِ ازلی آپ کی خدمت میں اسی مقام پر حاضر ہوئے اور مراحلِ طریقت کی تکمیل کی۔ اس کے بعد جب کہ سن مبارک پینتالیس سال تھا کسی غیبی اشارہ کے بموجب اُس کُٹی کو خیر باد کہہ کر لاہور محلہ تیل پورہ میں رخت افگن ہو گئے اوّلاً چالیس روز تک پیر علی مخدوم گنج بخش ہجویری کی خانقاہ عالیجاہ میں معتکف رہے پھر اقامت گاہ پر تشریف لائے تعلیم و تلقین اور تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مشہور ہے کہ اس محلہ تیل پورہ کے قریب محلہ گنج پور میں ایک پُرانی مسجد تھی۔ ایک ہندو جوگی اس مسجد میں رہا کرتا تھا۔ چونکہ یہ جوگی باکمال تھا۔ کسی مسلمان کو ہمّت نہ ہوتی تھی اس کو مسجد سے نکالے۔ جب میاں اسمٰعیل صاحب وہاں پہنچے تو آپ نے جوگی صاحب سے مسجد خالی کر دینے کی فرمائش کی۔ جوگی نے کہا۔ مسجد کو مجھ سے محبّت ہو گئی ہے۔ اگر میں جاؤں گا تو مسجد بھی میرے ساتھ چل دے گی۔ یہ کہہ کر

مسجد سے چل دیا۔ جیسے ہی مسجد سے باہر قدم رکھا، مسجد میں جنبش[۱] پیدا ہوئی۔ حضرت میاں صاحب نے عصاء مبارک کو مسجد کی دیوار میں مارا اور فرمایا "ساکن شو" مسجد فوراً ساکن ہوگئی۔ جوگی نے جب یہ کرامت دیکھی، کان دبا کر چلا گیا۔ حضرت میاں اسمٰعیل صاحب نے اس مسجد کو اپنی خانقاہ اور درس گاہ بنایا اور یہیں سے رشد و ہدیٰ کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے۔ اور بقول مصنّف تذکرۃ العلماء والمشائخ یہی مدرسہ "درس میاں وڈا" کے نام سے ساڑھے تین سو برس گذر جانے کے بعد بھی آج تک جاری ہے۔ یہاں اندھے اور اپاہج طلبہ قرآن شریف اور فقہ کی تعلیم پاتے ہیں جنہیں کُل اخراجات خانقاہ سے ملتے ہیں۔ بقول مصنّف خزینۃ الاصفیاء، شاہجہاں بادشاہ کی کسی دایہ نے اس مسجد کو ازسرِ نو تعمیر کرا دیا۔ جو اب تک میاں صاحب کے مزار کی چار دیواری میں موجود ہے۔ پھر عالمگیرؒ نے خانقاہ اور مدرسہ کی مدد معاش کے لئے سات مواضع مع مزروعہ اراضی عطا کئے۔

قرآن پاک کا درس میاں صاحب کا خاص مشغلہ تھا اور جس کو خود قرآن شریف پڑھاتے تھے، پانچ چھ ماہ میں حافظ ہو جاتا تھا۔

ایک لطیفہ بھی ہے اور کرامت بھی، جو اس موقعہ پر ذکر کی جاتی ہے کہ ایک شخص حاضر خدمت ہوا کہ میری بیوی حافظ قرآن ہے اور مَیں اُمّی محض۔ مجھے بیوی مباشرت سے منع کرتی ہے کہ کلام اللہ کی بے حرمتی ہوگی۔

میاں صاحب نے فرمایا۔ چھ ماہ یہاں رہو۔ انشاءاللہ حافظ ہو جاؤ گے۔ اس

---

[۱] جوگی جیپال جو حضرت خواجہ غریب نواز، حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں تھا اس کے بھی اس قسم کے واقعات زبان زد ہیں اسی لئے حضرت مجدّد صاحب اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ فرماتے ہیں کہ خوارق اور اس قسم کے حیرت انگیز کارنامے دلیل بزرگی نہیں۔ انسان کی بہت سی پوشیدہ قوتیں ہیں جن کی اگر نگہداشت کی جائے تو اس قسم کے شعبدے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ فی زمانہ مسمریزم کے بہت سے کرتب ہمارے سامنے دکھائے جاتے ہیں، ان کا تعلق بھی مشق سے ہے۔ ۱۲

شخص نے نہایت عاجزی کے ساتھ اتنے عرصہ حاضری سے معذرت کی۔ آپ نے فرمایا۔ کل صبح ہمارے ساتھ نماز پڑھو اور داہنی طرف کھڑے ہو۔ چنانچہ نماز صبح کے بعد جب میاں صاحب نے سلام پھیرا تو جتنے شخص داہنی طرف تھے، حافظِ قرآن ہو گئے اور جو بائیں جانب تھے وہ ناظرہ خواں[1]۔

یہ شخص ایک نظر کیمیا اثر کی برکت سے حفظ کلام اللہ کی دولت لے کر اپنے گھر گیا۔

میاں صاحب فرمایا کرتے تھے۔ "ہماری خاکِ قبر سے بھی حفظِ قرآن کا فیض جاری رہے گا"۔ غلام سرور چشتی فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ بشارت صادق ہوئی۔ چنانچہ آپ کے بعد آپ کے برادر یک جدمی شیخ محمد صالح پچپن ۵۵ سال، پھر حافظ محمود صاحب بیالیس ۴۲ سال، بعد ازاں حافظ معز الدّین صاحب پینتیس ۳۵ سال، اس کے بعد حافظ شرف الدّین صاحب ساٹھ سال تک اسی جگہ حفظِ قرآن اور علومِ قرآنی کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔

حافظ شرف الدّین صاحب کی وفات ۱۲۷۲ھ (بارہ سو بہتر) میں ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حافظ احمد الدین صاحب اس دو صد سالہ خدمت کو ہمّت و استقلال سے انجام دے رہے ہیں اور تقریباً ایک سو پچاس بینا و نابینا متعلم اس مدرسہ معلّے میں علمِ قرآنی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جن کو دو وقتہ خوراک اور دیگر ضروریات کا انتظام مدرسہ سے ہوتا ہے۔

صاحبِ تذکرہ فرماتے ہیں:

مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دورِ تسلّط میں سکھ فوج نے مدرسہ کی عمارت کو بہت نقصان پہنچایا۔ جس کی تلافی مرمّت وغیرہ کے ذریعہ سے بعد کے مسلمانوں نے کی ہے۔

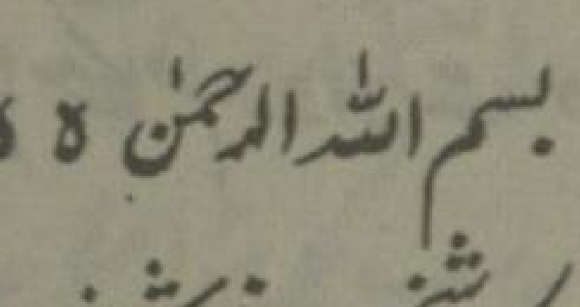
---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص۱۰۸۔ اس قسم کے واقعات اور بزرگوں کے بھی مشہور ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کرامات الاولیاء حق۔ واللہ اعلم۔

شیخ محمد صالح موصوف - شیخ محمد ہاشم - شیخ عبدالحمید و عبدالکریم قصوری -
اخوند محمد عثمان - اخوند محمد عمر - امانت خاں - حافظ عبداللہ ساکن کیوال - حافظ محمد فاضل -
حافظ اللہ بخش - حافظ محمد حسین آدادن - حافظ فتح محمد خوشابی - مولوی تیمور لاہوری -
میاں جان محمد[1] لاہوری - جان محمد ثانی متوفی ۱۱۲۰ھ - آپ کے سینکڑوں خلفاء میں
خاص شہرت رکھتے ہیں - جنھوں نے حضرت شیخ کے مسلک پر تعلیم و تدریس میں اپنی

---

[1] شیخ جان محمد سہروردی لاہوری متوفی ۱۰۸۲ھ (ایک ہزار بیاسی) - ابتدا میں آٹا پیس کر
اپنی زندگی بسر کیا کرتے تھے اور اس پر شاکر و قانع تھے - ایک روز میاں اسمٰعیل صاحب نے
از راہِ شفقتِ مرشدانہ ایک تعویذ مرحمت فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اپنے گھر میں رکھو - جب
دنیاوی نعمتوں سے سیر ہو جاؤ تو تعویذ واپس کر دینا - مسبب الاسباب نے ایک ہی دفعہ
میں غیب سے بہت سا ایسا سامان کر دیا کہ ان کی پریشانیاں دُور ہو گئیں - آپ نے تعویذ حضرت
شیخ کی خدمت میں واپس کر دیا - البتہ اس کی عام اجازت جناب میاں صاحب سے حاصل کر لی -
بموجب روایت مصنف خزینۃ الاصفیاء (ص ۱۰۵ جلد ۲) تعویذ حسب ذیل ہے :

بسم اللہ الرحمٰن ہ ہ ہ ہ ہ لے لے محصصد 

ایک شخص نے شیخ جان محمد صاحب سے تنگیٔ رزق کی شکایت کی - آپ نے فرمایا پنجگانہ
نماز (باجماعت) کے بعد قبلہ رُو بیٹھ کر سو مرتبہ سُبحَانَ اللہ ایک ہفتہ تک پڑھو - پھر آ کر
اپنی حالت بیان کرو - یہ شخص ایک ہفتہ کے بعد حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ آپ کی دعا سے دولتِ
لازوال دستیاب ہو گئی - فرمایا - ایک ہفتہ تک اور یہی عمل کرو - چنانچہ وہ ایک ہفتہ کے بعد
حاضر ہوا، اور عرض کیا - تمام دنیا کے دفونہ خزائن اب میری آنکھوں کے سامنے ہیں - مگر
لینے کو طبیعت نہیں چاہتی - اب یہی تمنا ہے کہ آپ اپنی غلامی میں منظور فرمائیں - چنانچہ
وہ شخص مرید ہو کر کاملینِ طریقت کے زمرہ میں سرفراز ہو گیا - واللہ اعلم -
(خزینۃ الاصفیاء ص ۱۰۵ - جلد ۲) -

زندگیاں صرف کیں۔ رحمہم اللہ

مولانا شیخ اسمٰعیل نے نوّے ۹۰ سال کی عمر پاکر پنجم ماہ شوال سنہ ۱۰۸۵ھ (ایک ہزار پچاسی) کشت زار دنیا سے گلگشتِ جنّت کی راہ لی۔ رحمہ اللہ قدس سرہ۔

خواجہ معین الدین خلف خواجہ خاوند محمود نقشبندی قدس سرہٗ

صاحبِ خزینۃ الاصفیاء کے الفاظ ہیں:

از عظماء مشائخ و کبراء علماء کشمیر جنّت نظیر است۔ در زہد و ورع و اتباعِ شریعت و ترویج نسبت و رفع بدعت ثانی نداشت در ہمہ علماء و صلحاء وقت تحریر و تقریرش مقبول و مشائخ عظام علماء کرام را رجوع تمام بخدمت وے بود۔ علماء عہد مثل مُلّا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر علّامہ و مُلّا ابوالفتح کلو و مُلّا یوسف مدرّس و مفتی محمد طاہر و مولانا عبدالغنی و مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ کہ در کشمیر علمِ شریعت مے افراختند، سر بر خط فرمان وے داشتند و با حکّام روایت و عدالت فتویٰ از وے مے جستند۔

آپ نے اپنے زمانہ کے علماء کی فرمائش سے علومِ شریعت و طریقت میں فتاوٰی نقشبندیہ، کنز السعادات و رسالہ رضوانی وغیرہ تالیف و تصنیف فرمائے۔

ظاہری اور باطنی علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کئے۔

وہی شیعہ سنی جھگڑا جو عہد اکبر میں فتح کشمیر سے پیشتر رونما ہوا تھا۔ جس کی قیادت شیخ یعقوب صوفی نے فرمائی تھی، آپ کے زمانہ میں پھر شعلہ افگن ہوا معاذ اللہ تبرّا کے خلاف عقل و تہذیب اور زہریلے مرض نے فضاءِ کشمیر میں وباء عام پیدا کر دی حق اور ناحق کی حمایت میں طرفین سے خوب بازار گشت و خون گرم ہوا۔ شاہجہاں

لہ خزینۃ الاصفیاء صلا۴۳ صلا۴۴ ج ۱۔

بادشاہ کا عہد معدلت مہد تھا۔ مظہر خاں حاکم و ناظم کشمیر تھے بمشکل بلوا فرو کیا گیا۔ قاضی محمد عارف اور قاضی ابو القاسم کا عدالتی بورڈ تصفیہ مقدمہ کے لئے بیٹھا۔ زیادتی اہلِ تشیع کی ثابت ہوئی۔ مگر اہلِ تشیع کا نرغہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ دونوں قاضیوں کی ہمت نہ پڑی کہ اہلِ تشیع کو سزا دیں۔

حضرت خواجہ معین الدین اور آپ کی جماعت نے جب محسوس کیا کہ مرعوبیت کے باعث یہ دونوں قاضی عدل پر کاربند ہونے میں تساہل کر رہے ہیں تو شہر کے تمام سنیوں کو لے کر ہجرت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اور مقام ہفت چنار پر آ کر قیام فرمایا۔ اور وہاں سے حضرت خواجہ نے نہایت سخت و درشت تحریر ناظمِ کشمیر کے نام لکھی۔

ناظمِ شہر اور دیگر حکّام پہلے ہی سے حواس باختہ تھے۔ تحریر پہنچتے ہی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہزار منّت و سماجت سے اس ہزاروں کے قافلہ کو شہر میں لے گئے اور پھر شیعوں میں سے :

> مردمانیکہ زباں بہ سب و تبرا، اصحاب دراز کردہ بودند۔ بسیار کس را بقتل رسانید۔[1]

یہ سب کچھ ہوا مگر حاکمِ کشمیر کو اپنی خفّت اور سبکی کا بہت زیادہ احساس تھا۔ اُس نے حضرت خواجہ کے متعلق بہت کچھ شکایتیں لکھ کر شاہجہاں کے پاس بھیجیں شاہجہاں نے حضرت خواجہ کو لاہور طلب کیا، اور وہیں قیام فرمانے کا حکم دیا۔

حضرت خواجہ نے بادشاہِ اسلام کی اطاعت ضروری سمجھی اور اپنی جگہ اپنے صاحبزادہ کو جانشین بنا کر خانقاہِ کشمیر کے فیض کو بدستور جاری رکھا۔

ماہ محرم ۱۰۸۵ھ (ایک ہزار پچاسی) میں حضرت خواجہ نے درِ عقبیٰ کو محلِ اقامت بنایا۔ رحمہ اللہ۔

شیخ عبد الخالق حضوری مجددی قدس سرہٗ | متوفی ۱۰۸۶ھ (ایک ہزار چھیاسی ہجری)

---

[1] خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۶۴۴ جلد ۱

حضرت آدم بنوری کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ کثرتِ حضوری کے باعث حضوری کا خطاب ہو گیا۔ خواجہ قطب خاں مصنف "تذکرۃ الاولیا" فرماتے ہیں کہ دارا اور عالمگیر کی جنگ جاری تھی۔ میں نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے کہ خداوندِ عالم عالمگیر کو تختِ سلطنت عطا فرمائے۔ میں ایک گاؤں خدّام کی نذر کر دوں گا۔ یہ سُن کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا۔ لشکرِ دارا کو شکست ہوئی اور عالمگیر تخت نشین ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ جب میں سلطان عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس واقعہ کا ذکر کر کے ایک گاؤں کے متعلق شاہی فرمان حاصل کر لیا، اور حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو پیش کرنا چاہا۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔ خدا کے لئے ہم نے امداد کی۔ نذرانہ قبول کرنا ہمارے مشائخ کا طریقہ نہیں۔ دولتِ دنیا کو پاکوب کر کے قُوتِ لَایَمُوت پر زندگی ختم کر دی۔ رحمہ اللہ۔

میر سیّد عبد الفتاح العسکری احمد آبادی از کبار اولیا رست مستجمع دانش رسمی و معنوی، فیض عام و قبول تمام داشت [1]

سلطان عالمگیر نے جب آپ کے کمالات کی شہرت سُنی تو احمد آباد سے دہلی طلب کیا اور خصوصی صحبتوں میں میر صاحب سے "برکات فراواں کسب نمود"۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد آپ بادشاہ سے رخصت لے کر وطن پہنچے اور چوبیس ذی الحجہ ۱۰۹۰ھ (ایک ہزار نوے) میں نوّے ۹۰ سال کی عمر گرامی کو حوالۂ اجل کر دیا۔ خواب گاہ احمد آباد ہے۔ مثنوی مولانا روم سے شغف تھا، اس کی شرح بھی تصنیف فرمائی۔

شیخ سعدی بلخاری مجددی لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز حضرت شیخ آدم بنوری قدس اللہ سرہ العزیز کے چہیتے اور دلارے خلیفہ ہیں۔ لاہور کے قریب کسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال تک وہیں زندگی بسر کی۔ مگر مربّیِ اوّل ہی کوئی ایسا کامل تھا جس نے نماز وضو وغیرہ فرائض، ضروریات کے ساتھ سنن اور مستحبات بھی یاد کرا دیں۔ اور

---

[1] مآثر الکرام ص۱۰۱ جلد ۱

انہیں کا عادی بنایا۔ حضرت شیخ سعدی اسی آٹھ سالہ عمر میں ایک روز گاؤں سے باہر ایک کنویں پر وضو کر رہے تھے۔ کنواں لبِ سڑک تھا۔ مولانا حاجی سعد اللہ وزیر آبادی جو حضرت شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ کے خلفاء میں سے تھے اور بنور تشریف لے جا رہے تھے اپنے قافلہ کے ساتھ اس راستہ سے گذرتے ہوئے حضرت شیخ سعدی کو غور سے دیکھتے رہے۔

شیخ سعدی کے اس مکمّل وضو سے جس میں سنن و آداب کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا تھا، حضرت حاجی سعد اللہ صاحب کو بہت تعجّب ہوا۔ آپ نے اپنے رفقاء سفر سے اس کی تحسین فرمائی۔

حاجی سعد اللہ کا غور سے دیکھنا اور پھر اپنے احباب سے کچھ تذکرہ کرنا ہشت سالہ سعدی کے لئے بھی ایک نئی سی بات معلوم ہوئی۔ آپ نے حاجی صاحب کے ساتھیوں سے حاجی صاحب کی تعریف پوچھی۔ بتایا گیا کہ آپ شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ ہیں اور بنور تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ سُنتے ہی حضرت سعدی اس قافلہ کے پیچھے پیچھے ہو لئے، اور اس طرح کہ کسی پر ظاہر بھی نہ کیا کہ وہ اُن کے ہمراہ ہیں یا بھُوکے پیاسے ہیں۔

بنور پہنچ کر حاجی سعد اللہ صاحب مع رفقاء سفر حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ صاحبزادے بھی انہیں حضرات کے ہمراہ ایک کنارہ پر بیٹھ گئے۔

حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز نے ہر ایک صاحب سے علیحدہ علیحدہ خیریت دریافت فرمائی۔ آخر میں جب صاحبزادہ کا نمبر آیا تو حاجی سعد اللہ صاحب نے فرمایا یہ بچہ بھی ہمارے ساتھ چلا آیا۔ اس کی حالت بھی عجیب ہے۔ حضرت شیخ آدم نے فوراً بات کاٹ کر فرمایا۔ یہ مت کہو کہ یہ بچّہ بھی ہمارے ساتھ آگیا بلکہ یہ کہو کہ ہم اس بچہ کے ہمراہ آئے ہیں۔ یہ بچہ سعادت مند ازلی اور مقبولِ لم یزلی ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ آدم نے صاحبزادہ کی طرف متوجّہ ہو کر نام دریافت

فرمایا۔ اور جب معلوم ہوا کہ سعدی نام ہے تو نہایت مسرت کے ساتھ بار بار فرمایا۔

"سعدی، ہر جا کہ باشی، سعدی، ہر جا کہ روی سعدی، در دنیا سعدی، در عقبےٰ سعدی"۔

بہرحال بہت زیادہ عنایت اور نوازش فرمائی، اور اپنے ہمراہ حرم سرا میں لے جاکر گھر والوں سے فرمایا:

"ایک نوعمر لڑکا آج آیا ہے جو بچپن ہی میں ولی کامل ہے۔ سیّد عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور سیّدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا نے اس کو اپنی فرزندی میں داخل فرمالیا ہے۔ اپنی بیعت سے مشرف فرماکر خدماتِ خاص پر مامور فرما دیا ہے"۔

یہ طفلِ نوخیز حضرت شیخ آدم کی خدمت میں جوان ہوا، اور مدارجِ رُوحانیت میں درجاتِ مشائخ پر پہنچا۔ ناگاہ حضرت شیخ آدم کو شاہجہاں بادشاہ کی جانب سے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ملا۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے بہت چاہا کہ اپنے رُوحانی تصرفات سے بادشاہ کو نقصان پہنچائیں۔ مگر حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز ہر ایک موقع پر مانع ہوتے رہے کہ اس جیسے معاملہ میں تحمّل لازمی ہے مسلمانوں کا بادشاہ ہے جو مخلوق کا خیرخواہ ہے۔

حضرت شیخ آدم کی روانگی کے بعد کچھ دنوں شیخ سعدی والدین کی خدمت میں حاضر رہے۔ پھر آپ بھی زیارت بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوگئے۔ میر منصور بدخشی جو پہلے شاہی امیر تھے اور اب حضرت شیخ آدم کے خادم تھے، شیخ سعدی کے ہمراہ تھے۔ حضرت شیخ آدم کے بعد دوسرے جہاز سے یہ دونوں صاحبان حجاز پہنچے اور حج بیت اللہ ساتھ ساتھ ادا کیا۔ پھر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے اور جب تک حضرت شیخ آدم زندہ رہے، شیخ سعدی انہیں کی خدمت میں حاضر رہے۔ شیخ آدم کی وصیت کے بموجب وفات کے بعد لاہور تشریف لاکر خدمتِ خلق اللہ شروع کردی۔ خود حضرت

شیخ سعدی کے قول کے بموجب آپ کے مریدوں کی تعداد آسمان کے تاروں کی طرح حد شمار سے خارج تھی۔ بہت سے جلیل القدر خلفا، میں آپ کے چار فرزند خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ خواجہ محمد سلیم۔ خواجہ محمد غنی۔ خواجہ محمد یوسف۔ خواجہ محمد عارف۔

چہار شنبہ سوم ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ (ایک ہزار ایک سو آٹھ) میں شبستانِ خاک کو ضیا بخشی[1]

حافظ سیّد عبداللہ قدس اللہ سرہ العزیز زاد بوم موضع کھیڑی (متصل بارہ) ضلع مظفر نگر۔ عہدِ طفولیت میں سایۂ والدین جُدا ہوگیا۔ دنیائے ناپائیدار کی یہ پہلی بے وفائی درسِ عبرت ہوئی۔ داعیۂ خدا طلبی نے ترکِ وطن اور صحرا نوردی پر آمادہ کر دیا۔

اطرافِ پنجاب کے ایک شاداب صحرا میں ایک خدا رسیدہ قاری صاحب نے مسجد بنا رکھی ہے۔ انسان کے شور وشغب اور دنیاوی جھگڑوں سے علیحدہ اس بیابان کی مسجد کو نشیمن بنائے ہوئے ہیں۔ رزاقِ حقیقی پر توکّل ذریعہ معاش ہے مشغلۂ بادیہ پیمائی نے جویارِ حق عبداللہ کو اس مسجد تک پہنچا دیا۔ یہ بیابان کی مسجد اور وہاں فرشتہ خصلت قاری صاحب گویا تارک دنیا عبداللہ کی تمنّا مجسّم ہوکر نمودار ہوگئی۔

سیّد عبداللہ قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی درخواست کی۔ قاری صاحب: ارشاد وتلقین دوسروں کا حصّہ ہے مجھے قرآن پاک یاد ہے، تم بھی یہی دولت حاصل کر لو۔

سیّد عبداللہ کی تمنّاؤں کی یہ پہلی کڑی تھی۔

کچھ دن نہ گذرے تھے کہ سیّد عبداللہ، حافظ قاری سیّد عبداللہ ہوگئے۔

صبح کا سہانا وقت ہے۔ افقِ آسمان کی پیشانی پر سنہری کرنوں کی سراسری فضاءِ آسمان کو عروسِ دلربا بنائے ہوئے ہے۔ قدرت کی نیرنگیوں پر گلہائے رنگ برنگ مسکرا رہے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان مصروفِ تسبیح ہیں۔ یہ اُستاد اور شاگرد کلامِ پاک کے دور میں مصروف،

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۵۲ جلد ۱۔

ہیں۔ استغراق اور انہماک نے حسبِ عادت حضرت قاری صاحب کی آنکھوں کو خوابیدہ بنا دیا ہے۔

ایک باوجاہت، باوقار، مقدّس صورت سردار گویا سرتاپا نُور، اس کے جلو میں عربی وضع سبز پوش، ادب اور تہذیب کے پیکر "مقدّس نفوس" کی جماعت نمودار ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر قاری صاحب کی قراءت کو خاموشی سے سُنتی ہے۔ نشاط اور مسرّت کے آثار ان بزرگوں کے مقدّس چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ رئیس جماعت کی مبارک زبان سے "بارک اللہ اَدّیت حق القرآن" کے پیارے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ پھر یہ جماعت واپس ہو جاتی ہے۔

اس جماعت کی جلالت و عظمت نے سید عبداللہ پر اثر ڈالا۔ وہ کھڑے ہو گئے مگر استماعِ قرآن کا ادب گفتگو کرنے سے مانع ہوا۔

قاری صاحب کی پُرکیف قراءت بدستور جاری رہی۔ حتیٰ کہ سورت ختم ہو گئی۔ ختمِ سورت کے بعد حضرت قاری صاحب نے چشم خواباں کو وا کیا۔ شاگرد سے خطاب فرمایا۔ یہ کون حضرات تھے جو اس وقت آئے تھے۔ اُن کی عظمت و جلالت سے میرا دل کانپ گیا۔ مگر ادبِ قرآن اُن کے احترام سے مانع ہوا۔

سید عبداللہ: نہیں معلوم کون حضرات تھے۔ البتہ جب ان کے سردار قریب پہنچے تو میرے لئے بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

استاد شاگرد یہی تذکرہ کر رہے ہیں کہ اسی وضع قطع کے ایک اور صاحب تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم آج شب اپنے اصحاب سے فرما رہے تھے اس صحرا میں جو حافظ صاحب رہتے ہیں، اُن کا قرآن پاک سُننے کے لئے صبح کو جائیں گے۔ کیا فخرِ موجودات یہاں تشریف لائے تھے؟ اب کہاں تشریف لے گئے۔

---

[1] اللہ برکت دے۔ آپ نے قرآن پاک کا حق ادا کر دیا۔

کہلا کر بھیجا :

زمین آسمان ، دوزخ جنّت غرض جس پر نظر ڈالتا ہوں ، اس کو معدوم پاتا ہوں حتیٰ کہ اپنے وجود کو بھی معدوم پاتا ہوں ۔ صرف ایک ذات حق جل مجدہ ہے اور وہ بے پایاں ۔ علماء طریقت نے اس کیفیت کو مدارجِ سلوک کی انتہا قرار دیا ہے جناب کا خیال کیا ہے ؟

حضرت مجدّد صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا :

یہ قلب کی ایک عارضی کیفیت ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے مقاماتِ قلب میں سے ابھی ایک چوتھائی کو طے کیا ہے ، تین درجہ اور باقی ہیں (اس کے بعد مقاماتِ قلب کی تفصیل فرمائی ہے[1]) ۔

شیخ ادریس نے جب حضرت مجدّد صاحب کا جواب مطالعہ کیا ، تو احترام کے ساتھ مجدّد صاحب کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہو گیا ، لیکن کچھ موانع ایسے پیش آئے کہ حضرت مجدّد صاحب کا دورِ ارشاد ختم ہو گیا ، اور شیخ ادریس اپنا اشتیاق پورا نہ کر سکے ۔ پھر اسی کے شکوک حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز سے گاہ بگاہ حل کرتے رہے ۔ جب حضرت شیخ ادریس کی وفات ہو گئی تو حضرت سید حافظ عبداللہ صاحب کو جاذبِ سعادت نے حضرت شیخ آدم کی خدمت میں پہنچایا ۔ جہاں سلسلۂ آدمیہ مجدّدیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔

سید عبداللہ صاحب کے چچا حضرت سید عبدالرحمٰن پہلے سے حضرت شیخ آدمؒ سے منسلک تھے ۔ اب یہ چچا بھتیجے ہمراہ رہنے لگے ۔ ایک سلسلہ کی شاہراہِ مستقیم پر تگاپو شروع کر دی ۔ چنانچہ حضرت شیخ آدم کے مکتوبات میں ان دونوں کے نام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ۔

سید عبداللہ صاحب روحانی کمالات کی برتری اور انتہائی بلندی کے باوجود اپنی وضع قطع اور اپنا طرز عام مسلمانوں جیسا رکھتے تھے ۔ صورت دیکھ کر اُن کے رُتبہ عالی کو

---

[1] ملاحظہ ہو انفاس العارفین ص۹ ۔

شناخت کر لینا مشکل تھا۔

خدمتِ خلق کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بوڑھی عورتوں کے مکانات پر جا جا کر اُن کے لئے پانی بھر دیتے، بازار سے اُن کا سودا لاکر دیا کرتے تھے اکثر ایسا ہوتا کہ باندیوں یا غلاموں کے مالک، جو کام باندیوں یا غلاموں کو بتاتے، اس کو آپ اُن سے لے لیتے اور خود کر دیتے، اور اُن کو ہدایت فرما دیتے کہ میرا نام نہ لینا۔ ممکن ہے تمہارے مالک تم پر خفا ہوں۔

جب حضرت شیخ آدمؒ کی خدمت میں پہنچے تو اشتیاق ہوا کہ خانقاہِ معلّٰی کی کوئی خدمت اپنے ذمہ لیں۔ مگر وہاں تمام خدمات احبابِ طریقت اپنے ذمّہ لئے ہوئے تھے۔ ایک عرصہ تک انتظار کیا۔ پھر دیکھا کہ جن صاحب کے ذمّہ یہ تھا کہ لکڑیاں چُن کر لائیں، وہ ضعیف، و کمزور ہیں بڑی خوشامد کے ساتھ اُن سے التجا کی کہ یہ خدمت میرے سپرد ہو۔ بہت اصرار کے بعد انہوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ لکڑیاں چُن کر لانے کی خدمت کے عرصہ تک آپ ہی ذمّہ دار رہے۔ جب حضرت شیخ آدم شاہجہانی حکم سے حجاز مقدس تشریف لے جانے لگے تو حضرت سیّد عبداللہ صاحب نے رفاقت کی درخواست کی۔ مگر منظور نہ ہوئی، اور ہندوستان میں رہ کر طریقہ کی خدمت سپرد فرمائی گئی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد جب آپ سے بیعت ہوئے تو حضرت حافظ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ نے مجھے ہندوستان میں آپ کی تربیت کے لئے ہی چھوڑا تھا۔ جس زمانہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اکبر آباد (آگرہ) میں مرزا زاہد سے کتب منطق پڑھا کرتے تھے، حضرت سیّد عبداللہ صاحب نے عالمِ قدس کا رُخ کیا۔

حصور ہونے کے باعث آپ نے شادی نہیں کی۔ خمول اور پوشیدگی کا ذوق اس قدر غالب تھا کہ وصیّت فرما دی کہ گورِ غریباں میں دفن کیا جائے۔ پھر یہ آپ کی کرامت تھی کہ لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ حافظ صاحب کی قبر کون سی ہے۔

استاد، شاگرد نشۂ نشاط اور جذبِ اشتیاق سے بے خود ہیں۔ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صحرا کو چھان ڈالتے ہیں۔ مگر یہ جستجو درحقیقت سُکر اور اضطرابِ شوق ہے ورنہ کہاں سرورِ کائنات اور کہاں جنگل کی جھاڑیاں۔

سیدنا ولی اللہ صاحب "انفاس العارفین" میں اپنے والد ماجد سے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس واقعہ کے بعد ایک عرصہ تک یہ صحرا ایک عجیب و غریب خوشبو سے معطر رہا۔

بہرحال حافظ سید عبداللہ صاحب نے حضرت قاری صاحب کی برکت سے حفظِ کلام اللہ اور قرارت و تجوید کے ساتھ تجرید و تفرید، ترکِ دنیا اور نفس و شیطان کی مضرّتوں سے محفوظ رہنے کے آداب اور طریقے بھی سیکھ لئے۔ اس کے بعد حضرت قاری صاحب نے حافظ عبداللہ صاحب کو رخصت کیا اور فرمایا۔ جاؤ تلاش کرو جہاں کوئی صاحبِ ولایت مل جائے، اس کی خدمت میں پوری جدّ و جہد کرو۔

حافظ عبداللہ صاحب اسی تلاش و جستجو میں سامانہ پہنچے، جہاں حضرت شیخ ادریس صاحب قادری فروکش تھے۔ حافظ عبداللہ صاحب نے اُن کی خدمت میں حاضری کی درخواست کی۔ شیخ ادریس صاحب نے فرمایا۔ آپ کہیں اور تشریف لے جائیے۔ دنیا میں درویش بہت ہیں۔ میرے پاس تو وہی رہ سکتا ہے جو زندگی میں مُردہ ہو چکا ہو، اور کھانے، پہننے، لباس پوشاک اور آمیزشِ حق سے کلیۃً منقطع ہو چکا ہو حافظ صاحب نے یہ تمام شرطیں منظور کیں اور حضرت شیخ کے توکّل کو سرمایہ بنا کر وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ شیخ ادریس صاحب نے نوجوان عبداللہ کی یہ استقامت دیکھی تو دل و جان سے ان کی تربیت پر متوجّہ ہوئے۔ شیخ ادریس صاحب کے فرزند ارجمند قرآن شریف پڑھتے تھے۔ یہ خدمت حافظ عبداللہ صاحب نے اپنے ذمّہ لی۔ جو شیخ کے ساتھ مزید تعلّق کا سبب بن گئی۔

حافظ عبداللہ صاحب کا بیان ہے کہ میرا طریقہ تھا کہ مَیں آنے جانے والے حضرات کی سہولت کے لئے استنجے کے ڈھیلے توڑ کر اور پتھر پر گھس کر رکھ دیا کرتا۔ ایک مرتبہ میرے دل میں اس خدمت سے ایک قسم کا ناز پیدا ہوا۔ جب مَیں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت شیخ نے فرمایا:

تم میرے بدن پر کچھ داغ زخموں کے دیکھتے ہو۔

جب مَیں مُرید ہوا تو ایک عرصہ تک حضرت مرشد کے استنجے کے لئے ڈھیلے اپنے بدن سے رگڑا کرتا، اور اس میں مجھے لذّت محسوس ہوا کرتی تھی۔ یہ داغ انہیں زخموں کے ہیں، جو ڈھیلے رگڑنے سے پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ سیّد عبداللہ قدس اللہ سرہ العزیز ہر پنجشنبہ کو شیخ مرشد اور اُن کے گھر والوں کے کپڑے ندی پر لے جاتے اور اُن کو دھو کر لایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ فاقہ تھا۔ جب کپڑے لے کر ندی پر پہنچے تو تمازتِ آفتاب کی برداشت نہ ہو سکی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

حافظ صاحب کا بیان ہے کہ ایک برقعہ پوش بزرگ پہنچے اور مجھے بیدار کیا۔ گرم گرم روٹیاں نکال کر مجھے دیں۔ میں نے کھانی شروع کر دی۔ ندی کا پانی گرم تھا۔ خیال آیا کہ ٹھنڈا پانی بھی ہو۔ اس بزرگ نے برقعہ کے اندر سے ٹھنڈے پانی کا کوزہ نکال کر مجھے دیا۔ مَیں نے سیر ہو کر پیا، اور خدا کا شُکر ادا کیا۔ کپڑے دھونے اور سُکھانے کے بعد جب حضرت شیخ کی خدمت میں واپس پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی فرما دیا۔

سیّدا! نان از دستِ خضر گرفتید۔ محمّدیاں را باید کہ منّتِ خضر را تحمّل نہ کنند۔

شیخ ادریس حضرت مجدّد صاحب کے ہمعصر تھے۔ جب حضرت مجدّد صاحب کے کمالات کی شہرت ہوئی، تو آپ نے حضرت مجدّد صاحب کی خدمت میں

لہ سیّد صاحب! حضرت خضر کے ہاتھ سے روٹی لے لی۔ محمّدیوں کو چاہیئے کہ خضر کا احسان اپنے سر نہ لیں۔

۱۱۳۰ھ (ایک ہزار ایک سو تیس) میں آپ کی وفات ہوئی۔ بلگرام میں مزار ہے۔

شیخ غلام[1] نقشبند لکھنوی قدس اللہ سرہٗ

بقول علّامہ آزاد بلگرامی :

علّامہ ایست جامع عجائب وغرائب علوم۔ وخدا رسے ست۔

خازن اسرار معلوم ومکتوم۔ وطن اصلی قصبہ کھوسی ضلع جونپور۔

والد ماجد شیخ عطار اللہ نے حضرت شاہ نقشبند کے رُوحانی اشارہ کے بموجب غلام نقشبند نام رکھا۔

میر محمد شفیع صاحب[2] قدس اللہ سرہ العزیز سے کسبِ کمالات کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیلِ عُلوم سے فارغ ہوگئے۔

ابتدا میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ دیکھا کہ سرورِ کائنات اپنے دستِ مبارک سے آپ کی اچکن کے بٹن کھول رہے ہیں۔ فوراً تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کے دروازے کُھل جائیں گے اِسی کی برکت تھی کہ آپ کے علم وتقدیٰ کی شان اس قدر بالا ہوئی کہ خود آپ کے شیخ میر محمد شفیع آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب حضرت میر محمد صاحب کی وفات ہوئی تو آپ کے متوسلین نے طے کر لیا کہ حضرت میر محمد شفیع صاحب کو آپ کا جانشین بنایا جائے گا۔ چنانچہ اسی غرض سے آپ کو دہلی سے لکھنؤ بُلایا گیا۔ آپ لکھنؤ تشریف لائے۔ سجادہ خالی تھا۔ ایک تاریخ مقرر کی گئی۔ عمائدین لکھنؤ تشریف لائے۔ لیکن

---

[1] ماثر الکرام ص۲۱۳ جلد ا۔ [2] شیخ پیر محمد لکھنوی قدس اللہ سرہ العزیز کے خلیفہ ہیں۔ شیخ غلام نقشبند کے والد ماجد شیخ عطار اللہ سے بھی کچھ استفادہ کیا تھا۔ اپنے زمانہ کے سربرآوردہ عالم اور مرشدِ کامل تھے۔ شاہجہان آباد میں قیام رہتا تھا۔ وہیں آپ کا مزار ہے۔ (ماثر)۔

جب دستارِ خلافت آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے نہایت ادب سے اس کو حضرت غلام نقشبند کے سر پہ آراستہ کر دیا، اور لجاجت کے ساتھ اس کی منظوری کی فرمائش کی۔ عمائدینِ لکھنؤ نے بھی حضرت میر صاحب کی تجویز پہ عمل کیا مگر یہ ایک ایسا فعل تھا جس کی اطلاع اس سے پیشتر خود غلام نقشبند صاحب کو بھی نہ تھی۔ بہر حال شیخ غلام نقشبند اپنے شیخ کے مرشد کے جانشین تسلیم کئے گئے۔ اور پھر آپ نے اس جانشینی کا پورا حق ادا فرمایا۔ علومِ ظاہری اور باطنی کے طلبہ کے لئے آپ مرجع اور ملاذ بنے۔ اور:

> جہانے را بہ یمن تربیت کمالات جہتین گراں مایہ ساخت۔ سلسلہ اکثر فضلاء عصر بآنجناب منتہی مے شود۔

آپ کی تمام تر توجّہ حفظِ شریعت میں مصروف رہتی۔ الحُبّ لِلّٰہ اور البغض للّٰہ کے بموجب جس سے بھی خلافِ شریعت کوئی حرکت سرزد ہوتی، آپ اس کو تنبیہ فرماتے۔ پھر اگر اس کو توبہ کی توفیق ہوتی تو پہلے سے زیادہ موردِ عنایات ہوتا۔ شاہ عالم بادشاہ نے آپ کو تشریف آوری کی تکلیف دی اور حد سے زیادہ اعزاز و اکرام کیا۔

تیس ۳۰ رجب ۱۱۲۶ھ (ایک ہزار ایک سو چھبیس) کو آپ کی وفات ہوئی۔ قرآن پاک کی متعدّد سورتوں کی آپ نے علیحدہ علیحدہ تفسیر قلمبند کی۔ اُس کے علاوہ تصوّف وغیرہ میں بھی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ رحمہ اللہ۔

شیخ احمد عُرف مُلّا جیون امیٹھوی نوّر اللہ ضریحہٗ

بن شیخ ابو سعید، بن عبداللہ بن شیخ عبدالرّزاق، بن مخدوم خاصہ قدس اللہ سرہ العزیز۔

مخدوم خاصہ قصبہ امیٹھی[1] کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا نسب شریف

---

[1] امیٹھی از توابع لکھنؤ۔ (مآثر ص۲۱۶ جلد ۱)۔

چند روز بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ایک ایسے شخص کو اپنی ہمراہ قبرستان میں لے گئے جو حضرت سید صاحب کے دفن میں شریک تھا۔ اس کو بھی یاد نہ رہا، کہ حضرت سید صاحب کی قبر کون سی ہے۔

قاضی محبّ اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہ

بحرے است از علوم و بدرے است بین النجوم[1]۔

جائے ولادت، محب علی پور از لواحق صوبہ بہار۔

عنفوانِ شباب میں دیارِ پورب کی سیاحت کی۔ اور جابجا چیدہ چیدہ حضرات سے ابتدائی اور درجاتِ وسطیٰ کی کتابیں پڑھیں۔ آخر میں سید قطب الدین شمس آبادی کی خدمت میں پہنچے اور اس قطب والا درجات کی رہنمائی سے درجاتِ تکمیل طے کئے زیورِ فضائل سے آراستہ ہو کر دکن کی جانب سفر کیا، اور بارگاہ خلد مکاں (عالمگیر بادشاہ) میں باریاب ہو کر لکھنؤ کے منصب قضاء پر فائز ہوئے۔ تھوڑے دنوں بعد اس منصب سے معزول ہو کر دوبارہ دکن کا رُخ کیا۔ اور حیدر آباد کے منصبِ قضاء کی خدمت پر مامور اور سرفراز ہوئے لیکن کسی خاص سبب سے معتوب ہو کر

---

[1] مآثر الکرام صـ۲۱۱۔ [2] ایضاً۔ [3] اصلش از سادات امیتی (امیٹھی) من مضافات اودھ ست۔ از وطنِ خود نقل کرده شمس آباد را مشرق انوار ساخت شمس آباد از توابع قنوج ست۔ سید علّامۂ تحریر و فہامۂ بے نظیر بود۔ تلمذ از فضلاء عصر نمود۔ آخر در حوزہ درس ملا قطب الدین شہید سہالوی در آمد و قسطے از علوم فرا گرفت۔ و فاتحہ فراغ خواند و در شمس آباد مسند افادہ گسترد، و جم غفیر را بافاضۂ دانش و بنیش مرتبہ کمال و تکمیل کرامت نمود۔ ملّا قطب الدین شہید مے فرمود۔ "کسے کہ خواہد مغز سخن را دریابد، سید قطب الدین را ادراک نماید۔ قریب ہفتاد سال عمر یافت۔ و در سنہ ۱۱۲۱ھ احد و عشرین و مائۃ و الف ورق حیات گرداند۔ (مآثر الکرام صـ۲۱ جلد۱)۔

یہاں سے بھی معزول ہو گئے۔ کچھ ارکانِ دولتِ عالمگیری کی سفارش سے عتاب سے نجات پاکر شاہزادہ رفیع القدر (ابن شاہ عالم بن اورنگ زیب) کے اتالیق مقرر ہوئے۔

جب شاہ عالم پیش گاہِ خلافت سے صوبہ قابل کی گورنری پر مامور ہوئے تو قاضی محب اللہ صاحب شاہزادہ کے ہمرکاب کابل پہنچے۔

حضرت سلطان عالمگیرؒ کی وفات کے بعد جب شاہ عالم سلطنتِ مغلیہ کے فرماں روائے اعظم اور مختار مطلق شہنشاہ ہو کر ہندوستان واپس آئے، تو قاضی صاحب کا اختر اقبال بھی اوج جلال پر پہنچا۔ جملہ ممالکِ محروسہ کی صدارت اور فاضل خاں کے پُرہیبت خطاب سے آپ کے فخر و مباہات میں چار چاند لگائے گئے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی۔ ۱۱۱۹ھ (ایک ہزار ایک سو انیس) میں شاہ عالم اکبرآباد پہنچے۔ اور قاضی صاحب منصبِ حیات سے ہمیشہ کے لئے معزول ہو گئے۔

سلم العلوم منطق میں، مسلم الثبوت اصولِ فقہ میں، رسالہ جوہر فرد مسئلہ جزء الایتجزّٰی میں آپ کی طبع وقاد کے نتائج ہیں۔ رحمہ اللہ۔

سیّد محمّدی قدس سرہ | ابن سیّد بدیع الدّین عرف سیّد بنھا بن سیّد تاج الدّین حجرہ نشین قدس اللہ سرہ بلگرامی تحصیلِ علوم ظاہری و تکمیل ملکاتِ باطنی کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ ابنِ سلطان عالمگیرؒ کی رفاقت اختیار کی۔ شاہ عالم آپ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ خلوت میں شاہ عالم بادشاہ سے باتیں ہو رہی تھیں آپ نے اثنارِ کلام میں بادشاہ کے زانو پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا۔ "ناظرِ مجلس" جو موجود تھا، اس نے تنبیہ کی کہ بادشاہ کے ساتھ گفتگو کے وقت یہ بے تکلفی خلافِ ادب ہے۔ بادشاہ نے ناظر کو منع فرمایا کہ اہل اللہ کی شان جُدا ہے۔ بقول مولانا آزاد:

بسیار عالی مشرب بلند حوصلہ بود و قوّتِ باطن بدرجۂ کمال داشت۔
ہر صاحبدلے کہ با او برمے خورد مطیع و منقادے گشت [1]۔

---

[1] ماثر الکرام۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اُمت خیر الامم جس نے افضل الانبیاء کی دعوت نبوت پر اجابت و قبولیت کی سعادت حاصل کی اور رب العالمین کے وہ پاک بندے جن کو کتابِ الٰہی کی وراثت کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ تین طبقوں پر منقسم ہے :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ○ (فاطر - آیۃ ۳۲)

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو منتخب کر لیا تھا، ان کو کتاب کا وارث بنایا۔ پس کچھ تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں (حق انتخاب کو ادا نہیں کرتے) اور کچھ معتدل ہیں اور کچھ بندے افعالِ خیر اور اعمالِ نیک پر سبقت کرنے والے ہیں۔ اللہ کے حکم سے یہ سبقت اور جھپٹنا ہی فضل کبیر ہے۔

وارثین کتاب کے طبقاتِ ثلاثہ میں یہ تیسرا طبقہ وہ اعلیٰ اور ارفع طبقہ ہے جو وصول الی الحق ہی پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ جادۂ حق میں سب سے آگے نکل جانا اور بڑھ جانا چاہتا ہے۔

یہی مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ صالحین سے مرتفع ہو کر مرتبۂ شہداء یعنی شاہدین حق تک پہنچتا ہے اور پھر مرتبۂ صدّیقیت تک پہنچ کر انسانیت کبریٰ کے آخری نقطۂ علو و ارتفاع و مرکز دائرہ نوع انسان و مبداء کمال و ارتقاء بشری یعنی مقامِ نبوت سے ملحق ہو جاتا ہے۔ پس کائنات ارضی اور نوع انسانی میں جماعت "من انعم اللہ علیھم" ان چار قسموں سے باہر نہیں۔

الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

یعنی وہ پاک بندے جن پر خداوند عالم نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء،

لے مقتبس از تذکرہ مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ بحذف و تغیر و ایضاح و تفسیر۔ محمد میاں

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔ صدیقین، شہدار اور صالحین۔

یوں تو عام طور پر یہ حقیقت واضح فرمادی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے

الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ ان کے لئے وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ نہریں چل رہی ہیں۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ط انہیں باغات میں رہیں گے۔ یہی ہے

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ○ "فوز کبیر" یعنی بہت بڑی کامیابی۔

لیکن طبقات ثلاثہ کا تیسرا طبقہ جو سبقت بالخیرات میں سابقین پر بھی بازی لے جاتا ہے۔ ان کو اس فوز کبیر سے آگے تقرب حضرت حق جل مجدہ سے نوازا جاتا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ سبقت کرنے والوں پر بھی سبقت کرنے

الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ والے، یہی ہیں جنات نعیم میں مقرب۔

یہی سبقت بالخیرات باذن اللہ ہے جس کو قرآن حکیم میں عزم امور فرمایا گیا۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

پھر عزم امور ہی کی وہ تقسیم ہے جس نے ایک دوسرے میدان میں اصحاب عمل کو دو جماعتوں میں منقسم کردیا۔ اور دوسرے نے پہلے سے اعلیٰ اور ارفع مرتبہ پایا۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ اہل ضرر (یعنی محتاجوں اور اپاہجوں) کے

الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ علاوہ وہ مسلمان جو جہاد میں حصہ نہیں لیتے

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اُن مسلمانوں کے برابر نہیں جو اپنے مال اور اپنی

اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ۔ جانوں سے راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔

اور اگرچہ یہ دونوں جماعتیں مومنین اور صادقین کی ہیں، اور اللہ نے ہر ایک سے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے۔ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ لیکن:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى غیر مجاہدین کے مقابلہ پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین

سیدنا صدّیق اکبر سے وابستہ ہے۔

مُلّا جیون قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ پورب کے متفرق قصبات میں رہ کر فضلاء عصر سے استفادۂ عُلوم کیا۔ آخر میں مُلّا لطف اللہ کوڑوی سے سندِ فراغت حاصل کی۔

کششِ طالع نے آپ کو عالمگیر تک پہنچایا۔ عالمگیر نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، اور پھر تمام عمر حد سے زیادہ اعزاز و احترام کرتا رہا۔ اسی طرح شاہ عالم خلف عالمگیر بھی آپ کے سامنے لوازمِ تکریم بجالاتا تھا۔

مُلّا صاحب سادہ وضع تھے۔ تکلّفاتِ رسمی سے قطعاً بے گانہ۔ مگر حافظہ نہایت قوی تھا۔ کتبِ درسی کی عبارتوں کے پورے پورے ورق حفظ یاد تھے۔ بڑے بڑے قصیدے ایک مرتبہ سُننے سے یاد ہو جاتے۔ آپ کے تبحرِ علمی کے متعلق آزاد بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں:

حاصل کلام الٰہی و در دانش عقلی و نقلی بحرِ لا متناہی۔

تمام زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کی۔

زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ تفسیر احمدی اور نُور الانوار آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ سنہ ۱۱۳۰ھ (ایک ہزار ایک سو تیس) میں کاشانۂ فردوس کو نشیمن بنایا۔ نعش مبارک دہلی سے امیٹھی لے جا کر دفن کی گئی۔ رحمہ اللہ و قدس سرہٗ۔

تفاوتِ مراتب

مقامِ مجدّدیت، خلفاءِ مجدّدی، اور معاصرین کرام

دورِ مجدّدی کے چند معاصرین کا ذکر مبارک سپردِ قلم ہوا۔ بہت سے حضرات کا ذکر باقی رہ گیا۔ نہ وقت میں اتنی گنجائش ہے، نہ اوراقِ کتاب میں اس قدر وسعت۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق ان حضرات کے دلچسپ تذکروں سے پُر

ہیں۔ جن کو پڑھ کر قلب پر ایک عجیب عالمِ وجد و محویت طاری ہو جاتا ہے، اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف انہیں پاکانِ حق کا ذکر کیجئے۔

خوش دلکش ست قصّۂ خوبان روزگار

تو یوسفی و قصّۂ تُو احسن القصص

صدیاں گذر گئیں۔ عشّاقِ حق کے ذکر میں آج بھی یہ تاثیر ہے نہیں معلوم ان کی پاک صورتوں اور پاک صحیفوں کی گہرائیوں اور دل ربائیوں کا کیا حال ہوگا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

جن معاصرین کا ذکر کیا گیا وہ نہایت اجمال کے ساتھ۔ خطرہ ہے کہ ان پاک رُوحوں کو اس کوتاہ نویسی کی شکایت نہ ہو۔

در مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند

چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

خیر یہ تو ایک حقیر تحریر پر بے جا ناز و تبختر ہے واقعہ تو یہ ہے:

من ہیچم و کم ز ہیچ ہم بسیارے   وز ہیچ و کم ز ہیچ نیاید کارے

البتہ ناظرین کو بجا سوال پیدا ہوگا کہ جب ان پاک بازانِ عشق مولیٰ کی زندگیاں بھی ریاضت، جفاکشی، مجاہداتِ فی سبیل اللہ، اعلانِ حق، تلقین و ارشاد وغیرہ وغیرہ کے گلہائے رنگا رنگ سے رشکِ چمن و گلشن بنی ہوئی ہیں۔ تو پھر حضرت مجدّد صاحب کی اتنی تعریف و توصیف اور مخصوص طور پر آپ کے لئے خطابِ مجدّدیت کا سبب کیا ہے۔

صفحاتِ سابق میں لفظ مجدّد، معنی مجدّد اور ضرورتِ مجدّد پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سطور ذیل میں اس مقام و حیثیت کی تشریح منظور ہے جو ایک مجدّد کو اپنے اقران و امثال پر ممتاز کر دیتی ہے۔

ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ لیس وراء ذلک حبۃ خردل من الایمان۔

یہاں ذکر اگرچہ صرف مبتدعین و محرفینِ شریعت کے برخلاف جہادِ ید و لسان کا ہے لیکن اصل تقسیم اس میں محدود نہیں۔ مقصود نفسِ عزیمت اور اسبقیت بالخیرات ہے۔ اور یہ کہ ہر میدانِ علم و عمل میں ایک درجہ عزیمت کا، ایک رخصت کا اور ایک ضعف و انحطاط کا ہوتا ہے۔ البتہ اس تقسیم کا سب سے بڑا میدانِ عمل مقامِ دعوت و تبلیغِ حق ہے۔ یعنی قیامِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ مبتدعین فی الدین اور اعداء حق و اسلام کا مقابلہ۔ احیاء سُنّت و اِخمادِ بدعت۔ علومِ نبویہ اور اسرارِ حکمۃ شرعیہ کا کشف و اظہار۔ یہی وہ فضل و امتیاز کی وادی اور وہ عقبۂ آزمائش ہے جس میں اصحابِ طریق کے ادبار و اقدام کا فیصلہ ہوتا ہے، اور مدارجِ ایمانیہ اور مراتب علمیہ و عملیہ کے جوہر کھلتے اور امتیاز پاتے ہیں۔

یرفع اللّٰہ الّذین اٰمنوا منکم والّذین اوتوا العلم درجات

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئے توحید

منزل گہ مردانِ موحد سرِ دار است

پس پہلا درجہ ہر حال میں السابقون السابقون اور مجاہدون بالعمل والجوارح کا ہے جو تمام جماعتوں پر شرف اور مزیّت رکھتے ہیں۔ اور ضعفاءِ طریق تو ان کے جولانِ کمال کی گرد و غبار بھی نہیں پا سکتے، اور پھر جس طرح ہر قسم و جماعت میں حسبِ حال و استعداد فرقِ مراتب و معارج ہوتا ہے۔ اسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب و مقامات ہیں اور کتاب و سُنّت نے اُن کے حالات و علامات بیان کئے ہیں۔ از انجملہ سب سے اعلیٰ اور افضل طبقہ ان اخص الخواص مزکّی کا ہے،

ؔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاد باللسان، جہاد بالسیف سے بڑھ جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ خود احکامِ شریعت جہاد بالسیف کی اجازت نہ دیں۔ چنانچہ حدیث مشہور ہے۔ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ وفی روایۃ کلمۃ عدل۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

جن کو قائدِ توفیقِ الٰہی اور سائقِ فیضانِ ربّانی عزائم اُمور کے لئے چُن لیتا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

اور جن کا نورِ علم و عمل مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ اور جن کا قدم طریق و منہاج نبوّت پر واقع ہوتا ہے، انہیں افرادِ خاصہ کو حدیث بخاری میں محدَّث (بالفتح) کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا۔ اور یہی مورد و مصداق حدیث مجدّد کے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظامِ حق و ہدایت کا مقوّم و منظّم ہے، اور انبیاء کرام کی اصلی وراثت انہیں میں منتقل ہوتی ہے۔

البتہ یہ مقام ازبس اعلیٰ و ارفع ہے، اور ہر عہد اور دور میں صرف چند نفوسِ عالیہ ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا قدمِ ہمت امتحان گاہ مصائب و مہالک سے آگے بڑھ کر وہاں تک پہنچتا ہے، اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عمل حق کو انجام دیتا ہے۔ اس کے لئے نہ تو مجرّد علم و تدریسِ کتب کام آتی ہے، نہ رسوم و ہیئاتِ زہد و انقطاع۔ نہ مدارس و معابد دینی کے غلغلہ و ہنگامۂ فضیلت کو اس میں دخل ہے، اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشۂ انزوا کو۔ ان کے عہد میں علماء و اصحابِ مشیخت کی کمی نہیں ہوتی اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اُجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے ان کا زمانہ علماء و مشائخ اُمّت کا سب سے بڑا مجمع و ماویٰ ہوتا ہے، اور آبادیوں کی آبادیاں اصحابِ علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں۔ تاہم مقامِ عزیمتِ دعوت و قیامِ ہدایت کی ان میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔ کوئی دامنِ رخصت میں پناہ لیتا ہے، کوئی گوشۂ انزوا و انقطاع میں اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے، کوئی راہ میں فتنہ و فساد کا شور سُن کر صرف اسی کو کافی سمجھتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کر لے۔ کسی پر اضعف الایمان کا درجہ تنزّل تسفل اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ زبان کو یکسر گنگ اور دستِ عمل کو یک قلم شل پاتا ہے۔ اور کسی کو نفس خادع اور خاطر فاسد ضلالت حیل و نفاق میں مبتلا کر کے سرگرم دنیا پرستی و

اَلْقَاعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ کو بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔

اور پھر اسی عزیمت اور سابقیت بالخیرات کے بنیادی فرق نے مجاہدین فی سبیل اللہ میں سے بھی منفقون قبل الفتح (فتح مکہؐ سے پہلے خرچ کرنے والوں) کو منفقون بعد الفتح پر فضیلت بخشی کہ ساری بڑائی سب سے قدم اُٹھانے والے کے لئے ہے، نہ کہ دوڑتے ہوؤں کو دیکھ کر دوڑنے والوں کے لئے اگرچہ چلنے والے قدم بہرحال بیٹھے ہوؤں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ط اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ط وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی ط	تم میں سے کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا جنہوں نے فتح مکہؐ سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی۔ یہ لوگ درجہ میں بہت بڑھے ہونے ہیں اُن کی بہ نسبت جنہوں نے فتح مکہؐ کے بعد خرچ کیے اور جہاد کیا اور ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔

بہرحال پاک سرشتان نیکوکار اور وارثانِ کتاب اللہ کے چند طبقات قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات نے ہمارے سامنے پیش فرما دیئے ہیں۔

ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ۔	اپنے نفس پر ظلم کرنے والے (فاسق و فاجر)
خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا یعنی مُقْتَصِدٌ	وہ لوگ جنہوں نے ایک نیک کام اور دوسرے بُرے کام کو ملا رکھا ہے۔ یعنی معمولی رفتار سے چلنے والے
سَابِقُوْنَ بِالْخَیْرَاتِ۔	اچھے کاموں پر جھپٹنے والے اور سبقت کرنے والے۔
اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ۔	سبقت کرنے والوں پر بھی سبقت کرنے والے۔

طبقات عاملین بالخیر کی توضیح و تشریح متعدد احادیث میں فرمائی گئی ہے۔ ازانجملہ مسلم شریف کی یہ حدیث ہے:

ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ من قبلی الا کان لہ فی امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ او یقتدون بامرہ۔ ثم انہا تخلف من بعدہم خلوف یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن لیس وراء ذٰلک من الایمان حبۃ خردل۔ (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)۔

"یعنی سُنّتِ الٰہی یہی ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت اُمّت میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جماعت حواری یا اصحاب کے لقب سے ملقب ہوتی ہے اور درس گاہِ نبوّت کی سب سے پہلی تعلیم یافتہ جماعت ہوتی ہے۔ یہ لوگ نبی کی سُنّت کو قائم رکھتے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی شریعتِ الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے اُس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیتے۔ لیکن ان کے بعد بدعات و فتن کا دَور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اسوۂ نبوّت سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ ان کا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے، اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے شریعت نے حکم نہیں دیا۔ سو ایسے لوگوں کے خلاف جس نے قیامِ حق و سُنّت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مومن ہے۔ جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے۔ جس سے جہادِ لسانی بھی نہ ہو سکا، صرف دل کے اعتقاد اور نیّت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں"۔

اس حدیث میں تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اصحابِ عزیمت کا۔ دوسرا اصحابِ رخص کا۔ تیسرا ضعفاء طریق کا۔ وذٰلک اضعف الایمان۔ اور اس آخری درجہ پر

دین فروشی کر دیتا ہے۔ غرض کہ سب کے سب یا ناچار مقام رخصت ہوتے ہیں یا واماندۂ ضعف و بے چارگی یا مدہوشِ غفلت و ہوا پرستی۔ ان میں سے ایک حصۂ غالب تو علمارِ سُو اور دُعاۃِ فتن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور جو جماعت علمارِ حق کی باقی رہتی ہے وہ بھی ضُعف کدۂ رخصت سے قدم باہر نہیں نکالتی اور حق پرستی کی بڑی سے بڑی بات اور تقویٰ و طہارتِ نفس کی بڑی سے بڑی فضیلت یہ سمجھتی ہے کہ اپنے قدم کو لغزش نہ ہو۔ اور جب کہ ایک دنیا امواجِ ظلمت و فساد میں ڈوب رہی ہے تو ہم کنارۂ سلامتی پہ قدم جمائے باقی رہ جائیں۔ گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور پچھلا درجہ عامہ ناس اور ضعفار عمل کے لئے تھا، وہی خواصِ اُمّت اور ہداۃ و مرشدینِ ملّت کے لئے بلندی و عروج کا سب سے اُونچا مقام ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑا متقی انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کے قدم "جہاد بالقلب" کی پائیں بساط سے پیچھے نہ ہٹیں لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزمِ ایمانی توقفُ و سکون کی جگہ جماعت و اُمّت بلکہ نوع و ارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو جس کا حوصلہ کار و عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہو جائے کہ خود نہیں ڈوبا۔ کیونکہ یہ تو ضعف و بے چارگی کا سب سے آخری درجہ ہے، فضیلت و کرامت اس میں کیا ہوتی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لئے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لئے موت ہو۔ جبکہ دنیا اُس کو سب سے بڑائی سمجھتی ہو کہ خود کنارے پر پہنچ جائیں، تو وہ بتلا دے کہ خود بچنا نہیں بلکہ ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لئے سمندر میں کُود پڑنا بڑائی ہے۔ اور جبکہ لوگ اپنے اپنے دروازے بند کر رہے ہوں تاکہ راہ کے فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائیں تو وہ اپنا دروازہ کھول دے کہ بند کر کے چھُپ رہنے میں فضیلت نہیں ہے بلکہ کھول کر باہر نکلنے میں اور اگر باہر امن نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دروازے کھولنے کا اصلی وقت یہی ہے، نہ کہ بند کرنے کا۔

مقامِ عزیمت و رخصت کا یہی وہ فرق ہے جو ایک صاحبِ دل نے خانقاہ کے گوشۂ عزلت سے نکل کر شیخِ شیراز کو بتایا تھا۔

گفت آں گلیمِ خویش بدر مے برد ز موج
دین سعی مے کند کہ ہر آرد غریق را

تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سُنّتِ الٰہی اپنی عادتِ جاریہ کے مطابق قیامِ حق و دفعِ باطل کے لئے سرگرم انبعاث وظہور ہوتی ہے اور توفیقِ الٰہی سے کسی اصلح و امثل بندے کے قلب کا عزیمت و دعوت کے لئے انشراح کر دیتی ہے اور اس کے قدمِ طریق کو منہاجِ نبوّت پر ثابت و مستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحابِ علم و فضیلت اور اربابِ صوامع و مدارس کو تنگنائے رخصت وضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضاء علو، ورفعت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سماء کمال وکرامت اپنی تمام بلندیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے دوڑتا ہے گویا آسمان اس کے لئے اُتر آتا ہے۔ اور زمین اس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے۔ اس کی ہمّت رفعت طلب اس کا حوصلہ متصاعد و متعارج کسی بلندی پر بھی نہیں رُکتا اور اُونچی بلندیوں کو بھی حضیض تسفل و تنزّل سمجھتا ہے۔

مقام عزیمت دعوت کی بلندی تک بڑے بڑے کار فرمایاں عہد کی نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتی تھیں، اور ضعفاء زبان و بے چارگانِ رخصت کے وہم و گمان کو بھی اس تک بار نہ تھا۔ اُس کا شہبازِ ہمّت اور سیمرغِ عزم اس کی چوٹیوں پر بھی پہنچ کر دم نہیں لیتا اور پیوستہ سرگرم بال افشانی و ہموارہ صفیر زنان بلند پروازی رہتا ہے۔ ولسان حالہ ینشد بھذا البیت:

بال بکشا وصفیر از شجر طوبےٰ زن
حیف باشد چوں تو مرغے کہ اسیر قفسی

پس اگرچہ اس عہد میں ہزاروں مدعیانِ کار موجود ہوں مگر اس فضیلتِ مخصوص میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہوتا۔ صرف اسی کو اس عہد کی اقلیمِ ہدایت کی سلطانی و فرمانروائی پہنچتی ہے، اور صرف وہی اپنے زمانے کا کلید بردار خزائن برکات و

فیضانِ سماویہ ہوتا ہے۔ تمام اصحابِ طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اسی مصباحِ ہدایت سے روشن کریں، اور تمام راہروانِ جادۂ مقصد مجبور ہوتے ہیں، کہ اسی کے کاروانِ فضل و قافلۂ کرامت کی بانگِ درا پر اپنے اپنے قدم اُٹھائیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہندوستان کے تین مجدّد

حضرت مجدّد الف ثانیؒ۔ شاہ ولی اللہؒ۔ شاہ اسمٰعیلؒ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام صاحب کے ایک تبصرہ سے اس باب کو ختم کیا جائے جو تفاوت درجات کی توضیح کرتے ہوئے تحریرِ سابق کا خلاصہ اور آئندہ کے لئے تمہید کی حیثیت رکھے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا مقام دوسرا ہے اور عزیمتِ دعوت کا دوسرا۔ ضرور ضرور نہیں کہ ہر راہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہدِ ظہورِ دعوت" میں ہزاروں اصحابِ علم و کمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازہ کھولنے والا صرف مجدّد العصر ہی ہوتا ہے اور اس کے ظہور کے لئے ضروری نہیں کہ عامۂ اصحابِ علم و حق بالکل معدوم ہو گئے ہوں۔ خود ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثالیں دیکھ لو۔

حضرت مجدّد الف ثانی شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہدِ جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخِ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسدِ وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجودِ گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔ معلوم ہے کہ اُس عہد میں بڑے بڑے عُلماء و

اصحاب خانقاہ موجود تھے۔ بدایونی، طبقات، روضۃ العلماء اور اخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔

علماء میں شیخ وجیہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ جلال تھانیسری، مُلّا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، مُلّا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدّث، مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا الہداد جونپوری وغیرہم اپنے وقتوں کے مالک اور علم و تعلیم کے بادشاہ تھے۔ بایں ہمہ دوسرے گوشوں اور کاموں میں اپنا اپنا وقت بسر کر گئے۔ اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اُٹھ سکا۔ شیخ عبدالحق محدّث رحمۃ اللہ کو تو حضرت مجدّد صاحب کے بارے میں سخت لغزش بھی ہوئی۔ اگرچہ آخر عمر کے اعتراف و رجوع نے تلافی کر دی۔ اصحابِ طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارفِ کامل خود دہلی میں بعہدِ اکبری مقیم رہے۔

لیکن وہ خود کہتے ہیں کہ مَیں چراغ نہیں ہوں۔ چقماق ہوں۔ آگ نکال دونگا، چراغ شیخ احمد سرہندی ہے۔

جو حالت اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام کابل، ترکستان و خراسان کی ہو رہی تھی، ان سب کے سامنے تھی۔ سب اس پر آہ و فغاں بھی کرتے ہیں مگر اس سے آگے معاملہ نہیں بڑھتا۔ ہندوستان میں بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوّف کا رنگ غالب تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہ تھی۔ لیکن تصوّفِ صالح کا جوہر پاک جہل و بدعت کی آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا بلکہ ایک طرح کی انانیت و مطلق العنانی تھی جس کو طریق باطن و اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ مُلک کا مُلک شریعت و علومِ شریعت سے بے گانہ محض۔ اور اصل حقیقت یک قلم معدوم۔ صرف خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑ بند تھی۔

دوسری طرف عہدِ اکبری کی بدعات تخت و تاجِ حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں، اور علماء سُوء و مشائخ دنیا پرست خود ان کے احداث و اشاعت کے نقیب تھے۔ کون تھا کہ اس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا۔ اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا۔ اور پھر نصرتِ الٰہی کے لشکروں اور نفوسِ باطنی کے سامانوں سے ایسا مسلح ہوتا کہ نہ شہنشاہ ہند کا تاج و تخت اس کی راہ روک سکتا، اور نہ وقت کی حکمرانی و فرمانروائی اس کے سلطان حق و سطوتِ الٰہی پر غالب آسکتی۔

خود حضرت موصوف ایک مکتوب میں اپنے فرزند کو لکھتے ہیں:

اے فرزند ایں وقت آنست کہ در امم سابقہ دریں طور وقتے کہ پُراز ظلمت ست پیغمبر اولوالعزم مبعوث مے گشت و بناء شریعتِ جدیدہ مے کرد۔ دریں اُمّت کہ خیر الامم ست و پیغمبر ایشاں خاتم الرسل علماء را مرتبہ انبیاء دادہ اند و از وجودِ علماء بوجودِ انبیاء کفایت فرمودہ اند دریں وقت عالمے عارفے تام المعرفۃ ازیں اُمّت درکارست، کہ قائم مقام انبیاء اولوالعزم باشد۔

فیضِ رُوح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

کچھ شک نہیں کہ توفیقِ الٰہی نے حضرت ممدوح کے وجودِ گرامی ہی کے لئے یہ مرتبہ خاص کر دیا تھا۔ انبیاء اولوالعزم کی نیابت و قائم مقامی یعنی مقام عزیمت دعوت کا خلعت صرف انہیں کے جسم پر چُست آیا۔ باقی جس قدر تھے یا تو مدرسوں میں پڑھاتے رہے یا موٹی موٹی کتابیں اور نئی نئی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے، یا پھر ان کی تضلیل و تکفیر کے فتووں پر دستخط کرتے رہے۔ وقت کا جو اصلی کام تھا، اس کو کوئی ہاتھ نہ لگا سکا۔

دوسری جلد کے چوتھے مکتوب میں لکھتے ہیں:

از حق الیقین و علین الیقین چہ گوید و اگر گوید نے فہم کند۔ ایں معاملات از حیطۂ ولایت نیست ارباب ولایت در رنگ علماء ظواہر در ادراکِ آں عاجز اند۔ ایں کار مقتبس از مشکوٰۃ نبوت ست کہ بعد از تجدید الف ثانی بہ تبعیت و وراثت تازہ گشتہ۔ صاحب ایں علوم و معارف مجدد ست الخ

یہ جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ وقت کا سلطان اور خزینہ دو نہیں ایک ہی ہوتا ہے، خواہ کوئی ہو اور کیسا ہی ہو۔ مگر اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں پا سکتا۔ تو یہ وہی حقیقت ہے جس کو بار بار حضرت ممدوح فرماتے رہے، اور ان سے پہلے بھی تمام محرمانِ راز نے اشارات کئے۔

مجدد آں ست کہ ہرچہ دراں مدت از فیوض بہ اُمت رسد بتوسط او رسد اگرچہ اقطاب و اوتاد آں وقت باشند۔

خاص کند بندۂ مصلحتِ عام را

حضرت شاہ ولی اللہ پھر بارھویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چکی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبارِ علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسلِ درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں جیسے بلادِ عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی۔ محمد ابن احمد سنادینی نجدی۔ سید عبدالقادر کوکیانی۔ شیخ عمر ناسی ٹیونسی۔ شیخ سالم بصری۔ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی۔ شیخ عبدالخالق زبیدی۔ شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کو شاہراہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے، اور حقیقتِ مستورہ کے شناسا و حق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورۂ آخر کے فاتح اور سلطان العصر ہونے کا

مقام تھا وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے لئے ہی تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ تھے، کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا، وہ صرف یہیں کے لئے تھا۔

تفہیمات میں اس معاملہ کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں جوشِ قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف یہی لکھ گئے ہیں۔ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں :

نعمتِ عظمیٰ بریں ضعیف آنست کہ اورا خلعت فاتحیت دادند و فتح دورہ بازپسیں بر دست وے کردند۔

تفہیمات میں لکھتے ہیں :

بر سرم در دادہ اند کہ ایں حقیقت بہ دم برساں کہ امروز وقت تست و زمان زمانِ تُو، وائے بر کسے کہ زیر لوا، تُو نہ باشد۔

اس باب میں اُن کے اشارات بے شمار ہیں۔ علی الخصوص تفہیمات میں کہ متعدد رسائل و مقالات اسی مقام کی شرح و تحقیق میں لکھے ہیں اور ان سب کے آخر میں ذوقِ باطن کے التہاب و اضطراب سے بے خود ہو کر اپنے معاملات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو۔ مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو۔ صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لئے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ کامل اور جامع ہے۔ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہُوا، تجدید و تدوینِ علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحابِ استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مثلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیقِ الٰہی نے یہ کام صرف حضرت علّامہ و مجدّد و شہیدؒ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب

کا بھی اس میں حصّہ نہ تھا۔

میخواست رستخیز ز عالم بر آورد
آں باغباں کہ تربیتِ ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو اُن کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔حضرت میر انصاری کا قول یاد رہے:

"من مرید خاقانی ام لیکن اگر خاقانی دریں وقت مے بود باوجود پیریش مرید مے کردم"۔

شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدمِ تحمّل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم:

بہ رمز نکتہ ادا مے کنم کہ خلوتیاں
سرِ سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاحِ اُمّت کے جو بھید پُرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے، اب اس سلطانِ وقت اور سکندرِ عزم کی بدولت شاہجہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گذر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے جن باتوں کے نکلنے کی بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب بر سرِ بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجّت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا یا حق پر چلنے والے اور حق کا ورد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکے۔

خود اس خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر اساتذہ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور

مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر اُن کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لئے تھا اور ایک ہی پر چُست آیا۔ دُنیا اس کے لئے خلعتِ عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ اُمیدواروں پر اُمیدوار یکے بعد دیگرے گذر رہے تھے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بار غم او عرض بہر کس کہ نمودم
عاجز شدہ ایں قرعہ بنامم ز سر افتاد

یہ تو وہی حقیقت ہے جو کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کر رہا ہوں یعنی اس وادی کا مرد ہر صاحبِ علم و عمل نہیں ہو سکتا ع

مردِ ایں راہ را نشانے دیگر ست

استاذی و شاگردی، نوعمری و کہولت، خانقاہوں کی دھوم دھام اور مدرسوں کا ہنگامہ، یہ ساری باتیں یہاں کے لئے بیکار ہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھوں، باعتبارِ علم و عمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا، اور بقدرِ طاقت دعوت و تذکیر و ارشاد خلق میں ساعی۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے اور عزیمتِ دعوت کا مقام دوسرا ہے۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

نہ ہر کہ طرف کلاہِ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئینِ سروری داند

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا، اور سر و سامان و اسبابِ کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیئے۔ اگر آدمی نہیں تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیئے۔ وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے جا کر کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا۔ بلکہ زمانہ آتا ہے تا کہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کر دوں۔ اللہ کی حکمت و ربوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں سے چُن لیتی ہے اور بحکم وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ، اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب و خوارق ان کے لئے مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی کا ساجھا ہوتا ہے نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

خلفاءِ مجدّدی کا سیاسی ماحول

شاہجہاں بادشاہ، داراشکوہ اور عالمگیر!

مذہبیت اور ترویجِ شریعت کا دَور

عمل اور ردِّ عمل کی ترتیب زمانۂ اکبری سے لے کر عہدِ عالمگیر تک حسبِ ذیل ہے۔

اکبر : لا مذہب۔

جہانگیر : مذہبیت اور لا مذہبیت میں متوسّط۔

شاہجہاں : مذہبیت میں پختہ۔ چشتیت اور مجددیت میں متوسط۔

عالمگیر : مذہبیت میں پختہ اور خالص مجدّدی۔

گذشتہ اوراق نے ثابت کیا کہ یہ تدریجی انقلاب، ثمرہ ہے حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جدّ و جہد اور قربانیوں کا۔

اکبر اور جہانگیر کے خیالات و عقائد درج کئے جاچکے ہیں۔ شاہجہاں اور عالمگیر کے متعلق یہ فریضہ باقی ہے۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس وقت ملک کے سامنے غلامی اور آزادی یا ملکی اور غیر ملکی اقتدار کا سوال نہیں تھا۔

بادشاہ ہندوستانی تھا۔ ہندوستان کسی مُلک کا باج گذار نہیں تھا۔ ہر ایک ہندوستانی خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ خود مختار پنچایتی نظام اس کے شخصی حقوق اور شخصی عزّت و حرّیت کا ذمّہ دار تھا۔

اس وقت اصلاح کے معنی صرف یہ[1] تھے کہ عوام النّاس، اراکینِ دولت اور

---

[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ولی اللہ نمبر میں حضرت مجدد صاحب کے اسی ایک نظریہ کی تشریح مندرجہ ذیل دفعات میں کی ہے۔ ۱: بادشاہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کی یک قلم موقوفی (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

خود سلاطین طے کرلیں کہ انفرادی طور پر پابندئ مذہب، اتباعِ سُنّت اور اجتماعی طور پر ترویجِ شریعت ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی تمام انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کا محور ہے۔

اس نظریۂ اصلاح کی کامیابی ثابت کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ شاہجہاں اور عالمگیر کے حالات پیش کئے جائیں۔

اگر یہ دونوں بادشاہ باربار اعلان کرچکے ہوں کہ ہمارا مقصود پابندی مذہب اور ترویجِ شریعت ہے تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہوجاتا ہے۔

ہم ان کو معصوم نہیں کہتے۔ ایک مسلمان سے کچھ غلطیاں، کچھ خلافِ شرع امور کا ارتکاب ممکن ہی نہیں بلکہ غیر معصوم فطرت کا عین تقاضہ ہے۔ لیکن تاہم اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ترویجِ شریعت کا مدعی جان بوجھ کر کسی دنیاوی مقصد کے لئے، خواہ وہ حکومت اور سلطنت ہی کیوں نہ ہو، خلافِ شرع کام کرے، اور بالخصوص عالمگیر کے سوانح حیات میں بھائیوں کا قتل اور باپ کی نظربندی جس پر اس کی اکیاون سالہ سلطنت کی بنیاد قائم ہوتی ہے، بظاہر ایسے قابلِ نفرت افعال ہیں کہ مذہب تو کیا انسانیت بھی گوارا نہیں کرتی کہ ایسے شخص کو معمولی درجہ کا خدا پرست بھی کہا جاسکے۔

اگر عالمگیر کو خالص مجددی کہہ دیا جائے تو کیا مجدد صاحب کی تعلیم کا تقاضا یہی تھا؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جس کے حل کے لئے ہمیں کسی قدر طوالت اختیار کرنی پڑے گی۔

شاہجہاں بادشاہ

ربیع الاوّل کا وہ مبارک مہینہ جو سیّد الکونین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۲: ذبیحہ گاؤ کی اجازت۔ ۳: بادشاہ اور ارکینِ دولت پر باجماعت نماز کی پابندی۔ ۴: عہدہ قضا اور شرعی احتساب کے محکمہ کی تجدید۔ ۵: تمام بدعات اور شرعی منکرات کا قلع قمع۔ ۶: غیر شرعی قوانین کی منسوخی۔ ۷: شکستہ اور منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر۔

کی ولادت مقدّسہ، بعثت، ہجرت اور پھر وفات کے تاریخی فضائل اور خصوصیات کا حامل ہے، ایک ہزار گردشوں[1] کے بعد اس کی آخری شب نے مخمل سیاہ کی چادر تان رکھی ہے۔

تاروں کو یہ ہزار سالہ جشن مناتے ہوئے پانچ ساعت اور بارہ دقیقے ہی گذرے ہیں کہ شاہزادہ جہانگیر کے حرم میں جودھ بائی عرف جگت گوشائیں دختر مہاراجہ اودھے[2] سنگھ راٹھور والی جودھ پور کے بطن سے شہر لاہور میں اخترِ برجِ خلافت نے طلوع کیا۔ جس کا نام دادا (جلال الدین اکبر) نے خرّم رکھا۔ جو کچھ عرصہ بعد جہانگیر کی زبان سے شاہجہان بنا۔ اور پھر اس کے اسی نام نے ابدی زندگی حاصل کی۔

چھٹی کے دن اکبر دولت سرائے جہانگیر میں گیا۔ مبارک باد کے بعد ظاہر کیا کہ میری خواہش ہے کہ اس نونہال کو مَیں اپنی فرزندی میں پرورش کروں۔ چنانچہ پوتے کو اپنے محل سرا میں لایا، اور سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کے سپرد کر کے کہا کہ تمہارے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس بچّہ کو اپنی

---

[1] توزک جہانگیری ص۔ اس کے بعد تحریر ہے: تاریخ ولادت اشرف حامل چندیں بشارت ست۔ از انجملہ ازیں کہ باستبشارِ سنّتِ الٰہی کہ بر سر ہزار سال در عالم جہانبانی بوجود آید کہ بہ معاونتِ توفیقِ ازلی رسوم مذموم بغی و جہالت از عرصہ جہاں براندازد۔ چنانچہ قبل ازیں بہ پانصد و شصت و پنج سال رموز شناس اسرار یزدانی افضل الدین حکیم خاقانی از طلوعِ ایں کوکب دولت و اقبال خبر دادہ واز محرومی دریافت و حسرت نایافت آں وقت قطعہ بر صفحہ روزگار یادگار گذاشتند۔ ابیات

گویند کہ بر ہزار سال عالم   آید بجہاں اہلِ کمالے محرم

آمد زین پیش و ما نزادہ زعدم   آید پس ازیں وما فرو رفتہ لغم

[2] (شاہ اکبر) دو نہصد و نود و چہار ہجری بدختر فرخندہ اثر راجہ اودے سنگھ کہ باصالت جاہ لشکر و دستگاہ از جمیع راجہاء ہند ممتاز بود نامزد ساختند، راجہ اودے سنگھ پسر راجہ مالدیو ست کہ راجہاء معتبر صاحبِ شوکت بود و شمار لشکرِ او بہشتاد ہزار سوار رسیدہ ۸۰۰۰۰ (ص۶ توزک)

اولاد کی طرح پرورش کرو۔

دادی نے مادری شفقت کے ساتھ اس کو تربیت کیا اور اکبر کی موت تک شاہزادہ خرّم اسی کی خدمت میں رہا۔ باپ جب اورنگ نشین ہوا تو اس نے بھی اس قابل فرزند پر سب سے زیادہ نوازش کی۔ ہشت ہزاری و پنج ہزاری سوار، دو اسپہ وسہ اسپہ اور علم وغیرہ کے علاوہ آفتاب گیر، سرخ بارگاہ وغیرہ سے نوازا "مہر اوزک"[1] اس کے حوالہ کی اور حصار فیروزہ کا علاقہ جاگیر میں دیا، جو مدّت سے اس خاندان میں ولی عہدوں کو ملا کرتا تھا۔

۱۰۱۹ھ میں مرزا حسین صفوی کی لڑکی سے نکاح ہوا۔ اور پھر ربیع الاوّل ۱۰۲۱ھ میں مرزا ابوالحسن آصف خاں کی لڑکی سے[2]۔ یہ دونوں نکاح جہانگیر نے اپنی تجویز سے کئے۔

دختر آصف خاں ایسی ادب شناس، سلیقہ مند، بادفا اور مزاج دان خاتون تھی کہ شاہجہاں کی سب سے زیادہ محبوب بیوی بنی۔ اور "نواب ممتاز الزمانی ممتاز محل بیگم" خطاب حاصل کیا۔

کارنامے | اکبر کی پالیسی ہر جگہ کامیاب رہا کرتی تھی۔ مگر خاندان اودھے پور نے

---

[1] بادشاہ کی عموماً دو مہریں ہوتی تھیں۔ ایک مدوّر یا بیضاوی جو چھوٹی ہوتی تھی۔ اس پر صرف بادشاہ کا نام ہوتا تھا اور اسے "اوزک" کہتے تھے۔ یہ صرف خاص خاص فرامین کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اور نہایت معتمد رکنِ دولت کے پاس امانت تھی۔

دوسری مہر مربع یا مدوّر لیکن بڑی ہوتی تھی۔ اس کے وسط میں بادشاہ کا نام ہوتا تھا، اور چاروں طرف آباؤ اجداد کے نام کندہ ہوتے تھے۔ چونکہ اس سے اپنی خاندانی بزرگی کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ اس لئے یہ مہر عموماً دوسرے سلاطین کو خطوط بھیجتے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں عام فرمانوں پر بھی ثبت ہونے لگی۔ (مق ص۲۴)

[2] اس کے نانا یعنی آصف خاں کے خسر کا خطاب بھی آصف خاں ہی تھا۔ مگر ان کا نام مرزا غیاث الدین قزوینی تھا۔

اپنا سرِ نیاز اکبری دربار میں کبھی خم نہیں کیا۔ اس ریاست کے مہارانا اپنا سلسلہ نسب نوشیرواں عادل سے ملاتے تھے۔ راجگانِ ہندوستان میں ان کا احترام یہ تھا کہ ریاست اودھے پور کے مہارانا ہندوستان کے مہاراجوں کی گدّی نشینی کے وقت انکی پیشانیوں پر اپنے انگوٹھا کے خون کا تلک لگایا کرتے تھے۔

اور اس کے بعد گدّی نشینی کے مراسم ادا ہوتے تھے۔ یہی وہ ریاست ہے جس کے اولوالعزم فرمانروا مہاراجہ سنگرام عرف رانا سانگانے بابری فوج کا مقابلہ موضع خانوہ (موجودہ فتح پور سیکری ضلع آگرہ) میں کیا اور خوب ہی دادِ شجاعت دی۔ اگرچہ یہ بابر کا اقبال تھا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔

اکبر کی دل رُبا پالیسی اودے پور کو مغلوب نہ کر سکی۔ لیکن شاہزادہ خرّم نے ۱۰۲۴ھ میں رانا کرن کو شکست دے کہ "اودے پور" کے زعفرانی عَلَم کو جو آٹھ سو برس سے گیلوت ٹھاکروں کے قلعوں پر مغرورانہ لہرا رہا تھا، نیچا کر دیا۔

اس مہم میں شاہزادہ خرّم کے ساتھ ہندو راجا بھی تھے۔ رائے سندر داس کو "سِردہی" کی جانب شاہجہاں نے بھیجا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر اپنی راجپوت فوج کے ساتھ بہادری کے جوہر دکھائے۔ یہ لوگ بادشاہ کی حمایت میں اس قدر سرشار تھے کہ خود اپنے دین و آئین کا بھی خیال نہ کیا اور رانا کے بت خانوں کو مسمار کیا۔ بتوں کو توڑا۔

بدلہا چناں مہر او خانہ ساخت   کہ ہندو بتخریب بتخانہ تاخت

(تاریخ ہندوستان جلد ہفتم صک)

راجہ کرن امیروں کی سفارش کی مدد سے دربارِ جہانگیری میں حاضر ہُوا اور نذر گذرانی۔ جہانگیر نے خلعتِ گراں بہا اور منصب عطا کر کے مُلک واپس دے دیا کیوں؟ —— اس لئے کہ:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

اس نمایاں خدمت کے صلہ میں شاہزادہ خرّم کو شاہجہاں کا خطاب مرحمت

ہو کر شاہی تخت کے برابر کرسی پر بیٹھنے کی عزّت دی گئی۔

شاہزادہ نے قندھار، دکن اور گجرات میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور موردِ مراحمِ خسروانہ رہا۔

جب معاملاتِ سلطنت میں نُورجہاں کا اقتدار ہوّا، حتیّٰ کہ سکہ اور خطبہ میں اس کا نام شامل کیا گیا تو شاہزادہ کی وہ خاطر اور مدارات نہ رہی۔ انتہا یہ کہ اس کی جاگیر منتقل کر دی گئی۔ شاہجہاں بغاوت پر مجبور ہوّا، اور جہانگیر کی وفات تک پریشان پھرتا رہا۔

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے داعیِ اجل کو لبّیک کہا اور ۸ جمادی الثانیہ کو شاہجہاں نے تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی اسلامی ریاستیں دہلی کی باجگذار ہوئیں اور احمد نگر کی سلطنت مطیع ہوئی۔

ہندوستان کی دولت و ثروت نے بے انتہا عروج حاصل کیا۔ معلوم ہوتا ہے، سونے چاندی کا سیلاب تھا جو مُلک کے ہر گوشہ سے اُمنڈ اُمنڈ کر باشندگانِ ملک کو سیراب و شاداب کر رہا تھا۔ مُلک کا ہر ایک باشندہ چین اور آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور ہندوستان صحیح معنوں میں جنّت نشان بنا ہوّا تھا۔

بیشک ملک میں کبھی کبھی کسی صوبہ میں قحط پڑ جاتا ہے مگر جیسے ہی بادشاہ کو اطلاع ہوتی ہے، شاہی خزانوں کے تالے کُھل جاتے ہیں۔ جگہ جگہ لنگر خانے قائم کر دیئے جاتے ہیں اور ضرورتمندوں کو روپیہ کی تقسیم شروع ہو جاتی تھی۔

ہر سال بادشاہ دو مرتبہ سونے، ریشم، خوشبو وغیرہ بارہ چیزوں سے بارہ بارہ مرتبہ، اور جملہ شاہزادے جو تین سال یا تین سال سے زائد ہوں نیز شاہزادیاں اور بیگمات سال میں ایک ایک مرتبہ انہیں چیزوں سے متعدد بار تولے جاتے ہیں اور یہ پچاسوں بلکہ سینکڑوں من سونا خاص انتظام سے فقراء اور محتاجوں کو بلاتفریق

مذہب و ملّت تقسیم ہوتا ہے۔ ایک مستقل محکمہ اس کے لئے قائم ہے۔

اس کے علاوہ بیس سالہ عہدِ حکومت میں ساڑھے نو کروڑ روپیہ خیرات و انعامات میں صرف کیا ۱۰۵۴ھ میں ایک قندیل مرصّع تیار کرا کر سیّد احمد سعید صاحب کے ذریعہ مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ یہ قندیل دراصل شمامہ عنبر تھا، جو قندیل کی شکل کا تھا (ستر تولہ وزن۔ قیمت دس ہزار روپیہ) اس پر سونا چڑھایا گیا اور جواہرات کے ریزوں سے مرصّع کیا گیا۔ بیچ میں ایک ۱۱۰ سو دس رتی کا ایک الماس جڑا گیا، جس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھی۔ قندیل کی مجموعی لاگت ڈھائی لاکھ روپیہ ہوئی۔ گُلِ محمّدی اس کا نام تجویز ہوا۔

فوج کشی کے وقت سپاہیوں کو سال سال بھر کی پیشگی تنخواہیں دی جاتیں اور علامی سعد اللہ جیسے منصف اور رحم دل وزیر کو یہی تاکید ہوتی کہ اگر کوئی سپاہی رہ جائے گا تو قیامت کو اس کی باز پرس تم سے ہوگی[1]۔

بہر حال داد و دہش، انعام و اکرام، عدل و انصاف، رحم و کرم، دشمنوں سے درگذر اور اس عقیدے میں کہ "درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست" اگرچہ خاندانِ مغلیہ کے تمام ہی شہنشاہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ مگر شاہجہاں کو مخصوص طور پر چند خصلتوں میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

(۱) عمارتوں کے سلسلہ میں اکبر آباد، دہلی، لاہور اور قندھار کی خوب صورت اور سر بفلک عمارتیں آج بھی اس کی نفاست پسندی، اور عالی حوصلگی کی زندہ مثالیں ہیں۔

تختِ طاؤس اور خیمہ دل بادل ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں مگر صفحاتِ تاریخ اُن کی قدر و قیمت کا پتہ دیتے ہوئے شاہجہاں کی فراخ حوصلگی کی شہادت دیتے رہتے ہیں۔

---

[1] صفحہ ۳۲۲ تاریخ ہندوستان جلد ۷۔

(۲) ملک گیری کی ہوس تیموری خاصہ ہے۔ اس لئے شاہجہاں کو بھی یہ شوق رہا۔ مگر بلند حوصلگی کی مندرجہ ذیل مثالیں شاہجہاں کا طرۂ امتیاز ہیں۔

(۱) **دشمنوں کی کمزوری سے فائدہ نہ حاصل کرنا** آغازِ حکومت میں قندھار فتح کیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ عباس صفوی والی ایران نے موقع پاکر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۵۱ھ میں شاہ عباس کا انتقال ہوگیا۔ اس کا نوجوان شاہزادہ عباس ثانی تخت نشین ہوا۔ موقعہ تھا کہ اس قدرتی انقلاب سے فائدہ اُٹھایا جاتا چنانچہ داراشکوہ نے اس کی درخواست کی۔ مگر شاہجہاں کی اس بلند ہمّت کی نظیر مشکل سے ملے گی کہ اس نے جواب دیا:

"ایک لڑکے کی سلطنت پر جس کے باپ کی حال ہی میں وفات ہوئی ہو، اور جس کی حکومت نے ابھی استحکام نہ حاصل کیا ہو، حملہ کرنا سلاطینِ نیک سیرت کے رویہ کے مخالف ہے[۱]۔"

(۲) **دشمن کی پریشانی میں امداد** نذر محمد خاں والی بلخ اگرچہ دوستی کا اظہار کرتا تھا مگر اس سے چند حرکتیں سلطنتِ مغلیہ کے خلاف سرزد ہوچکی تھیں اور اسی بنا پر شاہی فوجیں شاہزادہ مراد کی سرکردگی میں اس کے مُلک پر تاخت کر رہی تھیں۔ مگر شاہجہاں کو معلوم ہوتا ہے کہ نذر محمد خاں کے مُلک پر اوزبکوں نے غارت گری شروع کر دی ہے تو باوجودیکہ ڈپلومیسی کے لحاظ سے شاہجہاں کے لئے یہ بہت غنیمت ہے مگر شاہجہاں شاہزادہ مراد کو حکم کرتا ہے کہ نذر محمد خاں کے مقابلہ کو چھوڑ کر ان گستاخ باغیوں کو تنبیہ کرے جنھوں نے نذر محمد خاں کے ساتھ گستاخی کی ہے[۲]۔

(۳) اکبر کے زمانہ میں یورپ کا عیسائی مشن آیا تو اس کا اعزاز و اکرام کیا گیا۔ جہانگیر نے بھی کافی مدارت کی۔ لیکن شاہجہاں ان کا ابتدا سے مخالف تھا۔

(۴) اکبر اور جہانگیر کا تعلّق ایران سے نہ صرف دوستانہ بلکہ نیازمندانہ رہا۔

---

[۱] تاریخ ہندوستان صفحہ ۳۰۲ جلد ۷۔ [۲] تاریخ ہندوستان صفحہ ۳۳۸ تا صفحہ ۳۴۰۔

لیکن شاہجہاں کے زمانہ میں یہ تعلّق دوستانہ کے بجائے حریفانہ ہوگیا۔ البتہ شاہجہاں نے ترکوں سے اپنے تعلّقات بڑھائے۔ چند مرتبہ ہدئے بھی بھیجے گئے۔ پھر حکومتِ ایران دارا کی حامی اور اورنگ زیب کی مخالف تھی۔ منشآت طاہر وحید اس کے شاہد ہیں۔ چنانچہ عالمگیر کے زمانہ میں حریفانہ جذبات نے مزید پختگی اختیار کرلی۔ یہ سیاست کا بہت بڑا انقلاب تھا۔

(۵) یوں تو جہانگیر نے بھی قلعہ کانگڑہ کی فتح کے بعد وہاں گائے ذبح کرا کر اور اذان دلوا کر مذہبیت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ نیّت کی اصلاح کرو۔ یعنی فوج کشی اور جنگ و جدال کا مقصد ملک گیری نہ ہو، بلکہ کلمۃ اللہ کی بلندی اور احکامِ الٰہی کی ترویج مقصودِ جنگ ہونی چاہیئے۔

۱۰۴۷ھ میں مہم قندھار میں کامیابی ہوئی، تو تاریخ ہندوستان کے الفاظ یہ ہیں:

"۸ ذی قعدہ کو بلدہ قندھار کے باہر اپنا خیمہ لگایا۔ سُکّانِ قندھار بلکہ سارے اہلِ دیار بادشاہی لشکر کے غلبہ سے خوش ہوئے۔ جس کے سبب سے اُن کو قزلباشوں کے ظلم و تعدّی سے رہائی ہوئی۔ مساجد و معابد جن کے اوراد و اذکار سوائے سبِّ اصحاب و شتمِ احباب کچھ اور نہ تھے اب ان میں خلفاء راشدین کے مناقب بیان ہونے لگے" (ص ۲۵۷ جلد ۷)۔

اسی طرح گولکنڈہ، بیجاپور وغیرہ کی لڑائیوں میں اس شرط پر صلح کرنا کہ صحابہ کرام پر تبرّا نہ ہوگا اور خطبوں میں خلفاء راشدین کا نام لیا جاسکے گا، ان لڑائیوں کی مذہبی حیثیت واضح کردیتا ہے۔

لیکن اصلاحِ نیّت کے نقطہ کی توضیح کے ساتھ کسی طرح جائز نہیں کہ اس رواداری کو نظر انداز کردیا جائے جس پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شاہجہاں عمل پیرا تھا۔ اس رواداری نے اس کو ہندوؤں کا بھی ایسا ہی محبوب بادشاہ بنا دیا تھا،

جس طرح وہ مسلمانوں کا محبوب بادشاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو راجہ جو شاہجہاں کے حامی تھے، وہ شاہجہاں کو مسلمان سمجھتے ہوئے بھی اس کے اقتدار کو اپنی ذلت نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے شاہِ دہلی کو شمالی ہند کا مشترک بادشاہ تسلیم کر رکھا تھا، اور وہ اس کو پورے ہندوستان کا واحد شہنشاہ بنانا چاہتے تھے اور بلاشبہ شاہجہان کا طرز قابلِ صد تحسین ہے کہ پابندیِ مذہب کے باوجود اس نے جائز رواداری سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک جان بنا رکھا تھا۔

وہ جس طرح ہندو راجاؤں اور راجپوت فوجوں کو کسی ہندو راجہ کے مقابلہ میں بھیجتا تھا، اسی طرح بیجاپور، گولکنڈہ کے فرمانرواؤں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قندھار، بلخ اور بدخشاں کی جنگ پر بھی ان ہی فوجوں کو بھیجتا تھا، جہاں صرف مسلمانوں سے ہی مقابلہ ہوتا تھا۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں کے زمانہ میں بُت خانے توڑے گئے، مگر اس کا کیا جواب کہ توڑنے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اور حکم دینے والا افسر بسا اوقات ہندو ہوتا تھا۔

بے شک شاہجہاں کی نظر میں جنوبی ہند کی لڑائیاں اسلامی جہاد تھیں مگر ایک مؤرخ حیران رہ جاتا ہے کہ ان لڑائیوں کو ہندو مسلم جنگ قرار دے جبکہ گولکنڈہ کا بادشاہ قطب الملک ہے اور بیجاپور کا بادشاہ عادل خاں۔

اور شیواجی مرہٹہ جو اُن کا حامی ہو جاتا تھا، وہ شاہجہاں کے دربار میں پنج ہزاری منصب سے سرفراز ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جہاد کو بھیانک چیز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ عام طور پر ذہن نشین کرا دیا گیا ہے کہ قتل و خون کی جائز وجوہات کے بغیر وحشیانہ طرز پر کافر کُشی کا نام جہاد ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام جائز قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسان کی مصلحت کے

پیش نظر غیر مسلموں سے مل کر حکومت قائم کی جائے۔[1]

یہ مشترک حکومت جو اسلامی حدود کے بموجب قائم ہوگی، ایک مسلمان کیلئے واجب الاحترام ہوگی اور اس سلطان کا حکم واجب الاتباع ہوگا۔ اس مشترک حکومت کا تحفظ فریضۂ مسلم ہوگا، اور اس کے بقاء و تحفظ کے لئے قربانیوں کا پیش کرنا جہاد ہوگا۔ صرف ایک شرط ہے:

الدین یعلو ولا یُعلیٰ علیہ — دین غالب ہو، مغلوب نہ ہو۔

لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ — کلمۃ اللہ ہی سر بلند ہو۔

بے شک اعلانِ جنگ کے بعد یہی ہوگا۔

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم۔ — جہاں پاؤ، مشرکوں کو مارو۔

مگر یہ شرط بہر حال ملحوظ رہے گی۔

ان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ۔ — اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اسی طرف مائل ہوجاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو۔

آج ہماری غلامانہ ذہنیت، بزدلی اور پست ہمّتی کی نحوست ہے کہ نہ ہمیں اپنے اُوپر اعتماد ہے نہ خدا پر۔ عفو و رحم کے تصوّر سے بھی ہمارے دماغ محروم ہوگئے

[1] خلافتِ اسلامیہ کے نظام میں غیر مسلم کی مداخلت بے شک نہ ہوگی۔ خلیفۃ المسلمین دنیا میں ایک ہی ہوگا۔ باقی دیگر ممالک کے مسلمان اگر خلافت اسلامیہ کے نہج پر حکومت قائم کر کے مرکزی خلافت سے الحاق کرلیں، تو بہت ہی بہتر ہے۔ اور اگر اسلامی قانون کو قانونِ ملک قرار دے کر دوسری قوموں کو بھی شریکِ کار کرلیں تو اس کی مخالفت شریعت میں نہیں ہے۔ البتہ ان حکومتوں کو مرکز سے الحاق کرلینا ضروری ہے۔ تاکہ نظامِ ملّت تمام دُنیا میں وحدت اور یگانگت اختیار کرے۔ محمود غزنوی وغیرہ نے اپنی حکومتوں کا تعلّق خلافتِ عباسیہ سے اسی طرح کیا تھا۔

ہیں۔ مگر ان بادشاہوں کے حیرت انگیز اعتماد کا دنیا ہمیشہ تعجّب اور حیرت سے مشاہدہ کرتی رہی۔ سخت سے سخت دشمن گرفتار کر کے لایا گیا۔ جس پر قابو پانے کے لئے کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانیں ضائع کی جا چکی تھیں لیکن جب وہ مغلوب ہو کر سامنے آیا تو فاتح کا مستانہ نعرہ یہ ہوتا تھا:

در عفو لذّتیست کہ در انتقام نیست

اگر دوبارہ بغاوت کرتا، اور پھر شاہی قشون قاہرہ سے مغلوب ہو کر ندامت کا اظہار کرتا تو نشاطِ فتح میں نہایت تمکنت سے کہہ دیا جاتا:

ایں درگہِ ما درگہِ نا اُمیدی[1] نیست

یہ بادشاہ کہا کرتے تھے کہ ہم زمین میں خدا کا سایہ ہیں۔ مگر اس کے معنی ان کے عقائد کے بموجب صرف یہ تھے کہ جس طرح خداوندِ عالم ارحم الرّاحمین ہے ہمیں دنیا میں اس کی مخلوق کے لئے پیکرِ رحم بن کر رہنا چاہیئے۔

راجہ رُوپ سنگھ پسر جگت سنگھ کو کانگڑہ کا فوجدار مقرّر کر دیا گیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس کو جہانگیر نے فتح کیا تھا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر علم بغاوت کیا۔ اس کے باپ جگت سنگھ نے خود درخواست پیش کی کہ روپ سنگھ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے اس کو مامور کیا جائے۔

یہ وہاں پہنچا تو بادشاہ سے غدّاری کر کے رُوپ سنگھ کا ہمنوا ہو گیا۔ خود اپنے استقلال کا اعلان کر دیا اور پوری قوّت کے ساتھ جنگی سامان فراہم کر لیا۔ شاہی افواج نے بڑی مشکل سے ان قلعوں کو دوبارہ فتح کیا۔ روپ سنگھ اور جگت سنگھ گرفتار ہُوئے۔ مگر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو گویا ایک نہایت معمولی قصور تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد پھر اُن کو گورنر بنا کر دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ خلعت انعام سے نوازا گیا۔ (تاریخ ہندوستان)

---

[1] جیسا کہ جب شیواجی نے دوسری مرتبہ عالمگیر کے سامنے ندامت کا اظہار کیا تو عالمگیر نے یہی جواب دیا تھا۔ ۱۲

غدّاری اور مکّاری پر غور کرو اور پھر عفو و کرم کو غور میں لاؤ۔ اس قسم کے واقعات سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں۔

کیا یہی تھے وحشی مسلمان، غیر مہذّب مغل۔

تہذیب کی دعوے دار قومیں کیا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہیں تعجب ہے جس مذہب کی مسلّمہ کتاب انقلابات کی حکمت یہ بتائے:

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ	انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ	کے ذریعہ سے ہٹانے کی خداوندی سُنّت اگر
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	کارفرما نہ ہو تو رُوئے زمین پر بربادی اور
ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○	تباہی پھیل جائے لیکن اللہ تعالٰے تمام
	جہانوں پر بہت بڑا فضل کرتا رہتا ہے۔
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ	انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ	کے ذریعہ سے ہٹانے کا خداوندی دستور
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ	اگر نہ رہے تو تمام مندر گرجا نمازیں اور
صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ	وہ مسجدیں جن میں خدا کا نام بہت زیادہ
فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط	لیا جاتا ہے، تباہ کر دیئے جائیں۔

جس کی رواداری کا یہ عالم ہو کہ انقلاب جیسی عظیم الشّان حقیقت کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے مساجد کا نام بھی لیا تو سب سے آخر میں، اور وہ مذہب جو اپنے ماننے والوں کو نہ صرف بے جا ظلم و ستم سے روکے، بلکہ ان کی زبان تک کو اتنا پابند کر دے کہ:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	ان لوگوں کو سخت و سست مت کہو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔	جو اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں۔

تعجب ہے اسی قوم کی انقلابی جدّ و جہد پر وحشت اور بربریت کا الزام

لگایا جائے۔

بہرحال اس مختصر تفصیل و توضیح سے یہ عقدہ تو حل ہوگیا کہ شاہجہاں پکّا مسلمان ہوتے ہوئے کس طرح ہندو مسلمانوں کا مشترکہ بادشاہ بن سکتا ہے اور کس طرح راجپوت قومیں اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلمانوں کے جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ یعنی ان تمام حقوق اور مراعات کے باوجود اگر کوئی باغی جماعت مسلمانوں کو اسلام کی خاطر یا مسلمانوں کے مساجد و مقابر کو نقصان پہنچائے گی، تو چونکہ وہ نقضِ امن کی طرف خود قدم بڑھا رہی ہے، لہٰذا اس کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

متھرا یا گجرات میں بُت خانوں کو مسمار کر کے مسجدیں بنوانا اسی بِنا پہ ہوا، کہ وہاں مسجدوں کو مندر بنا کر خود فساد کا تخم بو دیا گیا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بادشاہ نامہ عبدالحمید جلد ۲ صـ۹۴ و صـ۱۰۶ و تاریخ ہندوستان صـ۱۸۶ و صـ۱۹۳ و صـ۱۹۸ جلد ۷، و اورنگ زیب عالمگیر پہ ایک نظر وغیرہ)۔

شاہجہاں کے اخلاق

پابندیٔ مذہب اور اصلاحات

فہم و تدبّر، رحم و کرم، عدل و انصاف، غربا پروری، علم دوستی، متانت اور سنجیدگی وغیرہ وغیرہ شاہجہاں کے وہ اوصاف ہیں جن میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کی تہذیب اور متانت کا یہ حال تھا کہ ناشائستہ کلمات سے اس کی زبان ہمیشہ پاک رہی۔

حلم و بردباری اور حسنِ اخلاق یہ کہ وہ اپنی مجلس میں خطاوار کے متعلق بھی حتی الوسع ایسے کلمات سے احتیاط کرتا جن سے اس کو شرمندگی ہو۔

وہ بہادر تھا اور بہادری میں اپنے دادا بابر کی زندہ یادگار تھا۔ مگر بے نظیر

شجاعت کے باوجود حد سے زیادہ رحم دل اور نوعِ انساں کا ہمدرد۔

علاقہ ایران کے اوزبکوں اور قزلباشوں کے مظالم کا تذکرہ اس کے سامنے ہوتا تو اس کا دل بھر آتا، اور ہمدردانہ تاثر کے ساتھ کہتا کہ خداوندِ عالم نے بادشاہوں کو برتری عطا فرما کر نوعِ انسان کو اُن کے سامنے اس لئے مطیع کیا ہے کہ وہ مظالم کو دنیا سے ناپید کر دیں مظلوموں اور بیکسوں کا سہارا بنیں۔

انسانی ہمدردی کا یہی جذبہ تھا کہ جس نے اس کو ہمیشہ بلخ، بخارا اور قندھار وغیرہ کی جنگ میں مصروف رکھا۔

شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ شاہی خزانے صرف اس لئے ہیں کہ باشندگانِ مُلک کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ بادشاہ ان کے صرف امانت دار ہیں۔

اخلاق و اوصافِ شاہجہاں کے متعلق تاریخ کی مبسوط تحریروں کے بجائے سلطان عالمگیر کے صرف ایک رقعہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

یہ رقعاتِ[1] عالمگیری کا بارہواں[2] رقعہ ہے۔ جو عالمگیر نے شاہزادہ محمد اعظم کے نام لکھا ہے:

اعلیٰ حضرت فرمایا کرتے تھے۔ شکار بے کاروں کا کام ہے۔ انسان اگر اُمورِ آخرت میں مشغول نہ ہو، تو دنیاوی کاموں کو درست کرنے ہی میں کیا خرابی ہے۔ آخر دنیا کو آخرت کی کھیتی بتایا گیا ہے۔

چار گھڑی[3] رات رہتی تھی کہ خود بدولت بنفسِ نفیس خواب گاہ سے باہر نکل کر

---

[1] چونکہ یہ کتاب عموماً دیسی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اس لئے اس کی عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ [2] رقعہ ۱۴ بھی قابلِ ملاحظہ ہے جس کا ترجمہ داراشکوہ کے تذکرہ میں آئے گا۔ انشاءاللہ۔ [3] عہدِ شاہجہاں میں طے کیا گیا تھا کہ ایک دن چوبیس (۲۴) پہر اور ساٹھ (۶۰) گھڑی کا ہوگا۔ یعنی ایک پہر مساوی ایک گھنٹہ اور ڈھائی گھڑی مساوی ایک پہر یا ایک گھنٹہ۔ لہٰذا چار گھڑی مساوی ڈیڑھ گھنٹہ تقریباً۔ محمد میاں۔

وضو کر کے اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اذان صبح کے بعد علماء اور فضلاء کی جماعت کے ساتھ نماز صبح ادا کر کے جھروکہ درشن میں تشریف لے جاتے تھے، اور درشنیوں کو دیدارِ فیض آثار کی سعادت سے نوازتے۔

جب چار گھڑی دن پڑھ جاتا تھا۔ دیوان عام کرتے تھے۔ اس میں جملہ کارپردازانِ حکومت متعلقہ خدمات کو پیش کر کے اپنے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے پھر گھوڑوں اور ہاتھیوں کی معینہ تعداد کو ملاحظہ فرما کر دیوانِ عام اور دیوانِ خاص میں تشریف لے جاتے، جہاں بڑے بڑے بخشی نو سرفرازانِ منصب (جدید ملازموں) کو مکرر درخواست اور بادشاہ کی نظر ثانی کے بعد حکم حاصل کرتے اور ہر ایک صوبے کے چیدہ چیدہ واقعات پیش کر کے ہر ایک کے بموجب احکام اور فرامین صادر کرنے کے لئے شاہی اجازت اور حکم ناطق حاصل کرتے۔ دوپہر کے قریب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد طعام خاصہ پیش ہوتا جو تاکید کر کے وجہ حلال سے تیار ہوتا تھا۔ ذاتِ شاہانہ، تقویتِ بدن اور عبادت وانصاف پروری کی طاقت حاصل کرنے کے لئے بقدر سدِّ رمق[1] نوش جاں فرماتے تھے اور جملہ وظیفہ خواروں اور راتبہ داروں کے کھانے پینے کی بذاتِ خود خبر لے کر خواب گاہِ خاص میں تشریف لے جاتے تھے۔

زیادہ تر وظیفہ خوار اور راتبہ دار علماء فضلاء طلباء علوم، مساکین غرباء یتیم بے کس اور بیمار ہوتے تھے جن میں سے اکثر سے ذاتِ شاہانہ کو بذاتِ خود تعارف ہوتا تھا اور نظر کیمیا اثر ان سے روشناس ہوتی تھی۔ قلبِ بیدار کے ساتھ ایک ساعت قیلولہ فرما کر دو پاس اور چار گھڑی دن گذرنے پر خواب گاہ سے باہر تشریف لا کر وضو فرما کر نماز خانہ میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر نماز ظہر ادا کرنے کے بعد برج اسد میں رونق افروز ہوتے، وظیفہ لب پر ہوتا اور تسبیح دست مبارک میں۔ اس وقت، دیوانِ اعلیٰ حاضر خدمت ہو کر ملکی اور مالی مہمات کو پیش کر کے

---

[1] اتنی خوراک جس سے زندگی باقی رہ سکے۔ ۱۲

اکثر کاغذوں کو دستخطِ انور سے مشرف کرتے تھے۔ جب چہار گھڑی دن رہتا تو دوبارہ دیوانِ عام کرتے۔ اس وقت بخشی اور دیوان تن نو سرفرازانِ منصب اور خواستگارانِ جاگیر کو ملاحظۂ عالی میں پیش کرتے۔ آنحضرت ہر ایک شخص کے حسب، نسب، جوہرِ ذاتی اور واقفیتِ کار کے متعلق تحقیق فرما کر پورے غور و فکر سے تعیین منصب اور تنخواہ جاگیر کے متعلق حکم فرماتے۔

شام کو دیوانِ عام سے اُٹھ کر نماز مغرب ادا کر کے خلوت کدۂ خاص میں تشریف لے جاتے۔ وہاں مورخانِ شیریں زبان، قصہ خوانانِ فصیح بیان، قوالانِ خوش الحان، اور سیاحانِ عرصہ جہان حاضر ہوتے۔ پردہ کے اندر خواتین ہوتیں اور باہر مرد ہوتے۔ طبع اشرف داعلیٰ کی رغبت کے موافق گذشتہ بزرگوں اور بادشاہوں کے حالات اور زمانہ کے عجائب و غرائب بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت نصف شب تک تمام اوقات کو تقسیم کر کے زندگی اور فرمان دہی کا حق ادا کرتے تھے۔

سلطان عالمگیر اس مفصل مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

چونکہ آنفرزند کے حق میں شفقتِ پدری قلبی بے مصنوعی نہیں۔ لہٰذا جو چیز اچھی ہو اور آنفرزند ارجمند کے لئے زیبا ہو، اس کے تحریر کرنے اور اطلاع دینے میں ہم بے اختیار ہیں۔ اس وقت جو یاد آیا، زبانِ قلم کے حوالہ کر دیا۔ معاف دارند۔

یہ مکتوب اگرچہ نظام الاوقات ہے مگر اُمورِ مملکت میں سرگرمی، احکامِ مذہبی کی پابندی، اکلِ حلال کی طرف کامل توجہ وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مؤرخین نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ ہمیشہ باوضو رہتے اور اگر جواہر جیسی چیزوں کو ہاتھ لگاتے، تو وضو کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انسان کو باخدا اور ولی اللہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ جہاں آرا بیگم دختر شاہجہاں نے کس قدر مختصر الفاظ میں شاہجہاں اور اس کی حکومت کی تصویر کھینچی ہے۔

الحمد للہ کہ اعلیٰ حضرت عموم اوقات فرخندہ ساعات شبان روزے را بعد ادار وظائف طاعات باہتمام نظام ملک وملّت مصروف داشتہ ہموارہ توجّہ اشرف بمعموری وامنیتِ مملکت و رفاہیت خلائق مبذول دارند واز مبادی احوال فرخندہ فال تا حال پیوستہ بر رونق احکام کتاب و سنّت حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام اطاعت حضرت رب العزت پیش نمودہ شیوہ کہ شبیہ بل مشتبہ بہ بے روشی وبے طریقی باشد از ہیچ کس قبول ندارم علی الخصوص از فرزندانِ سعادت مند آراستہ مزایا، ادب واخلاق اند[1]

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مطالبات پر نظر ڈالئے، اور پھر جہاں آرا کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ کامیابی تحریک کا کس قدر مبارک منظر سامنے آئے گا۔

مکتوب بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہجہاں کو سماع سے بھی شوق تھا اور یہ اس چشتیت کا باقی ماندہ اثر تھا جو اکبر کے زمانہ سے اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ بھنبر (علاقہ کشمیر) میں جگ ناتھ کلاونت نے اپنے ہندی دوہرے سنائے۔ شاہجہاں نے اُس کو سونے سے تلوایا، اور چار ہزار پانچسو روپے انعام دیئے۔ اسی طرح خاص خاص

---

[1] رقعہ $\frac{1}{194}$ رقعاتِ عالمگیر صلا۳۱ یعنی الحمد للہ کہ اعلیٰ حضرت خداوندی عبادات کے ادا کرنے کے بعد رات اور دن کے تمام اوقات نظامِ ملک وملّت کے اہتمام میں خرچ کرتے ہوئے سلطنت اور ملک کی آبادی ورونق اور امن وامان نیز مخلوق کی خوشحالی، عافیت وراحت کی جانب توجہ اشرف ہمیشہ ہمیشہ مبذول فرماتے رہتے ہیں۔ شروع سے ابتک ہمیشہ کتاب اور سُنّت حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بموجب حضرت رب العزت کی اطاعت کو اپنا شیوہ قرار دے کر کسی شخص سے بھی اور بالخصوص اپنی اولاد سے (جو تہذیب و اخلاق کی شریف ترین خصوصیات سے مزیّن ہے) کوئی ایسا فعل کبھی گوارا نہیں کرتے جو لامذہبی اور بے آئینی کے مشابہ ہو یا اس کا ادنی سا شبہ بھی پایا جائے۔

مواقع پر میلاد[1] شریف بھی کرایا کرتا تھا۔ قبروں اور مزارات کو پختہ بنانے کا طرز اس کے آباؤ اجداد سے چلا آرہا تھا۔ مقبرات کے متعلق اُس کے حُسن و ذوق نے اس کے مقبرہ کو تاج محل کی شکل دیدی جو دنیا کی تعمیرات میں بے نظیر ثابت ہوئی۔

اس نے اپنے جلوس کے پہلے سال ہی سجدہ کی ممانعت کر دی۔ زمین بوسی کا طریقہ رائج کیا۔ پھر سنہ ۱۰۴۶ھ میں اس کو بھی منسوخ کر دیا کہ اس میں بھی انسان کے سامنے سجدہ کی مشابہت[2] ہے۔ درشن کا دستور جو اکبر کا ایجاد کردہ تھا، بحالہٖ باقی رہا۔

شیعوں کے رسوخ کے باعث صحابۂ کرام بالخصوص خلفاء راشدین کے ذکرِ خیر پر جو اثر پڑ سکتا تھا، محتاجِ بیان نہیں۔ دکن کے شیعہ فرمانرواؤں کے قلمرو میں آئے دن خطبہ میں خلفاء راشدین کے ذکر پر پابندیاں عائد ہوتی رہتی تھیں۔

شاہجہاں نے ان ریاستوں سے صلح کی پہلی شرط یہی رکھی کہ شتم صحابہ نہ کیا جائے۔ مدحِ صحابہ پر پابندی نہ عائد کی جائے۔

شاہجہاں نے سکہ کے ایک رُخ پر بیچ میں کلمہ طیبہ اور حاشیہ پر اسماء خلفاء راشدین اور دوسرے رُخ پر "ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحبِ قران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی" کندہ کرایا۔

سنہ ۱۰۴۳ھ میں جب کہ سیر کے لئے کشمیر گیا تھا تو معلوم ہوا کہ مسلمان احکام و تعلیماتِ اسلام سے ناواقف ہیں۔ ہندوؤں میں بیاہ شادیاں ہوتی ہیں۔ ہندو لڑکی

---

[1] غالباً تعجب ہوگا کہ میلاد شریف میں قرآن شریف کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ شہنشاہِ اسلام پناہ دوران محفلِ فیض منزل گردیے از علماء و فضلاء و صلحاء و حفاظ خطہ دل پذیر کشمیر را کہ بتفاوت درجات دراں قدسی انجمن قعود نمودہ بتلاوت قرآن مجید مے پرداختند بمرحمتِ خلعت و فرجی و مدد معاش از زمین و یومیہ سرفراز ساختہ الخ (عبد الحمید ص۴۸ جلد ۲)۔ معلوم ہوتا ہے، کہ ان حضرات کی اصطلاح میں قرآن شریف پڑھوا کر روحِ پُر فتوح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایصالِ ثواب کا نام میلاد تھا۔ محمد میاں۔ [2] تاریخ ہندوستان ص۲۳۲ جلد ۷۔

کو مرنے کے بعد مسلمان زمین میں گاڑتے ہیں اور مسلمان لڑکی کو ہندو جلاتے ہیں شاہجہان نے حکم دیا کہ جو مسلمان لڑکی ہندو کے گھر میں ہو، اگر اس کا شوہر مسلمان ہو جائے، تو از سر نو نکاح کرایا جائے۔ ورنہ مسلمان لڑکی کو علیحدہ کر لیا جائے۔ اس کے بعد قاضی اور معلّم مقرر کر دیئے اور ان کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کر دیا۔

جب گجرات (پنجاب) کے اطراف میں پہنچا تو وہاں کے مشائخ اور سادات نے استغاثہ دائر کیا کہ کچھ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے اور کچھ مسجدیں اپنے تصرّف میں کر لی ہیں۔ بادشاہ نے شیخ محمود گجراتی کو حکم دیا کہ تحقیقات کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے تصرّف سے نکالیں، اور مسجدوں کو دوبارہ آزاد کریں۔ اس طرح سات مسجدیں اور بہت سی عورتیں ہندوؤں کے قبضہ سے برآمد ہوئیں۔

نیز اس سلسلہ میں چار سو مرد اپنی مسلمان بیویوں کی خاطر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ جن کا دوبارہ نکاح انہیں عورتوں سے ہو گیا۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں نجومیوں پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔ تمام بڑے بڑے کاموں کے لئے اوقاتِ سعید کی تشخیص نجومی کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کام شروع کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں اگرچہ اس رسم کو ختم تو نہیں کیا گیا مگر اس پر اعتماد کو ضرور ختم کر دیا گیا اور اپنا عقیدہ یہ ظاہر کیا کہ کذب المنجمون و ربّ الکعبۃ[1]۔

عمر میں صرف ایک مرتبہ شراب پی، جب کہ جہانگیر نے حکم کیا تھا جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ بظاہر پان کھاتا تھا اور پان کا شوقین تھا۔ ایک دو مرتبہ خلعت کے ساتھ پاندان عطا کرنے کا تذکرہ بھی آتا ہے۔

عجائب خانہ بیجاپور کے مخطوطات میں ملی بیاض ہے۔ اس کے اندر اہم تاریخی مسودات بھی ہیں، جن کا تعلق سلاطین بہمنیہ سے ہے۔ اسی بیاض کے ایک

---

[1] تاریخ ہندوستان ص۱۶۶ جلد ۷۔

صفحہ پر درج ہے :

شاہجہاں وقت برآمدن بر تخت ایں رباعی خوانده اشک ریختہ برمے نشست ۔

فاختہ بر سرِ سروِ بلند نعرہ برآورد کہ اے ہوشمند
دولت گیتی کہ تمنّا کند با ما کہ وفا کرد با ما کند[۱]

یہ تھا شاہجہاں بادشاہ جس کو ہم نے چشتیت اور مجدّدیت کا درمیانی واسطہ قرار دیا ہے ۔ رحمہ اللہ وغفرلہٗ ۔

شاہجہاں کی کمزوریاں

سلاطینِ ایشیا کا عام نظریہ ہے کہ الملک عقیمۃ یعنی بادشاہ کے اولاد نہیں ہوتی ۔ جہانگیر کا مقولہ تھا کہ بادشاہ عزیزے و قرابتے ندارد" ۔ چنانچہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی وہی احتیاط برتتا جو غیروں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔

لیکن اس کے برخلاف شاہجہاں کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کو اپنی اولاد اور اپنی بیوی[۲] سے بہت زیادہ محبّت تھی ۔ دارا شکوہ سب سے بڑا لڑکا ہے ، جو دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا ۔ سب سے بڑی بہن کا انتقال شیر خوارگی میں ہو گیا تھا ۔ دارا اور اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم لاڈ پیار کے پلے ہوئے تھے ۔

شاہجہاں کو دارا اور جہاں آرا بیگم سے جو محبّت تھی اس کو عشق کے درجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ جہاں آرا بیگم کو بھی اگرچہ باپ سے اتنی ہی محبّت تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد جہاں آرا بیگم نے سلیقہ مند اور صاحبِ شعور اور باسعادت بیٹی کی حیثیت سے باپ کی اتنی خدمت کی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ۔

اس نے امن اور رحم کی ملکہ بن کر خلق اللہ کو بھی اتنا فائدہ پہنچایا ، کہ اس کی

---

[۱] برہان ص۲۹۳ نمبر۴ جلد۷ ۔ [۲] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۲/۱۲۵ رقعات عالمگیر ۔

غربا پروری کے قصے آج تک مشہور ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ دارا باپ کی اسی محبت کے سبب سے بدقسمتی کا شکار ہوگیا۔ باپ نے اس کو جاگیریں بڑی بڑی دیں۔ مگر انتظام کارندوں کے ہاتھ میں رہا۔ دارا ہمیشہ شاہجہاں کے ساتھ رہا۔ اپنی جاگیروں میں جانے اور نظامِ حکومت سنبھالنے کا اُسے موقعہ ہی نہ ملا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا۔ وہ امراء کے حق میں بدخلق اور گستاخ ہوگیا (جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا)

جہانگیر اپنا طریقہ بیان کرتا ہے:

در کنگاش امورِ سلطنت و ملک گیری اکثر آنست کہ برائے وفہمیدگی خود عمل مے نمائم از کنگاش ہائے دیگر کنگاش خود معتبر مے دانم[۱] (توزک)۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ اپنے خیال یا دوسروں کے بھکانے سے جب شاہجہاں سے وہ بدگمان ہوگیا تو پھر آخر تک وہ نفرت ہی کرتا رہا۔ ملنا بھی پسند نہ کیا۔ حتیٰ کہ وکیلِ شاہجہاں کو اتنا بھی موقعہ نہ دیا کہ وہ شاہجہاں کی طرف سے صفائی اور معذرت ہی پیش کر دے۔

شاہجہاں جہانگیر کا فرزندِ سعید تھا۔ وہ اس وصف میں باپ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ جب عالمگیر کی بُرائی اس کے ذہن میں بٹھا دی گئی تو وہ دن بدن ترقی ہی کرتی رہی۔ عالمگیر نے جب بھی معذرت کی وہ عموماً نامنظور ہوئی، اور اس کے جواب میں کوئی اور نکتہ چینی کر دی گئی[۲]۔

شاہجہاں کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بائیس سال متواتر شب و روز

---

[۱] معاملاتِ سلطنت و ملک گیری کے متعلق غور و فکر میں اکثر یہی ہے کہ میں اپنی رائے اور فہم پر عمل کرتا ہوں، دوسروں کی رائے اور فہم سے اپنی رائے کو معتبر جانتا ہوں ۱۲ [۲] تفصیل ملاحظہ ہو۔ مقدمہ رقعاتِ عالمگیر مصنفہ سید نجیب اشرف صاحب ندوی۔ کسی قدر تفصیل ہم بھی انشاء اللہ چند صفحات کے بعد تذکرہ عالمگیر کے سلسلہ میں کریں گے۔

انتھک کام کرنے کے باعث مزاج میں تیزی بھی پیدا ہوگئی تھی۔

بہرحال شاہجہاں کی یہی کمزوریاں تھیں جس نے آخری عمر میں اُس کی سیاست کو شکست دے کر اس کو قلعہ آگرہ میں نظر بند کر دیا۔ (باقی حالات چند اوراق کے بعد تذکرۂ عالمگیر کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیے)۔

ایک مذہبی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیت اور عقیدہ کی درستی کے باوجود انسانی کمزوریوں کے باعث فکر اور رائے میں جو غلطی واقع ہو، اس کے نتائج عملی دنیا میں اگرچہ وہی ہوں گے جو غلطی کے ہونے چاہئیں۔ مگر کیا یہ غلطی عنداللہ قابلِ مواخذہ ہے یا اس کو خطاء اجتہادی سمجھا جائے گا، اور عنداللہ اس کی معافی کا عقیدہ رکھا جائے گا۔ درستیٔ نیت اور اہلیتِ اجتہاد کے ساتھ اگر غور و فکر میں پوری جدّوجہد کی گئی اور پھر بھی غلطی ہوگئی تو اس خطاء اجتہادی کے متعلق نص حدیث میں یہ ہے کہ مواخذہ کے بجائے اس کو غور و فکر کا ثواب ملے گا۔

بہرحال یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس کے حل ہو جانے پر شاہجہاں اور عالمگیر کے متعلق مذہبی حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

داراشکوہ

یہ شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا ہے۔ ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ کو پیدا ہوا۔ ۱۰۴۳ھ میں نادرہ بانو بیگم صبیہ شاہزادہ پرویز سے نکاح ہوا۔ سلیمان شکوہ اور سعید شکوہ اسی بیگم کے بطن سے تھے۔ عربی فارسی زبان پر مثل اہلِ زبان کے عبور تھا۔ سنسکرت کی تعلیم بنارس میں بہترین پنڈتوں سے حاصل کی تھی۔ اس کے قیام کے لئے بنارس میں عمارت بنوادی گئی تھی، جو آج بھی موجود ہے اور پرانی عدالت کے نام سے مشہور ہے[1]۔

---

[1] کاتب الحروف فروری ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب، اور حضرت مولانا عبدالحنان صاحب کے ہمراہ بنارس گیا۔ جب گیان باپی کی مسجد کو دیکھتے ہوئے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

غلام سرور چشتی خزینۃ الاصفیاء میں تحریر فرماتے ہیں :

شاہزادہ بلند اقبال جامع اوصاف کمال بادشاہ صورت، درویش سیرت، خادمِ درویشاں، مظہر صفات ایشاں ست ۔ جامۂ فقر و خرقۂ خلافت از دست عارف حق آگاہ مُلّا شاہ پوشیدہ بخدمت حضرت میاں میر بالا پیر ہم حاضر شدہ مستفید و مستفیض مے گشت ۔

در فقر شان عالی و رتبہ بلند داشت ۔ صاحبِ تصانیف است کہ احوالِ باطنش از تصانیف وے اظہر من الشمس ست و از تصانیف مشہورۂ وے کتاب سفینۃ الاولیاء و سکینۃ الاولیاء و سراکبر و دیوان اکسیر اعظم و رسالہ حق نما و رسالہ معارف وغیرہ ست و سخنش دریائے توحید ست کہ از زبانِ گوہر افشانِ او دواں گشتہ، مغزے باید کہ سخنش رابفہمد و دلے باید کہ معانی آں در وے امکاں پذیرد ، وے تمام عمر خود در معرفتِ حق گذرانید ۔ آخر ازیں دارِ ناپائیدار مردانہ رفت و شہادت یافت ۔ قصّۂ شہادتِ وے زبان زد خاص و عام ست کہ از دست اورنگ زیب عالمگیر برادرِ خود بقتل رسید و شاہ عالمگیر صرف بطمع فرمان فرمائیِ ہندوستان و تخت نشینیِ مملکت آں گوہرِ دریائے وحدت رابشکست (ص۱۷۵ جلد۱) ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہم اس کی پشت کی جانب پہنچے تو کچھ مسلمانوں نے بتایا کہ حال ہی میں یہاں سے ایک کتبہ برآمد ہوا تھا جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ توڑا ہوا حصہ "دینِ الٰہی" کا عبادت خانہ تھا ۔ دارا قیامِ بنارس کے زمانہ میں یہاں عبادت کیا کرتا تھا اور اس کا دروازہ مغرب کی جانب تھا ۔ عالمگیر نے دینِ الٰہی" کے اس معبد کو مسجد بنایا ہے ۔ اس شکستہ حصّہ کی محرابوں میں جو کنگرے ہیں اُن کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ یہ تصویریں تھیں جن کو عالمگیر نے توڑوایا مگر ان کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ تصویریں نہیں بلکہ پھول دار کنگرے ہیں جواب تک بدستور ہیں ۱۲

مصنف خزینۃ الاصفیاء نے دارا کے حالات لکھتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ بظاہر خود اپنے خیالات کی شیرازہ بندی ہے۔

اس کے بعد "تذکرہ آدمیہ کے حوالہ سے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کا وہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ میں آپ نے سُنا کہ" داراشکوہ ولی عہد شاہجہاں پدرِ خود شدہ است"۔ تو چونکہ عالمگیر سے دارا کو عداوت تھی، اور عالمگیر خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کا مرید تھا، اور اس وجہ سے حضرت خواجہ اور آپ کے متوسلین سے بھی دارا کو عداوت تھی۔ لہٰذا حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ کو فکر ہوا۔ آپ نے ہندوستان پہنچنے کا ارادہ کیا، اور اجازت حاصل کرنے کے ارادہ سے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ سیدالکونین شمشیر بدست جلوہ فرما ہوئے اور فرمایا کہ:

ہر کہ دشمنِ شماست برائے او ایں شمشیرِ قہر الٰہی کافی ست۔

جب مراقبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ داراشکوہ ہندوستان میں مارا گیا۔

ان دونوں روایتوں کا تعارض ظاہر ہے۔ ایک فیصلہ کرنے والے کیلئے دشواری ہو جاتی ہے۔ مگر غالبًا مصنف خزینۃ الاصفیاء نے داراشکوہ کی کتابیں خود نہیں پڑھیں۔ اب ہم مولانا نجیب اشرف ندوی مصنف مقدمہ رقعاتِ عالمگیر کا بیان اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

داراشکوہ، شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ پیارا تھا ماں باپ کے لاڈ پیار، درباریوں کی خوشامد، غلط تعریف اور خود شاہجہاں کی انتہائی محبت نے اُسے خودسر، خود رائے اور ستایش پسند بنا دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تمام حکومت میں اس سے زیادہ صائب الرائے، ہوش مند، وسیع المشرب اور صاحبِ اقتدار کوئی نہیں ہے اس لئے جب اس کے دوسرے بھائی سنِ شعور کو پہنچے اور اپنے درجہ، مرتبہ اور کاموں کی وجہ

سے لوگوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنے لگے تو اُسے یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی، اور چونکہ اورنگ زیب ان میں سب سے زیادہ با اثر، عقل مند، دُور اندیش اور سب سے زیادہ کامیاب تھا، اس لئے دارا کو اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہوگئی، اور جوں جوں اورنگ زیب ترقی کرتا، اور لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا جاتا، دارا کی دشمنی اور اس کی سازشیں، اس کے خلاف بڑھتی جاتیں۔ ذیل میں ثبوت ملاحظہ ہو۔

رقعاتِ عالمگیری مطبوعہ کے رقعہ ۵ کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

میہین پور[1] خلافت یا شاہزادگی کے زمانہ میں ہم اُمراء کے ساتھ ایسا سلوک کیا کرتے تھے کہ سب ہم سے راضی تھے اور ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے ہماری تعریف کیا کرتے تھے۔ بلکہ باوجودیکہ برادرِ نامہربان (داراشکوہ) کو بہت زیادہ اقتدار حاصل تھا مگر تب بھی کچھ اُمراء نے ان کی رفاقت ترک کر کے ہماری ملازمت اختیار کر لی تھی اور جن لوگوں نے برادرِ نامہربان کے اشارہ سے نامناسب حرکتیں کی تھیں اور ہمارے متعلق بے ادبی کے کلمات زبان پر لائے تھے، ہم نے ان سب کو اغماض و تحمّل کے تازیانہ سے متنبہ کیا الخ

رقعہ ۴۷ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

ایک روز اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) نے خلوت میں داراشکوہ سے ارشاد فرمایا۔ اُمراء پادشاہی کے حق میں بدگمان مت رہا کرو۔ ان سب کو عواطف و الطاف میں شامل رکھو۔ باتیں بنانے والوں کی غرض آلود باتوں پر توجہ مت دیا کرو۔

رقعہ ۵۴ کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

فرزند عالی جاہ! ایک معتبر شخص کی زبانی یہ نقل کانوں تک پہنچی جو رشتۂ تحریر میں منسلک کی جاتی ہے تاکہ آپ بھی اس سے سبق حاصل کریں۔

اعلیٰ حضرت (شاہجہاں بادشاہ) نے ایک روز علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو

---

[1] یعنی خلافت کا سب سے بڑا لڑکا۔ عالمگیر کی تحریروں میں اس لفظ سے شاہزادہ محمد معظم مراد ہوتا ہے۔ اور شاہجہاں کی تحریروں میں داراشکوہ۔

خصوصیت کے ساتھ خلوتِ خاص کی عزت سے نواز کر زبان گوہر فشاں سے فرمایا :

"ملک و مال کا بند و بست فہم و انصاف پر منحصر ہے۔ معاذ اللہ اگر کوئی بادشاہ جو جوہرِ قابلیت سے محروم ہو، رتبۂ خلافت پر فائز ہو جائے اور ایسے وزراء اور امراء کو جو حسنِ تدبیر سے عاری ہوں کام پر لگا دے تو نظم و نسقِ ممالک میں پورا خلل اور نقصان رونما ہو جائے گا۔ اس کا یہ فعل رعایا کی پریشانی، خلق اللہ کی بے سامانی، آمدنی کی کمی اور ویرانی ملک کے لئے ایک وثیقہ ہوگا۔ آپ دونوں صاحب خدا کے واسطے فقراء اور صلحاء کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے پانچوں نمازوں کے بعد دعا کراتے رہو، کہ ہماری سلطنت کی رونق نہ گھٹے۔ کوئی شخص (ہمارے متعلق) زبان پر بُری بات نہ لائے، اور ہمارے بعد جو لڑکا بھی فرماں روا ہو، اس کو اچھّے کام کی توفیق ہو۔ بعض وقت خیال ہوتا ہے کہ مہین پور خلافت (دارا شکوہ) شان و شوکت، تحمّل و صولت کے اسباب و سامان بہت کچھ رکھتا ہے لیکن نیکوں کا دشمن[1] اور بُروں کا دوست واقع ہوا ہے ع

با بداں نیک و بد بہ نیکاں ست

شاہزادہ شجاع میں صرف ایک وصف ہے یعنی سیر چشمی۔ اس کے سوا اور کوئی وصف نہیں رکھتا۔ شاہزادہ مراد بخش مجہول الکیفیت ہے، اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہی دشوار ہے۔ کھانے پینے کا شوقین ہے۔ ہمیشہ شراب میں مست رہتا ہے۔ مگر فلاں لڑکا (یعنی یہ عاجز فانی[2]) صاحبِ عزم اور مآل اندیش نظر آتا ہے۔ غالب خیال ہے کہ وہ ریاست و سلطنت کے بارِ گراں کو برداشت کر سکے گا۔"

اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی افتادِ طبع کے متعلق حمید الدین خاں نیمچہ

---

[1] کیونکہ وہ خود رائے، خود سر اور ستائش پسند ہے۔ جو اس کی خوشامد کرے، اسی سے خوش رہتا ہے اس جملہ سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ خواجہ محمد معصوم اور مجدّدی حضرات کا دشمن کیوں تھا۔ واللہ اعلم۔ [2] یعنی عالمگیر جو اس خط کا لکھنے والا ہے۔

کی تحریر کا ترجمہ حسبِ[1] ذیل ہے۔

دار اشکوہ کسی امیر کے ساتھ عداوت اور کسی کے ساتھ غرور و تکبّر کا طریقہ اختیار کرتا۔ حضرت عالمگیر ہر ایک کے ساتھ خاص تعلّق رکھتے تھے۔ یہ امراء بھی حضرت عالمگیر کے پس پُشت پوری محبّت کے ساتھ لوازم مع دوستی پر عمل پیرا رہتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کو دل دل میں بہت گرانی ہوتی تھی۔

دار اشکوہ کے افعال و اقوال کی قباحتوں پر اس کو نصیحت کرتے۔ جب دیکھا کہ دار اشکوہ پر نصیحت کا اثر نہیں ہوتا تو اعلیٰ حضرت کی خواہش ہوئی کہ محمد اورنگ زیب امراء کے ساتھ یکساں سلوک نہ رکھیں بلکہ تفاوت برتیں (کہ آنہا دست از حفظ الغیب بردارند۹)۔ چنانچہ دستخطِ خاص سے ایک تحریر ارسال فرمائی۔

"بابا سلطان اور فرزندانِ سلطان کو چاہیئے کہ بلند ہمّت ہوں۔ عالی فطرتی کو کام میں لائیں۔ سُنا گیا ہے کہ تم ہر ایک نوکر کے ساتھ بہت ہی پست ہو کر سُلوک کرتے ہو۔ اس پست فطرتی سے مذمّت کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔"

اورنگ زیب نے اس کا یہ جواب دیا کہ:

---

[1] دار اشکوہ با بعضے امراء طریقِ عداوت و با بعضے امراء بطور تبختر سُلوک نے کرد۔ و حضرت عالمگیر با ہر کدام ربطے خاص داشتند، ہر کدام ازیں از کمال محبّت در حفظ الغیب آنچہ لازمۂ دوستی بود بعمل آورد دید اعلےٰ حضرت را در خاطر بسیار گراں مے آید۔ بدار اشکوہ نصیحت از قبائح افعال و اقوالِ او مے فرمودند، چوں دیدند کہ دار اشکوہ را پند فائدہ نہ کند، خواستند کہ محمد اورنگ زیب در سلوک خود با امراء تفاوت کنند کہ آنہا دست از حفظ الغیب بردارند برشتہ بدستخط خاص نوشتہ فرستادند کہ بابا سلطان و فرزندانِ ایشاں را باید کہ بلند ہمّت باشند و عالی فطرتی را کار فرمایند شنیدہ شد کہ شما با ہر کدام از نوکراں سلوک مے کنند کہ نہایت پستی را بخود راہ مے دہند۔ ازیں پست فطرتی بغیر ندامت فائدہ حاصل نخواہد شد۔

"براہِ فضل و کرم اس غلام مستتسہام کے بارہ میں قلم عنایت[1] رقم سے جو کچھ مرقوم ہوا، آسمانی وحی کی طرح نزول فرمایا۔

پیر و مرشد برحق سلامت۔ عزت و ذلت قادر و عباد اور خالقِ ارض و بلاد کے حکم کے بموجب ہے۔ جس کی شان ہے تعزّ من تشآءُ و تذلّ من تشاء۔ بندہ حدیث صحیح کے بموجب جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں عمل کرتا ہوں مَنْ اَذَلَّ نَفْسَہٗ اَعَزَّہٗ اللہ۔ (جو اپنے آپ کو خدا کے لئے پست کرے خدا اس کو عزت دیتا ہے) دل شکنی کو سب سے بڑا گناہ اور سب سے زیادہ شرمناک عیب شمار کرتا ہے۔ نشانِ کرامت ترجمان سے جو کچھ صادر ہوا، اس پر کوئی انکار نہیں۔ لیکن یہ یقین ہے کہ وسواس خناس کے غرض کے بموجب یہ تحریر ہوا ہے۔

تعلیم | دارا شکوہ کی تعلیم کے واسطے اس وقت کے بہترین اساتذہ بلائے گئے تھے۔ ان میں مولانا عبداللطیف صاحب سلطان پوری اور مُلّا میرک شیخ ہروی کا عبدالحمید نے تذکرہ کیا ہے۔

خطاطی کے لئے عبدالرشید ویلمی جیسا استاد نصیب ہوا۔

شعر و شاعری کا ذوق مغلیہ شاہزادوں کو وراثت میں ملا تھا۔

---

[1] آنچہ از راہِ فضل و کرم در باب غلام مستتسہام مرقوم قلم عنایت رقم بود، کالوحی من السماء نازل گردید۔ پیر و مرشد برحق سلامت تعزّ من تشاء و تذلّ من تشاء محض بتقدیر قادر عباد و خالقِ ارض و بلاد است بندہ بموجب حدیث صحیح کہ راوی آں انس بن مالک رضؓ باشد مَنْ اَذَلَّ نَفْسَہٗ اَعَزَّہُ اللہ و عمل نماید و انکسارِ قلوب را اذنب ذنوب و افحش عیوب مے شمارد (احکام عالمگیری ۳۰۶ تا ۳۵۴) و آنچہ بنشانِ کرامت ترجمان صادر شدہ انکارے برآں ندارد لیکن بہ یقین میداند کہ بموجب غرض وَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ، مرقوم فرمودہ اند ؎

زبان عرض ندارم بغیر عذرِ گناہ بخش جرمِ من رو سیاہ و نامہ سیاہ

(وقائع عالمگیر ص۲)

تصوّف سے بھی اُسے خاص ذوق تھا۔ سنسکرت اس نے بنارس میں رہ کر وہاں کے بہترین پنڈتوں سے سیکھی تھی۔

بیشک اُس کو ہر قسم کی ترقی کے لئے قدرت نے بہترین موقع عطا فرمایا تھا۔ مگر اس کی فطری خود پسندی[1] نے اس کو غلط راستہ پر لگا کر اسلام کی جگہ الحاد کا حامی بنا دیا۔ اس کی تصانیف کی ترتیب صاف طور پر بتاتی ہے کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ زندقہ اور الحاد کی طرف جا رہا ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف "سفینۃ الاولیا" ہے۔ اس کتاب کو اُس نے اس وقت لکھا ہے جب کہ وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا۔ یہ کتاب[2] ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو ختم ہوئی۔ اس میں چار سو گیارہ بزرگانِ دین کے مختصر حالات ہیں اور دو فصلوں پر منقسم ہے۔ اس میں اس نے اپنے نام کے ساتھ "حنفی و قادری" کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ اس کے تین سال بعد ۲۸ برس کی عمر میں ۱۰۵۲ھ میں اُس نے "سکینۃ الاولیاء" لکھی۔ یہ کتاب اس کے پیر مُلّا شاہ بدخشانی کے مُرشد حضرت میاں میر کے حالات میں ہے۔ ان کو دارا شکوہ باری تعالیٰ کہا کرتا تھا۔

"چوں ایشاں در کوہائے نواحی قصبہ باری عزلت گزیدہ بودند من[3] ایشاں را حضرت باری تعالیٰ مے گفتم (حسنات[4] العارفین منہ ۳)۔

اسی وقت سے اس کو الہام یا ندائے غیبی کا تجربہ ہونا بھی شروع ہو جاتا ہے۔

---

[1] حالانکہ فطری قابلیت کی حالت یہ تھی جو عالمگیر نے اپنے ایک مکتوب (بنام شاہجہاں بادشاہ معزول) میں درج کی تھی۔ ہنرے جز خوشامد ظاہری و چرب زبانی و خندہ بسیار نداشت۔ در خدمتِ ولی نعمت دلش با زبان موافق نہ بود۔ ۱۲ (ص ۲۱۴ رقعات عالمگیر رقعہ نمبر ۲/۱۳۵)۔ [2] سفینۃ الاولیا، مطبوعہ ۱۸۵۳ء۔

[3] صرف میاں میر ہی کی کیا تخصیص، شاہ دلربا کو بھی عین الرحمٰن کہہ رہا ہے۔ این ذرہ چہ لائق کہ آں شاہ محققاں و عین الرحمٰن ایں را بستانند۔ (رقعہ ۱/۲۰۴ ص ۳۱۹ رقعات عالمگیر)۔

[4] مقدمہ رقعات عالمگیر ط ۳۵۶ (حاشیہ)۔

چنانچہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اُس نے ایک ندا سُنی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی چیز ملے گی جو آج تک کسی بادشاہ کو نہیں ملی، اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس نے مُلّا بدخشانی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

پھر اُس نے رسالہ "حق نما" لکھا۔ اس میں واصل الی الحق ہونے کے متعلق مختلف مدارج بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ اس رسالہ کو صرف ایسے شخص کو پڑھنا چاہیے جس کی ہدایت کے لئے ایک مُرشد موجود ہو۔

پھر لکھتا ہے کہ اہل اللہ اور عارف اس رسالہ کو پڑھیں گے۔ وہ اس بات پر متحیّر ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کشف رموز و حقائق کے کیسے کیسے ابواب مجھ پر کھول دیئے ہیں، اور ایک شاہزادہ ہونے کے باوجود اور کسی ریاضت و عبادت کے بغیر عرفان کا دروازہ کس طرح مجھ پر باز ہے[1]۔

یہ رسالہ جو چار فصلوں پر منقسم ہے، ۱۰۵۶ھ میں ختم ہوا۔ اس رسالہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

شبے بخواب[2] دیدم ہاتفے آواز داد۔ چہار بار تکرار کرد کہ آنچہ ہیچ یکے از سلاطین[3] روئے دست نداده۔ اللہ تعالیٰ بتوارزانی داشتہ (ص۶ وص۷)

---

[1] حق نما کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ این نیازمند درگاہ صمدی محمد داراشکوہ حنفی قادری ازاں طائفہ ست کہ جاذبۂ فضل یُحِبُّهُمْ بے سبب ریاضت و مجاہدت بتاثیر نظر کامل آنہا بسوئے خود کشیده، این فقیر مراتب تجرید و تفرید و دقائق عرفان و توحید را چنانچہ حق معرفت ست یک بیک دانستہ و دریافتہ۔ ص۲ مقدمہ (رقعات عالمگیر ص۲۵۷) [2] ایک رات مَیں نے خواب میں دیکھا کہ ہاتف آواز دے رہا ہے، اور اس نے چار مرتبہ یہ ندا دی کہ جو (نعمت) روئے زمین کے سلاطین میں سے کسی کو نہیں دی گئی، اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی ہے۔ [3] اگر خلفاء راشدین کو لفظ سلاطین کے مصداق سے خارج بھی کر دیا جائے تو حضرت سلیمان علیہ السّلام کے متعلق کیا جواب ہوگا جن کی مقبول دُعا کے قرآنی الفاظ یہ ہیں۔ ربّ ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی۔ خداوندا مجھے ایسا مُلک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اسی زمانہ میں اُس نے علانیہ ایسے جملے اور الفاظ عام گفتگو میں استعمال کرنے شروع کئے جو شریعت کی نظر میں قابلِ الزام تھے۔ اس پر جب بعض لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں تو دارانے "حسنات العارفین" (شطحیات) کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اصحاب کبار کے بعض موضوع اقوال اور مختلف بزرگوں کی حالتِ جذب وغیرہ کے اس قسم کے جملے جمع کئے ہیں۔ جن سے ظاہراً منصوری دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۶۲ھ میں ختم ہوئی۔ اس کتاب کا مطالعہ یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ داراشکوہ کم از کم لوگوں پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس درجہ و رُتبہ پر پہنچ گیا، جہاں[1] پہنچ کر (عوام کے عقائدِ باطلہ کے بموجب) کفر و اسلام کا سوال باقی نہیں رہتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یعنی ایک بے نظیر حکومت مجھ کو عطا فرما۔ کیا دارا کے اس الہام کو جو نص قرآن، نیز احادیث کے مخالف ہے، وسوسہ شیطانی نہ کہا جائے؟

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ہندوستان میں آریوں کے بعد بھی ترکستانی، ایرانی، آذر بائیجانی، یونانی، اشکانی وغیرہ وغیرہ مختلف ممالک کی مختلف قومیں اپنے اپنے عقائد اور تہذیب لے کر آئیں، اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں یہاں بھی کرشن، رام، بودھ وغیرہ مختلف العقائد، ریفارمر پیدا ہوتے رہے۔ ان سب کے مختلف عقائد کے مجموعہ کا نام ہندو مذہب ہوگیا۔ یہی سبب ہے کہ ہندو مذہب کی کوئی تعریف جامع مانع نہیں کی جاسکتی۔ سر سید نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے شکایت کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کو ہندو کیوں نہیں کہتے۔ اس رلی کھچڑی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہر ایک مذہب حق ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کا اپنا مذہب مُدوّن اور مرتب نہ ہو۔ لیکن مسلمان جس کے مذہب کی حدود مقرر کر دی گئی ہیں، جس کے لئے ہر ایک عقیدہ اور ہر ایک اصول کھول کھول کر بتایا گیا ہے اور جس کے لئے حضرت حق کا کلام اللہ شریف میں جگہ جگہ اعلان ہے۔ تِلْكَ حدود اللهِ فلا تعتدوها، نہیں کہہ سکتا کہ ہر ایک مذہب حق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آسمانی مذاہب جب نازل ہوئے تو وہ حق تھے۔ لیکن اگر وہ اسی حقانیت پر رہتے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کو تمام دنیا کے لئے ہادی، مبشر، نذیر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس نے یہ کتاب لکھ کر اپنا پردہ خود فاش کر دیا۔ یہ درست ہے کہ صوفیاء کرام مخصوص حالات میں غیب کے عجیب وغریب واردات سے متاثر ہو کر بے اختیار ان کو زبان پر لاتے ہیں مگر الفاظ ان کی مدد نہیں کرتے۔ کیونکہ الفاظ کے دامن میں ان کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ وہ لامحالہ اُنہی عام الفاظ میں ان حقائق کو ادا کرنا چاہتے ہیں جو انسان اور اس کے حالات اور کیفیات کیلئے وضع کئے گئے تھے۔

مثلاً باری تعالیٰ سے ملنے اور بات چیت کرنے کو لامحالہ ملاقات، زیارت، بات چیت، کلام اور تکلّم وغیرہ کے الفاظ سے ہی ادا کریں گے۔ حالانکہ یہ سب الفاظ انسانی کیفیات اور اعمال وحالات کے ساتھ مخصوص ہیں۔

باری تعالیٰ عز اسمہٗ سے ملاقات کی جو صورت ہو سکتی ہے۔ انسانی الفاظ اس کو ادا بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ کیفیت نہ عام انسانوں نے دیکھی، نہ اس کے لئے ان کے پاس الفاظ ہیں۔

بہرحال صوفیاء کرام سے بھی شطحیات سرزد ہوئے ہیں جن کے متعلق حضرت مجدّد صاحب کے مکتوبات کے کچھ اقتباسات ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان الفاظِ بے خودی کو الفاظِ بے خودی یا شطحیات ہی کہا جاتا ہے۔ ان کو شریعت قرار دینا سراسر زندقہ اور الحاد ہے۔

منصور کے انا الحق کو اگر شریعت کہہ دیا جائے تو پھر اسلام اور کفر میں کیا فرق رہے۔ لیکن داراشکوہ کا یہ غرور تھا، اور اسی غرور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور رحمت بنا کر اسی لئے بھیجا گیا کہ تمام دنیا کے مذاہب اپنی صداقت اور حقانیت سے ہٹ چکے تھے۔ آپ اسی لئے آئے کہ ان کی خرابیوں سے ان کو آگاہ کریں۔ حق وصداقت کی ہدایت کریں۔ اتباعِ صداقت کی شکل میں ان کو بشارت دیں۔ آپ رحمۃ للعالمین اسی لئے ہیں کہ پوری دنیا کے تمام ممالک اور تمام انسانی طبقات باطل پرستی کے باعث دوزخ میں جا رہے تھے۔ آپ نے رحمت بن کر اُن کو دوزخ سے بچنے کی واضح اور سیدھی راہ بتائی۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

محمد میاں عفی عنہ

تمام باتیں بناوٹی تھیں کہ جب اس پر اعتراض ہونے لگے تو وہ فوراً اپنے کو حق بجانب کرنے اور اُن ہی شطحیات کو عین دین، عین شریعت قرار دینے کیلئے تصنیفیں لکھنے لگا۔

چنانچہ اسی خیال کو تقویت دینے اور ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے اُس نے اپنی وہ کتاب لکھی جو مجمع البحرین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دارا کی آخری تصنیف ہے جو اس کے عقائد و خیالات کو عریاں کرکے سامنے لاتی ہے، ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔

اس کتاب میں دارا نے یہ دکھایا ہے کہ اسلامی تصوف اور ویدانتک فلسفہ اپنے اصول اپنی تعلیمات اور اپنی حقانیت کے لحاظ سے ایک ہیں، اور جو شخص حق کو حاصل کرنا چاہے وہ ان میں سے راستہ کو بھی اختیار کرے، اس سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اُسے خود خطرہ تھا کہ مسلمان اس کی تصنیف کو پسند نہ کریں گے۔ اس لئے اُس نے دیباچہ میں لکھ دیا کہ اُس نے یہ کتاب "رازِ درون خانہ سے واقف" "اہلِ بیت" کے لئے لکھی ہے "و مرا بعوام ہر دو قوم کارے نیست"۔ اسی وقت سے حنفی و قادری کی نسبت بھی غائب ہو جاتی ہے۔

ے گوید فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ بعد از دریافت حقیقۃ الحقائق و تحقیقِ رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیہ عظمیٰ درصدد آں شد کہ درکِ کنہہ مشرب موحدانِ ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید با بعضے از کاملان ایشاں کہ بنہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوّف خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند مکرر صحبتہا داشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلافِ[1] لفظی دریافت و شناخت

[1] جوگیوں کے ساتھ یہ عقیدت کہ واقعی اختلاف بھی صرف لفظی اختلاف ہو گئے اور علماء و مشائخِ اسلام سے یہ نفرت و بد اعتقادی کہ:

مدتے کتب حال مشائخ مطالعہ میکردم، چوں اختلاف بسیار ظاہر شد مطالعہ کتب را بالکل

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تفاوتے[1] ندیدہ۔ ازیں جہت سخنانِ فریقین را باہم تطبیق دادہ و بعضے سخناں کہ طالبانِ حق را دانستن آں ناگزیر و سود مند است فراہم آوردہ[2]۔ (ص ۲۰۳ مجمع البحرین[3])

اس کے بعد وہ اس قسم کی کتابیں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے ملازمین سے بھی لکھواتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور رسالہ وہ ہے جو اس کے منشی چندربھان نے مکالمہ داراشکوہ و بابا لعل کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اس مکالمہ کی روح اس خیال کی تائید ہے کہ حق و صداقت کسی خاص ایک مذہب کی ملکیت نہیں۔

دوسری کتاب جوگ بشسٹ ہے۔ دارا کے حکم سے ۱۰۶۶ھ میں سنسکرت سے اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس ترجمہ کے متعلق دارا کا بیان خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔

"اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) منزوک ساختم و مطالعہ دل کہ بحریست لامحدود و ازاں ہمیشہ گوہرہائے تازہ بروں مے آید پرداختم سہ

مرا بہ ہیچ کتابے دگر حوالہ مکن   کہ من حقیقت خود را کتاب میدانم

(رقعہ دارا بنام شیخ محب اللہ الہ آبادی رقعات عالمگیر ص ۳۳)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کیا جوگی رسالتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی قائل تھے؟ یہی ہے زندقہ اور الحاد۔ [2] فقیر بے اندوہ محمد داراشکوہ کہتا ہے کہ حقیقت الحقائق کے معلوم کر لینے اور صوفیہ کے مذہب حق کے رموز و دقائق کی تحقیق اور اس عطیۂ عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد میں اس کے درپے ہوا کہ ہندوستان کے توحید پرستوں اور ہندو قوم کے محققین کے مشرب کی حقیقت معلوم کروں۔ ہندو قوم کے چند کاملین کے ساتھ (جو ریاضت تحقیق، فہمیدگی اور انتہا درجہ کے تصوف، انتہا درجہ کی خدارسی اور سنجیدگی میں آخری درجہ پر پہنچے ہوئے تھے) بار بار ملاقات کی۔ لفظی اختلاف کے سوا یافت اور شناخت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ اسی لئے (اس کتاب میں) فریقین کی باتوں کو ایک دوسرے پر منطبق کیا۔ اور بعض وہ باتیں کہ طالبانِ حق کے لئے ان کا جاننا ضروری اور فائدہ بخش ہے، جمع کیا۔ [3] متن حاشیہ ص ۳۵۹۔

ہم نے (دارانے) مطالعہ کیا تورات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت، ایک اُونچے پر اور دوسرے کسی قدر اُن سے نیچے کھڑے ہوئے معلوم ہوئے۔ جو اُونچے پر کھڑے تھے بشسٹ تھے اور دوسرے رام چندر۔ مَیں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بشسٹ نے نہایت مہربانی کے ساتھ اپنا ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چندر! یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے، اس سے بغلگیر ہو۔ رام چندر کمال محبّت کے ساتھ مجھ سے ملے اِس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تاکہ مجھے کھلادے مَیں نے وہ شیرینی کھائی۔ اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سرِ نو زیادہ ہوئی، اور دربارِ عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص اس خدمت پر مقرر ہُوا، اور ہندوستان کے پنڈتوں سے اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کرایا۔ (منہاج السالکین ترجمہ جوگ بشسٹ)[ع]۔

عالمگیر نامہ[1] میں مفصل طور سے اس کے آخری مذہبی عقائد کو اسی طرح بیان کیا ہے:

اباحت و الحاد اس کی طبیعت میں جم چکا تھا۔ اور اس کو وہ تصوّف کہا کرتا تھا۔ آخری حالت میں فقط اباحت و الحاد کے اظہار پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ہندوؤں کے دین اور ان کے رسم و رواج کا گرویدہ ہو گیا برہمنوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ ہمیشہ صحبت رکھتا اور ان کو

ع متن صنہ ۳۶۔ [1] در اواخر حال باظہار مراتب اباحت و الحاد کہ در طبع او مرکوز بود و آنرا التصوّف نام مے نہاد۔ اکتفا نہ نمودہ۔ بدیں ہندوواں و کیش و آئین ایشاں مائل شدہ بود ہموارہ برہمناں و جوگیاں و سنیاسیاں صحبت میداشت و آں گروہ را مرشدان کامل و عارفان بحق واصل مے پنداشت و کتاب آنہارا کہ بہ بید موسوم است کتاب آسمانی و خطاب ربّانی میدانست و مصحف قدیم کتاب میخواند۔

مرشدانِ کامل اور خدا رسیدہ و عارف سمجھتا اور وید[1] کو کتابِ آسمانی اور خطابِ ربانی جانتا اور کتاب کریم کا سب سے پہلا مصحف کہتا تھا۔
عقیدہ[2] باطل اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ الماس یاقوت اور زمرد وغیرہ قیمتی جواہر کے نگینوں پر جن کو وہ پہنا کرتا تھا، خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ کے بجائے پوری عقیدت مندی کے ساتھ ہندی خط میں ایک ہندی نام "پربھو" کندہ کرایا تھا، اسی کو متبرک سمجھتا اور اسی سے برکت حاصل کرتا۔ اور چونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ عبادت کی تکلیف ناقص لوگوں کے لئے ہے، عارف کامل کو عبادت کی ضرورت نہیں اور آیۃ کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کا مطلب ملحدوں کے خیال کے بموجب گھڑ کر اپنے ان خیالاتِ باطلہ کی دلیل بناتا تھا لہٰذا انہیں عقائدِ باطلہ کی بناء پر نماز، روزہ اور جملہ تکالیف شرعیہ کو

---

[1] اپنشد کے ترجمہ میں صاف لکھتا ہے کہ قرآن مجید اصل میں اپنشد ہے۔ اور قرآن پاک کی یہ آیت کہ انه لقرآن كريم الآیۃ اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو پوشیدہ ہے۔ اور اس کی وہی تلاوت کر سکتا ہے جس کا دل پاک ہو چکا ہو۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ایں خلاصہ قدیم کہ بے شک و شبہ اصل کتب سماوی و سرچشمۂ توحید ست و قدیم کہ انه لقرآن كريم فى كتاب مكنون لا يمسه الا المطهرون یعنی قرآن کریم در کتاب است کہ آں کتاب پنہاں ست و را تلاوت نے کند مگر دے کہ مطہرہ باشد الخ [2] واز کمال اعتقادِ باطل بجائے اسمائے حسنائے الٰہی اسمے ہندوے کہ ہنود آں را "پربھو" مے نامند و اسمِ اعظم مے دانند بخط ہندوی بر نگینہا الماس و یاقوت و زمرد وغیرآں از جواہر گرے پوشید نقش کردہ باں تبرک مے جست و چوں معتقد آں بود کہ تکلیف عبادات ناقصاں راست و عارف کامل را عبادت در کار نیست۔ آیۃ کریمہ واعبد ربك حتّٰى ياتيك اليقين را بمشرب ملاحدہ فرا گرفتہ دلیل ایں معنی مے ساخت۔ بنا بریں عقیدۂ فاسدہ نماز و روزہ وسائر تکالیف شرعیہ را خیر باد گفتہ بود۔ (عالمگیر نامہ)۔

خیرباد کہہ چکا تھا۔"

حسنات[1] العارفین میں اسی طرح قرآن مجید کی دوسری آیتوں کے معنی بھی دارا نے گھڑے ہیں۔ مثلاً دارا کے پیر مُلّا شاہ نے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰارٰی کے یہ معنی اور تفسیر بیان کی ہے۔

"اے[2] کسانیکہ ایمانِ حقیقی آوردہ آید نزدیک نماز نشوید در وقتے کہ در حالتِ سکر و مستی باشید۔ مقرر سکر حالت بلند تر ست از نماز گذاردن اگر مستی مجازی است قربِ نماز ممنوع ست تا نماز ملوّث نشود۔ دریں صورت عزّتِ نماز ست و اگر سکر حقیقی ست، باز ہم قرب نماز ممنوع ست دریں صورت عزّتِ سکر ست مصلی نماز، نماز کہ خواند (ص۳۲)۔

دارا شکوہ اپنے آپ کو فنا فی اللہ سمجھتا تھا۔ اس لئے عبادت کی پابندی سے بھی آزاد ہے۔ اسی طرح خود مُلّا شاہ کے پیر میاں میر نے خَتَمَ[3] اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ الآیہ کے متعلق بتایا ہے کہ:

در حق خاصاں[4] ست۔ ختم ست بر دلہا ایشاں کہ درون ایشاں غیر نیاید و چشمِ ایشاں غیر نہ بیند و گوش ایشاں غیر نشنود۔ و مر ایشاں را لذّت و حلاوت بسیار ست ازاں کفر۔ (ص۳۰۸)

---

[1] مق ص۳۶۳۔ [2] اے وہ لوگو جو ایمان حقیقی حاصل کر چکے ہو، سکر و مستی کی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ کیونکہ حالتِ سکر ادائے نماز سے بلند تر ہے۔ اگر سکر مجازی ہے تو قربِ نماز ممنوع ہے تاکہ نماز آلودہ نہ ہو، اور اس صورت میں نماز کی عزّت ہے۔ اور اگر سکر حقیقی ہے تب بھی قرب نماز ممنوع ہے۔ اس صورت میں سکر کی عزّت ہے۔ نماز پڑھنے والا ہی نہ رہا، نماز کون پڑھے [3] مُہر کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر۔ [4] یہ خاص عشاق کے حق میں ہے کہ ان کے دلوں پر مُہر ہو گئی ہے کہ غیر اللہ کا ان میں دخل نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہیں غیر کو نہیں دیکھتیں، اُن کے کان غیر کو نہیں سُنتے۔ اُن کو بہت زیادہ لذّت و حلاوت ہے اس کفر سے۔

محمد کاظم مصنّف عالمگیر نامہ اگرچہ عالمگیر کا ملازم اور اس کا مورّخ ہے ــــ مگر حسنات العارفین کی تحریر بالا اس کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے ۔ مزید تصدیق ملاحظہ ہو ۔ خود دارا کے الفاظ ہیں ۔

اپنے ایک خط میں شاہ دلرُبا کو لکھتا ہے :

"الحمدللہ الحمدللہ کہ از برکت صحبتِ ایں طائفۂ شریفۂ مکرمۂ معظمہ از دل ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفر حقیقی روئے نمود ــــ اکنوں کہ قدر کفر حقیقی دانستم زنار پوش و بُت پرست بلکہ خود پرست[1] و دیر نشین گشتم (رقعات عالمگیر ص۳۲۲ رقعہ نمبر ۴/۷ بحوالہ ص۲۰۷)۔

لیکن کیا دارا واقعی درجۂ فنا پر پہنچ چکا تھا ۔ وہ اپنی تمام خواہشات، تمام ہوسناکیوں، تمام حیلہ و فریب، تمام جاہ پرستی و اقتدار پسندی کو فنا کر چکا تھا؟ اس کا جواب تاریخ کے اوراق دے سکتے ہیں، جن میں چاروں بھائیوں کے جنگ کے اسباب و وجوہات درج ہیں ۔ ان کا اجمالی بیان عالمگیر کے حالات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۔ لہٰذا دارا کے باقی حالات کو اُسی مقام کے حوالہ کرتے ہوئے ہم ناظرین کرام کو حضرت مجدّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدماتِ جلیلہ کی طرف پھر توجہ دلاتے ہیں ۔

تسلیم کیا جا چکا ہے کہ دارا کی تباہی کا سبب اسی کے خیالات تھے ۔ اس کے انہیں عقائد نے درپردہ سنجیدہ اُمراء دولت کو اس سے متنفر کر دیا تھا ۔ اور یہی سبب تھا کہ جیسے ہی کسی کو موقع ملا، وہ دارا کو چھوڑ کر اورنگ زیب کی پناہ میں پہنچا اور دارا کے انہی خیالات کا مخالفانہ اثر تھا جس نے امراء دولت کے قلوب کو نہ صرف

---

[1] مدّعیِ فنا کا یہ لفظ خود، اپنے دعوے کی خود تردید ہے ۔ یہ ہندوانہ گمراہی ہے کہ آتما پرماتما بن جاتی ہے ۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خودی کو اتنا فنا کر دو کہ خود کا تصوّر تک بھی نہ آئے لا الٰہ الا اللہ (دیکھو مکتوبات حضرت مجدّد صاحب کے اقتباسات جو پہلے پیش کیے گئے)۔

دارا سے بلکہ شاہجہاں کی جانب سے بھی جس کے وہ نمک خوار اور قدیمی معتمد علیہ تھے، ہٹا کر عالمگیر کے لئے فتح مندی اور فیروز بختی کو آسان کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہجہاں نے قلعہ آگرہ جس میں وہ خود محفوظ ہو کر بیٹھا تھا اور جس کا فتح کرنا دشوار ترین امر تھا، اس کی کنجیاں خود عالمگیر کے پاس بھیج دیں کیونکہ وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو چکا تھا۔

اکبر اور جہانگیر کا تخت دارا کو دھکیل رہا ہے، اور زاہد خشک، پابندِ مذہب عالمگیر کے لئے مضطرب ہے۔ یہ انقلاب کس کی جد و جہد کا نتیجہ ہے؟ مبصرین کا فیصلہ ہے کہ اگر اس وقت عالمگیر نہ ہوتا، تو ہندوستان سے اسلام رخصت ہو گیا تھا۔

سلطان اورنگ زیب[1] عالمگیر رحمہ اللہ

ولادت — تعلیم — تربیت

پروفیسر جدو ناتھ سرکار اپنی مشہور تاریخ "اورنگ زیب" کی تمہید ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

"اورنگ زیب کی تاریخ عملاً ہندوستان کی شصت سالہ تاریخ ہے۔ خود اس کا عہدِ حکومت (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) سترھویں صدی کے منتصف آخر پر حاوی ہے اور ہمارے ملک کا اہم ترین تاریخی زمانہ ہے۔ یہ اسی بادشاہ کا ورود مسعود تھا، جب کہ حکومتِ مغلیہ

---

[1] اس مضمون کی ترتیب کے وقت، بادشاہ نامہ عبد الحمید۔ رقعاتِ عالمگیری، سفر نامہ کپتان الیگزینڈر ہملٹن۔ رقعات عالمگیر و قائع عالمگیر۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، مقدمہ رقعات عالمگیر، ہمارے سامنے رہی ہیں۔ باقی کتابوں کے اقتباسات انہیں سے ماخوذ ہیں۔ متن سے مراد مقدمہ رقعات عالمگیر ہے۔

اپنے انتہائی عروج کو پہنچی اور ابتداء عہد تاریخ سے برطانوی حکومت کے قیام تک کے زمانہ میں شاید یہ واحد حکومت ہے جس نے اتنی وسعت حاصل کی۔

غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے کر کرناٹک تک تمام ملک ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں تھا، اور لادک و مالا بار کے دُور دراز مقامات پر بھی اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اسلام کی آخری سب سے بڑی ترقی کا یہی زمانہ تھا۔

اس طرح سے جو حکومت قائم ہوئی تھی، ایک سیاسی وحدت تھی۔ اس کے مختلف قطعات پر ماتحت حکمرانوں کا تسلط نہ تھا بلکہ بلا واسطہ بادشاہ کے ماتحت تھے۔ اور اس حیثیت سے اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت اشوک، سمدر گپت یا ہرشوردھن کی حکومت سے وسیع تر تھی۔ اس وقت تک کسی صوبہ کے گورنر نے سر نہ اُٹھایا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں عَلَم بغاوت بلند ہوتا تھا لیکن کسی صوبہ میں بھی کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، جو شہنشاہِ دہلی کے حکام کی سرتابی کر سکتا[1]

ولادت یوں تو شاہجہاں کی اولاد کی تعداد سولہ ہے لیکن اسکی محبوب ترین بیگم ممتاز محل بنت آصف خاں، اس کے چودہ بچوں کی ماں تھی اور اورنگ زیب کو باعتبار ترتیب چھٹا درجہ حاصل تھا۔ جس طرح اورنگ زیب کی تمام عمر گھر سے باہر اور دارالسلطنت سے دُور گذری، اسی طرح اس کی ولادت و موت دونوں پردیس میں واقع ہوئیں۔

جہانگیر احمد نگر کے سپہ سالار ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف

---

[1] اورنگ زیب جلد اوّل مقدمہ بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر صـ ۱۱۸ جلد ۱۔

اطمینان سے واپس آرہا تھا کہ مالوہ اور گجرات کی انتہائی سرحد پر بمقام دوحد سنیچر کا دن گذر کر رات کے وقت ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو ہندوستان کے سب سے بڑے تاجدار نے کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں قدم رکھا۔ شاہجہاں بھی جہانگیر کے ساتھ تھا۔ اور اُس نے دیرینہ رسم کے مطابق ایک ہزار اشرفی کی نذر گذرانی۔ جہانگیر نے اُسے قبول کرتے ہوئے اس مولود مسعود کا نام اورنگ زیب رکھا۔ گویا اسی وقت قضا و قدر کے کارکنوں نے خود دادا کے منہ سے اس پیشین گوئی کو ظاہر کر دیا جو چالیس سال بعد پوری ہونے والی تھی۔

چونکہ دوحد کی زمین اس قابل نہ تھی کہ "لائق جشن و ضیافت باشد" اس لئے جہانگیر وہاں سے کوچ کر کے ایک تالاب کے پاس ٹھیرا۔ اور وہاں ابتدائی رسوم ادا کر کے پورا قافلہ "اوجین" پہنچا اور وہاں پہنچ کر جشنِ ولادت پوری شان و شوکت سے منایا گیا۔[1]

رضاعت | میر ابو المعالی،[2] خواقی خاں کی اہلیہ محترمہ کو یہ شرف حاصل ہوا۔

---

[1] خود اورنگ زیب کو اپنے مولد سے خاص محبت رہی ہے۔ وہ اس مقام کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خواہاں رہا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں اپنے بیٹے معظم خاں کو لکھتا ہے۔ "فرزند عالی جاہ! قصبہ دوحد از مضافات صوبہ گجرات مولد ایں عاصی پُر معاصی ست، رعایت سکنۂ آنجا واجب دانند و پیر منحنی را کہ مدّت فوجدار آنجاست بستمال و بحال دارد و حرف مریضان غرض کہ "فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضاً"۔ در شان آنہاست بحق او نہ شنوند۔ عنایت بر ضعیفان گوشہ چشمے دیگر دارد۔ بمہر کوچک خود لطف دیگر یست شاہاں را۔ (رقعات عالمگیری) ایک اور مکتوب میں اسی بیٹے کو لکھتا ہے۔ آنچہ ضرور باعثِ آبادی و رفاہ متردیں باشد بکنند و جزیہ و حاصل یک دو سال معاف (احکام عالمگیری۔ مق، ص ۱۲۱) [2] میر ابو المعالی سیدے بود موصوف بصلاح و تقویٰ بعنوان درویشانہ مے گذرانید۔ حلیلہ جلیلہ او بشرف رضاعت فیض اشاعت شاہزادہ محمد اورنگ زیب عالمگیر بہادر رسید (مآثر الامرا، جلد ا ص ۷۹۸)۔

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تعلیم و تربیت اساتذۂ اورنگ زیب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمار گرامی ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) میر محمد ہاشم گیلانی۔[۱]

(۲) مُلّا موہن بہاری۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میر صاحب موصوف کے دو لڑکے تھے۔ ان میں چھوٹا "میر ملک حسین" اورنگ زیب کا رضاعی بھائی تھا۔ وہ ہمیشہ اورنگ زیب کے ساتھ رہتا۔ اورنگ زیب نے بھی کبھی اس کی ترقی میں اغماض نہیں کیا۔ جس وقت وہ مرا ہے تو "خان جہاں بہادر ظفر جنگ کوکلتاش" کے پُر رعب القاب سے مخاطب تھا (وقائع عالمگیر) ۱۹ جمادی الاولی ۱۱۰۸ھ کو بمقام شولاپور انتقال کیا۔ اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ بڑے دبدبہ کے امیر تھے۔ تاریخ آسام انکی تصنیف ہے۔ ان کے ایک بھائی کا نام مظفر حسین اور فدائی خاں خطاب ہے۔ دوسرے بھائی اعظم خاں کوکہ کہلاتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] میر محمد ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی مدّت دوازده سال در حرمین شریف بوده منقولات را از شیخ محمد عربی محدّث و شیخ عبدالرحیم حسانی و ملا علی نبیره مُلّا عصام الدّین مشهور و معقولات را از میر نصیر الدّین حسین پسر زاده میر غیاث الدین منصور و مرزا ابراہیم ہمدانی فراگرفته بهندوستان آمد و طب و ریاضی نزد سرآمد اطبا حکیم علی گیلانی۔ ورزیده چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود۔ چوں دانائی او را در فنون فضائل خصوصاً طب بعرض اقدس رسید حکم شد که بهمان بلده بخدمت صدارت و طبابت بپردازد۔ پس از انقضاء مدّتے ملزم عبودیت شده بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج شاہزاده محمد اورنگ زیب بهادر یافت و اکنوں در ملازمت آں والا گوہر کامیاب ست بتفسیر بیضاوی حاشیه نگاشته (عبدالحمید جلد احصه دوم ص۳۴۵)۔ [۲] نام اصلی او محی الدین ست۔ مولد منشا بلده بهار در سن ده سالگی کلام الله را حفظ کرده۔ بخدمت پدر خود مُلّا عبدالله کسب علوم نمود۔ و در هفده سالگی فاتحه فراغ خواند۔ چندے در وطن خود بدرس و افاده پرداخت۔ بعد ازاں بملازمت شاہجہان بادشاه رسید۔ و بتعلیم شاہزاده محمد اورنگ زیب معین گردید (آداب عالمگیری و تحفة الکرام۔ ص ۱۲۶)

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

(۳) علامی سعد اللہ وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ۔[1]

(۴) مولانا سیّد محمد قنوجی۔[2]

(۵) شیخ احمد معروف بہ مُلّا جیون امیٹھوی۔[3]

(۶) دانش مند خاں۔[4]

ذہانت و ذکاوت ۳؍ ذی الحجہ ۱۰۴۵ھ (ایک ہزار پینتالیس) کو عالمگیر تمام دکنی صوبوں کا گورنر بنادیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال دس روز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) و بخدمت شاہ حیدر نبیرہ شیخ وجیہ الدین گجراتی بیعت کرد۔ عاقبۃ الامر از پیش گاہ خلافت رخصت گرفتہ بوطن شتافت و بریاضت و مجاہدہ کار بست۔ بعمر ہشتاد و چہار سالگی در ۱۰۶۸ھ (ہزار و شصت و ہشت) مرحلہ آخرت پیمود (ص ۸۳ مآثر الکرام جلد ۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] حضرت عالمگیر باہر کرام ربطے خاص داشتند۔ سعد اللہ خاں را کہ خطاب عصاپیری وزیر باتدبیر داشت، نزد او درس خواندہ خود را شاگرد او مقرر نمود (احکام عالمگیری ص ۴ مق ص ۱۲۶) باقی حالات پہلے ملاحظہ سے گذر چکے۔ محمد میاں۔ [2] از فرقہ سادات رسول واز اساتذۂ اورنگ زیب عالمگیر ماہر علوم ریاضیہ و ادبیہ بود، و حاشیہ مطول از تصانیف اوست ۱۲۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۸۳)۔ [3] مقدمہ واقعات عالمگیری میں مُلّا جیون کا نام مُلّا محمود تحریر کیا ہے مگر جیسا کہ معاصرین دورِ مجددی کے سلسلہ میں مآثر الکرام وغیرہ سے نقل کرکے درج کیا گیا۔ مُلّا محمود جونپوری دوسرے بزرگ ہیں جو شیخ محمد افضل جونپوری کے شاگرد اور شمس بازغہ و فرائد کے مصنف ہیں، شاہجہاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعزاز پایا۔ ۱۰۵۲ھ میں وفات ہوئی، اور مُلّا جیون کا اصلی نام احمد ہے۔ یہ امیٹھی کے رہنے والے ہیں۔ ۱۱۳۰ھ میں وفات ہوئی۔ نور الانوار اور تفسیر احمدی آپ کی تصانیف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں۔ [4] چوں اورنگ خلافت و جہانداری بعز جلوس عالمگیری ارتفاع یافت، خان مذکور مورد مراحم خاقانی شدہ و بادشاہ دین پناہ بعض کتب نزد خان موصوف تکرار نمودہ، خصوص احیاء العلوم غزالی از اوّل تا آخر تلمذ نمودہ۔ (فرحۃ الناظرین۔ مق ص ۱۲۷)۔

تھی۔ اس اٹھارہ سالہ نوجوان کے متعلق عالمگیر نامہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

"از علومِ مکتسبہ و فنونِ متعارفہ تام النصیب کامل التحصیل و از مبدأ فیاض بجمائد صوری و محامد معنوی بہرہ مند و کامیاب"۔

"خامۂ معنی نگار آنحضرت حرفِ نسخ و نستعلیق بکرسی تحسین و تزئین نشاندہ"۔ (عالمگیر نامہ)

خلاصہ[1] یہ کہ جملہ علوم و فنون کو مکمل طور پر حاصل کیا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں پوری مہارت پیدا کی اور عربی اور فارسی خط (نسخ و نستعلیق) میں کمال حاصل کیا۔ اسی کے ساتھ فنونِ حربیہ، ملکی آئین، طریقِ جہانبانی و دستورِ فرمانروائی کا وہ بہترین سلیقہ فراہم کیا کہ اس ننھی سی عمر میں سب سے زیادہ پُر آشوب صوبوں یعنی صوبجات دکن کی وہ کامیاب گورنری کی کہ بعد کے کہنہ مشق حکام اور افسران اس کامیابی کے ساتھ حکومت نہیں کر سکے (جیسا کہ چند صفحات کے بعد معلوم ہوگا)۔

حفظِ کلام اللہ اور تجوید و قراءت یہ تو عام[2] طور پر معلوم ہے کہ اورنگ زیب

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر وغیرہ۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں۔ عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا۔ اس کی انشار پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے۔ اس کے رقعات باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرہ، قصہ طلب جوابوں کا مجموعہ اور جغرافیانہ اطلاعات کی یادداشت ہیں۔ تاہم ادائے مطلب کی قدرت و عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطلب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشیں ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ مولانا محمد حسین کے الفاظ میں عالمگیر جس طرح سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشورِ سخن اس کے زیر قلم ہے۔ [2] از جلائل فضائل آں خدیو یزداں پرست توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانی ست در عین اوان سلطنت جہانبانی و زمان اشتغال بامور ملک رانی و کشورستانی کہ ہیچ یک سلاطین اسلام و دین پروران، پاستانی را ایں خصیصۂ سعادت چہرآرائے دولت نگشتہ۔ اگرچہ ہم از مبادی مال و دولت و اقبال برخے از سورِ کریمہ قرآنی و بسیارے از آیات بینات فرقانی محفوظ خاطر اقدس بود لیکن حفظِ مجموعہ کلام اللہ ازاں بادشاہ خدا آگاہ بعد جلوس براورنگ حشمت و جاہ اتفاق افتاد۔ (عالمگیر نامہ)۔

حافظ کلام اللہ تھا۔ مگر قابلِ تحسین یہ کہ یہ فخر و سعادت لڑکپن میں نہیں بلکہ عمر عزیز کی تینتالیس (۴۳) بہاریں گذر جانے کے بعد یہ دولت حاصل کی، جب برادرانہ جنگ سے نجات پاچکنے کے بعد اورنگ زیب بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان کا شہنشاہ ہوچکا تھا۔ غالباً یہ اسی کا شکریہ تھا جو اس نے اپنے معبودِ تاج بخش کی بارگاہ میں پیش کیا۔

ابتداءِ حفظِ قرآن کی تاریخ آیہ کریمہ "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ" (۱۰۷۱) اور اختتام کی "لوحِ محفوظ" (۱۰۷۸) سے نکلتی ہے۔ اورنگ زیب کے ایک مقرب شاعر ضمیرؔ نے اس موقعہ پر کہا تھا:

تُو حامیِ شرع و حامیِ تُو شارع
تُو حافظِ قرآں و خدا حافظِ تُو

مزید برآں قابلِ ستائش یہ کہ:

"درعرض اندک دقتے و مختصر فرصتے مجموع کلام مجید و فرقانِ حمید بارعایت مراتب قراءت و شرائط تجوید و ادراک شانِ نزول آیات بینات و تفسیر معانی و فہم اسرار و نکات آں بر لوحہ حافظ اشرف مرقوم گشت (عالمگیر نامہ)۔

پہلے پڑھ چکے ہو کہ ۱۰۷۰ھ میں عالمگیر کے اصرار پر حضرت خواجہ محمد سعید صاحب خلف رشید حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز دہلی تشریف لائے۔ حفظِ کلام اللہ شریف آپ کی تشریف آوری کی پہلی برکت تھی۔

اس کے بعد رُوحانی تکمیل کے لئے حضرت شیخ سیف الدین صاحب نبیرۂ حضرت مجدد صاحبؒ دہلی تشریف لائے تھے۔ غالباً زمانہ قیام ہی میں یہ دولت حاصل ہوئی۔ حفظِ قرآن اور فہم کلام اللہ کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے فیضِ صحبت سے جو رُوحانی کمالات حاصل کئے، اُن کا اندازہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے چند

جملوں سے ہو سکتا ہے۔

آنچہ در احوالِ پادشاہ دین پناہ مرقوم نمودہ بودند، از سرایت ذکر در لطائف وحصول سلطان ذکر و رابطہ قلتِ خطرات وقبول کلمہ حق و وقع بعضے منکرات وظہور لوازم طلب ہمہ بوضوح پیوست شکرِ خداوندی جل شانہ بجا آورد۔ در طبقہ سلاطین ایں نوع امور حکم عنقاء مغرب دارد (مکتوب ۲۲ جلد سوم بنام شیخ سیف الدین صاحب قدس اللہ سرہما)۔

ہاتھی سے لڑائی ۲۹ ذی قعدہ ۱۰۴۲ھ (۲۸ مئی ۱۶۳۳ء) کی صبح کو شاہجہاں شاہانِ مغلیہ کی دیرینہ رسم کے مطابق مست ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کے لئے قلعہ آگرہ کے جھروکہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے دو مست ہاتھی لڑنے کے لئے چھوڑے گئے۔ دارا، شجاع اور چودہ سالہ اورنگ زیب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار میدان میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ صورت سندر نامی ہاتھی ایک طرف کو بھاگا۔ اُس کے مقابل سدھکر نامی ہاتھی نے تعاقب کیا۔ حریف دُور نکل گیا تھا۔ سدھکر نے مجمع کا رُخ کیا۔ سب سے آگے اورنگ زیب کا گھوڑا تھا۔ مجمع میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مگر اورنگ زیب نے بازوئے جلادت کشودہ پیشانی آں دو نہاد۔ دیو نژاد را مجروح ساخت۔

چوٹ کھا کر ہاتھی اور غضب ناک ہوا۔ اس نے اورنگ زیب کے گھوڑے پر اپنے دانتوں سے اس زور کا حملہ کیا کہ گھوڑا لڑکھڑا کر گرا۔ مگر اورنگ زیب فوراً اُچک کر کھڑا ہو گیا اور تلوار نیام سے کھینچ لی۔ دارا تو دہشت کھا کر بھاگ نکلا۔ مگر شاہزادہ شجاع اور راجہ جے سنگھ نے دوسری طرف سے ہاتھی پر حملہ کیا۔ اسی اثنا میں صورت سندر نے عقب سے آکر سدھکر پر حملہ کر دیا۔ سدھکر بھاگ نکلا۔

اورنگ زیب فیروزمندی کے ساتھ باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہجہاں نے بہت کچھ انعام و اکرام کے بعد فرمایا۔ خدانخواستہ نوعے دیگر مے شد چہ رسوائی بود۔ عالمگیر نے عرض کیا۔ مرنے میں کیا رسوائی ع پردہ پوش بادشاہاں مرگ ست۔

رسوائی تو یہ تھی جو بھائی صاحب سے سرزد ہوئی۔[1]

یہ عالمگیر کے عہدِ طفلی کا عظیم الشّان واقعہ ہے، اور یہی دارا کی رقابت کا آغاز ہے۔

عطاءِ منصب تقریباً ایک سال بعد یعنی ۳ رجب ۱۰۴۴ھ جبکہ عالمگیر شاہجہاں کے ساتھ کشمیر جا رہا تھا، اُس کو "لوکہ بھون" کا پرگنہ عطا ہوا۔ نیز بمنصب دو ہزاری ذات و چہار ہزاری سوار و عَلَم و نقارہ و طومان طوغ بلند پائیگی بخشیدہ فرمان دادند کہ بعد ازیں خیمہ سُرخ برائے آں گوہرِ اکلیل سلطنت برپا مے کردہ باشند۔[2]

مُلکی مہمّات اور دارا کی رقابت

عالمگیر کی پوری سوانح حیات لکھنی مقصود نہیں۔ مندرجہ ذیل نمبروں میں جنگِ برادران اور معزولیِ شاہجہاں کے اسباب و وجوہات اجمالی طور سے بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ بارگاہِ مجدّدی کے آستانہ بوس اور اس کے مخالفین کے اعمال و مساعی پر انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکے۔

(۱)

عالمگیر اپنے تمام اوصاف و کمالات، تمام سعادت مندیوں اور بلند اقبالیوں کے باوجود ایک چیز میں بدقسمت واقع ہوا تھا یعنی شفقتِ پدری، جو اُس کے حصّہ میں بہت کم آئی تھی۔

شاہجہاں کی اولاد میں جس نے شفقتِ پدری سے بہت زیادہ اور بے نظیر حصّہ پایا تھا، وہ اس کا لاڈلا بیٹا دارا تھا۔ جو ایک بچہ کے انتقال کے بعد بہت زیادہ آرزوؤں اور تمنّاؤں کی حالت میں پیدا ہوا، جب کہ اس کیلئے اجمیر شریف حاضر ہو کر منت مانی تھی۔ دارا کی اس خصوصیّت میں اگر کسی کو شرکت تھی، تو وہ

---

[1] احکامِ عالمگیری، ص ۱۳۵۔ [2] عبد الحمید جلد ۲ ص ۱۶۵

شاہجہاں کی سب سے بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم تھی۔

باوجودیکہ دارا فقط خوشامدی اور چرب زبان تھا، متانت اور سنجیدگی سے محروم، بے موقعہ ہنس دینے والا، طبیعت میں اس قدر نفاق کہ خود باپ کے ساتھ بھی اس کا رویہ مخلصانہ نہ تھا مگر عیاری میں اس درجہ کمال رکھتا تھا کہ آخر تک شاہجہاں کو اپنا معتقد بنائے رکھا۔ اگر کبھی اس کا مکر و فریب شاہجہاں کے سامنے کھُل جاتا تو وہ جلد ہی ظاہر پرستی اور تملق سے اس کی تلافی کر دیتا۔

عالمگیر حسنِ خدمات، جفاکشی، خلوص و صداقت کا یہانتک دلدادہ تھا، کہ دارا کی عیاریوں کا جواب بھی اپنی صداقت کیشی ہی سے دینا چاہتا تھا۔

اُس کا اعتقاد تھا کہ صداقت پسند شاہجہاں رفتہ رفتہ خود حق و صداقت اور عیاری و فریب کاری میں امتیاز کرے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ حتّٰی کہ وہ وقت آگیا کہ عالمگیر کے لئے خاموش رہنا، اس کی ذات کے لئے نہیں بلکہ مُلک و ملت کیلئے ہلاکت کے مرادف ہو گیا۔ لامحالہ عالمگیر کے لئے لازم ہو گیا کہ جو پردے خود سے نہیں ہٹتے، اُن کو تلوار کی نوک سے چاک کر ڈالے، اور جو تاریکی خود نہیں جاتی، ایک الاؤ جلا کر اس کو روشنی سے بدل دے۔

معزول شاہجہاں سے جب اپنی جسارت اور دلیری کی معذرت کرتے ہوئے عالمگیر اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے، اور شاہجہاں لاجواب ہے:

"بادشاہزادۂ کلاں کہ ہنرے جز خوشامد ظاہری و چرب زبانی و خندہ بسیار نداشت و در خدمتِ ولی نعمت دلش باز باں موافق نہ بود۔ از کردار ناقابل او چندیں ناشنیدہ انواع خفت مے کشید۔ چنانچہ فرامین سابقہ بداں ناطق است۔ بایں امید کہ شاید صدق عقیدت و بندگی را نتیجہ پدید آید، اصلاً از طریقِ اطاعت و انقیاد انحراف نورزیدہ بہمیں کہ اعلیٰ حضرت ایں مرید را بعنوان رضا جوئی یاد میفرمودند

خوسند مے بود۔ ہرگاہ دراں وقت اثر بر حسن اعتقاد وتحمل آں زیادہ نہاد بے وجہ مترتب نگشتہ، حق از باطل جُدا نشد وصفائی جوہر رسوخ عقیدت مستور ماندہ سخنِ منافقاں دُور بود واز پیش رفتہ موافق واز منافق وراست واز ناراست امتیاز نیافت وایں مرید قابل اعتماد والتفات نگردید اکنوں کہ مصدر گوناگوں گستاخی وبے ادبی شدہ پیدا ست کہ اعلےٰ حضرت چگونہ توقع نیکی ازیں گنہگار خو درداشت وہر قول و فعل او چہ ساں اعتماد خواہد نمود" (رقعہ نمبر ۱/۱۲۵ ص ۲۱۴ رقعات عالمگیر)۔

(۲)

نظامت دکن بار اوّل ۳ رذی الحجہ ۱۰۴۵ھ سے صوبجات دکن عالمگیر کے حوالہ ہوئے۔ آٹھ سال تک ان صوبوں کا گورنر رہا۔ اس عرصہ میں اس نوجوان گورنر نے نہ صرف دکن کے مغل علاقوں کو باغیوں، راہزنوں اور ڈاکوؤں سے پاک صاف کیا بلکہ اس میں بگلانہ وغیرہ کا اضافہ بھی کر دیا۔ مختصر یہ کہ :

صوبہ دکن را کہ در نہایت ویرانی و برہم خوردگی بود۔ نوعے معمور ساختہ کہ بر عالمیان ظاہر ست[1]۔

۲۷ محرم ۱۰۵۴ھ کو (جبکہ عالمگیر کو دکن کی گورنری کرتے ہوئے سات سال گذر چکے تھے) جہاں آرا بیگم کا جشن سالگرہ تھا۔ اتفاقاً دامن میں شمع سے آگ لگ گئی جہاں آرا بُری طرح جل گئی۔ چار لونڈیاں جو ہاتھوں سے آگ بجھانے لگی تھیں، ان کے کپڑوں میں بھی آگ لگ گئی۔ ان میں سے دو مر گئیں۔ بادشاہ کو بہت پریشانی ہوئی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد صحت ہوئی۔ بہن کی مزاج پُرسی کے لئے عالمگیر آگرہ آیا۔ ابھی آگرہ آئے ہوئے تین ہفتے نہیں گذرے تھے کہ یکم ربیع الثانی ۱۰۵۴ھ کو عالمگیر نے ترکِ دنیا کا ارادہ کر کے خدمات سے استعفا دے دیا۔ لیکن شاہی عتاب سے معتوب ہوا۔ پھر جہاں آرا کی

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۶۹ رقعہ نمبر ۵/۳۷

سفارش سے ۵ رشوال ۱۰۵۴ھ کو قصور معاف ہوا۔ صوبہ گجرات کا ناظم بنایا گیا۔

عالمگیر نے ترکِ دنیا کا قصد کیوں کیا تھا؟ اس پر معتوب کیوں ہوا؟ اور پھر قصور معاف ہونے کا کیا مطلب؟ یہ ایک معمہ ہے۔ اس کا انکشاف دس سال بعد کے ایک خط سے ہوتا ہے جو عالمگیر نے دوسری مرتبہ نظامتِ دکن کے زمانہ میں اپنی بہن جہاں آرا کے نام بھیجا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مشفقہ من! اگرچہ یہ فدوی مریدانِ بادشاہی اور بندگانِ مغرب کے زمرہ میں خود کو داخل نہیں سمجھتا، بلکہ اپنے تئیں ایک ذلیل غلام شمار کرتا ہے لیکن چونکہ ہمیشہ اس دولت کے زیر سایہ عزت و آرام کی زندگی بسر کی ہے اور ذاتِ شاہانہ کے احسانات و نوازش سے پرورش پائی ہے۔ طرح طرح کے احسانات مجھ پر ہوتے رہے ہیں حتیٰ کہ ولایت دکن کی صوبہ داری بھی اس مرید کی درخواست کے بغیر میرے پیر و مرشد حقیقی نے اپنے خسروانہ لطف و کرم سے خود ہی مرحمت فرمادی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ پھر یہ بے رخی اور بے التفاتی جو شانِ مرید پروری اور بندہ نوازی کے قطعاً مخالف، اور اس فدوی کے تذلیل و توہین اور عدمِ استقلال کا سبب ہے، آخر کیوں ہے۔

یہ عقیدت سرشت جو ایزد جہاں آفریں عز شانہٗ کے بعد قبلہ و کعبہ کی ذات والا صفات کے سوا کوئی پناہ نہیں رکھتا، بلا وجہ کیوں معتوب ہے۔

اگر کسی کی خاطر یا کسی مصلحت سے طبع مبارک کی مرضی یہ ہے کہ یہ فدوی اس قسم کی ذلیل زندگی گذارتے گذارتے آخر کار کسی نامناسب صورت سے تباہ و برباد ہو جائے، تب بھی اطاعت سے گریز نہیں۔

ہر چہ رود بر سرم چوں تو پسندی رواست

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْل۔

لیکن چونکہ اس طرح جینا اور مرنا دشوار ہے اور قطعاً بے لطف۔ نیز فانی اور ناپائیدار امور کے لئے نہ تو تکلیف اور مصیبت ہی برداشت کی جا سکتی ہے اور نہ خود کو دوسروں کے حوالہ کیا جا سکتا ہے لہذا یہی بہتر ہے کہ اعلیٰ حضرت کے حکم سے جن کی رضامندی پر تمام مریدوں کا سر و جان فدا ہے، ایسی زندگی کے ننگ و عار سے رہائی پالوں تاکہ مصلحت ملکی بھی فوت نہ ہو، اور بہت سے دل بھی اس فکر و پریشانی سے آسودگی حاصل کریں۔

اس مرید نے دس سال پہلے ہی اس بات کو معلوم کر کے اور خود کو مخلِ مقصود سمجھ کر استعفاء پیش کیا تھا۔ پھر محض پیر و مرشد حقیقی کی خوشنودی کے لئے جو اس فدوی کا سب سے بڑا مقصد ہے، اس کام میں مشغول ہو گیا۔ جو کچھ برداشت کرنا تھا برداشت کیا۔ بہتر یہ تھا کہ اسی وقت معاف فرما دیتے تاکہ گوشہ نشینی اختیار کر کے کسی کے لئے غبارِ خاطر نہ ہوتا، اور اس کش مکش میں نہ پڑتا۔ اب بھی اس کام کی تدبیر اعلیٰ حضرت کی رائے صواب نما پر موقوف ہے بہرحال جو کچھ اس مرید کیلئے مناسب ہو حکم فرمایا جاوے تاکہ مرضی مقدس سے آگاہ ہو کر اس کے لئے کوشش کرے[1]۔

(۳)

جنگِ بلخ و بدخشاں

عالمگیر صوبہ گجرات میں ایک سال چند ماہ رہا۔ کیونکہ پھر اس کو بلخ و بدخشاں کی جنگ پر مامور کر دیا گیا۔ جہاں پہلے شاہزادہ مراد کو بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ کافی فتوحات حاصل کیں۔ مگر پھر محض علاقہ اور باشندگانِ بلخ

---

[1] رقعہ ۲۷/۱۵۹ رقعات عالمگیری ص۲۵ و ص۲۵۱۔

وغیرہ کے غیر مانوس ہونے کے باعث بلا اجازتِ سلطانی اس جنگ کو ناتمام چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ مراد کی اس طفلانہ حرکت نے غنیم کی ہمت بھی بڑھا دی، نیز موقع دیا کہ اس فرصت میں پراپیگنڈا کر کے قوم و نسل کا سوال پیدا کر دیا جائے۔ اوزبکوں اور دیگر جنگ جُو قبائل کو پہلے سے زیادہ جنگ پر غنیم نے آمادہ کر لیا، اور اب مغلوں کی مخالفت کا جذبہ تمام ملک میں عام ہو گیا۔

عالمگیر وہاں پہنچا تو اُس کے پاس فوج بھی ناکافی تھی، اور مراد کی فوج کے مقابلہ میں ہر ایک اعتبار سے تقریباً نصف۔ بایں ہمہ کامیاب رہا۔ حتیٰ کہ ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۷ھ کو عبد العزیز خاں والی بخارا نے صلح کی پیش کش کی۔ جس کو عالمگیر نے منظور کیا۔ تحریک صلح کا باعث عالمگیر کا مذہبی استقلال ہے یعنی میدانِ جنگ میں بازارِ قتل و خون گرم ہے۔ اسی گرمی کے ہنگامہ میں نماز ظہر کا وقت آجاتا ہے۔ عالمگیر فوراً جماعت ظہر کا حکم دے دیتا ہے۔ بندگانِ خیر اندیش معذرت کرتے ہیں۔ مگر یہ پیکرِ استقلال آگے بڑھتا ہے۔ نہایت اطمینان کے ساتھ ظہر کے فرض اور سنّتیں وغیرہ حسبِ معمول ادا کرتا ہے۔ نہ کوئی خوف ہے نہ ہراس۔ اور نہ کوئی گزند پہنچ سکتا ہے نہ غنیم کا کوئی حملہ کارگر ہوتا ہے۔ عبد العزیز خاں جب یہ سُنتا ہے تو اس پختگی اور عزم سے مرعوب ہو کر صلح کی التجا کرتا ہے۔ مآثر عالمگیری کے الفاظ یہ ہیں:

در زمان ورود موکب معلی کہ عبد العزیز خاں مقابلہ آرا صفِ کارزار گردید افواج فراواں از مور و ملخ پیرامون لشکر فیروزی اثر حلقہ زدہ بجنگ پیوست۔ در عین گرمی ہنگامہ پیکار وقت نماز ظہر در رسید۔ وآں حضرت باوجود التماس امتناع بندہا ظاہر بیں از مرکوب خاص فرود آمدہ۔ صف آرائی جماعت شدہ، فرض و سنّت و نوافل را بتعدیل ارکان وکمال حضور و اطمینان ادا کردند۔

عبد العزیز خاں بمجرد استماع ایں خبر شجاعت اثر از خیران استقلال

مُؤیّد من عند اللہ شدہ طرح صلح نمود و بزبان گذارونذکہ :

با چنیں در افتادن در افتادست[1]

بلخ و بدخشاں کی جنگ کامیاب رہی ۔ مگر عالمگیر کے لئے مزید پریشانی کا سبب بن گئی ۔ کیونکہ مصارفِ جنگ کے سلسلہ میں عالمگیر کا باقی مطالبہ جو شاہی خزانہ کے ذمہ باقی رہ گیا، وہ وجہ نزاع بن گیا ۔ اور مخالفین کو ایک[2] موقعہ مل گیا کہ اس پردہ میں جھوٹی سچی باتیں بنا کر شاہجہاں کو مشتعل اور برافروختہ کر دیں ۔

(۴)

مہم قندھار قندھار پر شاہجہاں نے پہلے قبضہ کر لیا تھا لیکن عین اس زمانہ میں کہ شاہجہاں اپنے شاہجہاں آباد اور قلعہ شاہجہاں آباد کے افتتاح میں مشغول تھا، اور تاریخ ہندوستان میں عیش و راحت کی بہترین گھڑیاں گذر رہی تھیں ۔ شاہ عباس ثانی والی ایران نے موقع پا کر بے شمار فوجوں سے قندھار پر حملہ کر دیا، اور اس کے تمام مضبوط قلعوں پر قابض ہو گیا ۔

شاہجہاں نے فوراً سعد اللہ خاں کو لاہور سے اور اورنگ زیب کو مُلتان[3] سے جوابی کارروائی کے لئے روانہ کر دیا ۔ ان دونوں نے وہاں پہنچ کر بہت سی فتوحات حاصل

---

[1] ماثر عالمگیری صا۵۳۱ متن صا۱۶۸ ۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمات رقعات عالمگیر خصوصاً ص۱۷۳ تا ص۱۷۵ ۔ [3] اورنگ زیب بلخ و بدخشاں کی کامیاب جنگ سے واپس آ کر دریا کے ایک کنارے مقیم تھا کہ اُسے بادشاہ نے ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵ مارچ ۱۶۴۸ء) کو ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا ۔ پھر ذی الحجہ ۱۰۵۹ھ میں جب کہ وہ پہلی مہم قندھار سے واپس ہو کر لاہور میں مقیم تھا بادشاہ نے اُسے سندھ کا صوبہ بھی دے دیا اور بیکر و سیوستان کا علاقہ در تیول آں کامگار مرحمت گردید ۔ اورنگ زیب دوسری مہم قندھار سے واپسی یعنی ۱۷ شعبان ۱۰۶۲ھ تک تقریباً چار سال ملتان اور ڈھائی سال سندھ اور ملتان دونوں کا صوبہ دار رہا ۔ یہی زمانہ ہے جب کہ وہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا ہے ۔

کیں مگر قلعہ کا فتح کرنا ابھی دشوار تھا عنقریب وہ موسم آنے والا تھا۔ جب برفباری کے باعث تمام راستے بند ہو جاتے۔ لہٰذا شاہجہاں نے فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا

اس جوابی حملہ میں جو کامیاب لڑائیاں ہوئیں، ان کے صلہ میں شاہجہاں نے تمام لشکر کو انعامات سے نوازا، اور اورنگ زیب کو "بعنایت خاصہ نواختند"۔

اورنگ زیب نے واپس ہو کر آئندہ محاصرہ کے لئے فوراً ہی تیاری شروع کر دی، اور پھر شاہی حکم کے بموجب ۱۶ ربیع الاوّل ۱۰۶۲ھ کو قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد سعد اللہ خاں کو بھی روانہ کر دیا گیا۔ اس محاصرہ کی تفصیلی کارروائی درج کرنی بے کار ہے۔ البتہ اس زمانہ کے رقعات و مراسلات سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاہجہاں نے دہلی اور لاہور رہ کر اس محاصرہ کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔

عالمگیر موقع پر موجود تھا، حالات کو دیکھ رہا تھا۔ ضرورتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر جو اُس کی رائے ہوتی، شاہجہاں کی رائے اس کے مخالف ہوتی۔ اور یہ اس زمانہ میں کہ نہ ریل کا سلسلہ تھا نہ تار برقی اور ٹیلیفون۔ خط و کتابت میں عرصہ صرف ہوتا۔ اور جو جواب ہوتا وہ عالمگیر کی رائے کے برخلاف۔ تاہم عالمگیر شاہجہاں کے احکام کی پوری چستی اور مستعدی سے تعمیل کرتا۔

مگر ضرورت اور موقعہ کے برخلاف جو احکام صادر ہوں، اُن کا نتیجہ معلوم ہے حقیقت یہ ہے کہ دارا نے ابتدا ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ کسی صورت سے بھی اورنگ زیب کامیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ اس کی عزت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اور اس مقصد کے لئے اُس نے ہر وقت اورنگ زیب کی ہر رائے کے خلاف شاہجہاں کو مشورہ دیا۔ شاہجہاں خود ملتان کے راستہ سے قندھار جانا چاہتا تھا لیکن داراشکوہ نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بادشاہزادہ دوم "شجاع" کو بنگال سے صرف اسی لئے بلایا گیا تھا کہ عالمگیر کے ساتھ محاصرۂ قندھار میں شرکت کرے لیکن داراشکوہ نے یہ کہہ کر کہ ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، اس کو بھی قندھار جانے سے روک دیا

اور پھر شاہجہاں کو اس درجہ بددل اور عالمگیر کی طرف سے اس قدر مایوس کر دیا کہ اس نے صرف دو[1] ماہ بعد اس دشوار تر مہم سے واپسی کا حکم سعد اللہ خاں کے نام روانہ کر دیا اور پھر اورنگ زیب پر ناکامی اور ناکارگی کا الزام لگا کر اسقدر معتوب اور ذلیل کیا کہ شاید تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ اس محاصرہ میں غریب عالمگیر کی حیثیت ایک ماتحت جنرل سے زیادہ نہ تھی۔ جو سعد اللہ خاں وزیر اعظم کی رائے کا پابند تھا اور شاہجہاں کے حکم کا منتظر۔ مہم کی کمان خود شاہجہاں کے ہاتھ میں تھی۔

مقدمہ[2] رقعات عالمگیر میں اس محاصرہ کی پوری روئداد کے بعد تحریر ہے کہ:

"ابتداء محاصرہ سے لے کر آخر وقت تک اورنگ زیب کا جو طرز عمل رہا، اس نے ہر بات پر جس طرح بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی، اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ شاہجہاں اس کی اطاعت اور اس کی جانفشانی کی قدر کرتا لیکن اس کے بجائے شاہجہاں کو یہ سمجھایا گیا کہ اس ناکامی کا ذمہ دار اورنگ زیب اور صرف اورنگ زیب ہے۔ اور اسی وقت سے معمر شاہجہاں نے اورنگ زیب کے خلاف وہ معاندانہ رویہ اختیار کیا اور اس کی ہر کارروائی پر اس تکلیف دہ طرز سے تعریض اور تنقیص شروع کر دی کہ شاید ہی کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اتنے تیروں کا نشانہ بنایا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہم اورنگ زیب کی سعادت مندی بردباری اور اس کے تحمل کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں کہ اس پر طعن و تشنیع کے دل دوز تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ جا بجا سازشوں کے جال بچھائے

---

[1] ۳ رجمادی الثانیہ ۱۰۶۲ھ کو عالمگیر قندھار پہنچا اور ۴ شعبان ۱۰۶۲ھ کو صرف دو ماہ ایک دن بعد "فرمان والا صادر شد کہ دور حصار برخاستہ و تسخیر آں را بوقت دیگر باز گذاشتہ خورد و کلاں را ہمراہ گرفتہ بدرگاہ آسمان جاہ روز (وارث ص ۱۱)۔ [2] مقدمہ ص ۱۸۶۔

ہمارہے ہیں اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو بڑے سے بڑا دشمن کر سکتا تھا لیکن اسکی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں۔ اس کا دامنِ صبر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کا قدم جادۂ استقامت و اطاعت سے باہر نہیں پڑتا، اور اس کی کوئی ادا، کوئی حرکت، حتیٰ کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو خلافِ تہذیب اور خلافِ ادب کہا جا سکے۔ اور وہ جب دیکھتا ہے کہ شاہجہاں دشمنوں کی غیبت کا شکار ہو چکا ہے تو مایوسی کی حالت میں اپنی بہن کو بلیغ ترین اشارہ میں اس کی طرف توجہ دلاتا ہے اور صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہے:

گر تو اے گل گوش بر آواز بلبل مے کنی
کارِ مشکل مے شود بر بے زبانانِ چمن[1]

دارا کا خیال تھا کہ اورنگ زیب کو اس طرح ناکام کر کے خود مہم قندھار پر جائے اور اس فتح کا امتیازی تمغہ خود حاصل کرے۔ چنانچہ اس کے بعد عالمگیر کی فوج اور سامانِ جنگ سے بہت زیادہ فوج اور سامانِ جنگ لے کر قندھار گیا۔ وہاں پہنچ کر جدّ و جہد بھی کی۔ اور سب سے اہم کوشش یہ کی تھی کہ:

"محمد جعفر دو پشمینہ پوش، ردا بردوش فقیروں کو دارا کے پاس لایا اور عرض کیا کہ دونوں مراقبہ کر کے دنیا کے حالات کی خبر دیں گے۔ داراشکوہ نے ان کو اعزاز و احترام سے باریاب کیا۔ قسم قسم کی خوشبوئیں پیش کیں۔ مراقبہ کے بعد ایک نے کہا: میں سیر کرتا ہوا اصفہان گیا۔ وہاں دیکھا کہ شاہِ ایران کے حادثہ کی واویلا مچ رہی ہے۔ دوسرے نے کہا: میں اصفہان گیا تو دیکھا کہ شاہ عباس کو سپردِ خاک کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا تھا ان دونوں صاحبانِ حال کی زبانی یہ مژدہ سنتے ہی محمد جعفر اور دوسرے درباری ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ خوشی کے نقارے پٹنے لگے۔ اس کے بعد

---

[1] رقعہ نمبر ۲/۱۳۶ ص ۱۳۹ جلد ا۔

محمد جعفر ایک ریاضی داں نوجوان کو لایا، اور دارا شکوہ سے عرض کیا کہ یہ شخص جنّات کو مسخّر کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر ایک لولی (بازاری عورت) ایسی ایسی شکل کی اور کچھ سہ سالہ دو آتشہ شراب اور دیگر ضروری چیزیں فراہم کر دی جائیں تو وہ ایسا عمل کرے کہ جنات، بادشاہی فوج کے ساتھ مل کر زیادہ سے زیادہ چالیس روز میں قلعہ فتح کر ڈالیں گے۔ حکم ہوا کہ جملہ ضروریات فراہم کر دی جائیں عامل صاحب نے عمل کیا اور جب دیکھا کہ چالیس روز ختم ہونے والے ہیں، اور قلعہ فتح ہونے کی کوئی شکل نہیں تو چپکے سے بھاگ نکلا (تاریخِ ہندوستان صـ۴۴۲ جلد ۷)۔

دارا کی یہ تمام حماقتیں یا تو شاہجہاں کے علم میں نہیں آئیں، یا وہ محبّتِ دارا میں اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بُری بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حبك الشئ يُعمی ویُصم۔

بہرحال اوہام پرست اور ضعیف الاعتقاد شاہزادہ سے قندھار جیسی مہم نہ سر ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ اور لاکھوں روپیہ برباد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ بیدار مغز شاہجہاں، دارا اور عالمگیر کے معاملہ میں اس قدر تہی دماغ کیوں ہو گیا تھا۔

جب عالمگیر قندھار گیا ہوا تھا۔ اس کا صوبہ (مُلتان و سندھ وغیرہ) دارا کے حوالہ کر دیا گیا۔ دارا نے اپنے نائب کے حوالہ سے بادشاہ تک شکایت پہنچائی، کہ اورنگ زیب کے آدمیوں نے ملتان کا شاہی محل لُوٹ لیا اور اس کے دروازوں کے چوکھٹ اور پتھر تک بیچ ڈالے۔ بادشاہ کی جانب سے تحقیقات کے لئے ایک افسر مقرر ہوتا ہے۔ وہ تحقیق کرتا ہے کہ ملازمانِ عالمگیر کے روانہ ہونے کے بعد دارا شکوہ کے گماشتوں نے توجّہ نہ کی۔ خود وہاں کے باشندوں نے موقع پا کر محل کا سامان لُوٹ

لیا۔ کواڑ، پتھر اور تختے جو وہ نکال سکتے تھے، نکال کر لے گئے۔ چنانچہ تلاشی کے وقت وہاں کے باشندوں کے مکانات سے وہ چیزیں برآمد ہوئیں، اُن کو سزائیں دی گئیں۔ مگر تعجب ہوگا کہ یہ تحقیقاتی رپورٹ شاہجہاں کے سامنے پیش نہیں کی گئی اور شاہجہاں کی بدگمانی کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ بدستور باقی رکھا گیا۔

(۵)

نظامتِ دکن بار دوم | یہی وہ پُرآشوب دَور ہے جس کی انتہا شاہجہاں کی معزولی اور جنگ برادران پر ہوتی ہے۔ اس دَور کے تمام حالات ایک طویل افسانہ ہیں۔ ہم چند واقعات کی جانب نہایت اختصار کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے تفصیل کو اُن کے ماخذ کے حوالہ کرتے ہیں۔

الف: داراشکوہ کی خوشامد پسند، مغرور اور بر خود غلط طبیعت نے خود شاہجہاں کو اس فیصلہ پر مجبور کر دیا تھا کہ "باداں نیک و بد بہ نیکاں سُست"۔[1]

چونکہ عالمگیر اوصافِ حمیدہ میں تمام بھائیوں پر فوقیت لئے ہوئے تھا لہٰذا دارا کی رقابت، حسد اور بغض کا بھی سب سے زیادہ شکار تھا۔ مگر دوسرے بھائی بھی اس کے ایذاء اور شرانگیزی سے محفوظ نہ تھے۔ اپنی اپنی استعداد و قابلیت اور علوِ ہمت اور بلند حوصلگی کے بموجب ہر ایک نے دارا کے اس سفرۂ عام سے حصّہ پایا تھا۔

چنانچہ ہر ایک بھائی اس سے نالاں اور خائف تھا۔

مہم قندھار سے فراغت کے بعد جب عالمگیر کو دکن پہنچنے کا حکم ہوا تو اگرچہ دارا کی کوشش یہ تھی کہ قندھار سے واپسی پر شاہزادہ شجاع اور اورنگ زیب کی ملاقات نہ ہو چنانچہ ہر ایک کے کوچ کے پروگرام مرتب کرا کر اس کی پابندی کے متعلق شاہی فرمان پہنچ چکے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ دونوں بھائی آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے خاص اکبرآباد میں آکر مل گئے۔ تین روز تک دونوں بھائیوں میں مخلصانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہر ایک کے

---

[1] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۵۴ رقعات عالمگیری جس کا ترجمہ دارا کے حالات میں سپردِ قلم کیا گیا۔

خیال میں دارا ملحد تھا۔ دشمنِ مذہب اور ہر ایک بھائی کا بدخواہ، نظریہ کا یہ اتحاد ایک معاہدہ کا محرّک ہو گیا۔

اس کے بعد دکن جاتے ہوئے راستہ میں عالمگیر کی شاہزادہ مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہی محرک یہاں بھی موجود تھا۔ چنانچہ تینوں بھائیوں کے درمیان طے ہو گیا کہ ہر ایک کو اپنی قوّت محفوظ رکھنی چاہیئے۔ اور شاہجہاں کے لئے جب امر ناگزیر آئے تو متحدہ طور پر اس دشمنِ دین و ملّت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر دارا کسی ایک بھائی کی طرف اقدام کرے تو دوسرے بھائیوں کو اسکی امداد کرنی چاہیئے۔

ب: دس سال بعد ۱۵ ربیع الاوّل ۱۰۶۳ھ کو عالمگیر دوبارہ برہان پور (صوبہ دکن) میں داخل ہو رہا ہے۔ اس دس سال میں خاں دوراں، راجہ جے سنگھ، اسلام خاں، شاہنواز خاں، مراد بخش اور شائستہ خاں غرض چھ صوبہ دار یکے بعد دیگرے "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت"، کے موجب نئے نئے انتظامات کر چکے ہیں۔ مگر ان کا نتیجہ ترقی کے بجائے تنزّل تھا، اور آئے دن کے نئے انتظامات نے جن میں صوبہ داروں کی بدمزاجیوں یا اغراض پرستیوں کو بھی دخل تھا۔ ایک طرف تو وہاں کے افسروں کو بادشاہ کی خفگی سے مامون اور خود غرض کر دیا تھا اور دوسری طرف رعایا تباہ، زراعت برباد، ملکی انتظام تقریباً مُردہ۔ انتہا یہ کہ وہی صوبہ جس کی آمدنی تین کروڑ باسٹھ لاکھ تھی، ۱۰۶۲ھ میں صرف ایک کروڑ رہ گئی۔

پہلے پڑھ چکے ہو کہ بلخ و بدخشاں کی مہم کے بعد دس لاکھ کا مطالبہ خزانہ شاہی پر باقی رہ گیا تھا۔ قندھار کی دونوں مہموں کے بعد وہ مطالبہ سترہ لاکھ تک پہنچ گیا۔ اب یہ صوبہ عالمگیر کے حوالہ کیا گیا جو خود برباد تھا۔ عالمگیر کی بار بار کی درخواستوں پر جاگیریں بھی دی گئیں۔ مگر چونکہ شاہی دفتر پر دارا کا تسلّط تھا، لہٰذا ان جاگیروں کی آمدنی دو چند سہ چند قرار دے کر خود شاہی خزانہ کا مطالبہ ان پر اتنا رکھ دیا گیا جتنی ان کی اصل آمدنی ہو سکتی تھی۔ یہ معاملہ بذاتِ خود بہت زیادہ اختلاف کا باعث بنا رہا جس کے پردہ

میں حریفوں کو خوب خوب موقعہ ملا کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب سے زیادہ سے زیادہ متنفرّ کر سکیں حتیٰ کہ شاہجہاں نے شجاع کو بطور شکایت لکھا کہ عالمگیر دکن کا انتظام اچھی طرح نہیں کر سکا۔[۱]

ج : دستور یہ تھا کہ ماتحت حکام کی ترقی یا آس پاس کی ریاستوں سے تعلقات کے متعلق گورنر گویا خود مختار ہوتا تھا۔ ملازموں کا تقرر اپنے اعتماد کے بموجب صوبہ دار خود کرتا تھا۔ البتہ رسمی طور پر منظوری بادشاہ سے حاصل کر لی جاتی تھی۔ کسی صوبہ دار کی سفارش کو رد کرنا گویا اس پر بداعتمادی کا اظہار تھا۔

رقعات عالمگیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر اس بداعتمادی کے تیر کا بار بار نشانہ بنایا گیا۔

قلعہ اسیر شاہزادہ مراد بخش پسر داراشکوہ کے حوالہ تھا۔ دستور کے بموجب اس کا قلعہ دار وہاں مقرر تھا۔ لیکن اس مرتبہ جب نظامت دکن کے سلسلہ میں حسب دستور یہ قلعہ عالمگیر کے حوالہ ہوا، اور عالمگیر نے اپنے اعتماد کا قلعہ دار وہاں مقرر کرنا چاہا تو اس کی سفارش کو رد کر دیا گیا۔

عالمگیر جن پردرد الفاظ میں اس کا شکوہ اپنی بہن جہاں آرا سے کرتا ہے اُن سے عالمگیر کے تاثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخری فقرہ یہ ہے کہ :

"زہے خسارت و ندامت، و کم طالعی ایں مرید کہ باوجود آنکہ بست سال صرف خدمت و بندگی نمودہ۔ در طریق عقیدت بجان و مال مضائقہ نہ کردہ ہنوز برابر برادر زادہ بیمال ہم شایان اعتماد نیست و قبلہ و ولی نعمت اوراچنیں تصوّرے فرمایند۔"[۲]

د : اس زمانہ کا گورنر خود مختار نواب ہوتا تھا، ملکی ضرورتوں کے ساتھ فوجی محکمات کا انصرام بھی اسی سے متعلق ہوتا تھا اور وہی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا تھا۔

---

[۱] رقعہ نمبر ۵/۲۱۹ صفحہ ۳۴ جلد ا رقعات عالمگیر۔ [۲] رقعہ نمبر ۲۷/۱۵۱ رقعات صفحہ ۲۵ جلد ا۔

بالادست بادشاہ کی طرح اس کو بھی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ وفادار ملازموں کی تربیت کرے تاکہ ضرورت کے وقت وہ کام آئیں۔ کسی گورنر کے معتمد آدمیوں کو اس سے لے لینے کے دوسرے معنی یہ ہوتے تھے کہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے اور پھر جس طرح عالمگیر دکن کی مخالف سلطنتوں کے بیچ میں پھنسا ہؤا تھا، اس کو زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد تجربہ کار، وفادار ملازموں کی ضرورت تھی۔ لیکن جب کہ عالمگیر کو بے بس ولاچار کرنا ہی مقصود تھا تو اس کے انھیں وفادار ملازموں کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ان کو اعلیٰ عہدوں کی طمع دے کر شاہی ملازمت کے لئے طلب کیا جانے لگا۔ یہ چال اگر کامیاب ہو جاتی تو یقیناً عالمگیر کی بربادی اور تباہی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہتا۔ عالمگیر اسی مکتوب میں یہ شکوہ بھی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہر گاہ ایں راہ وا شود و تابینان ایں فدوی از نوکری جدا شدہ بہ بندگی درگاہ معلٰے سرفراز گردند و مناصب زیادہ از حالتِ خود بیابند معلوم ست کہ کسے پیش ایں مرید نخواہد ماند۔ وبعد ازاں ایں جماعت کہ در مدّت بست سال فراہم آمدہ اند، بایں طریق متفرق شوند۔ از عہدہ خدمات چگونہ تواند برآمد۔ اگر مصلحتے دریں حکم ست حکم اعلیٰ صادر گردد تا جمیع نوکراں کارآمدنی را بطیبِ خاطر روانہ حضور پُر نور ساختہ آمادہ حصول مطلب عزیزاں باشد۔"[1]

۷ : الغرض اس قسم کی سازشوں نے شاہجہاں کو اتنا برافروختہ کر دیا کہ وہ شاہانہ متانت بھی کھو بیٹھا۔ اور اب اُس نے ایسی نکتہ چینیاں شروع کر دیں، جن کے تخیل سے بھی ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ عالمگیر کا انگوٹھا کٹ گیا۔ عالمگیر اپنے ہاتھ سے شاہجہاں کو خط لکھا کرتا تھا۔ اس حالت میں بھی اُس نے اپنے ہاتھ سے ہی خط لکھا۔ مگر انگوٹھے کی تکلیف کے باعث خط میں تغیر آگیا۔ شاہجہاں کے

---

[1] رقعہ نمبر ۲۷/۱۵۹ رقعات صـ ۲۵۱ و صـ ۲۵۲۔

دربار میں عالمگیر سے حسنِ ظن کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ یہ سمجھا، یا اس کو سمجھایا گیا، کہ عالمگیر کی یہ حرکت متکبرانہ اور سرکشانہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھا۔ بس پھر کیا تھا، شاہجہاں برافروختہ ہوگیا اور باز پرس کر لی۔[1]

ایک[2] اس سے بھی رکیک باز پرس تھی جو آموں کے متعلّق ہوئی۔ برہان پور کے شاہی باغ میں "بادشاہ پسند" نام ایک مشہور آم تھا۔ جب اورنگ زیب دکن گیا تھا۔ اسی وقت بادشاہ نے اس سے کہا تھا کہ شاہی باغ کے آم اس کے پاس بھیجے جائیں۔ عالمگیر نے اس حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ کبھی ایک دانہ بھی اس آم کا خود نہیں کھایا۔ لیکن اتفاق سے اس سال آم کم آئے۔ عالمگیر نے ان کی بھی کافی احتیاط کرائی۔ لیکن شاہجہاں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ آم ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اب کبھی شکایت ہوتی ہے کہ آم کم بھیجے جا رہے ہیں۔ کبھی یہ کہ آم خراب ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ کہ آم سیدھے راستہ سے نہیں بھیجے جاتے بلکہ بُرہان پور وغیرہ سے توڑ کر پہلے اورنگ زیب کے پاس جاتے ہیں اور وہاں سے بادشاہ کے پاس تک آتے آتے خراب ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ کہ آم کچے توڑ لئے جاتے ہیں۔

اسی طرح کپڑوں کا قصّہ چلتا رہا جو بادشاہ کے لئے برہان پور کے شاہی کارخانوں میں بنائے جاتے تھے۔

اس قسم کی رکیک رکیک نکتہ چینیاں دیکھنے کے بعد یقین ہوتا ہے کہ منصوبہ یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو، اورنگ زیب عالمگیر کو بغاوت پر مجبور کر دیا جائے، تاکہ شاہجہاں کے اقبال مند دور ہی میں اس کو کچل کر آئندہ کے لئے ہر ایک خرخشہ سے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔ لیکن

دشمن چہ کند چوں مہربان باشد دوست

---

[1] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر 10/96 رقعات ص ۱۷ جلد ۱۔ [2] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر 16/48 ص ۱۴۴ و رقعہ نمبر 2/58 ص ۱۰۴ و رقعہ نمبر 4/60 ص ۱۰۸ و رقعہ 20/152 ص ۲۴۵۔

عالمگیر کو حیرت انگیز ضبط و تحمّل، بے پایاں حلم اور قیاس سے زیادہ متانت اور فہم و فراست عطا ہوئی تھی۔ وہ ہر تلخ سے تلخ چیز کو شہدِ خالص اور عسلِ مصفّٰی سمجھ کر خورد و نوش کرتا رہا۔ اور غالبًا ایسے خوش نصیب کے لئے جس کو پچاس سال تک پورے ہندوستان کی حکومت عدل و انصاف کے ساتھ کرنی تھی، ابتداء میں یہ امتحانات لازمی تھے۔

کیمیا ئیست عجب بندگی پیر مغاں
خاکِ او گشتم چندیں درجاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد
کہ بیا زار غمت صبر و ثباتم دادند

(٦)

دکن کی جنگی مہمات اور داراشکوہ کی فتنہ انگیزیاں

الف: بیجاپور، حیدرآباد، گولکنڈہ وغیرہ مسلم حکومتوں کے علاوہ مرہٹوں کی ایک زبردست طاقت جنوبی ہند میں تھی۔

مرہٹوں کی خصوصیت یہ تھی کہ میدان میں جب جنگ ہوتی تو وہ فرار ہی کو کامیابی سمجھتے اور پہاڑوں میں جا چھُپتے۔ اور جب فوج کا کوئی دستہ ان کا تعاقب کرتے کرتے پہاڑوں کے دروں میں گھُستا تو وہ سب طرف سے نکل کر ایک دم حملہ کر کے دستہ کو تباہ کر دیتے۔ عالمگیر وقتاً فوقتاً شاہجہاں کے ایماء اور احکام کے بموجب ان طاقتوں سے جنگ کرتا رہا۔ کروڑوں روپیہ اور ہزاروں جانیں ختم کرنے کے بعد وہ ان طاقتوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرتا رہا۔

وہ جنگ جو، مدبّر اور بہادر جرنیل تھا، اس کو ان قربانیوں کا احساس بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دربار شاہجہاں کا رویہ اس کیلئے بہت زیادہ پریشان کن

اور یاس افزا تھا۔

وہ شاہجہاں کے حکم سے ایک غنیم سے جنگ کرتا۔ روپیہ اور جانوں کی ہولی کھیل کر اس کو زیر کرتا۔ مگر اسی غنیم کے ساتھ دارا کی خفیہ ساز باز ایک طرف اس کے مغلوب غنیم کو سرکش بنا دیتی اور دوسری جانب اسی سرکشی کی کوئی علت تلاش کر کے یا ایجاد کر کے خود عالمگیر کو شاہجہاں کی جانب سے معتوب کر دیا جاتا۔ اس اجمال کی تفصیل بہت طویل ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

قطب الملک مملکت گولکنڈہ کا خود مختار فرمانروا ہے جو سلطنت مغلیہ کا باجگذار ہے۔ میر جملہ[1] اس کا وزیر اعظم ہے۔ محمد امین پسر میر جملہ اسی ریاست کا افسر اعلیٰ ہے۔ میر جملہ مدبر۔ تجربہ کار اور بہادر جرنیل بھی ہے۔ قطب الملک سے اس کی مخالفت ہوتی ہے وہ اور اس کا بیٹا سلطنت مغلیہ کی ملازمت میں آنا چاہتا ہے شاہجہاں منظور کر لیتا ہے۔

شہنشاہ کا حکم قطب الملک کے نام پہنچتا ہے کہ یہ دونوں شاہی ملازم ہو گئے ہیں لہٰذا ان دونوں کو بھیج دیا جائے۔

---

[1] میر جملہ، اصل نام محمد سعید، اردستان (اصفہان - ایران) کا تاجر تھا۔ وہ ۱۰۳۰ھ میں گولکنڈہ کی شیعی حکومت میں آیا۔ اور رفتہ رفتہ ایسا رنگ جمایا کہ عبداللہ قطب شاہ نے اسے اپنا وزیر اعظم بنا دیا۔ اور جب کرناٹک کا علاقہ فتح کرنا چاہا تو اسی کو وہاں کا سردار اور سپہ سالار بھی بنا دیا۔ وہاں اس کے حسنِ انتظام کے باعث اس کی دولت میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اور فوج بھی اس کی گرویدہ ہو گئی۔ اب حاسدوں نے قطب الملک کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور قطب الملک کے ذہن نشین کر دیا کہ میر جملہ کی ترقی قطب الملک کے لئے خطرناک ہے چنانچہ قطب الملک میر جملہ کو دبانے اور اس کو گرفتار کرنے کی فکر کرنے لگا۔ میر جملہ نے یہ محسوس کر کے نجات حاصل کرنے کے لئے سلطنتِ مغلیہ سے تعلق قائم کرنا چاہا۔ چنانچہ عالمگیر کے ذریعہ سے وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ ابتداءً اس کو پنج ہزاری منصب ملا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔

اسی اثنا میں محمد امین شراب کے نشہ میں قطب الملک کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا ہے۔ قطب الملک اس کو گرفتار کر کے سزا کر دیتا ہے۔ شاہجہاں اس کو حکم عدولی کے لئے ایک حیلہ سمجھ کر عالمگیر کو حکم کرتا ہے کہ قطب الملک کی تادیب کی جائے۔ اس سے خاص خاص شرائط کا مطالبہ کیا جائے اور نہ مانے تو فوجی کارروائی کی جائے۔

قطب الملک مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جنگ شروع ہو جاتی ہے عالمگیر کی فوجیں فتوحات حاصل کرتی ہوئی گولکنڈہ پہنچ جاتی ہیں اور محاصرہ کر لیتی ہیں۔

جب قطب الملک مجبور ہو جاتا ہے تو اپنی بوڑھی ماں کو عالمگیر کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست کرتا ہے اور اپنی لڑکی محمد سلطان پسر عالمگیر کے لئے پیش کرتا ہے۔

یہ شرائط طے ہو رہی تھیں اور سلسلۂ مراسلت جاری تھا کہ اورنگ زیب کے نام شاہجہاں کا حکم صادر ہوتا ہے:

محاصرہ کو ختم اور قطب الملک کا پورا ملک اس کو واپس کر کے فوراً اپنے صوبہ کو لوٹ جاؤ۔

اس خط کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس عرصہ میں قطب الملک کے سفیر عبد الصمد نے دارا اور اس کی جماعت کو اپنا موافق بنا کر شاہجہاں کو یقین دلا دیا کہ قطب الملک نے ہر ایک شرط منظور کر لی ہے۔ البتہ اورنگ زیب اس کو تنگ کرنے اور اس سے مزید رقم وصول کرنے کے لئے وہاں موجود ہے۔ اور حملہ کے وقت سے اُس نے اس وقت تک لاتعداد جواہرات اور دوسری چیزیں تحفہ کے طور پر قبول کر لی ہیں اور ان کی بادشاہ کو اطلاع بھی نہیں دی۔ بس پھر کیا تھا، بلاتحقیق واقعات، شاہجہاں نے فوراً ہی مذکورہ بالا حکم صادر ہی نہیں کر دیا، بلکہ نامہ بروں کو ہدایت بھی کر دی کہ وہ اس کے مضمون کی تشہیر کریں، اور عالمگیر کو لکھ دیا کہ نقد و جنس جو کچھ ملا ہے، سب کا سب سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا جائے۔

اورنگ زیب کیلئے یہ انتہائی آزمائش کا وقت تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"ازانجاکہ این دنیاداران دکن از استماع خبر عدم استقلال ما و اعتبارِ ما و اطلاع بربے توجہی اعلیٰ حضرت و تعرضاتے کہ از پیش گاہِ خلافت مے رسد و مردم یکے را ہزار ساختہ بآنہامے رسانند از نوشتہ وگفتہ ما حساب نگرفتہ خود را از رجوع بایں جانب مستغنی دانند تاکید ما در و اثر نکرد، و بمقتضائے آنچہ نوشتہ بودیم، بعمل نیاورد و بعد ازیں نیز ممکن نیست کہ نوشتجات ما بپذیرد۔ (آداب نمبر ۱/۱۹۷)[۱]

ایسی حالت میں اگر شاہجہاں کا کوئی دوسرا لڑکا ہوتا، تو اس سے یہ ذلت برداشت نہ ہوتی۔ مگر یہ اورنگ زیب کا کلیجہ تھا کہ اُس نے ایک مطیع و فرماں بردار لڑکے اور ایک اطاعت گذار، سعادت مند بھائی کی طرح، باپ اور بھائی کی ہر قسم کی چالوں کو دیکھا۔ ان کے مظالم سہے، ان کی سازشوں کا شکار ہوا۔ لیکن پھر بھی اُس نے کوئی مخالف کارروائی نہیں کی۔ اپنے فرض سے غافل نہیں رہا، اور نہ اُس نے کوئی سخت خط ہی لکھا۔ جب وہ بہت گھبرا جاتا تو اپنے ایک دوست و غم خوار کو صرف اس قدر لکھتا کہ "شاید شبے ماہم سحرے داشتہ باشد۔"[۲]

اس قسم کے اور چند واقعات ہیں، جن کا اس موقعہ پر ذکر کرنا گنجائش سے باہر ہے۔

ب : بیجاپور کا والی عادل خاں تھا۔ جس کو شاہجہاں نے شاہ کا خطاب دے کر عادل خاں کے بجائے عادل شاہ بنا دیا تھا۔

یہ اگرچہ شاہجہاں سے صلح کئے ہوئے اور اس کے زیر پناہ تھا۔ لیکن اس کی خفیہ کوشش سلطنتِ مغلیہ کے مخالف رہتی تھی۔

قطب الملک کے ساتھ جو جنگ حال ہی میں ہوئی تھی، اس میں بھی اس نے قطب الملک کو امداد دی تھی۔ اس سے بڑھ کر عادل شاہ ایک اور چال چلا۔ اس نے اپنے

---

[۱] مق ص ۳۰۔ [۲] ان تمام واقعات کو مقدمہ رقعات عالمگیری میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ملازم[1] ساھوجی بھوسلہ کے لڑکے شیواجی کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مغلوں کے سرحدی مقامات پر حملہ کر کے اُن کی توجہ کو تقسیم کر دے۔

اور خود ساھوجی بھوسلہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ کرناٹک کے حصّہ پر قبضہ کرلے، جو میر جملہ کو ملا تھا۔

۲۶ محرم ۱۰۶۷ھ کو عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ بیجاپوری امراء نے شاہنشاہ کی مرضی کے خلاف اس کے متبنّیٰ کو "علی عادل شاہ ثانی" کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔

بہرحال اس قسم کے واقعات تھے جن کی بناء پر شاہجہاں نے عالمگیر کو نہایت سختی سے لکھا کہ وہ بیجاپور پر حملہ کر دے۔ "وبنہجے کہ مناسب داند بانجام رساند" اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ جب تک میر جملہ اورنگ زیب سے آکر مل نہ جائے وہ حملہ کے لئے روانہ نہ ہو۔ میر جملہ کے علاوہ شائستہ خاں کو یہ حکم ملا کہ وہ اپنے صوبہ سے جا کر اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں دار السلطنت دکن میں قیام کرے۔ نیز مہابت خاں، نجابت خاں، راجہ رائے سنگھ، نصیری خاں، مرزا سلطان وغیرہ بہت سے امراء کے نام فرمان صادر فرمائے کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر دکن کو روانہ ہو جائیں۔

مہم گولکنڈہ کے تلخ نتیجہ سے عالمگیر کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن ایک سعید فرزند کی حیثیت سے اُس نے اپنے باپ اور اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے پوری چُستی اور مستعدی سے خود کو پیش کر دیا۔

بہرحال پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ حملہ شروع کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی افواج بیجاپوری فوجوں کو پسپا کرتی ہوئی ملک کے بڑے حصّہ پر قابض ہوگئیں۔ اورنگ زیب اپنی اس فتح اور کامیابی پر مسرور تھا۔ بیجاپور کا سارا علاقہ اس کے سامنے

---

[1] تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا یہ زہریلا پودا خود مسلمان فرمانروایانِ دکن کا لگایا ہوا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی آبیاری بھی انہیں کے ہاتھوں ہوئی۔

کھلا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور وہ عنقریب خود بیجاپور کی طرف بڑھنے والا تھا کہ اس کے پاس اچانک بادشاہ کا حکم پہنچا کہ جنگ ختم کر دو۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے افسران کو براہ راست فرمان پہنچا کہ وہ فوراً دکن سے لوٹ آئیں۔

چنانچہ مہابت خاں اور اس کی تمام فوج اور تقریباً تمام راجپوت فوجیں عالمگیر سے رسمی اجازت لئے بغیر دہلی کو روانہ ہو گئیں۔

"دریں اثناء دو قطعہ فرمان کہ حسب الالتماس داراشکوہ بنام مہابت خاں و راؤ ستر سال از درگاہِ عالم پناہ شرف اصدار پذیرفتہ بود، پرتو نزول انداخت۔ در مناشیر مطاعہ حسن اندراج یافتہ بود کہ مہابت خاں باسائر مغلیہ و راؤ ستر سال با کل راجپوتیہ اصلاً برخصت شاہزادہ والا گہر مقید نشدہ، روانہ درگاہ گیتی پناہ گردند۔

ازیں راہ وہن و سستی تمام بحال اردوئے معلّٰی شاہی راہ یافتہ استقلال و بنائے ثبات و قرار جنود۔ تصرف موعود متزلزل و متخلل گردید۔[1]

سرکش مرہٹوں، نو مفتوح حکومت گولکنڈہ اور سرگرم پیکار بیجاپور وغیرہ وغیرہ کے بیچ میں، بتیس[۳۲] دانتوں میں ایک زبان کی طرح عالمگیر گھرا ہوا ہے۔

اس کی تمام جدّ و جہد، تمام قربانی، تمام جانفشانی پر پانی پھیر کر اُس کو اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ گویا خونِ عالمگیر کا پیاسا اپنے ذلیل ترین منصوبہ کو نہایت کمینہ طور پر پورا کر رہا ہے۔

واقعہ بھی یہی تھا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دفعۃً شاہجہاں بیمار پڑ گیا۔ اور اگرچہ ان احکام کا شاہجہاں کو علم تھا اور دارا نے اس کو راضی بھی کر لیا تھا مگر وہ اس وقت مردہ بدست زندہ تھا۔

اس کے علاوہ دارا نے شاہجہاں کے دستخط کی مشق کر لی تھی۔ جملہ کاروبار کا

---

[1] ظفر نامہ عالمگیری د مق ص ۳۲۷ ۔ [2] مق ص ۳۲۸

مالک بھی وہی تھا۔ اس نے متعدد فرامین اپنی مرضی کے موافق حکام کو لکھے، اور شاہجہاں کے جعلی دستخطوں سے ان کو روانہ کر دیا۔

بہر حال مذکورہ بالا فرمان کا سبب صدور بھی وہی داراشکوہ کا علی عادل شاہ کی حکومت سے خفیہ ساز باز ہے۔

شاہجہاں کی علالت اور معزولی

۷ر ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ، ۶ر دسمبر ۱۶۵۷ء تاریخ ہندوستان میں وہ دن تھا جس نے شیر بیشۂ حمیّت ملّی و غیرتِ اسلامی کو موقع دیا کہ اپنے نیستاں سے نکل کر داراشکوہ کی روباہ مزاجی کا خاتمہ نوکِ تلوار سے کر دے جبکہ تاریخ مذکور پر شاہجہاں دفعۃً عبس البول میں زندگی سے مایوس ہو گیا۔

الف : جیسے ہی شاہجہاں بیمار ہوا، داراشکوہ نے بادشاہ کی خبروں پر سخت نگرانی شروع کر دی۔ بنگال، گجرات اور دکن کے راستے بند کر دیئے، کہ مسافروں کے ذریعہ سے بھی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ تینوں بھائیوں کے وکلاء کو جو دربار میں رہا کرتے تھے، گرفتار کر لیا۔ مزید برآں عالمگیر کے وکیل عیسیٰ بیگ کا گھر ضبط کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا اور یہی ہوا کہ عام طور پر یقین ہو گیا کہ شاہجہاں مر گیا ہے۔ چنانچہ تمام ملک میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔

"چوں دادا بھائی جیو در ایّامِ عارضہ مزاج مقدس، مصدر اداہ چند شد کہ ہمہ مخالف طرز پسندیدۂ حضرت اعلیٰ بود گشتہ راہ ہائے نوشتجات، وکلاء، وآمد و رفت اخبار دربار جہاں مدار مسدود ساختہ عالم را بشورش در آوردند۔ و با برادران .... بدسلوکی کہ با وجود ذاتِ مقدس مبارک امکان نداشت بیش گرفتہ نگذاشتند کہ عرائض کمترین مریدان .... بنظر اشرف اعلیٰ در آید تا بجواب

چہ رسد[1]"

جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں اور دارا کی حمایت میں اورنگ زیب کو مکتوبِ موعظت لکھ کر جنگ داراشکوہ سے روکنا چاہتی ہے، اعتراف کرتی ہے کہ:

"دریں وقت کہ بسبب ہرج و مرج . . . . . از زیادہ سرائی فتنہ پرستان وہن و سستی بکشاد و بست امور ولایت نزدیک و دُور راہ یافتہ ضرر کلی عائد حال رعایا و ضعفا گشتہ[2]"

دوسرے خط میں تحریر کرتی ہے:

"وہن و فتورے کہ بسبب بیماری آں برگزیدہ انفس و آفاق بحال کافہ برایا و عامہ رعایا راہ یافتہ[3]"

شاہزادہ مراد نے تو اپنے علاقہ سے آگے بڑھ کر سورت پر حملہ بھی کر دیا کیونکہ از تقاریر جاسوسان معتمد بیقین پیوستہ کہ در واخر شہر ذی الحجہ حضرت را ہنگام موعود رسیدہ[4] شجاع کو لکھتا ہے:

وقوع واقعہ ناگزیر حضرت اعلیٰ دیر یست کہ ایں مخلص متحقق و متیقن شدہ[5]

شاہزادہ مراد کے جاسوسوں نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ عوام کے ہیجان و اضطراب پر قابو پانے کے لئے داراشکوہ ایک شخص کو جو شاہجہاں کے ہم شکل ہے، دریچہ یا جھروکہ میں بٹھا دیتا ہے، اور شبیہ شاہجہاں لوگوں کا سلام بھی لیتا ہے۔

"مدتیست کہ سلطان داراشکوہ یکے را کہ بصورت قدسی طینت بادشاہے جہاں شباہتے تمام دارد گاہے از دریچہ و غرفہ بر آوردہ

---

[1] مکتوب شاہزادہ مراد بنام شاہجہاں نمبر ۲/۲۳۴ رقعات ص ۳۴۵ نیز رقعہ نمبر ۲/۶۲۲ ص ۳۴۴ و رقعہ نمبر ۱/۲۵۵ ص ۳۷۶ بنام جعفر خاں۔ [2] مکتوب جہاں آرا بیگم بنام اورنگ زیب نمبر ۱/۱۹۷ الف و ب ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳۔ [3] مزید براں عالمگیر۔ [4] مکتوب مراد بنام اورنگ زیب بہادر نمبر ۷/۲۴۳ ص ۳۶۵۔ [5] مکتوب مراد بنام شاہزادہ شجاع نمبر ۷/۲۳۴ ص ۳۵۶۔

۔بمردم بنماید واں صورت بے معنی سلامِ مردم مے گیرد۔[1]

ب : یہ عام فتنہ اور ہیجان عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے لئے از روئے انصاف جائز قرار دیتا ہے کہ وہ واقعات کی تحقیق کریں اور کوئی صورت دگرگوں ہو تو اپنے تحفظ نیز اپنے آباد اجداد کی حکومت وسلطنت کے بقاء کے لئے ہر ممکن جدّ وجہد کر ڈالیں۔

جاسوسوں کے ذریعہ سے تحقیق واقعات کی روئداد تو وہ تھی جو مراد نے اپنے مکاتیب میں شجاع اور اورنگ زیب کو لکھی۔ اب اس کے بعد خود جا کر تحقیق کرنے کا دوسرا مرحلہ تھا۔

اس کے جواز کی دلیل یہ تھی کہ جب ہمشیرۂ کلاں جہاں آرا بیگم کی علالت کے زمانہ میں مزاج پُرسی اور زیارت کے لئے جایا جاسکتا ہے تو پیر ومرشد، قبلہ وکعبہ وخداوند مجازی، مربّی، منعم ومحسن (بالقابہ) کی مزاج پُرسی اور زیارت کے لئے جانے میں وجہ ممانعت کیا ہوسکتی ہے۔[2] اور اگر بندش کی جاتی ہے تو یا تو شاہجہاں زندہ نہیں، اور اگر بفرض محال ہستند جز نامے بیش نیست۔[3]

ایسی صورت میں کہ شاہجہاں کا صرف نام باقی ہو، اور جملہ اختیارات دارا کے قبضہ میں ہوں، جو تینوں بھائیوں کے عقیدہ میں دشمنِ دین، ملحد، زندیق، بھائیوں کا بدخواہ اور ہر ایک کی تباہی وبربادی کا کوشاں ہے تو شاہزادہ مراد کے الفاظ میں "عقلاً وشرعاً حفظِ خود ودفعِ شر ضروری است۔[4]

ج : دارا کی نہایت کمینہ اور شرمناک حرکت یہ تھی کہ اُس نے شاہجہاں کے خط کی مشق کر کے شاہجہاں کے نام سے اپنے مطلب کے موافق فرامین لکھ کر تینوں بھائیوں اور اُمراء وافسران فوج کے نام بھیجنے شروع کر دیئے۔ شاہزادہ مراد

---

[1] رقعہ نمبر ۳/۲۲۳ صفحہ ۳۴۴۔ [2] مکتوب ۹/۹۴۵ از مراد بنام اورنگ زیب بہادر رقعات صفحہ ۳۶۸۔ [3] مکتوب نمبر ۱۳/۲۴۸۔ [4] ایضاً۔

اورنگ زیب کو لکھتا ہے :

ملحد خود تقلید خط اقدس را بمرتبۂ کمال رسانیدہ بر فرامین دستخط خود میکند ازانجملہ فرمانے ست کہ دریں ولایہ مخلص رسیدہ[1] ۔

ان جعلی فرامین کے ذریعہ سے دارا نے کوشش کی تھی کہ شجاع سے مونگیر، مراد سے مالوہ اور اورنگ زیب سے برار واپس[2] لے لے ۔

(۷)

شاہجہاں کو کس نے معزول کیا

ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ عالمگیر کے جانشین ناخلف ہوئے ۔ جنہوں نے اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے عالمگیر کو بدنام کرنا ضروری سمجھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر کی صحیح تاریخ اگر کوئی مرتب بھی ہوئی تو وہ شہرت نہیں حاصل کرسکی اور آج عالمگیر کے سوانح حیات کے روزنامچوں کے پراگندہ اوراق اور منتشر رقعات کی شیرازہ بندی ضروری ہو رہی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ رقعات، روزنامچے اور ڈائریاں کسی شخص کے حالات، سوانح اور اس کے جذبات وخیالات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ تسلیم کئے جاتے ہیں مگر فن تاریخ کے لئے یہ کوتاہی یقیناً شرمناک ہے کہ ایسے جلیل القدر سلطان کے صحیح حالات ڈھائی سو برس بعد مرتب کئے جائیں ۔

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے اور یہی مشہور کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب عالمگیر نے معزول کرکے قلعہ آگرہ میں محبوس کردیا ۔

مگر اس حقیقت کو صرف رقعات یا فارسی کی نایاب تاریخوں کے مطالعہ کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ معزول کرنے والا عالمگیر نہیں تھا، بلکہ خود دارا تھا ۔

---

[1] رقعہ ۷/۲۴۳ ص ۳۶۶ ۔ [2] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۴/۲۴ رقعات ص ۳۴۲ ۔

ہر سہ برادران کے وکلاء کو بند کر دینا، خبروں کو بند کر دینا، معزول کر دینے کے مرادف ہے۔ علاوہ ازیں شاہجہاں کے لئے آگرہ کی آب و ہوا مناسب نہ تھی۔ اطباء نے شاہجہاں آباد، دہلی جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن دارا کی مصلحت کے چونکہ مخالف تھا۔ لہذا اطباء کے اس مشورہ اور شاہجہاں کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ اپنی مرضی اور رائے کے مطابق فرامین مرتب کر کے عالمگیر کو نازک ترین موقعہ پر بے دست و پا کر دینا، اور پھر بہنوں بھائیوں کی جاگیروں کو تبدیل کرنے کے فرامین مرتب کرنا، اس کے دعوئے استقلال کا بیّن ثبوت اور تینوں بھائیوں کو مقابلہ پر مجبور کر دینے والے اُمور میں اس قسم کی متعدد حرکتوں نے نیز جاسوسوں اور بیوپاریوں نے مراد کو تو یہی یقین دلا دیا تھا کہ شاہجہاں کا انتقال ہو گیا۔ لیکن عالمگیر کی فراست نے اس کے لئے اس یقین کو فراہم نہیں کیا۔

وہ اوّل اوّل خبر مرگ کی صحت کے بارے میں متردد رہا۔ پھر اس کو یقین ہو گیا کہ خبر مرگ غلط ہے، البتہ معزول مُطلق کر دیئے گئے ہیں۔

"او خود را با عدم استحقاق شائستہ فرمانروائی دانستہ مربّی و ولی نعمت را معزول مطلق ساختہ۔[1]

مہین برادر متصدی امور سلطنت شدہ اوامر احکام بادشاہی بدون عرض اقدس بطور خود سرانجام دادہ و ہیچ امرائے اختیار والا نگذاشتہ۔[2]"

شاہزادہ مراد اوّل تو اپنے جاسوسوں کے اعتماد پر خبر مرگ کو صحیح سمجھ رہا تھا، اور عالمگیر کو بھی اسی کی تصدیق کی فرمائش کر رہا تھا۔ مگر اس کے بعد جب خود اس کو عالمگیر کے خیال کی تصدیق ہوئی تو داراشکوہ کے نام نہایت طنز آمیز خط لکھا کہ زہے خلف الصدق سعادت مند کہ پدر عالی قدر کہ جن کی توجہات اور جن کے احسانات کے طفیل میں خدماتِ سلطنت کے قابل ہوا، اُسی کو قید میں ڈال کر جانی دشمن کی طرح عزیز ترین بھائیوں کی جاں ستانی اور ہلاکت پر کمر باندھی ہے۔[3]

---

[1] مکتوب عالمگیر بنام شاہجہاں نمبر ۱/۱۲۴ رقعات ص ۲۱۲۔ [2] ایضاً نمبر ۳/۱۱۸۔ [3] مکتوب مراد بنام داراشکوہ ۱/۲۲۷ رقعات ص ۳۲۹۔

اسکے بعد معاملہ کی نوعیت قطعاً بدل جاتی ہے اور بجائے سلطنت طلبی کے ہر ایک سعادت مند فرزند کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو قید سے رہائی دلائے چنانچہ مراد اسی مکتوب میں دارا کو لکھ رہا ہے :

چونکہ پدر والا قدر کی رہائی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے۔ لہذا پنبۂ غفلت کانوں سے نکال کر جملہ سامان و ذرائع فراہم کر کے آمادہ جنگ ہو جاؤ اور ہم کو عنقریب طائرِ عجلت کے بازو پر سوار اپنے سر پر پہنچا ہوا سمجھو۔

(۸)

آج دارا کے مذہب میں بحث کی جاتی ہے۔ اس کو صوفی صافی مرشد باصفا گردانا جاتا ہے۔ مگر تینوں بھائی اس کو ملحد اور اس کی اولاد کو ملحد زادہ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ دارا کی اسی بے دینی نے ایک دوسری وجہ ان تینوں بھائیوں کی مخالفت اور اتحاد کی پیدا کر دیتی ہے۔

مراد جیسا آزاد منش شہزادہ بھی لکھتا ہے :

چوں نیت امداد و اعانت دین محمدی ست (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ یقین میدانم کہ فتح و نصرت غیبی جنودِ الٰہی باما ست[1]۔

(۹)

مؤرخین کا بیان ہے کہ جب دارا نے اورنگ زیب کے مقابلہ کے لئے فوجیں بھیجنے کا ارادہ کیا تو شاہجہاں نے سختی سے مخالفت کی مگر کارگر نہ ہوئی اس کا سبب وہ معذولی تھی جس کا تمام بھائیوں کو یقین ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جب دارا اور عالمگیر کی فوجیں مقابلہ میں صف آرا ہونے والی تھیں تو شاہجہاں کی پوری خواہش تھی اور یہی اس کو مشورہ بھی دیا جا رہا تھا کہ وہ خود جا کر دونوں فوجوں کے درمیان اپنا خیمہ نصب کر دے اور دونوں بھائیوں میں تصفیہ کرا کر قصّہ کو ختم کر دے[2]۔ اگر ایسا ہوتا

---

[1] رقعہ ۱۲/۲۴۸ رقعات ص۱۷۳۔ [2] تاریخ ہندوستان ص۱۷ و ص۱۸ جلد ۸۔

تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ جنگ وصلح کے ایک عجیب وغریب باب کی حامل ہوتی۔ مگر افسوس دارا کے اس دعوائے استقلال نے شاہجہاں کے اس ارادہ کو جامۂ عمل سے برہنہ رکھا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارا نے اس علالت کے دوران میں وہ خدمت انجام دی جو انتہا درجہ کے پُر فریب خوشامدی سے ایسے وقت ممکن ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس خدمت پر شاہجہاں نے ایک مرتبہ ڈھائی لاکھ روپیہ انعام دیا۔ پھر ۲۴ ربیع الاوّل ۱۰۶۸ھ کو ایک کروڑ روپیہ نقد اور ۲۴ لاکھ کے جواہرات دیئے۔ اور اس کا منصب پہلے چالیس پھر پچاس اور پھر بالآخر ساٹھ ہزاری کر دیا (جو شاہانِ مغلیہ کے پورے عہد میں کسی افسر یا کسی شہزادہ کا بھی نہیں ہوا)۔

اسی زمانہ میں درباری مؤرخ کے بیان کے بموجب بعض خاص امراء کو بُلا کر وصیّت کی۔ "اس کے بعد دارا تخت کا مالک ہوگا"۔[۱]

(۱۰)

جنگِ برادران کے سلسلہ میں تینوں بھائیوں کا متفقہ طور پر دارا کو ملحد اور بے دین قرار دینا، اور مسلمان جرنیلوں اور ارکانِ دولت میں سے کسی کا بھی دارا کی حمایت میں فوجوں کی کمان کو منظور نہ کرنا، البتہ راجہ جسونت سنگھ اور راجہ جے سنگھ کا حمایت پر آمادہ ہونا (اگرچہ وہ بھی عارضی تھی) یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ جنگِ برادران کے پردہ میں درحقیقت جنگ تھی ایمان والحاد کی، صحیح شریعت اور عامیانہ طریقت کی، اور اکبر کی اس بے قیدی اور اس پابندی کی جس کو حضرت مجدّد صاحب اور آپ کے خلفاء کی مسلسل کوششوں نے ارکانِ حکومت میں پیدا کیا تھا چنانچہ مصنّف عالمگیر نامہ لکھتا ہے:

"راجہ جسونت سنگھ ..... با وجین .... آمدہ بود۔ چوں طبع

---

[۱] مق صت ۴

کج گرائے ان بے بہرۂ جوہر دولت دارا بدین و آئین ہنود و احیاء مراسمِ کفر و جحود مائل مے دید ازیں جہت میل عظیم بسلطنت او داشتِ بنا بر خوشس آمد و رعایت جانب او مصدر بے ادبانہ حرکاتِ ناہموار گشتہ۔ بخیال محال بیداد در از کارِ خود را سدِّ راہ موکب جاہ و جلال مے شمرد۔[1]

جنگِ برادران

دارا نے اپنے استقلال کو تسلیم کرانے اور بھائیوں کے استیصال کے لئے دو[2] فوجیں تیار کیں۔ ایک کو بسرکردگی مرزا راجہ جے سنگھ و بہمراہی شاہزادہ سلیمان شکوہ شجاع کے مقابلہ کے لئے بنارس کی طرف بھیجا۔ اور دوسری کو زیر قیادت مہاراجہ جسونت سنگھ، مراد اور اورنگ زیب کی مدافعت کیلئے روانہ کیا۔

شاہزادہ مراد نے جو اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ تھا، اپنے ایک رقعہ میں اس جنگ کی روئیداد تحریر کی ہے۔ اس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

"روز پنجشنبہ یکم ماہ رجب المرجب ۱۰۶۸ھ کو دیپالپور میں برادرِ والاقدر (اورنگ زیب) سے ہماری ملاقات ہوئی۔ جسونت سنگھ سادات، راجپوت، افغانوں اور مغلوں کی تیئیس ۲۳ ہزار فوج جرار کو لئے ہوئے نہایت غرور اور تمکنت کے ساتھ "اجین" کے قریب پہنچا۔ جمعہ کے روز ہم نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا، اور خداوندِ عالم کی عنایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات مقدسہ پر تکیہ کرکے میں نے فوج کے دستِ راست اور بھائی اورنگ زیب نے فوج کے دستِ چپ کی کمان کرتے ہوئے دشمنِ لئیم کی مدافعت میں جدّ و جہد شروع کر دی۔

---

[1] عالمگیر نامہ صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۴۔

توپ خانہ اور آتش بازی وغیرہ کی کارگذاریوں کے بعد بندگان جاں سپار نے گھوڑے ڈال دیئے اور ان کے پیچھے پیچھے یہ مخلص بھی میدانِ جنگ میں کود کر سرگرمِ قتال وجدال ہوگیا۔ طرفین سے دادِ مردانگی دی گئی۔ اگرچہ فتح وظفر ہماری فوجوں کو نصیب ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ[1] اور قاسم خاں فرار ہوگئے۔ مکند سنگھ ہاڈا، افتخار خاں، دیال داس، رتن راٹھور، ارجن گوڑ وغیرہ جن کے ناموں کی تفصیل بعد کو معلوم ہوگی، ہلاک ہوگئے۔ . . . مختصر یہ کہ پانچ چھ ہزار آدمی طرفین کے قتل ہوئے اور بہت زیادہ خزانہ، ہاتھی، گھوڑے، خیمہ و توپ خانہ وغیرہ ہمارے ہاتھ آیا۔

عنایتِ الٰہی سے ایسی فتح نصیب ہوئی کہ گذشتہ سو سال میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔[2] راجہ جسونت سنگھ میدانِ جنگ سے فرار ہوکر شرم کی وجہ سے دارا سے بھی نہیں ملا۔ اور سیدھا اپنی راجدھانی میں چلاگیا، جہاں سے اُس نے عالمگیر کے پاس معذرت کا خط لکھا اور عالمگیر نے بدستورِ سابق اس کو منصب اور خطاب سے فائز کردیا۔ مگر اس فرار کا بغض جسونت سنگھ کے سینہ میں آخر تک رہا۔

عالمگیر نے اسی دوران میں شاہجہاں کی خدمت میں ایک طویل عرضداشت بھیجی۔ جس میں حسبِ دستورِ سابق فرزندانہ، مریدانہ اور نیازمندانہ آداب پدر بزرگوار مرشد حقیقی اور بادشاہِ وقت کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد عرض کیا:

"اس دوران میں سلطنت و مملکت کے جملہ ملکی اور مالی امور کی زمامِ اختیار حضرت والا کے قبضۂ قدرت سے خارج ہوکر شاہزادہ کلاں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ جس نے اُمورِ سلطنت کے بست وکشاد میں وہ اقتدار حاصل کرلیا جو احاطۂ تحریر و تقریر سے خارج ہے۔

---

[1] راجہ جسونت سنگھ نے راجپوت ہوتے ہوئے فرار اختیار کیا لیکن اس کی بیوی اور بہن نے اس کے لئے اپنے مکانوں کے دروازے بند کرکے اس عار پر خط نسخ کھینچ دیا۔ [2] مکتوب مراد بنام شجاع ۸/۲۳۵ رقعات ص ۳۵۷۔

یہ قدرت و تسلط پاتے ہی اُس نے اپنے بھائیوں کے استیصال کو اپنا اوّلین مقصود گردانا۔ جس میں اس کی جدّ و جہد روز بروز بڑھتی رہی چنانچہ حضرت والا کے فرزند رشید شجاع کے سر پر اپنے نو عمر لڑکے سلیمان شکوہ کو مسلّط کیا، شاہ شجاع کی ۳۲ سالہ خدمات کی کوئی وقعت نہیں کی اور اس کو حد سے زیادہ ذلیل و رسوا کیا۔ اپنی نفسانی خواہشات اور صرف خواہشات کی بنا پر اس نیازمند کی توہین و تذلیل کی ہمیشہ جدّ و جہد کرتا رہا۔ منافع اور آمدنیوں کے راستے اس نیازمند کے لئے بند کرتا رہا، اور طرح طرح کے نقصانات پہنچاتا رہا، اور ہمیشہ وہ کام کرتا رہا جو دین و ملّت کے مخالف اور بندگانِ خدا اور انسانی آبادیوں کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث تھے۔"

اس کے بعد مہم بیجاپور میں اپنی اور اپنی فوج کی جانفشانیوں، دشمن کی لاچاری، اور اپنی مکمّل فتح کے عنقریب نمودار ہونے کی صورت میں شاہی فرامین بھجوا کر دشمنوں کو دلیر کر دینے، عالمگیر کے لئے ایسی مشکلات (کہ جن سے نکل جانا صرف حُسنِ تدبیر اور فضلِ الٰہی کی وجہ سے تھا) کے پیدا کر دینے کا ذکر نہایت قوّت کے ساتھ کیا ہے۔ اور پھر لکھتا ہے کہ:

"دارا کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت کے بعد اگر فضلِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتا تو انہیں فرمانروایانِ دکن کے ہاتھوں آج تمام سلطنت تاراج ہوگئی ہوتی۔ یہ سب حرکت اُس نے صرف اپنی ذاتی غرض کے لئے کی۔ جس میں وہ اس قدر اندھا ہوگیا کہ خود سلطنت کی تباہی اور بربادی کا خیال بھی نہ کر سکا۔

پھر اپنی اسی مخالفت اور خصومت پر جس کی شہرت ایران اور توران تک ہو چکی ہے، قناعت نہیں کی، بلکہ مجھ جیسے وفادار سے (جس نے ساری عمر حضور والا کی اطاعت میں صرف کی اور کبھی بھی کسی معمولی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور عدول حکمی کو ہمیشہ گناہِ عظیم تصوّر کرتا رہا) صوبہ برار علیحدہ کر کے ایسے شخص کے حوالہ کرنا چاہا جو ہمیشہ حکومت کا مخالف رہا اور جس کی غداری

طشت از بام ہے۔

پھر خوشامدیں کرکے راجہ جسونت سنگھ کو میری کوبی کے لئے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ روانہ کردیا۔ مقصود یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، وہ مختصر سا علاقہ، جو حضور والا نے اس نیاز مند کو مرحمت فرما رکھا ہے اس نیاز مند سے چھین کر نیاز مند کو آوارۂ فنا ہے کسی و غربت اور سراسیمۂ صحرا محن و کرب کر دے۔

علاوہ ازیں خوشامدوں اور غلط چاپلوسی سے حضور والا کے مزاجِ اقدس پر اتنا اثر جما لیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، حضور والا بِلا تحقیق و تفتیش اس کی بات کو صحیح سمجھتے ہیں، اور اس کی رائے پر عمل فرماتے ہیں اور جملہ اختیاراتِ ملکی اُن کے حوالہ کر دیئے ہیں۔

اس صورتِ حال کے بعد ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ خود حاضر خدمت ہوکر اصل واقعات کو عرض کریں اور بارگاہ سلطانی میں اپنی مظلومیت کا اظہار کرکے عدل و انصاف کے طالب ہوں۔

عدل سلطان گر نہ پرسد حال مظلومان عشق
گوشہ گیراں را ز آسائش طمع مے باید برید

جب یہ خیر خواہ مسافت طے کرکے "اجین" کے قریب پہنچا تو جسونت سنگھ جو شاہزادہ کلاں کے اشارہ سے اس خیر خواہ کی ایذا رسانی کے لئے وہاں مامور تھا، سنگِ راہ بن گیا۔ اور بِلا لحاظ آداب و حقوق نہایت دلیری کے ساتھ حکم کیا کہ:

"مراجعت نمودہ بمکان خود برود و الا خواہد دید آنچہ خواہد دید"۔

نیاز مند کے سنجیدہ پیغامبروں نے اُس کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ سمجھایا کہ صرف حضرت اعلیٰ و اقدس کی زیارت کے لئے جانا مقصود ہے مگر اس مغرور کے ذہن میں ایک بات بھی نہ آئی اور وہ اپنے لشکر و قوت

کے گھمنڈ میں آمادۂ جنگ ہو گیا۔ ایسی صورت میں ہر ایک ذی ہوش کا کام تھا، کہ اس سنگِ راہ کو راستہ سے ہٹا کر اس کو غرور اور تکبر کا مزا چکھائے۔

اگر خدمتِ اقدس میں حاضری کے علاوہ کوئی اور مقصود ہوتا، تو ظاہر ہے کہ جب جسونت سنگھ اور اس کا لشکر شکست فاش کھا کر بدحواس بھاگ رہا تھا تو تعاقب کر کے ان کو قتل کر دیا جاتا۔ ورنہ کم از کم قید کر لیا جاتا مگر یہاں صرف راستہ حاصل کرنا مقصود تھا۔

اب شاہزادہ داراشکوہ بذاتِ خود دھولپور تشریف لاتے ہیں۔ آپ نے دریائے چنبل کے تمام گھاٹوں پر توپ خانہ اور فوجی دستے مقرر کر کے میرے لئے دریا کا عبور کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔ مگر اس ناممکن کو نیاز مند ممکن بنا چکا ہے اور دریائے چنبل سے پار ہو کر حضور والا کی قدم بوسی کا ارادہ کئے ہوئے ہے۔ سُنا جا رہا ہے کہ اب بذاتِ خود میدانِ معرکہ گرم کریں گے۔ یہ اُن کی بزرگانہ شان کے بھی خلاف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مجھ جیسے کار آزمودہ جنگجو کے مقابلہ پر اُن کا بازی لے جانا قطعاً ناممکن ہے۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ اپنی بزرگی کا وہ خود احترام کریں۔ اس ارادہ کو ترک کر دیں اور اپنے علاقہ پنجاب تشریف لے جائیں اور کچھ دنوں اس نیاز مند کو حضرت اعلیٰ واقدس کی خدمت میں باریابی کا موقعہ دیں[1]۔"

ایک دوسرے مکتوب میں جو تخت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے شاہجہاں کو لکھا تھا۔ تحریر کرتا ہے:

"قبل ازیں[2] مکرر معروض خدمت والا گردید کہ مقصود ایں مرید، از نہضت

---

[1] خلاصہ رقعہ ۴/۱۱۹ الف و ب ص ۱۹۸ تا ص ۲۰۵۔ رقعات عالمگیر۔ [2] اس سے پہلے بار بار خدمتِ والا میں عرض کر چکا ہوں کہ آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا مقصود بادشاہ اسلام کے مقابلہ میں بغاوت نہیں ہے، اور تمام غیب کے ارادہ اور نیتوں کے جاننے والا خدائے قدوس گواہ ہے کہ یہ نادرست ارادہ (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

بصوب اکبرآباد ارادہ بغی وخراج با بادشاہ اسلام نبود و عالم السر والخفیات گواہ ست کہ ایں قصدِ ناصواب غیر مشروع اصلًا وقطعًا پیدا در ضمیرِ من نگشتہ بلکہ چوں در آوان بیماری اختیار از دست اعلیٰ حضرت رفتہ بود و بادشاہ زادہ کلاں کہ رنگے از مسلمانی نداشت قوت واستقلال تمام پیدا کردہ امارت جہانبانی ظاہرے ساخت ورایت کفر والحاد در ممالکِ محروسہ مے افراشت، دفع او را کہ عقلًا وشرعًا وعرفًا واجب شدہ بود بر ذمت ہمت متحتم ساختہ۔ عزیمت ایں حدود نمود وجنگ اوّل باکفارہ اشرار کہ مساجد را منہدم وخراب ساختہ بت خانہا بر آں بنا نہادہ بودند روئے دادہ محاربہ بہ دیگر باملاحدہ نکوہیدہ کردار واقع شد وچوں نیت بخیر بود باجمعیت قلیل در ہر معرکہ مظفر ومنصور آمدہ از جسم زخم مصؤن ماند[1]"

یہ تھے جنگ برادران کے وجوہات، یہ تھا عالمگیر، اور یہ تھا مدعی فنا و بقار دارا شکوہ کا تصوف اور اس کا زہد و تقویٰ اور عشق مولےٰ، جو میاں میر کو باری تعالےٰ کہا کرتا تھا (معاذ اللہ) اور اسلام مجازی کو چھوڑ کر کفر اختیار کر چکا تھا، اور نماز روزہ کو ظاہر پرستوں کے حوالہ کرکے اسلام وکفر کی قیود سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور غلط خیال کبھی بھی میرے دل میں نہیں آیا بلکہ بیماری کے زمانہ میں چونکہ جملہ اختیارات اعلیٰ حضرت کے نکل کر شاہزادہ کے ہاتھ میں پہنچ گئے تھے جس میں اسلامی کوئی رنگت بھی نہ تھی اور اس نے اس زمانہ میں قوت واستقلال پیدا کر لیا تھا۔ بادشاہت کے تمام طریقے اختیار کرلئے تھے اور کفر والحاد کے جھنڈے ممالک محروسہ میں بلند کرنے لگا تھا۔ لہٰذا اس کا مقابلہ عقلًا، شرعًا اور عرفًا واجب ہوگیا تھا۔ اسی فریضہ کی ادائیگی کیلئے اس جانب کا قصد کیا تھا۔ پہلے ان کافروں سے جنگ تھی جو مساجد کو شہید کرکے انکی جگہ بتخانے بناتے تھے۔ اس کے بعد ان سے جنگ ہوئی جو ملحد و بے دین تھے۔ اور چونکہ نیت بخیر تھی، تھوڑے تھوڑے لشکر کے ساتھ ہر معرکہ میں کامیابی حاصل ہوتی رہی اور جسم زخم سے محفوظ رہا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] رقعات ص ۲۲۳ رقعہ نمبر ۱۳۰/۷۔

جس کے نزدیک جوگیوں اور دانش مندانِ ہند کی بات بھی ایسی ہی صحیح تھی، جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (معاذ اللہ)۔

بہرحال داراشکوہ نے ۷ رمضان ۱۰۶۸ھ کو پورے اہتمام کے ساتھ عالمگیر کی مقابلہ کے لئے لشکر آراستہ کئے۔ مگر شام ہونے سے پہلے بدحواس ہو کر میدان سے بھاگنا پڑا۔ غروب آفتاب کے بعد آگرہ پہنچا۔ شاہجہاں کے پاس جاتے ہوئے اس کو شرم آئی۔ کیونکہ وہ اس کو پہلے ہی عالمگیر کے مقابلہ سے منع کر چکا تھا۔ لہٰذا بیوی بچوں اور مقبوضہ جواہرات کے صندوق کو لے کر آخر شب میں دہلی روانہ ہوگیا۔

اس کے بعد پنجاب، گجرات وغیرہ میں قیام کر کے ایک سال تک عالمگیر کو شکست دینے کی سعی لاحاصل کرتا رہا۔ بالآخر شوال ۱۰۶۹ھ میں گرفتار ہوا۔ وسط ذی الحجہ میں دہلی لایا گیا۔ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کے آخری دن اس کو تختۂ دار کا آویزہ بنا دیا گیا[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ جب داراشکوہ مقید کر کے دہلی لایا گیا، تو اس نے عالمگیر کو لکھا:

بھائی صاحب من بادشاہِ من!

خیالِ بادشاہے اصلاً در دل نماندہ، بشما و فرزندانِ شما مبارک و فکرِ کشتنِ من بخاطر مبارک ناحق ست۔ اگر یک حویلی قابلِ سکونت و کنیز کہ از کنیزانِ مخصوص ما برائے خدمت عطا شود بگوشۂ عافیت و در دعاء آں صاحب اشتغال نمائیم[2]۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اسی کے پُشت پر جواب میں یہ آیت لکھ دی۔ آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ[3]

ایک سوال اور اس کا جواب | اعتراض کیا جاتا ہے کہ بالکل ممکن تھا کہ دارا کو

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد ۸ صفحہ ۸۹۔ [2] رقعات ۱/۲۱۲، صفحہ ۳۳۔ [3] رقعات ۱/۱۳۲، صفحہ ۲۲۶۔

کسی محفوظ مقام میں نظر بند رکھا جاتا، اور عالمگیر اس کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔

جواب یہ ہے کہ تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدّعیانِ سلطنت قید و بند ہو کر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے (جیسا کہ مراد اور شجاع کے حالات سے آئندہ معلوم ہوگا) اس کے ساتھ ان کے طرف داروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھتا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ و ریشے نہ کٹ جائیں۔

عالمگیر نے اپنے ایک مکتوب میں جو اُوپر نقل کیا گیا، اسی ایشیائی دستور کی طرف اشارہ کیا ہے:

سر دارش مُلک تا بر تن ست   تن مُلک را فتنہ پیراہن ست

عالمگیر نے شاہجہاں کو کیوں معزول رکھا

اگر عالمگیر کا مقصود بغاوت نہ تھا، وہ شاہجہاں کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا تھا، تو اُس نے شاہجہاں کو معزول کیوں رکھا؟ آگرہ پہنچنے کے بعد اُس کو تختِ سلطنت پر متمکن کیوں نہ کیا؟

مندرجہ ذیل واقعات اس کا جواب دینے کے لئے کافی ہیں۔ عالمگیر جب اکبرآباد پہنچ چکا اور شاہجہاں نے بھی یہ دیکھ کر کہ:

"فلک در ہیچ مرتبہ از مراتب آزار ہیچ وجہ کوتاہی نمے کند و اقبال در سر ہر پلہ از دستیاری پا کشیدہ از تقدیم پامردی دست بازمے دارد ..... دست از کار و کار از دست رفتہ"

قلعہ کی کنجیاں عالمگیر کے پاس بھجوا دیں، تو پھر شاہجہاں نے مشفقانہ انداز میں خط تحریر فرما کر اورنگ زیب کو قلعہ میں ملاقات کے لئے طلب کیا۔ جس کے خاتمہ پر یہ مصرعہ تھا:

زود آئی دل تنگ مرا مونس جاں باش[1]

---

[1] رقعہ نمبر ۳/۱۹۰ — رقعات صفحہ ۳

عالمگیر کے شرکار، کار اور فدا کار رفقاء اب بھی قلعہ میں جا کر ملاقات کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن عالمگیر نے تن بتقدیر شاہجہاں کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کر ہی لیا۔ مگر جب وہ بابِ قلعہ کے پاس پہنچا تو شائستہ خاں امیر الامراء اور شیخ میر نے پھر لجاجت کے ساتھ اس ارادہ سے باز رہنے کی درخواست کی۔ عالمگیر اُن سے سوال و جواب میں مشغول تھا کہ دفعتہً "ناہر دل خاں چیلہ" شاہجہاں بادشاہ کے قلمِ خاص کا لکھا ہوا ایک پرزہ لئے ہوئے پہنچا، جو دارا شکوہ کے نام تھا۔ اُس کو دہلی بھیجا جا رہا تھا اور ہدایت یہ تھی کہ جواب جلد از جلد لائے۔

مضمون خط یہ تھا:

"دارا شکوہ[1] شاہجہاں آباد میں قیام کرے۔ خزانہ اور لشکر کی وہاں کمی نہیں۔ ہرگز ہرگز دہلی سے آگے نہ بڑھے۔ ما بدولت یہاں معاملہ ختم کئے دیتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ خواجہ سراؤں، ترکی اور حبشی لونڈیوں اور غلاموں کو جو شاہی ایوانوں کی خدمت کے لئے قلعہ میں موجود تھیں، مسلح کر دیا تھا کہ جیسے موقعہ ملے ایک دم عالمگیر پر حملہ کر کے معاملہ ختم کر دیا جائے۔[2]

عالمگیر نے جب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، وہ واپس آگیا۔ مگر یہ اُس کا ظرف تھا کہ اُس نے درجہ ابوت، و پدری کا خیال کرتے ہوئے اس کا تذکرہ تک بھی مناسب نہ سمجھا، اور صرف ملاقات کے ارادہ کو ملتوی کر دیا۔

جب دہلی میں بھی دارا نے شکست کھائی اور پنجاب کی طرف بھاگا تو مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام شاہجہاں کا خط پہنچا:

---

[1] دارا شکوہ در شاہجہاں آباد قیام ورزد۔ کمی خزانہ و لشکر در آنجا نیست زینہار از انجا بیشتر نہ گذرد کہ ما بدولت مہم را درینجا فیصل میفرائم (رقعہ $\frac{1}{186}$ رقعات ص۲۹۵ و مآثر الامراء، و رقعات عالمگیری وغیرہ۔ [2] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر ترجمہ اردو جلد اوّل ص۱۱۴-۱۱۲ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص۳۸۔

"داراشکوہ من بلاہور میرسد۔ از خزانہ در لاہور کمی نیست و آدم و اسپ در کابل وافر و مثل مہابت خاں کہ زمانہ از مہابت او در تزلزل بمثرا ہے ہمچوں شاہجہاں منزوی می باشد غرابت دارد۔ ہمیں آں کہ شیر بیشہ تہوری بالشکر آں عزیمت بکند و جلو ریز بلاہور رسیدہ بمدد و رفاقت داراشکوہ بابا پرداختہ۔ بمقابلہ و جزائے اعمال ہر دو نابرخوردار پردازد۔ و صاحب قران ثانی زندانی را برآورد ببیند کہ نام نیک بہ از گنج قارون و مناصب و مراتب دنیائے دوں چہ قدر حاصل خواہد شد۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

و بفرزند ارجمند نوشتہ ام کہ خود را باو گذاشتہ بہبود حال و قال خویش و اطاعت آں سپہ سالار داند و خلاص من ازیں شناسد۔

مکرر نوشتہ مے شود کہ دنیا جاء سہل ناپائیدار است و باہیچ کس وفا نہ کردہ و نخواہد کرد و نیک نامی بصفحہ روزگار یادگار خواہد ماند، و مہابت خاں چگونہ خواہد پسندید کہ صاحب قران ثانی زندہ در اقسام بلا گرفتار باشد۔ و شخصے کہ بدام تزویر عالمے را رام نمودہ بکام خود ساختہ بر تخت خلافت کامرانی کند۔ و بایں حال اگر آں "عمدۃ الملک" اغماض نماید فردا، قیامت، دست من و دامن او۔[1]

شاہزادہ محمد مراد جو اس وقت اورنگ زیب کے ساتھ تھا، اور اگرچہ اس سے پیشتر بھی اس کو برار کی حرص دے کر عالمگیر سے توڑنا چاہا تھا، مگر چونکہ دارا کے وجود کو وہ بہرحال اپنے لئے خطرناک سمجھتا تھا، لہٰذا عالمگیر کی مخالفت اور ترکِ رفاقت پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ اب جبکہ آگرہ سے دارا کو ختم کر دیا گیا تو مراد کا ہموار ہو جانا آسان تھا۔ چنانچہ اس کے نام تحریر کیا گیا، کہ کل ہندوستان کی بادشاہی تم کو عطا کی گئی ہے۔ تم پر فرض ہے کہ ابھی اس کا تذکرہ نہ کرو۔ چند روز بعد بھائی اور بھتیجوں کو دعوت کے بہانہ سے اپنے یہاں بلا کر ختم کر دو، اور پھر اپنے نام سے

---

[1] رقعہ نمبر ۱/۱۹۶ رقعات صفحہ ۳۰۹ و صفحہ ۳۱۰۔

تمام ملک میں سکہ اور خطبہ جاری کرو ۔ الفاظ مکتوب حسبِ ذیل ہیں :

"بادشاہے کُل ہندوستان بطیب نفس وطوعِ ضمیر باں فرزند سعادت پیوند حوالہ نمودہ ایم ۔ باید کہ دریں باب کمال آگاہی و بردباری بتقدیم رسانیدہ مطلقاً ایں راز سربستہ ہیچ کس از نزدیک و دُور ظاہر نسازد بعد از روزے چند برادر را و برادر زادہ را بہ بہانۂ ضیافت بخانۂ خود طلب داشتہ ، کار ہر دو بپایاں رساند ۔ وخطبہ ملک باسم ولقب خویش مزیّن گرداند کہ من بر ضیاء خاطر عہدۂ ایں امر خطیر را باں فرزند عقیدت مند سپردہ ام ایں کار عالی راز روئے کمال آگاہی سرانجام بخشد[1]

اسی زمانہ میں یا مراد کی گرفتاری کے بعد شاہزادہ شجاع کے نام ایک خط ہندی زبان میں تحریر کیا ۔ یہ حُسنِ اتفاق تھا اور عالمگیر کی اقبال مندی کہ عالمگیر کو ان تمام خطوط کا علم ہوتا رہا ۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس قسم کے خطوط کی اطلاع یابی کے بعد جب شاہ عالمگیر نے رسل و رسائل پر پابندی عائد کی تو شاہجہاں نے عتاب آمیز خط عالمگیر کو لکھا جس میں عذابِ آخرت سے ڈرایا ۔ باپ کے ادب و احترام کی تذکیر کی ۔

عالمگیر اس خط کے جواب میں ایک مفصّل عریضہ شاہجہاں کی خدمت میں بھیجتا ہے جس کا بجنسہٖ ترجمہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ۔ اس خط سے عالمگیر کے اصلی ارادہ اور بعد کے فیصلہ اور اس کی وجوہات پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔

عالمگیر لکھتا ہے :

اعلیٰ حضرت دانش مند ہیں ۔ زمانہ کی گرمی اور سردی ، پستی اور بلندی کے تجربوں میں عمر گرامی کے بیشتر اوقات ، صرف ہوئے ہیں ۔ اسی بنا پر میرا عقیدہ تھا کہ جو واقعات پیش آچکے ہیں ، ان کو تقدیری امور سمجھ کر اور اس امر پر راضی ہو کر کہ قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا کہ تخت و سلطنت

---

[1] رقعہ نمبر ۱/۱۹۵ رقعات ص ۳۰۸

اس بہاں نثار کے حوالہ ہو ۔۔۔ اس مرید کی شکست اور دوسروں کے کام کی رونق اور ترقی میں کوشش نہ فرمائیں گے ۔ چنانچہ جناب والا کے ساتھ نیاز مند نے بڑی حد تک بہتر ہی سلوک کیا اور پوری خواہش تھی کہ مخالفین کی اس شورش ختم ہونے کے بعد حضرت[1] والا کی رضا جوئی اور خدمت گذاری کے لئے جان و دل سے کمر ہمت کس لوں گا اور اس طرح سعادت دارین حاصل کروں گا ۔

ہر چند سنتا رہا کہ غبار فساد کی برانگیختگی اور بندگان خدا کے معاملات کی یہ برہم خوردگی آنحضرت کی تحریک سے ہے اور فرمان اقدس کے بموجب ہی بھائی صاحبان ہاتھ پیر مار رہے ہیں ، اور اپنی جانیں برباد کر رہے ہیں مگر میں نے کبھی لوگوں کے کہنے پر کان نہیں دھرا ، اور شاہراہ عقیدت سے انحراف کا خیال بھی نہیں آیا ۔

مگر جب کہ آنحضرت کی بے توجہی کی خبریں پے در پے اور لگاتار پہنچیں (جیسا کہ اس تحریر سے ظاہر ہے جو شاہ شجاع کے نام ہندی میں لکھی تھی اور جس کی بناء پر اس کے خان و مان کا برباد ہونا جناب والا کو بھی معلوم ہے) تو لامحالہ یقین ہو گیا کہ آنحضرت اس ارادت کیش عقیدتمند کو نہیں چاہتے ، اور اس کے باوجود کہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے ، جناب والا ابتک اسی جستجو میں ہیں کہ کوئی دوسرا ہی استقلال کرے اور اس فدوی کی وہ تمام کوشش جو دین متین کی ترویج اور معاملات سلطنت کے انتظام میں خرچ ہو رہی ہے ، ضائع اور برباد ہو جائے ۔ نیز یہ کہ جناب والا کسی

---

[1] عالمگیر اس کا عملی ثبوت پیش کر چکا ہے چنانچہ فتح آگرہ کے بعد اس کو موقع تھا کہ اپنے ہمنوا شجاع کو خود اپنی جانب سے صوبہ برار دے دیتا مگر اس نے شاہجہاں سے سفارش کی اور بادشاہ کی حیثیت سے شاہجہاں سے فرمان لکھوا کر بھجوایا ۔ (ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۱/۱۲۷ صلہ ۲۹۶ رقعات عالمگیر ۔

صورت سے بھی اس طرزِ عمل اور اس فکر سے علیحدہ نہیں ہو سکتے بلکہ اصرار کے ساتھ اسی پر کاربند رہیں گے۔ ان حالات میں مجبور ہو کر محض حزم احتیاط کے طور پر (تاکہ کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہو جائے جس کا تدارک ناممکن ہو) افسوس کہ اس آرزو کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا جو میرے دل میں تھی میرے قول کی صداقت پر خدا، توانا شاہد اور گواہ ہے۔

اس ارادت مند کو اطمینان خاطر اس وقت حاصل ہو گا جب کہ وہ دو[2] فتنے جو بار بار بے غیرتی کو اپنے سر لے چکے ہیں، فرار ہو کر ممالک محروسہ سے باہر ہو جائیں یا توفیقِ الٰہی سے گرفتار ہو کر اپنے بھائی کے پہلو میں بیٹھیں

سروارث مُلک تا بر تن ست تنِ ملک را فتنہ پیراہن ست

جب یہ فتنہ فرو ہو جائے گا، پھر اس احتیاط اور اس پابندی کی ضرورت ہی کیا رہے گی[1]"

شاہجہاں کی طرف سے معافی

دارا کا دوست اور عالمگیر کا دشمن ڈاکٹر برنیز جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مقیم تھا، اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:

"عالمگیر کا برتاؤ[2] شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح خاطر داری کرتا تھا نہایت کثرت سے تحفہ تحائف بھیجتا رہتا، اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اس کی رائے اور مشورہ کو مثل ایک پیر مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا اور اس کے عریضوں سے جو اکثر لکھا کرتا تھا ادب اور فرمانبرداری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح سے شاہجہاں کی مخالفت اور اس کا قصہ یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملاتِ سلطنت میں بیٹے کو ٹوکنے پڑنے لگ گیا بلکہ باغی

---

[1] رقعہ نمبر ۴/۱۲۷ رقعات ص۲۱۷ و ص۲۱۸۔ [2] سفرنامہ ڈاکٹر برنیز جلد اوّل ص۲۸۹ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص۳۹۔

فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی۔"

خاتمۂ بحث علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں انصاف کرو شاہجہاں اتنی بات پر جہانگیر سے لڑتا رہا کہ اُس نے شاہجہاں کی جاگیر نورجہاں کو دے دی تھی حالانکہ اور ہر طرح کی عنایتیں بحال تھیں۔ تاہم شاہجہاں نیک نام ہے۔ عالمگیر نے اس حالت میں کہ اس کی جاگیر چھین لی گئی۔ تنخواہ بند کر دی گئی عین دشمنوں کے مقابلہ کے وقت اس کی فوج اس کے پاس سے بُلا لی گئی۔ ۷۵ ہزار فوج خود اس کے مقابلہ اور مقاتلہ کے لئے بھیجی گئی قلعہ میں اس کے قتل کا بندوبست کیا گیا۔ ان سب باتوں کے ساتھ وہ شاہجہاں کا نہایت ادب و احترام کرتا رہا۔ تاہم وہ بدنام ہے۔

رند و صوفی ہمہ سرمست گزشتند و گزشت

قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند[1]

قتلِ مراد

عالمگیر نے بادشاہ زادہ مراد کی درخواست پر جو تحریر بطور معاہدہ قلمبند کی تھی، آداب عالمگیر کے حوالہ سے رقعات عالمگیر ص ۲۶۴ تا ص ۲۶۷ پر وہ نقل کی گئی ہے اس کے اہم اجزار کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

"معاہدہ کا نقطۂ نظر دین مبین سید المرسلین (علیہ من الصلوٰۃ اتمہا و من التحیات اعمہا) کی سربلندی اور برتری ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ نمازیانِ ظفر لوار اور مجاہدانِ نصرت انتمار کی مساعی سے دیارِ اسلام کے گلشنِ سدا بہار سے الحاد و زندقہ کا کانٹا نکال دیا جائے اور رئیس الملاحدہ (دارا) اپنے اتباع اور احزاب کے ساتھ نیست و نابود ہو، اور وُہ ہندوستان بہشت نشان کی سرزمین جو آبا و کرام کی مساعی جمیلہ سے کفر

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۹۔

و شرک کی گندگی سے پاک ہو چکی ہے افتراق و اختلاف کے فتنوں سے محفوظ ہے۔ برادر بجان برابر کو اپنی رائے و صواب پر عمل کرتے ہوئے اس مہم میں موافقت و مرافقت کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ آپ نے پختہ قسموں کے ساتھ عہد کیا ہے کہ اس دشمنِ دین و دولت کے استیصال اور اُمور سلطنت کے استقرار و انتظام کے بعد بھی وفاق و اتفاق کے جادۂ قدیم پر ثابت قدم رہ کر اسی طرح ہر وقت اور ہر جگہ ہر کام میں رفیق و شریک رہیں گے اور ہمارے دوست کے ساتھ دوست اور ہمارے دشمن کے ساتھ دشمن رہ کر کسی حال میں بھی خاطر عاطر کی رضامندی سے باہر قدم نہ رکھیں گے۔ اور ممالکِ محروسہ موروثی میں سے جو جو ملک اس ورقہ اتحاد کے التماس کے بموجب ان کے لئے چھوڑے جائیں گے ان پر قانع اور خوش ہو کر زیادہ کا مطالبہ نہ کریں گے۔

برادر عزیز کے اس عہد کی بناء پر ہماری جانب سے تحریر ہوتا ہے کہ جب تک اخلاص یک جہتی، یک رنگی اور حق شناسی کے خلاف برادر موصوف سے کوئی عمل سرزد نہ ہوگا، ہماری مہربانیاں روز افزوں رہینگی اور جانبین کے نفع و نقصان کو ایک سمجھ کر جملہ اوقات میں شرائط عنایت و امداد اور مراسمِ یگانگی و اتحاد کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا جائے گا اور آں عزیز کی نسبت جو الطاف و مراحم آج ہیں، مقصود کے حاصل ہو جانے اور ملحد نامقبول کے سقوط کے بعد ہر طرح بلکہ توقعات سے بھی بہتر صورت پر جاری رکھے جائیں گے اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔ اور جیسا کہ پہلے طے ہو چکا ہے، صوبہ لاہور، کابل، کشمیر، ملتان، بھکر، ٹھٹھہ بتمام و کمال اور خلیج عمان تک اُس طرف کا تمام علاقہ آں نامدار والاتبار کے لئے واگذار کر دیا جائے گا، اور اس باب میں کسی قسم کی

کسی دشواری اور پریشانی کا موقعہ نہ دیا جائے گا۔ اور اس ملحد کے استیصال سے فراغت کے بعد بلا توقف اُس عزیز کو اپنے علاقہ میں پہنچنے کا موقع دیا جائے گا۔ اپنے اس دعوے کی سچائی پر خدا اور رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد گردانتے ہیں اور آں برادر کے مزید اطمینان کے لئے یہ تحریر لکھ کر مُہر اور پنجہ کے نقش سے اس کو مزیّن کئے دیتے ہیں۔ نیز آں برادر سے توقع ہے کہ کلامِ الٰہی **واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا** کے بموجب اس معاہدہ کی پوری پابندی کریں گے، اور کسی صورت سے بھی ان اغراض پرستوں کی بات، پر جن کی آج کل کثرت ہے، توجّہ نہ کریں گے۔

وفقنا الله تعالیٰ وایّاکم لما یحبّهٗ و یرضاه والله یحق الحق و یهدی السبیل۔"

ترجمہ بالا میں خط کشیدہ عبارت لفظی ترجمہ ہے اور باقی حصّہ خلاصہ کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

الف : تجویز یا آج کل کی اصطلاح میں فارمولا یا پلیج عالمگیر نے مرتب کیا ہے۔ شاہزادہ مراد اس بلاک میں شریک ہوا ہے۔

ب : اس مہم کا قائد عالمگیر رہے گا، اور معاملات کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔

ج : دارا کے استیصال اور ملک میں اپنی حکومت کے استقلال تک شرکاءِ معاہدہ لازمی طور پر ایک دوسرے کے شریک رہیں گے اور استقلال کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرے گا۔

د : پورا ملک نہیں (جیسا کہ یورپین مؤرخ عالمگیر کو بدنام کرنے کیلئے لکھ دیتے ہیں) بلکہ ملک کا ایک حصّہ مراد کو دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے علاقہ میں مستقل

رہے گا، اور دونوں حکومتوں میں دوستانہ تعلقات رہیں گے۔

دھرمات پور کی جنگ (جو جسونت سنگھ سے ہوئی تھی) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد عالمگیر نے جس طرح اپنے بیٹے محمد سلطان کو نیز دوسرے امراء اور افسران فوج کو انعامات دیئے اور ان کے منصبوں میں ترقی دی، اسی طرح شاہزادہ محمد مراد بخش کو بھی پندرہ ہزار اور چار ہاتھی عنایت کئے۔

مؤرخین کا یہ متفقہ بیان بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ معاہدہ میں عالمگیر کو بالادست قرار دے کر قائد اور امیر کی حیثیت دی گئی تھی۔

بہرکیف شاہزادہ مراد اکبر آباد کی فتح تک اورنگ زیب کے ساتھ حق رفاقت ادا کرتا ہے۔ اکبر آباد پہنچنے کے بعد شاہزادہ شجاع کے نام خط لکھتا ہے جس میں فتوحات کا تذکرہ کرتا ہے۔ عالمگیر کے کسی طرز عمل کی اس میں شکایت نہیں ہے[1]۔

البتہ اس اثناء میں ایک خط پوشیدہ طور پر مراد نے شاہجہاں کو ضرور لکھا ہے جس میں وہ اپنی معصومیت ظاہر کر کے نہایت لجاجت کے ساتھ قصور کی معافی چاہتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے:

"درباب ایں عاصی تائب ہرچہ حکم اقدس وارفع شرف نفاذ یابد کاربند گردیدہ ازیں سرمشاری برآید"[2]۔

غالباً اسی خط کی بناء پر شاہجہاں کو مراد سے ایک توقع قائم ہوتی ہے چنانچہ وہ تمام ہندوستان کی بادشاہت مراد کو بخش کر ضیافت کے بہانہ سے عالمگیر اور اور اس کے لڑکوں کے قتل کا مراد کو مشورہ دیتا ہے[3]۔

بہرحال اس خط کی بناء پر یا اس لئے کہ آگرہ میں اس کو اس کے مصاحبین نے غلط توقعات دلادی تھیں۔ اس نے فوراً نہایت تیزی سے فوج کی بھرتی شروع کردی

[1] اس خط کا ترجمہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں نیز ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۹/۲۳۶ رقعات ص ۳۵۸۔ [2] رقعہ نمبر ۵/۵۲۵ ص ۳۲۶ رقعات ۱۲ [3] اس خط کو بجنسہ اوپر نقل کر آئے ہیں۔

چونکہ جنگ دھرمات پور کے زخموں کے باعث مراد ابھی بیمار تھا۔ عالمگیر نے بیماری کی حالت میں اس سے جواب طلب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ جب وہ دارا کے تعاقب میں دہلی روانہ ہونے لگا تو اسی علالت کے باعث مراد کو آگرہ ہی چھوڑ گیا۔ لیکن اب اس کے نادان دوستوں نے یہ سمجھایا کہ عالمگیر اس لئے چھوڑ گیا ہے کہ دہلی جاکر اپنی تخت نشینی کا باقاعدہ اعلان کر دے۔ مراد کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ دوسرے ہی دن دہلی کی طرف چل کھڑا ہوا۔ تاکہ جونہی اسے موقع ملے وہ اورنگ زیب پر عقب سے حملہ کر دے۔ اورنگ زیب نے اسی خیال سے کہ اس کو نقض عہد کا شبہ نہ ہو ڈھائی سو گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ بھی اس کے پاس بھیج دیئے لیکن مراد کے رویہ میں سرِمُو فرق نہیں آیا بلکہ اُس نے خود سری سے کام لینا شروع کر دیا حتیٰ کہ اپنے بادشاہِ ہند[1] ہونے کا اعلان کرنے لگا اور اپنے افسروں کو شاہی خطابات تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت اورنگ زیب دفعۃً تین دشمنوں کی زد میں آ رہا تھا۔ مزید براں متھرا میں (جو ہندوؤں کی کوششوں کا بڑا مرکز تھا) عام شورش اور بدامنی پیدا کر دی گئی تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر عالمگیر کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ سب سے قریبی دشمن یعنی مراد سے وہ اطمینان حاصل کر لے۔

چنانچہ اس سے پہلے کہ مراد ضیافت کے بہانہ سے عالمگیر کو بُلا کر اُس کا کام تمام کر دے۔ عالمگیر نے مراد کو حُسنِ تدبیر سے گرفتار کر لیا، اور باوجودیکہ مراد معاہدہ کی خلاف ورزی خود کر چکا تھا، تاہم عالمگیر نے گرفتاری کے بعد اس کو اطمینان دلا دیا کہ محض احتیاط کے طور پر اس شورش کے زمانہ میں یہ کارروائی کی جاتی ہے اس کے

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ مراد نے صوبہ گجرات میں مرگِ شاہجہاں کی غلط خبر پر ہی اعتماد کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ملازم خاص شہباز خاں کو لکھتا ہے۔ امروز روز شنبہ کہ نہم ربیع الاوّل ست یک پہر و یک گھڑی روز بر آمدہ در خاص و عام بدولت و سعادت بر تخت دولت بہ مبارکی نشستہ و خطبہ و سکہ بنام ما مشرف شد الخ رقعہ $\frac{2}{266}$ ص ۳۸۷ نیز رقعہ $\frac{1}{265}$ ص ۳۸۶ وغیرہ۔ مگر بایں ہمہ اورنگ زیب نے اس کو اپنے ساتھ لیا اور اُس کی حماقت کا خیال نہ کیا۔ ۱۲

بعد بھی اگر اپنے رویّہ سے معاہدہ کی پابندی کا ثبوت دے دیا جائے گا تو معاہدہ کے بموجب دارا کے معاملہ سے فراغت پاکر اور ملک میں امن بحال کرنے کے بعد آپ کو آپ کا علاقہ حوالہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس غرض سے عالمگیر نے مراد کو نہ صرف اس کے اہل وعیال بلکہ اس کی محبوبہ سرستی بائی کو اس کے پاس گوالیار میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس کے لئے معقول وظیفہ مقرر کر دیا اور ہر قسم کی محدود آزادی دے دی۔ لیکن مراد برابر اپنے بھاگنے کی کوشش میں لگا رہا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اُس نے سب سے پہلے اپنے پاس کے ملازموں کو ملا لیا۔ ان میں مشہور مؤرخ خافی خاں کا باپ بھی تھا اس کے بعد اُس نے مغلوں کو جو درویش صورت گوالیار میں رہتے تھے، رام کیا۔ پھر مغل کاروانوں کی جو گوالیار سے گذرتے تھے، دعوتیں شروع کیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان سب نے مل کر یہ طے کر لیا کہ مراد کو یہاں سے نکال لیا جائے۔

کمند ڈالی گئی اور مراد آخری مرتبہ اپنی محبوبہ سرستی بائی سے ملنے گیا۔ وہ پیغامِ وداع سُن کر چلّا پڑی۔ محل کے پہرہ داروں کو شبہ ہوا۔ تلاش کے بعد کمند کا پتہ چلا۔ اور مراد اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہا۔ اورنگ زیب اگر چاہتا تو اسی وقت مراد کو اس کی سزا دے سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے متعلق باز پرس تک نہ کی اور مراد تقریباً چار سال تک گوالیار میں رہا۔

اس کے بعد نظامِ حکومت شریعت کے مطابق چلنے لگا تو علی نقی کے چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے قصاص کا مطالبہ کیا جس کو مراد نے قتل کیا تھا۔ قاضی نے خوں بہا کی ترغیب دی۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ تو مجبوراً قصاص کا حکم جاری کیا۔ چنانچہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۰۷۲ھ کو علی نقی کے خون کا بدلہ مراد کو اپنے خون سے دینا پڑا۔

اورنگ زیب نے اس مقدمہ کو جس نظر سے دیکھا، اُس کا ثبوت خود خافی خاں کا بیان بہتر طریقہ سے دیتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ جس لڑکے نے استغاثہ داخل کیا تھا، وہ "مغضوب نظر بادشاہے گردید"۔

بادشاہ نامہ محمد صدیق کے بیان کے مطابق بادشاہ نے اس سے عرصہ تک گفتگو نہیں کی۔دوسری طرف[1] جس لڑکے نے:

آز دعوے پدر ابا نمودہ بود، بادشاہ قدرداں از فرمودن خدمات حضور و دیگر عنایات متوجہ حال او شدند۔[2]

فرارِ شجاع

شاہزادہ شجاع ۳۲ سال سے بنگالہ کا صوبہ دار تھا۔ یہ علاقہ زرخیز اور دشمنوں کے خطرات سے محفوظ تھا۔ امن اور عیش کی زندگی جو اس کو نصیب تھی، اُس نے شجاع کو تن آسان بنا دیا تھا۔ البتہ رقابتِ دارا کے تیروں سے اس کا سینہ بھی زخمی تھا۔ اسی زخم نے اس کو عالمگیر کا ہمنوا بنا دیا تھا۔

عرصہ سے شجاع کی خواہش تھی کہ صوبہ بہار ورنہ کم از کم پٹنہ اس کو دے دیا جائے تاکہ برسات کے موسم میں جب کہ بنگالہ کی آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے، وہ اپنے اہل و عیال کو پٹنہ پہنچا دیا کرے[3]۔ مگر چونکہ پٹنہ کے ملحق صوبے دارا کے تھے اور وہ پسند نہ کرتا تھا کہ کسی بھائی کے صوبوں سے اس کے صوبوں کی سرحد ملی ہوئی ہو، اسی وجہ سے شجاع کی یہ درخواست منظور نہ ہو سکی۔

وہ وقت آیا کہ داراشکوہ کی بدتدبیری سے وفات شاہجہاں کی شہرت پھیل گئی۔ شاہزادہ شجاع نے بھی شاہزادہ مراد کی طرح شہرت پر اعتماد کرکے اپنے استقلال کا

---

[1] قانون شریعت کے بموجب اگر اولیاء مقتول جو مدعیانِ قصاص ہوں۔ اگر ان میں سے ایک بھی دعوےٰ قصاص سے دست بردار ہو جائے تو قصاص کا حکم نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ورنہ محمد صدیق کا یہ بیان قابلِ غور ہے کیونکہ ان میں تضاد ہے۔ [2] عالمگیر نامہ، عمل صالح۔ ظفر نامہ عالمگیری۔ تاریخ شجاعی وغیرہ بحوالہ متن ص ۴۶۹۔ [3] ملاحظہ ہو رقعہ نمبر $\frac{5}{219}$۔

اعلان کر دیا۔ تخت سلطنت پر جلوس فرمایا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کر دیا[1] اور اپنے علاقہ کی حدود کو بنارس تک وسیع کر لیا۔ یہ سنجیدگی اور بردباری اور سلطنت و شاہیت سے استغناء عالمگیر ہی کا حصہ تھا کہ اس نے شہرت پر تو اعتماد ہی نہ کیا۔ استقلال دارا کا وہ ابتداء سے مخالف تھا۔ مگر شاہجہاں کے سامنے اپنے مقصود اور اپنی آخری معروضات کو دلائل اور براہین کی روشنی میں صفائی سے بیان کرنے اور حجت کو ختم کر دینے سے پہلے کوئی فعل ایسا نہیں کیا۔ جس سے شاہجہاں کی ہمسری یا شریک کار بھائیوں سے بے مروّتی کا اظہار ہو۔

داراشکوہ نے استقلال و اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ سلیمان شکوہ اور مرزا راجہ جے سنگھ کو شجاع کے اور جسونت سنگھ کو عالمگیر اور مراد کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔

شجاع اور عالمگیر میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ چنانچہ سلیمان شکوہ نے پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست دی کہ شجاع کو بنارس سے بھاگ کر مونگیر جا کر پناہ ملی اور پھر وہاں بھی نہ جم سکا۔

بہت ممکن تھا، اسی مرحلہ میں شجاع کا قصہ ختم ہو جاتا۔ مگر اورنگ زیب کی کامیابی نے دارا کو مجبور کیا کہ سلیمان شکوہ کو اپنی امداد کے لئے طلب کرے۔

فتح اکبرآباد کے بعد عالمگیر نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شاہجہاں سے سفارش[2] کر کے صوبہ بہار شجاع کو دلوا دیا۔

---

[1] در بلدہ راج محل بر سریر سلطنت و تخت مملکت جلوس نمودہ خود را ابو الفوز نصیر الدین محمد صاحب قران ثالث سکندر ثانی شاہ شجاع بہادر غازی ملقب ساختند و با لشکر ہائے ممالک مشرقیہ با بہت و عظمتِ بسیار بعزم گرفتن دہلی از بنگالہ بصوب دار الخلافہ عنان گسل گردید (تاریخ شاہ شجاع ص۳۲ بحوالہ المق ص۳۰۴)۔

[2] یہ واقعہ بھی عالمگیر کی صاف دلی کا بین ثبوت ہے اور اس کمال احتیاط یہ کہ اپنی جانب سے نہیں دیتا بلکہ شاہجہاں کی طرف سے دیتا ہے تاکہ بدعہدی کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکے ۱۲۔

شاہجہاں اورنگ زیب کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے فرمان میں لکھتا ہے :

"الحال از روئے کمال مرحمت صوبہ بہار را بہ صوبہ عمدہ بنگالہ و اُڑیسہ افزودہ۔ حسب التماس فرزند عالی قدر، بسلطان اورنگ زیب بہادر باقطاع آں فرزند اقبال مند و بختیار مقرر و مسلم داشتیم"[1]۔

اس کے ساتھ ہی عالمگیر نے اپنا خط شجاع کے نام بھیجا۔ جس میں صفائی سے لکھ دیا کہ سردست صوبہ بہار اپنے تصرّف میں لاکر فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ اسکی پرداخت اور اپنے نقصانات کی تلافی کیجئے۔ جب ہماری فوجیں دارا کی مہم سے فارغ ہوجائیں گی، اُس وقت :

"مطالب و مدعیات دیگر کہ داشتہ باشید در حصول آں نیز خواہیم کوشید و چنانچہ آئین اخوت و مقتضائے فتوت ست ہیچ چیز از مراتب ملک و مال مضائقہ نخواہیم نمود"[2]۔

اورنگ زیب کی سیرچشمی اور فراخ حوصلگی مستحق صد آفریں ہے، کہ شجاع کی کمزوری، معاہدہ سے لاپرواہی اور اپنے مقصود سے اس کی ناکارگی کو دیکھ رہا ہے مگر پھر بھی صوبہ بہار صرف اس لئے دلواتا ہے تاکہ اپنے نقصانات کی تلافی کرے اور صرف اپنی جد و جہد کے بعد جو ملک وہ حاصل کرے، اس میں بھی اپنی رائے اور مرضی کے مطابق نہیں بلکہ شجاع کے مدعی اور مطالبہ کے بموجب دینے کا وعدہ تحریری دے رہا ہے جس پر شجاع بھی بہت خوش ہے اور احسان مندی کا اظہار کر رہا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ شجاع کی حرص و طمع کا کاسہ اب تک پُر نہیں ہوا تھا مزید برآں شاہجہاں کے رقعہ نے جو ہندی میں لکھا گیا تھا، جذباتِ حرص و طمع میں نئی امنگ پیدا کر دی تھی۔

چنانچہ ایک پست ہمت، بزدل، حریص اور بے مروت انسان کی طرح (جو

۱؎ رقعہ $\frac{1}{187}$ ب ص ۲۹۶۔ ۲؎ رقعہ $\frac{4}{165}$ ص ۲۵۸۔

مقابل کی کمزوری اور پریشانی ہی سے فائدہ اُٹھانے کی تاک میں رہا کرتے ہیں) شجاع نے بھی پست اور رذیل اخلاق کے مظاہرہ میں کمی نہیں کی۔

عالمگیر دارا کا تعاقب کرتے ہوئے ملتان پہنچ گیا تھا، مراد گرفتار ہو چکا تھا۔ آگرہ کا قلعہ ناتجربہ کار محمد سلطان کی نگرانی میں تھا۔ اس سے بہتر موقعہ شجاع کو کب مل سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے فوراً پٹنہ سے اپنی فوجوں کے کوچ کا حکم صادر کر دیا۔ بنارس، الہ آباد اور رہتاس وغیرہ کے قلعے ابھی تک دارا کے ملازمین کے قبضہ میں تھے۔ دارا نے اُن کے نام خفیہ احکام جاری کر دیئے کہ وہ قلعوں کو شجاع کے حوالہ کر دیں۔ چنانچہ شجاع اپنی جرار فوجوں کے ساتھ بڑھتا ہوا الہ آباد تک پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کو جب شجاع کے بڑھنے کی خبر پہنچی تو پہلے اُس نے محمد سلطان کو حکم دیا کہ آگرہ کی موجودہ فوج کو لے کر بڑھے۔ پھر خود بھی روانہ ہوا۔ جسونت سنگھ جو دھرمات پور میں شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور راجہ جے سنگھ کی وساطت سے معافی پا کر شریکِ فوج ہو گیا تھا، ساتھ تھا۔

اورنگ زیب نے محمد سلطان کو ہدایت کی تھی کہ وہ لڑائی میں پیش قدمی نہ کرے بلکہ اس کے آنے کا انتظار کرے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جب شجاع کو اورنگ زیب کے پہنچنے کا علم ہو گا، وہ خود ہی واپس چلا جائے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی رفتار سُست کر دی۔ بارہ دن دہلی ٹھہر گیا۔ پھر سرون کی شکار گاہ میں جا کر خبروں کا انتظار کرنے لگا۔ مگر شجاع اندھا بنا ہوا تھا، وہ بڑھتے بڑھتے کھجوا پہنچ گیا۔

آخر کار عالمگیر کو خود متوجہ ہو کر شجاع کے مقابلہ کے لئے آنا پڑا۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو رزم گاہ میں پہنچا۔ فوجوں کی ترتیب دے دی۔ جسونت سنگھ کو بھی یمین کی کمان دی گئی۔ لیکن اُس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کر لی اور طے کیا کہ رات کو میں عقب سے عالمگیر کی فوج پر حملہ کر دوں گا اور تم سامنے سے حملہ کر دینا

اس طرح ہم دونوں مل کر عالمگیر کو پیس ڈالیں گے۔

رات کے دو حصے گذر چکے ہیں۔ سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نماز تہجد میں مشغول ہیں۔ یکایک لشکر میں شور ہوتا ہے۔ سلطان کے پاس پہرہ دار اور ملازمین آکر اطلاع دیتے ہیں کہ جسونت سنگھ اپنی چودہ ہزار فوج کے ساتھ سلطانی لشکروں کو پریشان کرتا ہوا شجاع کے پاس جا رہا ہے۔[1]

سلطان یہ خبر سنتا ہے اور ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے کہ "اگر رفت رفتہ باشد" جب اپنے وظائف اور معمولات سے فارغ ہو جاتا ہے تو میر جملہ کو طلب کر کے فرماتا ہے "یہ بھی خدا کا فضل و احسان ہی ہے۔ اگر یہ منافق عین معرکہ جنگ میں یہ حرکت کرتا تو تدارک مشکل تھا۔

اس کے بعد نقارہ اور سواری کا حکم ہوتا ہے۔ باقی شب ہاتھی کی کمر پر گذار دیتا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو سواری خاص کے فیلبان کو حکم ہوتا ہے کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو ہمیں شجاع کے ہاتھی کے پاس پہنچا دو۔

مرشد قلی خاں یہ حکم سنتا ہے تو فوراً عرض کرتا ہے:

"ایں طور جرأت خلاف طور پادشاہاں ست"

ارشاد ہوتا ہے۔

"ما ہیچ کدام بادشاہ نہ شدہ ایم۔ مردم بعد ازیں طور جرأتہا بادشاہ میشود۔ بعد از بادشاہی ہم اگر در جرأت تفاوت شود آں سلطنت نے ماند"

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آب دار دہد[2]

---

[1] یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اورنگ زیب نے مہاراجہ جسونت سے اس غداری پر کسی قسم کی باز پرس نہیں کی اور اس کے متعلق اگر کسی کو لکھا تو صرف اتنا کہ یہ فعل راجپوتوں کی شان کے مخالف تھا۔ چنانچہ مرزا راجہ جے سنگھ کو لکھتا ہے۔ "آنچہ جسونت سنگھ با خود کرد، ہیچ دشمن نکند۔ ... ما در عنایت و مرحمت نسبت با وجود تقصیرات و بے اخلاصیہا کمی نہ کردیم۔ آنچہ او کرد، ہیچ کم ذات یا سپاہیے نہ کند چہ جائے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بہرحال بقول اورنگ زیب عالمگیر ارادہ الٰہی فیصلہ کر چکا تھا کہ عروسِ مُلک کی ہمکناری صرف عالمگیر ہی کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ شجاع کو اس جنگ میں ایسی شکست ہوئی کہ اُس نے پٹنہ جا کر دم لیا۔

عالمگیر نے بذاتِ خود اس کا تعاقب پسند نہ کیا۔ میر جملہ کو اور شاہزادہ محمد سلطان کو تعاقب کے لئے بھیج دیا میر جملہ نے شکست پر شکست دے کر جب لاچار کر دیا تو شجاع بنگال چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ "مگھ" قوم کے ملک "ارچنگ" (ارکان) چلا گیا۔ یہاں کے راجہ نے اُسے نہایت اعزاز و احترام سے رکھا لیکن اس نے وہاں کے مسلمان باشندوں کے ساتھ سازش کر کے راجہ کے تخت پر قبضہ کرنا چاہا۔ عین وقت پر اس کا پتہ چل گیا۔ راجہ نے شجاع کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی اور جیسا کہ پرتگالی تاجروں کا بیان ہے، وہ اسی وقت اپنے ارکان کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ اس طرح بدنصیب شجاع نے اپنی خام کاریوں کی بدولت غریب الوطنی کی بےکسی میں جان دی۔

اورنگ زیب کو جب معلوم ہوا تو اُس نے اپنے افسروں کو لکھا کہ وہ شجاع کے خاندان کا پتہ لگائیں۔ لیکن اس وقت تو کیا آج تک کسی کو اس بدبخت خاندان کے متعلق کوئی بھی صحیح بات نہ معلوم ہو سکی۔

عالمگیر اور ہندو

سلاطین اور ملوک کے حالات لکھنا کتاب کا مقصود نہیں۔ علماء ہند کے سیاسی ماحول کو بیان کرنے کے لئے سلاطین کے صرف رجحانات، جذبات اور خدمات و اصلاحات کو بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کو حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کا ماہر ہونے کے باعث مولینا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی کہا جا سکتا ہے اِس لئے اس

(بقیہ صفحہ گذشتہ) راجپوت از خانوادہ کلاں (ص ۲۷۷)۔ ؎۲ احکام عالمگیری ص ۲۷۷۔

تذکرہ میں دیگر سلاطین کی بہ نسبت اُس کا خاص حصہ ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ شاہجہاں خود پابندِ مذہب، نیک نفس، پاک باطن بادشاہ تھا۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے اختلافی معاملات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا پڑا۔

باپ کو قید کرنے اور بھائیوں کو قتل کرنے کے علاوہ اورنگ زیب پر ہندو راجاؤں اور ہندو عوام کے ساتھ بدسلوکی کا الزام بھی لگایا جاتا ہے مگر خداوندِ عالم جزائے خیر دے" ان باہمیت اور غیور مصنفین کو جنہوں نے نہایت کاوش کے ساتھ ان تمام الزامات کی تنقید و تنکیر کر کے اس قسم کی تمام تاریک بدلیوں سے مطلع کو صاف کر دیا ہے، اور ہمیں اس فریضہ سے سبک دوش کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بساطِ تاریخ پر اگر حق و انصاف کی کوئی قیمت ہے تو نہایت بلند آہنگی اور دلیری کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ عالمگیر کے بعد سے آج تک (باوجودیکہ گردشِ لیل و نہار نے تقریباً ڈھائی صدیاں پوری کر دی ہیں) مگر عالمگیر جیسا رعایا پرور، رحم دل، انصاف پسند بادشاہ نہیں پیدا کر سکی۔

اور تاریخ ماضی میں بھی بے شمار سلاطین اور صاحب سطوت و حشمت ملوک کے زمرہ میں انگلیوں پر گن لینے کے قابل چند سلاطین کے علاوہ عالمگیر کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔

غور فرمایئے وہی جسونت سنگھ جس کے چند کارنامے پہلے گذرے یعنی جس نے داراشکوہ کی حمایت میں سب سے پہلے عالمگیر سے سختی سے مقابلہ کیا، عالمگیر کو گستاخانہ جوابات دیئے، شکستِ دارا کے بعد جب ندامت کا اظہار کرتا ہے تو عفوِ عالمگیر اس کے سر کا چتر بن جاتی ہے۔ ابھی شجاع اور دارا کے قصہ سے فراغت نہیں ہوئی۔ شجاع اکبر آباد پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا چلا آرہا ہے۔ جسونت سنگھ عالمگیر کی امداد کیلئے چودہ ہزار راجپوت لے کر پہنچتا ہے لیکن معرکہ جنگ کی شب میں اپنی ساری فوج کو لے کر شاہی خرگاہ اور خزانہ وغیرہ پر حملہ اور شاہی افواج کو پریشان اور تباہ کرتا ہوا شجاع سے

جا ملتا ہے۔

فتح اور فیروز مندی، اقبالِ عالمگیر کے قدم چومتی ہے تو جسونت سنگھ کو اپنے وطن جاکر منہ چھپانا پڑتا ہے مگر وہ اب پھر شاہی منصب کی ہوس میں مضطرب ہے۔ سامنے آتے ہوئے خود شرم آتی ہے۔ صرف درخواست بھیج دیتا ہے۔

یہ دریا دل اور پیکرِ رحم عالمگیر ہی ہے کہ غائبانہ اس کا قصور معاف کرتے ہوئے منصب اور شاہی اعزازات اور جاگیر وغیرہ سے بحال کر دیتا ہے اور گورنر بنا کر احمد آباد بھیج دیتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کو بڑی بڑی مہمات پر مامور کرتا ہے یہاں تک کہ دکن میں شیواجی کے مقابلہ پر بھیجتا ہے۔ لیکن یہ غدار یہاں بھی اپنی فطرت سے باز نہ رہا۔ انفسٹن صاحب کہتے ہیں:

"راجہ جسونت سنگھ شاہزادہ معظم کی طبیعت پر حاوی اور بادشاہ کی نسبت ہندوؤں کا زیادہ خیر خواہ تھا۔ علاوہ اس کے لوگوں کو یہ بھی یقین کامل تھا کہ وہ لوبھی ولالچی ہے اور روپیہ کی بات تھوڑی بہت مانتا ہے[1]۔"

غرضکہ ان وسیلوں سے شیواجی نے اس کو اپنا رفیق بنایا۔ جسونت سنگھ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ راؤ پہاڑ سنگھ ہاڈا کو (جو ریاست بوندی کا راجہ اور سہ ہزاری منصب رکھتا تھا اور اس مہم میں اس کا شریک تھا) اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ اور جب اُس نے نمک حرامی سے انکار کیا تو اس کی بہن کو جو جسونت سنگھ کے عقد نکاح میں تھی، وطن سے بُلوا کر بیچ میں ڈالا۔ لیکن اس وفادار نے اب بھی حق نمک کو قرابت پر مقدم رکھا۔ بالآخر جسونت سنگھ کابل کی مہم پر مامور ہوا، اور ۱۰۸۹ھ میں قضا کر گیا[2]۔

مرہٹوں سے جنگ | عالمگیر کے دامنِ رحم و انصاف پر یہ وہ مصنوعی دھبہ ہے جس کو

---

[1] بحوالہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۲۱ [2] انتقال کے بعد بھی عالمگیر نے چاہا کہ اس کے بچوں کی پرورش دربار مغلیہ کے دستور کے بموجب شاہانہ ناز و نعم سے اپنی نگرانی میں کرے۔ مگر خود غرض اور فتنہ جُو ادیبا، اور دارشان نے جو فتنہ برپا کیا۔ حتیٰ کہ خود عالمگیر کے لڑکے اکبر کو عالمگیر سے باغی بنا دیا۔ اس کی تفصیل کتب تاریخ میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲ محمد میاں

بڑھا چڑھا کر ہندو مسلم تفرقہ کی آگ کو ہوا دی جا رہی ہے لیکن جب تحقیق اور تنقید کی جاتی ہے تو اس بناوٹی داغ کے نیچے عفو اور کرم کی وہ روشنی نمایاں ہوتی ہے کہ اگر سلاطین و فرمانروانِ مابعد کے سینکڑوں درخشاں اور تاباں طرۂ امتیاز اس روشنی پر قربان کر دیے جائیں، تب بھی اس روشنی کا حقِ احترام ادا نہ ہو۔

غور فرمائیے۔ "ساہوجی"[1] نظام شاہ والی بیجاپور سے ناراض ہو کر شاہجہاں کے دربار

---

[1] سیواجی کا خاندان دراصل مہارانا اودے پور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان میں "سودیسین" نامی ایک شخص کسی وجہ سے چتوڑ چھوڑ کر پرگنہ "کرکنب" ضلع پر پنڈہ ریاست دکن چلا آیا۔ اس کے خاندان سے "مالوجی" اہل وطن سے ناراض ہو کر "ویلورہ" میں جو دولت آباد کے قریب ہے آ کر آباد ہو گیا۔ اس زمانہ میں دولت آباد نظام شاہی خاندان سے خاص تعلق رکھتا تھا۔ اور یہاں کا دیس مکھ یعنی تحصیلدار لکھی جادو نام ایک شخص تھا۔ مالوجی نے لکھی جادو کی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ مالوجی کے دو بیٹے تھے۔ چونکہ وہ شاہ شریف صاحب کا جن کی قبر احمد نگر میں ہے، نہایت معتقد تھا، اس لئے اس نے بیٹوں کا نام شاہ صاحب موصوف کے تعلق سے شاہ جی اور شرف جی رکھا۔ یہی "شاہ جی" آگے چل کر ساہوجی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور یہی ساہوجی ہے جو سیواجی کا باپ تھا۔ لکھی جادو کے کوئی اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہ جی چونکہ خوش اندام اور خوش رو تھا، لکھی جادو نے اس کو اپنا متبنیٰ بنایا، اور چاہا کہ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دے لیکن لکھی جادو کے خاندان والوں نے اس کو باز رکھا۔ بالآخر مالوجی نے ایک معزز زمیندار "اننگ پال کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اور دباؤ ڈال کر لکھی جادو کی لڑکی سے شاہ جی کی شادی کر دی۔ ساہوجی نے سب سے پہلے نظام شاہی دربار میں توسل حاصل کیا ۱۰۳۰ھ میں جب کہ نظام شاہ کی فوجوں نے نربدا اُتر کر مالوہ کو غارت کیا، اور جہانگیر نے اس کے دفعیہ کے لئے لشکر کشی کی، تو نظام شاہ کے فوجی سرداروں میں ساہوجی اور اس کا خسر جادو رائے بھی تھا۔ جہانگیر نے جب اس کے انتقام کے لئے شاہجہاں کو دکن بھیجا تو جادو رائے شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس کے صلہ میں اس کو پنج ہزاری منصب ملا، اور تمام خاندان کو حسب مراتب (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

میں حاضر ہوا، اور پنج ہزاری منصب، خلعت اسلحہ مرصع، علم، نقارہ، اسپ، فیل اور دو لاکھ نقد انعام سے سرفراز ہوا۔ ساہوجی کے سالوں (جادو لکھی کے لڑکوں کو جن کا نام بہادر اور جگدیو تھا) پنج ہزاری اور چار ہزاری منصب ملے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جزوی معاملات پر جن میں سراسر دکن کی مسلم ریاستوں کے ساتھ (جو سلطنتِ مغلیہ کے مخالف رہا کرتی تھیں) ساز باز اور اپنی ذاتی اغراض کو دخل تھا۔ دولتِ مغلیہ سے باغی ہوگیا۔

شاہزادہ عالمگیر تنبیہ کے لئے مامور ہوا۔ اور پھر دیگر امراء شاہی تادیب کے لئے ساہوجی کی طاقت کی پراگندگی اس کا نتیجہ ہوا۔ اور پھر وہ انتقال کر گیا۔

سیواجی، ساہوجی کا لڑکا تھا۔ اس نے اپنی قوم میں مذہبی تنظیم کا جذبہ پیدا کر کے مغلوں کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ اس نے آس پاس کے علاقوں پر لوٹ مار کر کے اپنی طاقت کو مضبوط کیا۔ پھر کبھی دکن کی مسلم ریاستوں سے (جن کو دربارِ دہلی سے دلی بغض و عناد تھا) ساز باز کر کے، اور جب اُن سے مخالفت ہوتی، تو دربار دہلی کی پناہ میں آکر اپنے ملک کو بڑھاتا رہا۔

عالمگیر دورانِ شاہزادگی میں دکن کی مہمات میں مصروف ہے۔ سیواجی دشمنوں کا ساتھ دیتا ہے لیکن شکست کھا کر معافی مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر جیسے ہی موقع ملتا ہے، آنکھیں بدل لیتا ہے۔ جب جوابی کارروائی کی جاتی ہے تو گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ معافی کی درخواست پیش کرتا ہے اور عادل شاہ والی بیجاپور سے سفارش چاہتا ہے۔ عادل شاہ کی سفارشی درخواست کے متعلق عالمگیر کا جواب، عالمگیر کے رحم و کرم اور اس کے بے نظیر حوصلہ کو ظاہر کرتا ہے۔

"اگرچہ ہفوات و زلات او از کثرت وافزونی قابلِ عفو نبود لیکن ازانجا

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) عہدے ملے لیکن پھر باغی ہو کر ۱۰۴۲ھ میں نظام شاہ کے پاس واپس ہوگیا نظام شاہ نے جادو رائے کو قتل کرا دیا۔ اس بناء پر ساہوجی نظام شاہ سے ناراض ہو کر دربار شاہجہان میں دوبارہ حاضر ہوا، اور منصب و علم و نقارہ حاصل کیا۔ اس کے بعد کے حالات اصل کتاب میں ملاحظہ ہوں۔ ۱۲

که آں سزاوار مکرمت ارادہ دولت و خدمت گذاری نمودہ واز تقصیرات خود نادم و پشیمان گشتہ وایں درگہ ما درگہ نا اُمیدی نیست بنابراں بشرط استقامت بر جادۂ بندگی و فرمانبرداری از روئے فضل و ذرہ پروری رقم عفو بر جرائد جرائم او کشیدہ شد، باید کہ بدیں عاطفت نمایاں استظہار فراواں اندوختہ در اظہار مراسم صدقِ عقیدت مساعی موفور بجا آورد۔[1]

غور کرو وہ عالمگیر جو ڈھائی سو برس بعد تنگ نظر، متعصب، اور ہندو کش بنا دیا گیا ہے، اپنے زمانہ میں کس طرح رحم و کرم کا دریا موجزن بن کر اپنے حریف کے وافر جرائم پر قلم عفو کھینچ رہا ہے، اور پھر شاہانِ مغلیہ کے اخلاق بھی ملاحظہ ہوں کہ اس مقہور اور شکست خوردہ حریف کے لئے سزاوار مکرمت، (قابلِ احترام) کے الفاظ بھی استعمال کر رہا ہے۔ کیا فرمانروایانِ مابعد کی بلند بانگ تہذیب اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔ اور یہ نہیں کہ عالمگیر سیواجی کو نہیں پہچانتا تھا۔ اسی خط میں عادل شاہ کو جو ہدایت کر رہا ہے وہ عالمگیر کی کامل بصیرت اور دُور بینی کے ثبوت کے لئے بھی روشن دلیل ہے۔ تحریر کرتا ہے:

"سیوا . . . را کہ در بعض قلاع کوکن بنیدہ غبار فساد برانگیختہ اگر خواہد کہ . . . نوکر شود کند جاگیر او را در کرناٹک تعین نماید۔ تا از حدود ممالکِ محروسہ دُور بودہ شورش افزا نہ گردد (آداب نمبر ۲۹۶)

---

[1] متن صـ۳۳۳ (ترجمہ) اگرچہ اس کی بیہودگیاں اور خطاکاریاں کثرت اور زیادتی کے سبب سے معافی کے قابل نہیں ہیں لیکن اس سبب سے کہ اُس قابلِ احترام نے دولت خواہی اور خدمتگذاری کا ارادہ کیا ہے اور اپنی کوتاہیوں سے نادم اور پشیمان ہے اور ہماری یہ درگاہ درگاہِ نا اُمیدی نہیں ہے لہذا بندگی اور فرمانبرداری کی سیدھی راہ پر قائم رہنے کی شرط کے ساتھ از روئے فضل و ذرہ پروری اس کے جرائم کے پرچوں پر معافی کا قلم کھینچ دیا، اور چاہیئے کہ اس نمایاں مہربانی سے بہت کچھ امداد حاصل کر کے صدق و عقیدت کے اظہارِ مراسم میں بہت زیادہ کوشش کرتا رہے۔

لیکن عالمگیر کے اس رحم و کرم کا بدلہ سیوا جی نے کیا دیا۔ وہی جو ایک عیار، بزدل اور پست ہمت دیا کرتا ہے۔ یعنی جب عالمگیر جنگِ برادران میں مصروف تھا، اس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اپنی طاقت کو خوب فروغ دیا۔

اس طرح عادل شاہ کی بیماری اس کے لئے طاقت بڑھانے کا بہترین موقع تھی۔ اور جب اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین علی عادل شاہ نے افضل خاں کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا تو مقابلہ سے پہلے ہی صلح کی درخواست بھیج کر افضل خاں کو گفتگو کے لئے بُلایا۔ پھر جس طرح دھوکہ دے کر اس کو قتل کیا، وہ ہندوستان کے ہر ایک خواندہ کو معلوم ہے۔

عالمگیر ابھی رقیبانِ سلطنت کے معرکوں سے فارغ نہیں ہوا تھا تاہم اُس نے ۳ جلوس مطابق جمادی الاوّل ۱۰۷۰ھ میں شائستہ خاں امیر الامراء کو بھیجا، جو سیوا کو شکست دیتا ہوا پونہ میں پہنچا۔ اور خاص اس محل میں قیام کیا جو سیوا جی نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا، اور ہر طرف سیوا کے تعاقب کے لئے فوجیں روانہ کیں سیوا پہاڑی دروں اور گھاٹیوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور ایک دو ہفتہ سے زیادہ کہیں قیام کا اس کو موقع نہ ملتا تھا۔ بالآخر اس نے لُوٹ مار کا پرانا طریقہ اختیار کیا، اور ایک روز شب کو ایک چور دروازہ سے محل میں گُھس کر شائستہ خاں پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ تو محفوظ رہا اور دھوکے میں دوسرا شخص مارا گیا۔

چونکہ امیر الامراء کی بے احتیاطی سے سیوا کو یہ موقعہ ملا تھا، لہذا عالمگیر نے امیر الامراء کو اس خدمت سے معزول کر کے شاہزادہ معظم کو اس مہم پر مامور کیا۔

سیوا نے اپنا رُخ دوسری طرف کیا۔ سورت کے پاس جو بندرگاہیں تھیں اُن پر قبضہ کر لیا، اور غارت گروں کے ساتھ حجاج کے لشکروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کو جو ریاست جے پور کا راجہ اور سپہ سالاری کا منصب رکھتا تھا۔ اس مہم پر مامور کیا اور فوج کا ہراول دلیر خاں کو مقرر کیا۔

ان بہادر سپہ سالاروں نے ہر طرف سے اس طرح گھیر لیا کہ سیوا کو نہ صرف شکست بلکہ اپنے اہل و عیال کی بربادی کا بھی یقین ہو گیا۔ مجبوراً اس نے اُس درگہ کی طرف پھر رجوع کیا جس کے متعلق مالک درگاہ لکھ چکا تھا :

این درگہ ما درگہ نا اُمیدی نیست

چنانچہ سیوا قلعہ پورندھر (جس میں سیوا کے اہل و عیال محصور تھے) سے تنہا نکل کر اس "درگاہ امید افزا" کے وکیل جے سنگھ کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا اور چند برہمنوں کو پہلے بھیج دیا۔ جنہوں نے نہایت عجز و زاری سے سخت قسمیں کھائیں۔

بہر حال جب راجہ جے سنگھ کو اطمینان ہو گیا کہ سیوا عاجزانہ آتا ہے تو راجہ جے سنگھ نے اپنے منشی (سکریٹری) "ادیب راج" کو استقبال کے لئے بھیجا لیکن چند مسلح راجپوت بھی ساتھ کر دیئے کہ ہوشیار رہیں۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر خلوص سے آتا ہے تو بے ہتھیار آئے ورنہ واپس چلا جائے۔

۷ ذی الحجہ ۱۰۷۵ھ کو سیوا جزیہ آیا۔ راجہ جے سنگھ نے اُٹھ کر گلے لگایا سیوا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ادنےٰ گناہ گار غلاموں کی طرح حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے، ماریئے یا چھوڑ دیجئے۔

سیوا نے درخواست کی کہ تمام بڑے بڑے قلعے پیش ہیں۔ میرا بیٹا سنبھاجی ملازمانِ شاہی میں داخل کیا جائے، مَیں مطلق العنان کسی قلعہ میں بسر کروں گا لیکن جب کبھی ضرورت ہو گی، فوراً حاضر ہو جاؤں گا جے سنگھ نے اطمینان دلایا اور دلیر خاں کو کہلا بھیجا کہ محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ چنانچہ سات ہزار زن و مرد قلعہ سے باہر نکلے اور اُن کو امان دی گئی۔

دلیر خاں نے اپنی طرف سے تلوار، جمدھر، دو عربی گھوڑے مع ساز طلائی سیوا کو عنایت کئے اور اس کا ہاتھ جے سنگھ کے ہاتھ میں دیا۔ جے سنگھ نے خلعت، گھوڑا اور ہاتھی عطا کیا۔ دلیر خاں نے اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی لیکن سیوا نے

تھوڑی دیر بعد کھول کر رکھ دی اور کہا کہ میں بغیر ہتھیار کے خدمت گذاری کروں گا۔

اس سے پہلے جے سنگھ نے معافی کے لئے دربار شاہی میں لکھ بھیجا تھا چنانچہ وہاں سے فرمان خلعت صادر ہوا۔ سیوا کو پہلے خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ چنانچہ فرمان کے استقبال کے لئے سیوا تین میل تک پیادہ گیا اور خلعت کے سامنے آداب بجالایا۔

سیوا نے ۳۵ قلعوں میں سے ۲۳ قلعے خدام شاہی کے حوالہ کر دیئے۔ سیوا کے بیٹے سنبھا کے لئے راجہ جے سنگھ نے پنج ہزاری کے منصب کی سفارش کی۔ چنانچہ وہ منظور ہوئی، اور سنبھا کو فرمان شاہی عنایت ہوا۔

سیوا ۷ ذی الحجہ ۱۰۷۵ھ کو جے سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اس وقت سے تلوار نہیں باندھتا تھا۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۰۷۶ھ کو تقریباً چار ماہ بعد راجہ جے سنگھ نے اس کو ہتھیار لگانے کی اجازت دی۔ اور مرصع تلوار عنایت کی۔

سنہ ۹ جلوس مطابق ۱۰۷۶ھ میں پایہ تخت (آگرہ) کو روانہ ہوا۔ جب شہر کے قریب پہنچا تو عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کے بیٹے کنور رام سنگھ اور مخلص خاں کو استقبال کے لئے بھیجا سیوا دربار میں پہنچ کر آداب بجالایا اور نذر پیش کی۔ عالمگیر نے ارشاد فرمایا کہ پنج ہزاری اُمرا کی صف میں اس کو جگہ دی جائے۔ لیکن سیوا کی توقعات اس سے زیادہ تھیں۔ اس نے ایک گوشہ میں جا کر رام سنگھ سے اس کی شکایت کی اور دردِ شکم کا بہانہ کر کے وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ فرودگاہ کو واپس جائے۔ سیوا چند روز سرکاری نگرانی میں اکبر آباد رہا۔ پھر وہاں سے فرار ہو کر دکن پہنچ گیا۔

آج سیوا جی کو ایک قابلِ پرستش کی حیثیت سے عزت و احترام کے بلند آسمان پر بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن کیا برادرانِ وطن کے سرمایہ فخر و مباہات ایسے ہی بزرگ اور پیشوا ہیں؟ ورنہ پھر اس فرقہ پرستانہ تعصب اور عناد پر جس قدر ماتم کیا جائے، کم ہے۔

عالمگیر کے لطف و احسان، شرافت اور فراخ حوصلگی اور بلند ہمّتی، اور سیواجی کی خود غرضی، تنگ نظری اور پست ہمّتی کا موازنہ کیا جائے تو عدل و انصاف کا فیصلہ صرف یہی ہوگا کہ عالمگیر اس لئے قابلِ ملامت ہے کہ وہ مسلمان تھا، اور سیواجی اسلئے واجب الاحترام اور قابلِ پرستش ہے کہ وہ ہندو تھا، خواہ وہ کیسا ہی تھا۔

ایک عجیب و غریب مطالبہ یہ ہے کہ عالمگیر کو سیواجی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ مگر کیا یہ مطالبہ سراسر متعصبانہ کور باطنی کا ثبوت نہیں۔

عالمگیر استقبال کے لئے راجہ رام سنگھ کو بھیجتا ہے۔ رام سنگھ، راجہ جے سنگھ کا بیٹا تھا جو اُمرارِ عالمگیری میں سب سے زیادہ ممتاز اور سپہ سالار افواج تھا۔ رام سنگھ ۱۰۵۵ھ جلوس شاہجہان کے انیسویں سال بارگاہِ شاہجہان میں پانچ سو سواروں کے ساتھ آیا۔ اس کو ہزاری منصب اور خلعت عطا ہوا۔ ۱۰۶۳ھ (۲۰ جلوس شاہجہانی) میں اس کا منصب سہ و نیم ہزاری تک پہنچا۔ عالمگیر کے زمانہ میں وہ معتمدِ خاص رہا۔ یہاں تک کہ سلیمان شکوہ پسر دارا کو لانے کے لئے عالمگیر نے اسی کو راجہ جے سنگھ کا قائم مقام بنا کر بھیجا۔ سیواجی کی اطاعت کی جس دن خبر آئی عالمگیر نے اس کو زیور مرصع اور ہاتھی اور خلعت عطا کیا۔

چونکہ سیواجی راجہ جے سنگھ کے توسط اور ضمانت سے دربار میں آیا تھا، اس لئے اس کے استقبال کے لئے رام سنگھ سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا، جو اپنے باپ کا فرزند رشید اور اس کا قائم مقام تھا۔

مخلص خاں اس کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ یہ نہ خیال ہو کہ ہندو پن کے تعصب سے کوئی مسلمان درباری نہیں بھیجا گیا۔ بعض یورپین مورخ نہایت چالاکی سے استقبال کا اصلی ممبر مخلص خاں کو قرار دے کر کہتے ہیں کہ راجہ رام سنگھ کو اس کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ حالانکہ تمام تاریخوں میں رام سنگھ کا نام مقدم رکھا گیا ہے۔

بہر حال مجرموں کے لئے استقبال اور پھر قابلِ فخر استقبال، کیا شاہانِ مغلیہ کا طرزِ مخصوص نہیں، جس کی نظیر اُن کے بعد کم از کم ہندوستان سے مفقود ہے۔

اس کے بعد سیواجی کو جو منصب عطا ہوا، وہ پنج ہزاری تھا۔ جس کو یہی یورپین مورخ تیسرے درجہ کا منصب قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ خود راجہ جے سنگھ کا منصب اس وقت تک پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ اس فتح عظیم کے صلہ میں جب اس کے منصب پر دو ہزاری کا اضافہ ہوا، تب جاکر وہ ہفت ہزاری ہوا۔

اس راجہ جے سنگھ پر ہی کیا موقوف، خود وزیر اعظم افضل خاں کا منصب پانچ ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مہارانا اودے پور سے زیادہ کوئی ہندوستان میں معزز راجہ نہ تھا۔ لیکن اس خاندان نے دربار شاہی سے ربط پیدا کیا تو جہانگیر نے رانا کرن کو بھی پنج ہزاری منصب دیا۔ اس کے بعد ۱۰۳۸ھ میں شاہجہان نے رانا جگت سنگھ کو یہی منصب عطا کیا۔ اس کے بعد رانا راج سنگھ کو دربار عالمگیری سے یہی منصب عطا ہوا۔ کیا سیواجی اودے پور کے مہارانوں سے بھی معزز درجہ رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ خود سیواجی کے باپ ساہوجی نے جب شاہجہاں کے دربار میں ۱۰۴۰ھ (۳ جلوس) میں رسائی حاصل کی، تو شاہجہاں نے اس کو بھی پنج ہزاری منصب عنایت کیا تھا

علامہ شبلی اس تمام بحث کے بعد فرماتے ہیں:

"سیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا۔ شاہی فوجوں نے اس کے تمام قلعے فتح کر لئے تھے۔ وہ قلعہ پورندھر میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ اس کے خاص صدر نشین قلعے کے برجوں پر شاہی پرچم لہرا رہا تھا۔ ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا، اور دربار میں روانہ کیا گیا۔ تاہم اس کے استقبال کے لئے عالمگیر نے سب سے زیادہ جو شخص موزوں ہوسکتا تھا، اس کو بھیجا۔ پنج ہزاری امراء کی صف میں جو خود فاتح یعنی راجہ جے سنگھ کا منصب تھا، جگہ دے کر فاتح اور مفتوح کو یکساں حیثیت دی۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہتا تھا۔ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لئے تخت سے اتر آتا۔[1]

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر صد۱۳

بہرحال جب سیواجی اکبرآباد سے فرار ہو کر دکن پہنچا تو جنوبی ہند کی حکومتوں کی آپس کی مخاصمت نیز دربارِ مغلیہ سے جنوبی ہند کی مخالفت اور پھر سیواجی کے پورا نہ ہونے والے دعوے اس کے لئے قوت فراہم کرنے کا ذریعہ بن گئے، اور فوراً ہی اُس نے تاخت و تاراج کا پرانا شیوہ پھر اختیار کر لیا۔

ان تمام جرائم اور سرکشیوں کے باوجود عالمگیر کی سیر چشمی ملاحظہ ہو کہ جب ۱۰۷۷ھ میں عالمگیر نے شاہزادہ معظم شاہ کو بہمراہی راجہ جسونت سنگھ دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا تو سیواجی نے جسونت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں اپنے بیٹے سنبھا کو بھیجتا ہوں۔ اس کو فوج میں کوئی عہدہ عنایت کیا جائے۔ جسونت سنگھ نے یہ درخواست منظور کی۔ سیواجی نے سنبھا کو ایک ہزار فوج کے ساتھ شاہزادہ معظم کی خدمت میں بھیجا۔

باوجودیکہ سنبھاجی پہلے پنج ہزاری منصب پر دربار عالمگیری میں فائز تھا اور پھر باپ کے بعد خود بھی فرار ہو کر باپ کی شورش و سرکشی میں شریک ہو گیا تھا۔ مگر ان شاہانِ لُطف و کرم کا تو نظریہ یہی تھا کہ "ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست"۔

چنانچہ سنبھاجی کو پنج ہزاری منصب، راجائی کا خطاب اور صوبہ برار بطور جاگیر عطا ہوا۔

سنبھاجی سیواجی ۱۰۹۱ھ مطابق ۱۶۸۰ء میں ترپن سال عمر پا کر بعارضہ تپ انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد سنبھاجی اس کا جانشین ہوا۔ پہلے پڑھ چکے ہو کہ پہلی مرتبہ جب راجہ جے سنگھ کے ذریعہ سے سیواجی نے معافی مانگی تھی، تب بھی سنبھا کو پنج ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد باپ کے فرار ہونے سے چند روز بعد باپ کے ساتھ جا ملا پھر جب راجہ جسونت سنگھ کے ذریعہ صلح ہوئی تو پھر سنبھا کو پنج ہزاری منصب، راجہ کا خطاب اور صوبہ برار عطا کیا گیا۔ لیکن سیواجی کے انتقال کے بعد ایک طرف تو اپنی آوارگی اور تباہ کاریوں کے باعث وہ اپنی قوم کو خوش نہیں رکھ سکا۔ علاوہ ازیں اُس نے استقلال حاصل کرتے ہی برہان پور پر دفعتہً حملہ کر کے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تمام شہر کو لُوٹا اور آگ لگا دی۔

علماء و مشائخ برہان پور نے ایک محضر تیار کر کے عالمگیر کے پاس بھیجا کہ یہ ملک دارالحرب ہو گیا اور اب یہاں جمعہ اور جماعت جائز نہیں۔ عالمگیر نے اب تک بذات خود مرہٹوں کی شرارت پر توجہ نہیں کی تھی لیکن اس کے جواب میں لکھا کہ میں خود آرہا ہوں۔ چنانچہ ۱۰۹۲ھ میں وہ خود دکن پہنچا۔ شاہزادہ محمد معظم کو مرہٹوں کو استیصال کے لئے روانہ کیا۔ معظم شاہ مرہٹوں کا تمام علاقہ پامال کرتے ہوئے انتہائی حد تک پہنچ گیا۔ مگر آب و ہوا کی خرابی اور رسد کی نایابی کے باعث ہزاروں آدمی اور مویشی تباہ ہو گئے۔ بالآخر عالمگیر نے اس کو واپس بلا لیا۔ پھر وقتاً فوقتاً فوجیں متعین ہوتی رہیں۔ مگر چونکہ حیدر آباد سے ان کو خفیہ مدد ملتی رہتی تھی، اس وجہ سے عالمگیر نے پہلے حیدر آباد پر حملہ کر کے ممالک محروسہ میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد ۱۱۰۰ھ میں مقرب خاں کو سنبھا کی سرکوبی پر مامور کیا جس نے بہت تیزی کے ساتھ حملہ کر کے سنبھا کو مع اہل و عیال گرفتار کر لیا۔

چونکہ سنبھا سخت سفاک اور ظالم تھا اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی اس کی سفاکیوں اور بے رحمانہ غارت گریوں سے نالاں تھے۔ جب اس کی گرفتاری کی خبر مشہور ہوئی تو تمام ملک میں خوشی کے غلغلے بلند ہوئے۔ جب وہ پابہ زنجیر عالمگیر کے دربار میں روانہ کیا گیا تو راہ میں جدھر گذر ہوتا تھا۔ شریف عورتیں گھر سے نکل آتی تھیں اور خوشیاں کرتی تھیں۔

اس مرتبہ بھی اگر سنبھا قدیم چاپلوسی سے کام لیتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ "ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست" کا جذبہ اس وقت کارفرما ہوتا۔ اور "درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست" کا کریمانہ لطف بے مزہ ہوتا۔ مگر افسوس اُس نے دربار میں حاضر ہو کر کسی قسم کی ملائمت کے بجائے عالمگیر کو رو در رو گالیاں دیں۔ اس صورت میں عفو و درگذر سے کام لینا وقار سلطنت کو برباد کر دینا تھا۔ مجبوراً عالمگیر کو وہ معاملہ کرنا پڑا جو اُس نے اپنے پچاس سالہ دورِ حکومت میں کبھی بھی کسی کے ساتھ نہ کیا تھا۔ یعنی زبان اور آنکھیں نکلوا کر اس کو قتل کرا دیا۔ لیکن پھر فوراً لطف و کرم کے فطری جذبہ نے عالمگیر کو مغلوب

کیا، اور اس مغلوبیت میں اُس نے وہ کیا جو حزم و احتیاط کے قطعاً مخالف تھا یعنی اس سات آٹھ سالہ بچے ساہو کو جو اپنی ماں کے ساتھ گرفتار ہوا تھا، ہفت ہزاری منصب اور راجہ کا خطاب دیا۔ اور اس کی سرکار قائم کر کے دیوان اور بخشی مقرر کئے۔ اور حکم دیا کہ اس کا خیمہ ہمیشہ شاہی خیموں کے ساتھ ایستادہ کیا جائے۔ اس کے چھوٹے بھائیوں یعنی مدن سنگھ اور اودھے سنگھ کی بھی اسی طرح قدر افزائی کی۔

بلاشبہ یہ بڑی فیاضی کا کام تھا مگر دُور اندیشی سے دُور تھا۔ خافی خاں نے سچ لکھا کہ یہ "افعی کشتن و بچہ اش را نگہداشتن" تھا۔ ہندوؤں کے مذہب میں قید کی حالت میں کھانا نہیں کھاتے۔ اس لئے ساہو صرف میوہ جات اور مٹھائی پر بسر کرتا تھا۔ عالمگیر کو یہ حال معلوم ہوا تو حمید اللہ کو کہلا بھیجا کہ ساہو سے کہہ دو کہ تم قید میں نہیں ہو، بلکہ اپنے گھر میں ہو۔ عالمگیر کا برتاؤ آخر تک ساہو کے ساتھ مربیانہ اور فیاضانہ رہا۔ ۴۷ جلوس، خلعت اور سونے کی پہونچیاں جن میں الماس جڑے ہوئے تھے اور سونے کی انگوٹھیاں جڑاؤ اور جمدھر اور اسپ مع زین طلا عطا ہوا۔ ۴۸ جلوس میں بہادر جی کی لڑکی سے نہایت دھوم دھام کے ساتھ شادی کر دی۔ سرپیچ میناکار اور جیغہ مرصع قیمتی دس ہزار روپیہ مرحمت ہوا۔ ۱۱۱۷ھ میں اپنے اتالیق کے ساتھ قلعہ بخشندہ کی تسخیر پر مامور ہوا۔ اسی سال بادشاہ کا انتقال ہوا۔ عالمگیر کے مرنے کے بعد ساہو نے خود مختاری کا عَلم بلند کیا۔ لیکن عالمگیر کے احسانات کا پھر بھی اتنا لحاظ تھا کہ سب سے پہلے عالمگیر کی قبر پر جا کر زیارت کی، اور کھانا پکوا کر فقیروں کو کھلوایا۔

یہ ہے متعصب اور تنگ نظر عالمگیر، جس کے تعصب اور تنگ نظری پر ہزاروں بے تعصبیاں نثار کر دینی چاہئیں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ عالمگیر کی دوسری بے تعصبیاں بھی جن کو آج نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا جاتا ہے، یہی حقیقت رکھتی ہیں۔

ہم مندروں کو ڈھانے اور مسجدوں کے بنوانے کے متعلق علامہ شبلی کا نہایت دلچسپ

فقرہ نقل کرنے کے بعد باقی تفصیلات کو دوسری کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں۔

"عالمگیر پچیس برس تک دکن میں رہا۔ ان ممالک میں ہزاروں بُت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اُس نے کسی بُت خانہ کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ الورہ کے مشہور مندر میں سینکڑوں تصویریں اور بُت ہیں۔ عالمگیر اسی نواح میں الورہ سے میل دو میل کے فاصلہ پر مدفون ہے۔ بڑے بڑے بزرگانِ دین کے یہاں مزارات جو عالمگیر سے پہلے گذرے لیکن یہ بُت اور تصویریں آج تک موجود ہیں الخ"[1]

غلطی یہ ہے کہ لوگ آج کل کی عینک سے پچھلے زمانہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ آج کل برسرِ بازار عیسائیت کی تردید کی جائے، نظرِ حکومت میں کوئی جرم نہیں لیکن اگر ڈیفنس آف انڈیا کی کسی دفعہ کے برخلاف کوئی عمل کیا جائے تو فوراً مستحقِ سزا ہو جائے گا۔ آج مسلمانوں کی مسجدیں اور ہندوؤں کے شوالے کوئی ملکی اثر نہیں رکھتے۔ لیکن اس زمانہ میں یہی چیزیں بغاوتوں اور ہنگاموں کے مرکز ہو جایا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان جب قابو پاتے تھے، ایک دوسرے کی پرستش گاہوں کو صدمہ پہنچاتے تھے۔ تاریخیں بھری پڑی ہیں کہ ہندو راجاؤں نے جب کبھی قوت و اقتدار حاصل کیا ہے، مسجدیں ڈھا کر برباد کر دی ہیں اور یہ بھی ہوا ہے کہ خود ہندوؤں نے مندروں کو منہدم کیا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کیونکہ ان ہندوؤں کے سیاسی مقاصد مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے (تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہوں کتبِ تواریخ)۔

اختتامِ سفر حضرت عالمگیرؒ ۱۹ شوال ۱۱۱۷ھ (۵۰ جلوس) میں دکن کے تمام قلعے وغیرہ فتح کرکے احمد نگر تشریف لائے اور اعلان فرمایا۔ "احمد نگر اختتامِ سفر ست" یہ کلمات اس سچی زبان سے صادر ہوئے تھے کہ جس کی پاسداری کار پردازانِ قضا و قدر نے بھی کی۔ منصور خاں ناظم "خجستہ بنیاد" اورنگ آباد کو آرزو تھی کہ جہاں پناہ اس کے صوبہ کو

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۲

رونق بخشیں۔ انہوں نے عرضداشت پیش کی کہ حضور معلّٰے احمد نگر میں رونق افروز ہیں اور قلعہ خجستہ بنیاد قابلِ مرمت ہے اگر ارشاد ہو تو درست کرالیا جائے تاکہ جہاں پناہ کی رونق افروزی کے وقت دقّت نہ ہو۔ حکم ہُوا :

در لحد خاک کشادہ است بغل بہر طلب
خواجہ از بے خبری رنگ سرائے ریزد
زود باشد کہ دریں غفلت و حرص وطلبش
استخوانہاش جدا گوشت جُدا مے ریزد

عجب ازاں خانہ زاد مزاج داں! باوجود آں کہ روزے باحمد نگر رسیدم مقرر فرمودیم کہ احمد نگر را ختم السفر بنویسید، پس ہرگاہ احمد نگر ختم السفر گفتہ باشیم آمدن "خجستہ بنیاد" چہ صورت دارد۔

در چند روز حیات گذشتہ در سخن تفاوت نشدہ۔ انشاء اللہ المستعان تا روزِ انتقال بسرائے جاوداں در اقوال و افعال تفاوت نخواہد شد۔ (وقائع عالمگیر صـ۱۲۲ و صـ۱۲۳)۔

وفاتِ عالمگیرؒ دکن کا چپہ چپہ فتح کرنے کے بعد سرزمین احمد نگر کو قیام کیلئے منتخب فرمایا۔ اور اعلان کردیا گیا کہ "احمد نگر اختتامِ سفر است"۔ یہ اعلان اس سچی زبان سے صادر ہُوا تھا جس کی پاسداری کارپردازانِ قضا و قدر نے بھی کی۔ ایک سال بعد ۱۱۱۸ھ کے اختتام میں صرف دو ماہ باقی تھے کہ بادشاہ کی طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوگئی۔ احکامِ شریعت کی پابندی کچھ ایسی طرح طبیعت میں رچ گئی تھی کہ شدّتِ مرض اور کمال نقاہت کے باوجود آج تک پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔

مرض خوفناک صورت اختیار کرنے لگا تو مخلص وفادار حمید الدین خاں نے درخواست پیش کی کہ ایک ہاتھی اور بیش قیمت دانہ الماس کے صدقہ کی اجازت دی جائے۔

درخواست پر قلمِ خاص سے تحریر ہُوا :

"فیل تصدّق برآوردن طریقہ اہلِ ہنود و اختر پرستاں ست، چہار ہزار روپیہ نزد قاضی القضاۃ بفرستید کہ بمستحقاں رساند۔"

اس عرضی پر یہ بھی تحریر فرمایا گیا:

"ایں خاکسار را زود بمنزل رسانیدہ بخاک سپارند۔ بتربیت تابوت نہ پردازند۔"

ایک مفصّل وصیّت نامہ بعد میں درج ہوگا۔ تجہیز و تکفین کے متعلق ایک مختصر وصیّت یہ تھی:

"چار روپیہ دو آنے جو ٹوپیوں کی سلائی سے حاصل ہوئے تھے، آیا بیگم محل دار کے پاس ہیں۔ ان میں تجہیز و تکفین ہو۔ تین سو پانچ (۳۰۵) روپیہ قرآن نویسی کی اُجرت کے "صرفِ خاص کے مد میں محفوظ ہیں۔ وفات کے روز مساکین میں تقسیم ہوں۔ چونکہ فرقہ شیعہ کے نزدیک کتابتِ قرآن کی اُجرت حرام ہے لہٰذا اس کو تجہیز و تکفین میں صرف نہ کریں۔

۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز صبح کے بعد کلمہ توحید کا ذکر شروع کیا۔ ایک پہرہ دن چڑھے کشاکشِ دنیا سے نجات پائی۔ رحمۃ اللہ تعالےٰ وتغمدہٗ بالآءہ۔ مدّتِ عمر اکیانوے سال تیرہ روز۔ ایّامِ سلطنت پچاس سال دو ماہ ستائیس روز۔[1]

تاریخ وفات	روح و ریحان وجنّت نعیم ۱۱۱۸ھ
مدفن	قصبہ جلال آباد۔ ضلع اورنگ آباد احاطہ درگاہ حضرت زین الدین قدس اللہ سرّہ العزیز۔

وصیّت نامہ

سلطان مرحوم کا وصیّت نامہ اصلی الفاظ میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اخلاق و اوصاف، مذہبی عقائد کے علاوہ زوالِ مغلیہ کے اسباب پر بھی اسی وصیت نامہ کی چند دفعات سے روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] تاریخ ہندوستان صفحہ ۴۶۴ و صفحہ ۴۶۵ جلد ۸

اوّل اینکہ ایں عاصی غرق معاصی را تلحیف و تفریش تربت مطہر مقدسہ حسینیہ علیہ السّلام نمایند کہ معز خاں بحر عصیاں۔ الغیراز التجا بآں درگاہ مرحمت و غفران پناہ نیست و مصالح ایں سعادت عظمیٰ نزد فرزندار جمند بادشاہ زادۂ عالیجاہ ست بگیرند۔

دوم آنکہ۔ چہار روپیہ دو آنہ وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگم محل وارست بگیرند و صرف کفن بیچارہ نمایند۔ وسہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن مجید در صرف خاص ست۔ روز وفات بفقراء دہند۔ ازیں راہ زر کتابت قرآن نزد فرقۂ شیعہ حرمت دارد، بکفن و مایحتاج آں صرف نہ کنند۔

سوم آنکہ باقی مایحتاج از وکیل بادشاہزادۂ عالیجاہ بگیرند کہ وارث قریب و اولاد ایشاں اند و حلت و حرمت بر ذمہ ایشاں ست۔ بریں بیچارہ باز پرس نیست کہ مردہ بدست زندہ۔

چہارم آنکہ ایں سرگشتۂ وادیٔ گمراہی را سر برہنہ دفن کنند کہ ہر گنہگار تباہ روزگار کہ سر برہنہ نزد بادشاہ عظیم الشان برند البتہ محل ترحم خواہد گردید۔

پنجم آنکہ بالائے صندوق تابوت پارچہ سفید گندہ کہ گزی گویند پوشش نمایند، واز شامیانہ و بدعت مغنیاں و مولودی احتراز کنند۔

ششم آنکہ بر والی ملک واجب باد کہ باخانہ زادان بے سرو پا کہ ہمراہ ایں عاصی (دور از حیاء) در دست و صحرا گشتہ اند مدارات نمایند و اگر بتصریح تقصیری از ینہا واقع شود بعفو جمیل و صفح جزیل مکافات فرمایند۔

ہفتم آنکہ بہتر از ایرانی برائے متصدی گری دیگرے نیست و در جنگ از عہد حضرت جنّت آشیانی تا حال احدے ازیں فرقہ از معرکہ رو گرداں نشدہ و پائے استقامت اینہا نہ لغزیدہ معہذا گاہے خودسری و حرام نمکی نہ کردہ اند لیکن چوں بسیار عزت طلب اند با اینہا ساختن بسیار مشکل۔ بہرحال باید ساخت و بجدار مزید باید کرد۔

ہشتم آنکہ فرقہ تورانی سپاہی مقرر اند و برائے تاخت و تاراج و شب خون

قید کردن خوب اند- از برگشتن در عین جنگ کہ ترجمہ "تیر بازکشی" ست وسواس و ہراس و خجالت ندارند و از جہل مرکب ہندوستان ایان کہ سر برو و لیکن جانرود بصد مرحلہ دُور اند- بہر حال ایں جماعت را محلِ رعایت باید داشت کہ اکثر جاہا ایں مردم بکار مے آیند کہ دیگرے بکار نے آید-

نہم آنکہ باسادات لازم السعادت بارہ بموجب آیہ کریمہ "وآت ذاالقربیٰ حقّہٗ" عمل باید نمود، حدِ احترام و رعایت فروگذشت نباید کرد- ازیں راہ کہ بموجب آیہ کریمہ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الّا المودّۃ فی القربیٰ محبّت ایں جماعت اجر نبوّت ست ہرگز مقصر نباید بود کہ ثمرِ خیر دنیا و آخرت ست- لیکن باسادات بارہ کمال احتیاط باید نمود در محبّتِ باطنی قصور نباید کرد- و بحست ظاہر مرتبہ اینہا نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک اند، اگر اندک استرخاء عنان شود، ندامت خواہد شد-

دہم- آنکہ تا مقدور والی ملک خود را از حرکت معاف ندارد و از نشستن در یک مکان کہ در ظاہر صورت آرام و در واقع منجر بہزار مصیبت و آلام ست- محترز باشد

یازدہم- بر پسران ہرگز اعتماد نکند و طور مصاحبت در زندگی نہ نماید کہ اگر اعلیٰ حضرت بادارا شکوہ چنیں سلوک نے کردند کار باینجا نے رسید و کلمۃ الملک عقیمۃ ہمیشہ مدنظر باید داشت-

دوازدہم- عمدہ رکن السلطنت اطلاع اخبار ملکی ست وغفلت یک لحظہ باعثِ ندامت سالہا دراز مے گردد کہ مقدمہ گریختن سیوا مقہور از غفلت شد و تا آخر عمر ہماں سرگرداں باقی بود-

مبارک اثناء عشر اختتام بر دوازدہ وصیّت کردہ شد-

اگر دریافتی بر دانشت بوس
وگر غافل شدی افسوس افسوس[1]

[1] وقائع عالمگیر صفحہ ۱۲۷ تا صفحہ ۱۳۰

اخلاق و اوصافِ عالمگیرؒ

گذشتہ مختصر حالات سے اخلاق و اوصاف کا کافی اندازہ ہوگیا بطور تکملہ و تتمہ چند سطور اس سلسلہ میں بھی سپرد قلم ہیں۔

عدل و انصاف اصول تھا۔ "قیامِ بنیانِ سلطنت از عدالت[1] نیز عقیدہ در دار الجزاء برعایت و غفلت از احوال و اعمال ماخوذ خواہیم شد۔[2] اصول اور دستور بھی بنایا جاسکتا ہے، عقیدہ بھی تسلیم کر جاتا ہے۔ مگر بسا اوقات عمل ندارد ہوتا ہے۔ لیکن سلطان عالمگیر کے عمل سے عقیدہ سمجھ میں آتا ہے۔

عموماً دوسروں کے لئے اصول و عقائد کو حجّت بنایا جاتا ہے۔ اپنوں کے لئے اصول بھی نظر انداز ہوتا ہے، اور عقیدہ بھی معافی کے لئے روزِ جزاء کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ مگر سلطان عالمگیرؒ سب سے پہلے اپنے اصول و عقیدہ کو اپنی اولاد پر استعمال کرتا ہے۔

بدترین بدخواہ اور سرکش باغی کے جرم کی تحقیق ہوتی ہے۔ اس کے سزا دی جاتی ہے مگر اپنے شاہزادوں کے لئے یہ اصول ہے کہ تحقیقات کچھ نہیں۔ جیسے ہی شکایت پہنچی، فوراً سزا یا تنبیہ و عتاب۔

اس کا اصول تھا کہ شاہزادوں کی یہی سزا ہے کہ ان سے متعلق شکایتوں کی تحقیق نہ کی جائے۔

صوبہ احمد آباد شاہزادہ محمد اعظم کی جاگیر میں تھا۔ وقائع نگار نے عرضداشت بھیجی کہ "بھاناجی" نے احمد آباد سے چالیس کوس کے فاصلہ پر سورت کی سڑک پر بیوپاریوں کو لوٹ لیا، اور جب شاہزادہ کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ امانت خاں متصدی سورت کی فوجداری میں ہوا ہے، ہم کو تعلق نہیں۔

عالمگیر نے شاہزادہ کے منصب میں پانچ ہزار کی تخفیف کر دی۔ اور تاجروں کے بیان

---

[1] رقعات عالمگیری ص۱۲۶ ۹ [2] رقعہ ۲۷ ص۲ رقعات عالمگیری۔

کے بموجب جملہ نقصان شاہزادہ کے ذمہ ڈالا۔ چنانچہ شاہزادہ کے نام حکم صادر فرمایا :

"پنج ہزار از اصل منصب کم۔ و بموجب اظہارِ تاجران زر نقد از وکیل ایشاں (محمد اعظم) بگیرند۔ اگر غیر از بادشاہ زادہ مے بود، بعد تحقیقات حکم شدے برائے شاہزادہ سزا عدمِ تحقیق ست۔ زہے شاہزادگی کہ خود را کمتر از امانت خاں بدانند۔ ہرگاہ در حیات ما دعوائے وراثت ملک داشتہ باشند کس چرا در حیات امانت خاں را شریکِ میراث نگرداند۔

دردے کہ با دوا نشد آں را علاج نیست

آں را کہ عقل نیست ہیچ احتیاج نیست"[1]

مرزا کام بخش، عالمگیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اُس کے کوکہ پر قتل کا الزام قائم ہوا عالمگیر نے تحقیقات کا حکم دیا۔ کام بخش نے اُس کی حمایت کی۔ عالمگیر نے کام بخش کو دربار میں بُلا بھیجا۔ کام بخش کوکہ کو بھی ساتھ لاتا تھا۔ کسی وقت اپنے سے جُدا نہیں کرتا تھا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ کام بخش کو بھی کوکہ کے ساتھ قید کیا جائے۔

چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کی اطلاع پہنچتی اور فوراً کارروائی ہو جاتی۔

اخلاق کیش واقعہ نگار حیدرآباد نے شراب پی لی، اور حالتِ نشہ میں حضرت خواجہ گیسو دراز کے مزار پر پہنچ گیا۔ دربار شاہی میں پرچہ گذرا۔ شاہزادہ محمد اعظم کے نام حکم جاری ہو گیا۔

"آں عالیجاہ را بایستے کہ ہرگاہ آں نابکار بایں احوالِ منکر دراں مقام رفتہ بود کساں خود تعیین نمودہ مے فرمودند کہ قشال کردہ (دست بر کتف بستہ) بیارند و جولاں کردہ ہمراہ گرز بردار بحضور میفرستادند۔ ظاہر از غایت واقعہ نگاری بریں نیاوردہ۔ ازیں جاگرز بردار شدید تعیین کردیم۔ آں یقین را بستہ بیارد، ناکساں کہ بر روئے کار آیند چنیں کنند۔ مارا در چنیں مقدمات رواداری

---

[1] رقعاتِ عالمگیر

ہیچ یکے از فرزنداں نیست، تا بعنایت اللہ خاں و دیگراں چہ رسد[1]۔

وقائع نگاری جاسوس اور سی آئی ڈی آج بھی موجود ہے مگر رعایا کی نگرانی کے لئے۔ لیکن عالمگیر کے جاسوس حکام کی نگرانی کے لئے تھے۔ ان وقائع نگاروں کے قلم شاہزادوں کے متعلق بھی ایسے ہی چلتے تھے جیسے دوسروں کے لئے۔

رقعات عالمگیری جو عام طور پر دیسی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اس کے بہت سے رقعات تحریری شہادتوں کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

پرچہ نویسی اور وقائع نگاری کے وسیع اور منظم انتظام کے باعث پورے ہندوستان کے چپہ چپہ کے حالات اس کے سامنے آئینہ کی طرح رہتے تھے۔ اور شکائتی رپورٹوں پر فوراً عمل ہوتا۔ ان کو بکس میں بند کر کے رکھنے کا کوئی ایک واقعہ کسی ایک شاہزادہ کے متعلق بھی پیش نہیں کیا جاسکتا۔

شاہزادہ محمد اعظم نے اطراف احمد آباد میں ایک فوج دار کا تقرر کیا۔ اس نے چند تھانوں میں اپنے رشتہ داروں کا تقرر کر دیا۔ کچھ لوگوں کو شکائتیں پیدا ہوئیں۔ مگر چونکہ فوجدار شاہزادہ کا مقرر کیا ہوا تھا، لوگوں کو شاہزادہ سے اپیل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وقائع نگار اس کی اطلاع عالمگیر کو دیتا ہے۔ عالمگیر اس کا تدارک کرتے ہوئے دیکھو کس دل سوزی سے لکھتا ہے:

"حیرانم کہ در وقت جزاء اعمال چہ جواب خواہیم داد۔ حق سبحانہ تعالےٰ عادل ست اگر ظالم را کار فرمائیم ہر عذابیکہ از ظالم، مامور ما، بر ما آید عدل است و باں سزاداریم کہ ظالم را از در وادن و بداد وخواہ نرسیدان در معنی خود مجوز ظلم بودن ست۔ بیت

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو[2]"

صرف رقعاتِ عالمگیری کے دیکھنے سے بھی ایسے واقعات مل جاتے ہیں کہ افسر متعلقہ کو

---

[1] رقعہ نمبر ۱۷ صـ۲۱ رقعاتِ عالمگیر۔ [2] رقعہ نمبر ۲۳ صـ۹ رقعات عالمگیری۔

اس واقعہ کی خبر بھی نہیں اور بادشاہ تک پرچہ نویسوں نے اس کو پہنچا دیا، اور افسر متعلقہ کو تنبیہ کی گئی۔

وکیلِ شرعی کا تقرر سلطنت اور سلطان سے جو زیادتی ہو، اس کے تدارک کے لئے صرف بادشاہ کی ذات ہی تھی، جس تک رسائی مشکل تھی۔

جہانگیر نے زنجیر عدل آویزاں کی، مگر اس کے لئے آگرہ پہنچنا ضروری تھا۔ سلطان عالمگیر قدس اللہ سرہ العزیز نے ممالک محروسہ کی تمام عدالتوں میں بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے وکیل متقرر کیا۔ اس کے ذریعہ سے ہر ایک عدالت میں سلطنت یا سلطان پر دعویٰ دائر کیا جا سکتا تھا۔

لیکن بایں ہمہ مستغیثین کی اہم درخواستیں سلطان عالمگیر کے پاس پہنچتی تھیں، اور سلطان بذاتِ خود خلوت میں ان کو ملاحظہ فرما کر حاشیہ پر قلمِ خاص سے احکام تحریر فرماتے تھے[1]

ڈاکٹر جیلی کریری نے اٹھتر برس کی عمر میں عالمگیر کو دیکھا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:

"وہ صاف و سفید ململ کی پوشاک پہنے عصاء پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پگڑی میں بڑا ٹکڑا زمرد کا ٹکا ہوا تھا۔ داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے وہ دن میں کئی مرتبہ دربارِ عام کرتا تھا اور مطلق کسی کی روک ٹوک نہ تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ جو چاہتا

---

[1] بعد فراغ از وظائف داد طلب را ستم دیدگان و مظلومان را در خلوت گاہ خاص طلب فرمودہ، بے واسطہ استفسار مے فرمایند و مرہمِ حلاوت بر جراحتِ قلوب شاں مے نہند و معنداز رقعات ارباب استغاثہ و جرم سزا بمطالعہ اقدس مے رسد و آنحضرت .... بدستخط مبارک بر ہر رقعہ مطابق دعار واقع جواب قلمی فرمودہ الخ (عالمگیر نامہ)۔

تھا، کہتا تھا اور عالمگیر نہایت توجّہ سے سُنتا تھا۔[1]

عدل و انصاف میں کمال احتیاط شیخ اشرف لاہوری، سلطان عالمگیرؒ کے بلند پایہ امیر تھے۔ قصر شاہی میں حاضر خدمت رہتے۔ ایک لڑکی کے معاملہ میں سید محمد امیر قدس اللہ سرہ العزیز پر عدالتِ عالمگیری میں دعویٰ دائر کر دیا۔ سید محمد امیر[2] کو دربار میں طلب کیا گیا۔ سید صاحب نے لاہور سے روانہ ہو کر دہلی کے قریب پہنچ کر دہلی سے باہر قیام کیا۔ سلطان کو جب سید صاحب کے پہنچنے کا علم ہوا تو شیخ اشرف کو حکم ہوا کہ دہلی سے نکل کر وہ بھی اتنے ہی فاصلہ پر قیام کریں، اور بلا طلب حاضر نہ ہوں۔ جب سماعت مقدمہ کیلئے طلب کیا جائے، تب حاضر ہوں کہ " در سر رشتۂ عدالت و حکم شرع مقدس رعایت داری احدے از مصاحبان نخواہد شد"۔

جب شیخ اشرف نے شکنجۂ عدالت کی یہ چُستی دیکھی، سارا ناز ختم ہو گیا، اور اپنے دعوے سے دست برداری دے دی۔

ترکِ دُنیا، مذہبی جذبات، زہد و تقویٰ افسوس آج عالمگیر کا بڑا جرم یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مذہبی بادشاہ تھا۔ بے شک وہ مذہبی تھا اور اس کے تمام اعمال و افعال پر مذہبیت غالب تھی۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ اس کی مذہبیت نے کس قسم کے جذبات پیدا کئے اور ان کے عملی نتائج کیا تھے؟ ہمارا یقین ہے اور یہی حق ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کی پابندی ہی عدل و انصاف، رعایا پروری اور رحم گستری کے بے لوث جذبات انسان میں پیدا کر دیتی ہے۔ عالمگیر کے کارنامے اس کی مثال ہیں۔ عقیدہ تھا۔ "عملِ والی در انفاع و اضرارِ خلق اللہ اثر دارد"[3]۔ (والی کا عمل خلق اللہ کو نفع اور نقصان پہنچانے میں اثر انداز ہوتا ہے)۔

تم پہلے پڑھ چکے ہو کہ شاہجہاں نے سرزنش کی تھی کہ شاہی دبدبہ کے خلاف

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص۵۔ [2] سید محمد امیر متوفی ۱۱۰۲ھ (گیارہ سو دو) سلسلۂ قادریہ کے جلیل القدر شیخ ہیں۔ ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیاء ص۱۷۸ جلد ۱۔ [3] رقعہ نمبر ۴۲ ص۱۳۔

ہر ایک شخص سے عجز و انکسار سے پیش آتے ہو۔ اس کا جواب بھی گذر چکا۔

"بندہ حضرت انس رضی اللہ کی روایت کے بموجب عمل کرتا ہے کہ جو خدا کے لئے عاجزی اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کو عزّت بخشتا ہے اور اسی بنا پر کسی کی دل شکنی کو سب سے بڑا گناہ اور بدترین عیب تصوّر کرتا ہے[۱]"

اسلام میں "مُثلہ" کی ممانعت ہے۔ بظاہر یہ عالمگیر کی مذہبی غلطی تھی کہ سنبھاجی کی زبان نکلوا دی۔ مگر پھر فوراً ہی مذہبیت نے غلبہ کیا اور اس کے یتیم لڑکے ساہو کے ساتھ وہ کیا، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اگرچہ اس مذہبی غلطی کا نتیجہ پھر یہی ہوا کہ ساہو کی پرورش "افعی کشتن و بچہ را نگہداشتن" کی مصداق بن گئی۔

اسلامی تعلیم ہے کہ کسی مذہب کے فقیر اور تارک الدنیا کو جو جنگ میں حصّہ نہیں لیتے، قتل نہ کیا جائے۔ اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ "جنجی" کا "قلعہ جب فتح ہوا، تو "رام راجہ" برادر سنبھا جوگیوں کا لباس پہن کر نکل گیا۔

میاں عبدالطیف[۲] اکابر اولیاء اللہ سے تھے۔ اُن کی خدمت میں زمانہ شاہزادگی میں بھی حاضری دیا کرتے تھے۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی حاضر خدمت ہوئے۔ ایک مرتبہ عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو علاقہ "کھرگون[۳]" کے کچھ دیہات مصارف خانقاہ کیلئے پیش کر دیئے جائیں۔ میاں صاحب نے ارشاد فرمایا:

شاہ مارا دہ دہد منت نہد رازقِ ما رزق بے منت دہد

اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ اگر واقعی نیت بخیر ہے تو محصولوں میں نصف کی

۱ؔ وقائع عالمگیر ص۴۔ ۲ؔ محلہ دولتمند شہر برہان پور میں مزار ہے۔ شاہزادگی کے زمانہ سے عالمگیر ان کا معتقد تھا۔ میاں صاحب نے اپنی کلاہِ مبارک بھی تبرکاً عنایت فرمائی تھی۔ عالمگیر اس کو جان کی برابر عزیز رکھتا تھا جس سال انتقال ہوا، کلاہِ حمید الدین خاں بہادر کو مرحمت ہوئی (وقائع عالمگیر)۔ ۳ؔ صوبہ خاندیس کا پرگنہ تھا اور اب ریاست اندور کے علاقہ میں زرخیز صوبہ ہے۔ ۱۲ (وقائع عالمگیر)۔

تخفیف کر دو۔ بلکہ مظلومانِ منّت کش کے لئے اس سے بھی زیادہ معاف کر دو۔ اور وہ گوشہ نشیں متوصل جو سوال سے ہاتھ کھینچ کر کوٹھڑیوں یا جنگلات کی جھونپڑیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے وظیفے مقرر کرو مظلوموں کی ایسی دادرسی کرو کہ کسی کا کوئی حق تلف نہ ہو، اور کوئی زبردست کسی زیردست پر ظلم نہ کر سکے (رقعات عالمگیری ص۸)

چنانچہ عالمگیر نے دارا کی مہم سے پوری طرح فراغت بھی نہ پائی تھی کہ سال دوم جلوس میں تقریباً اسّی ۸۰ ٹیکس یک قلم جملہ ممالک محروسہ میں معاف کر دیئے[۱]۔ جن کی آمدنی کئی کروڑ روپیہ سالانہ تھی۔ چند ٹیکسوں کے نام درج ذیل ہیں۔

تہ بازاری۔ چنگی۔ سرشماری۔ برشماری۔ برگدی۔ چرائی بنجارہ۔ عرس و جاترہ ہنود کے بازاروں کا ٹیکس۔ مسکرات و قمارخانہ و خرابات خانہ وغیرہ کے ٹیکس۔ طوغانہ۔ جرمانہ۔ شکرانہ وغیرہ وغیرہ۔

عمال اور عہدہ داروں کو رشوت کی گنجائش دے دینے والا طریقہ نذرانہ کا تھا۔ تمام وزراء اور عمال سالانہ جشن میں نیز ملاقات وغیرہ کے وقت گراں قدر نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ جہانگیر ان نذرانوں کا تذکرہ اپنی تزک میں بڑے لطف اور مسرت سے کرتا ہے ان نذرانوں کی تعداد بسا اوقات لاکھوں سے بھی تجاوز کر جاتی تھی، اور نذرانہ کی چیز فراہم کرنے کے لئے ناجائز دباؤ سے عمال دریغ نہ کیا کرتے تھے۔ عالمگیر نے رسمِ نذرانہ کو یک قلم

---

[۱] یہ حسن نیت کی برکت تھی کہ عالمگیر کے زمانہ میں محاصل سلطنت اسقدر ترقی کر گئے تھے کہ اکبر اعظم کے زمانہ سے اس وقت تک کبھی نہیں ہوئے تھے، اور ظاہر ہے کہ جب انصاف کے ساتھ واجبی مطالبہ باقی رکھا جائے گا۔ تو لوگ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے چنانچہ معدلت گستری کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ تخفیف محاصل کے باوجود سلطنت کی آمدنی میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ محاصل کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ اکبر ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ۔ شاہجہاں ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ پچاس ہزار پونڈ عالمگیر چار کروڑ پونڈ یعنی ساٹھ کروڑ روپیہ۔ عالمگیر کے حدود مملکت میں جو اضافہ ہوا تھا وہ حیدرآباد، بیجاپور، آسام، چاٹگام اور تبت تھا۔ لیکن ان تمام صوبوں کی آمدنی دس بارہ کروڑ روپیہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ باقی جو اضافہ ہے وہ صرف ہندوستان کی خوبی اور ملک کی آبادی یا عام رعایا کی خوش دلی کا نتیجہ ہے (اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر)۔

منسوخ کر دیا۔

زہد و تقویٰ کا بڑا حصہ خاص اپنی ذاتی آمدنی اور اخراجات سے متعلق ہے۔

سلاطین سابق کے زمانہ میں بادشاہ کی جیب خرچ کے لئے کروڑوں روپیہ آمدنی کے علاقے مخصوص ہوتے تھے۔ عالمگیر نے چند گاؤں اپنے مصارف کے لئے مخصوص کر لئے تھے، باقی کو بیت المال قرار دیا۔ اس کی زندگی بالکل سادی اور زاہدانہ تھی۔ ڈاکٹر برنیر نے اس کو ۱۶۶۵ء میں دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے :

"نحیف و زار ہو گیا تھا، اور اس لاغری میں اس کی روزہ داری نے اور اضافہ کر دیا تھا۔"

لین پول صاحب لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب فرصت کے وقت کُلاہیں بنایا کرتا تھا۔

بہر حال یہ مؤرخین کا متفقہ بیان ہے کہ وہ سلطنت کے بے پناہ مشاغل کے باوجود اپنی خوراک اپنے ہاتھ کی محنت سے بہم پہنچاتا تھا۔

وصیتوں کے سلسلہ میں گذر چکا ہے کہ ٹوپیوں کی اُجرت ہی سے تجہیز و تکفین کی وصیت کی تھی۔

اس پر یہ تقوےٰ اور یہ احتیاط کہ کتابت قرآن حکیم کی اُجرت کو تجہیز و تکفین صرف نہ کرنے کی وصیت صرف اس بناء پر کی کہ فرقہ شیعہ اس کو حرام کہتا ہے یعنی تجہیز و تکفین میں وہ پیسہ استعمال ہو کہ کسی مسلمان تو درکنار کسی اسلام کی طرف خود کو منسوب کرنے والے کے نزدیک بھی اس میں کوئی کراہت نہ ہو —— یہ ہے کمالِ تقویٰ۔

اسی طرح اُس نے دربار کے تمام سازو سامان کو ختم کر دیا تھا۔ چاندی کے بجائے چینی کی دوات کا حکم دیا۔ زربفت وغیرہ کے خلعت موقوف کر دیئے۔ دربار میں خلافِ ادب تھا کہ کوئی کسی کو سلام کرے، اس لئے صرف سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے ۱۰۸۰ھ میں عالمگیر نے حکم دیا کہ لوگ حسبِ سُنّت السّلام علیکم کہا کریں۔

عبادت | یورپین مؤرخین کی شہادت اُوپر گذری کہ نحیف و زار ہو گیا تھا اور اس

لاغری میں اُس کی روزہ داری نے اَور اضافہ کر دیا تھا۔

پابندیٔ نماز کا اندازہ اُس کے ایّام شباب کے اُس واقعہ سے ہوتا ہے — کہ عبد العزیز والیٔ بلخ کے مقابلہ پر جنگ کرتے ہوئے نماز ظہر کا وقت آگیا تو فوراً جماعت شروع کر دی۔ حریف کی جانب سے گولوں اور گولیوں کی بارش ہوتی رہی مگر اس نے اطمینان سے نماز ادا کی۔ رفقاء کار نے اس خطرناک وقت میں ادا نماز سے کچھ پس و پیش کیا، تو خود امام بنا۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ کسی سپاہی کو بھی گزند نہ پہنچا اور عبد العزیز کی صداقت پسندی تھی کہ اُس نے کہہ دیا۔ باچنیں در افتادن بر اوفتادن ست، کہ ایسے شخص سے لڑنا تباہ ہونا ہے۔

مفصّل گذر چکا ہے کہ شجاع سے مقابلہ کی شب میں جب جسونت سنگھ کے فرار ہونے کی اطلاع خیمۂ شاہی میں پہنچائی گئی تو عالمگیر نماز تہجّد کے بعد وظائف میں مشغول تھا

رُوحانی کمالات رُوحانی کمالات کے متعلق حضرت خواجہ سیف الدین اور حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہما سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے، جو پہلے گذر چکی۔

ہم اس عنوان کو مآثر عالمگیری کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔

"باقتضاء سعادت فطری در مراتبِ دینی بکمال رسوخ انصاف داشتند و بمذہب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ عامل و بناء خمسہ اسلام را کما ینبغی تاسیس و تشیید مے نمودند۔ و پیوستہ باوضو و بذکر کلمہ طیبہ و دیگر اذکار و ادعیہ ماثورہ رطب اللّسان مے بودند، و صلوٰۃ مفروضہ را اوّل وقت در مسجد وغیرہ مسجد با جماعت وجمیع سنن و نوافل و مستحبات را بخضوع و خشوع تمام مے کردند۔ و در مشہور روزہائے بیض و در ایّام ہفتہ در شنبہ و پنجشنبہ و جمعہ را صائم بودہ و نماز جمعہ در مسجد جامع بکافہ مسلمین و عامہ مؤمنین مے گذاردند و در لیالی متبرکہ باحیاء شب مے پرداختند.....

از غایت طلبی حق شبہا در مقصورۂ مسجد دولت خانہ صحبت باہل اللہ میداشتند

......وزکوٰۃ شرعی ......ہر سال بارباب استحقاق مے دادند.... وماہ مبارک رمضان را بصوم مے گذرانیدند...... و در عشرۂ اخیرہ در مسجد معتکف مے بودند[1]

احتساب اسلام کی اصطلاح میں سلطان کو "راعی" کہا جاتا ہے یعنی نگران۔ صرف جلالت وعظمت اور سریر آرائی ہی سلطان کا فرض نہیں بلکہ اصلاحِ خلق اللہ اور تہذیب اخلاق بھی اس کا فریضہ ہے، اور درحقیقت اسی فرض کی ادائیگی کے لئے نظامِ سلطنت ضروری سمجھا گیا۔

اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ عالمگیر نے اخلاقِ عوام کی اصلاح کے لئے خصوصیت سے احتساب کا محکمہ ہندوستان میں قائم کیا۔

کم تولنا، خرید و فروخت میں دھوکا، شراب خوری، رقص و سرود وغیرہ اخلاقی خرابیوں کی دیکھ بھال، ان کے انسداد کی جِدّ و جُہد محتسب کا فرض ہوتا ہے۔ مولانا مرزا زاہد جیسے بزرگ اس محکمہ کے افسر تھے۔ مرزا زاہد کے احتیاط کا اندازہ کبابوں کے واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مرزا صاحب کے حالات میں تحریر کیا گیا تھا۔

علم وفضل اس سلسلہ میں عالمگیر نامہ کے مندرجہ ذیل مضمون پر جملہ مؤرخین کا اتفاق ہے۔

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ وہبیہ گشتہ بتتبع علومِ دینیہ از حدیث وتفسیر وفقہ شریف حنفیہ است ازبس بمہارات، مراتبِ شرعیہ و استکشافِ عقائدِ اصلیہ ومسائل فرعیہ اشتغال در زیدہ اند قوت حافظ اشرف مخزن ایں حقائق شدہ وبسیارے از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چوں احیاء العلوم وکیمیاء سعادت و دیگر تصانیفِ عرفا واکابر ورسائل مؤلفات علماء باطن وظاہر بمطالعہ ہمایوں رسیدہ۔ حل عضلات وکشف اسرار آں فرمودہ اند، وبالفعل نیز بعد فراغ از نظمِ مہامِ

---

[1] مآثر عالمگیری ص۵۲۵ و ص۵۲۶ بحوالہ مق ص۱۳۱

سلطنت و سروری و تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائف اشغال پیوستگی دارند۔ (عالمگیر نامہ)۔

ابھی ایک صدی نہ گذری تھی کہ حکومتِ مغلیہ کے دربار سے فقہ تو درکنار حدیث و قرآن کو انتہا یہ کہ عربی زبان تک کو خارج کر دیا گیا تھا۔

قدرت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اسی دربار کا سر پر آرا وہ اورنگ زیب ہے جو انہیں علوم کا شیفتہ اور گرویدہ ہے جن کو اخراج کا حکم سُنایا گیا تھا۔ حدیث و قرآن تو بہت بڑی دولت ہے، وہ مشائخ کرام کی تصانیف اور فقہاء عظام کے فتاویٰ کو سر پر رکھتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے۔

فتاوےٰ ہندیہ کی تصنیف یہ تو سب کو معلوم ہے کہ فتاویٰ ہندیہ عرف فتاوےٰ عالمگیریہ کو عدالتی قانون کی حیثیت سے عالمگیر نے مرتب کرایا اور مُلّا نظام کی سرکردگی میں علماء کی ایک جماعت کئی سال تک اس خدمت میں مشغول رہی اور باوجودیکہ مآثر الامراء کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کا روزینہ تین روپیہ یومیہ سے زیادہ نہ تھا۔ مگر تاہم دو لاکھ روپیہ اس کی ترتیب و تدوین پر صرف ہو گیا لیکن حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی یہ روایت عالمگیر کے تبحر علمی، حذاقت و مہارت پر بہترین شاہد ہے کہ عالمگیر بذاتِ خود اس دینی خدمت میں کافی حصّہ لیتے تھے "۔ جمع و تدوین آں اہتمامے عظیم بود، حتیٰ کہ مُلّا نظام ہر روز یک دو صفحہ پیش بادشاہ مے خواند[1]"

---

[1] انفاس العارفین ص۲۴ ۔ مگر افسوس اس زمانہ کے بلند پایہ علماء مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم قدس اللہ سرہ العزیز نے اس خدمت میں شرکت سے اجتناب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ عبارت کی سلاست اور جامعیت میں تو بے نظیر ہے مگر استفادہ اور وثوق میں قاضی خاں وغیرہ کی حیثیت نہیں حاصل کر سکا۔ حتیٰ کہ تنہا علامہ ابن عابدین عرف علامہ شامی کی لکھی ہوئی تصنیف رد المختار کا مرتبہ بھی فتاویٰ عالمگیریہ سے بالا مانا جاتا ہے۔ بہرحال سلطان کی حسنِ نیّت میں کوئی شک نہیں اور بلاشبہ اس کتاب نے پہلی مرتبہ مفتیٰ بہ اقوال کا ایک جا مجموعہ اہلِ فتویٰ کے سامنے پیش کیا۔ محمد میاں عفی منہ

اورنگ زیب کے انشاء اور خط کے متعلق مقدمہ عالمگیر ص۴۷ تا ص۵۰ میں بہت سی شہادتیں جمع کی گئی ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے قرآن پاک چھ نسخوں اور ایک پنج سورہ کے پتہ بتلائے گئے ہیں جو مختلف کتب خانوں میں اب تک موجود ہیں۔ اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"یہ واقعہ عجائبات عالم میں شمار ہوگا کہ اورنگ زیب جس کلام مجید میں تلاوت کیا کرتا تھا وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ملکیت ہے۔" الخ

صاحب عالمگیر نامہ کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے عہد شاہزادگی میں ایک نسخہ خط مبارک سے لکھ کر "بمکہ مشرفہ زادہا اللہ قدراً فرستادند"۔

اور تخت نشین ہونے کے بعد تھوڑے عرصہ میں ایک دوسرا نسخہ تحریر کیا، اور ان دو نسخوں کے علاوہ دو قرآن مجید لکھ کر مدینہ منوّرہ بھیجے۔ ان کی لوح، جدول اور جلد پر سات ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔[۱]

علم پروری عالمگیر نے درس و تدریس کو جس قدر ترقی دی تھی، ہندوستان میں کبھی کسی عہد میں تعلیمات کی اتنی ترقی نہیں ہوئی۔ ہر ہر شہر اور قصبہ میں تمام علماء اور فضلاء کے وظائف اور روزینے مقرر تھے۔ جس کی وجہ سے مطمئن ہو کر تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہر جگہ طالب علموں کیلئے وظائف مقرر تھے۔ مآثر عالمگیری میں ہے:

"در جمیع بلاد و قصبات ایں کشور وسیع فضلاء و مدرساں را بہ وظائف لائقہ از روزانہ و املاک موظف ساختہ برائے طالب علم وجود معیشت درخور حالت و استعداد او مقرر فرمودہ اند۔"[۲]

ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس دین داری اور مذہبی وارفتگی کے وہ ظاہر پرست اور سریع الاعتقاد نہ تھا۔ اس کی دین داری دیکھ کر شریف مکہ نے کئی دفعہ اپنے سفیر بھیجے۔ اس پر عالمگیر ایک رقعہ میں لکھتا ہے:

"شریف مکہ معظمہ در ہندوستان دولت بے شمار شنیدہ ہر سال برائے

---

[۱] مق ص۵۔ [۲] اورنگ زیب عالمگیر ص۵۲۔

طلب نفع خود ایلچی مے فرستد۔ ایں سیلقان کہ مے فرستیم برائے مستحقین ست
بجہت او فکر بجا باید نمود کہ باآں جماعت برسد دوست ایں تعلف حق
(یعنی شریف مکہ) باآں نرسد[1]

مساوات پسندی خود پرستوں نے ہمیشہ سیاست کا یہی تقاضا سمجھا کہ خدا کی برابر یا اس سے بھی زائد اپنی پرستش کرائی جائے۔ اکبر اور جہانگیر نے اسی فرعونی سیاست کی تقلید میں اپنے آپ کو سجدہ کرایا۔ حضرت مجدّد صاحب کی اصلاحی تحریک کا آغاز اسی نمرودی ... شدّادی بدعت کے مقابلہ سے ہوا۔ دورِ شاہجہانی میں مجدّدی تحریک نے چہرۂ مقصد، کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا، اور عالمگیرؒ کے دور نے تحریکِ مجددی کو عروسِ کامیابی سے مکمّل طور پر ہمکنار کر دیا۔

شاہجہاں کے زمانہ کا انسانی مگر غیر اسلامی طرز (یعنی سلام کے بجائے سر پر ہاتھ رکھ لینا) بھی موقوف کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ سُنّتِ اسلام کے بموجب السّلام علیکم کہا جائے۔

اس کے ماسوا عالمگیر نے مختلف موقعوں پر صاف صاف اپنے طرزِ عمل سے جتا دیا کہ بادشاہ ایک معمولی آدمی ہے۔ اس کے حقوق عام لوگوں کی برابر ہیں ۱۶ سنہ جلوس مطابق ۱۰۸۳ھ میں عالمگیر بقرعید کی نماز کو جا رہا تھا۔ واپسی میں ایک شخص نے لکڑی پھینک کر ماری جو عالمگیر کے زانو پر آ کر لگی۔ گرز بردار اُس کو گرفتار کر کے لائے۔ عالمگیر نے کہا۔ چھوڑ دو۔

سنہ ۳۰ جلوس میں جب وہ جامع مسجد سے واپس آ رہا تھا، ایک شخص تلوار عَلَم کئے ہوئے ایک طرف سے دوڑا۔ لوگوں نے گرفتار کر لیا اور قتل کر دینا چاہا۔ عالمگیر نے روکا۔ اور ۸ ر (آٹھ آنے) یومیہ اس کا روزینہ مقرر کر دیا (مآثر عالمگیری) یہ واقعہ کسی اور مہذب و متمدن بادشاہ کے ساتھ پیش آتا تو مجرم کے ٹکڑے اُڑا دیئے گئے ہوتے۔

فراست اور دُور اندیشی عالمگیر کی وصیّتیں پہلے گذر چکی ہیں۔ بیٹوں کے نام رقعات

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر ص ۵۲

رقعاتِ عالمگیری میں طبع ہو چکے ہیں -ان کو درج کرنا طوالت ہے۔ البتہ ایرانی تورانی امرا ، یا سادات بارہ کے متعلق جو وصیّت ہے اس کا ایک ایک حرف صادق آیا بیٹوں کو رقعات میں جو لکھا وہ گویا دیکھ کر لکھا تھا۔ یہی ہے مومنِ صادق کی وہ دُور اندیشی جس کی تربیت ربانی نور سے ہوتی ہے ۔ اِتَّقُوا فراسة المؤمن فانہ یری بنُود اللہ ۔ (حدیث شریف)۔

جفاکشی | عالمگیر کا نظریہ تھا :

"بادشاہ ہرگز آرام طلبی و فراغت شعاری بر خود روا نہ دارد کہ بدترین اسباب خرابیِ مُلک و انہدام دولت ایں شیوۂ نامرضیہ است ہمیشہ تا مقدور در حرکت باید بود"۔

"بادشاہ و آب را در یک مکاں بودن بدست
آب مے گردد زبوں وشہ رود کاوش ز دخت
در سفر باشد شہاں را حرمت وعیش و وقار
فکر آرام و تنعم مے کند بے اختیار"

بیجاپور اور حیدرآباد فتح ہو جانے کے بعد عمدۃ الملک مدار المہام نے عرضداشت پیش کی کہ باقبال متعال (باقبال حضور کہنا عالمگیر کے یہاں جرم تھا) دکن فتح ہو چکا۔ اب ہندوستان کو رونق افروز فرما کر دنیا کو معلوم کرنے کا موقعہ دیجئے کہ خلافت پناہی کو اب ملک فتح کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔

حضرت عالمگیر نے فوراً جواب تحریر فرمایا :

"عجب ازاں خانہ زاد مزاج داں کہ ایں چنیں عرض نمودہ۔ اگر غرض آنست کہ بمردم معلوم شود کہ کار نماندہ است خلافِ واقع ست"۔

یہ رقعہ ۱۰۹۶ھ میں لکھا گیا۔ اس وقت مرہٹوں کا استیصال باقی تھا، اور عالمگیر کو ناگوار تھا کہ خلاف واقع کہا جائے ۔ دکن میں سب کام کر لئے ۔

عالمگیر نے اپنے اس خیال کو بارہا ظاہر کیا ہے کہ:

"اگر اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) بودن دار الخلافہ و مستقر الخلافہ اختیار نمے کردند و ہمیشہ در سفر بودند کار باینجا نمے رسید کہ برسید (وقائع عالمگیر وغیرہ)

داد و دہش عنایت اللہ خاں بخشی نے عرض کیا کہ روزانہ منصب عطا ہوتے ہیں اور حضور کی جاگیر محدود ہے۔ غیر محصور اور محدود کا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔

اس پر حکم ہوا:

"استغفر اللہ کارخانہ بادشاہی نمونہ درگاہِ الٰہی ست" الخلق عیال اللہ والرزق علی اللہ" ایں راتبہ رساں، بیچارہ، ذلیل (عالمگیر) زیادہ از وکیل رب جلیل نیست در بارگاہ الٰہی اعتقاد تحدد و تناہی عین ضلالت و تباہی ست"

الحمد للہ ثم الحمد للہ۔

اس کے بعد تحریر ہوتا ہے کہ ارشد خاں کی عرضی کے بموجب قلعہ ستارہ کی فتح کے بعد پانچ ہفت ہزاری جاگیریں اس فانی کی مِلک میں اپنی ہیں۔ سرِدست انہیں جاگیروں سے تنخواہیں دیں۔ جب یہ ختم ہو جائے گی، حق تعالیٰ "نوروز" میں "روزی نو" (نئے دن میں نئی روزی) عطا فرمائے گا۔"[1]

میر حبیب اللہ نے روپیہ خرچ کر ڈالا۔ اس کی شکایت کی گئی۔ جواب میں تحریر ہوا:

"معلوم ہوا ہے کہ میر موصوف کے پاس جو کچھ آتا ہے، اہلِ استحقاق اور مصرف خیر میں خرچ کر ڈالتا ہے۔ جب کہ اس عاصی غرق معاصی کا مصرف خیر میں صرف ہو چکا۔ اعادہ بے فائدہ ہے۔"[2]

شجاعت دارا شکوہ کی جنگ میں وہ پچیس تیس ہزار سے ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیدل فوج کے مقابلہ میں معرکہ آرا ہوا تھا۔ اور جب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو اس کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ اُس وقت اُس نے جو شجاعت ظاہر کی، اُس کو

---

[1] وقائع ص ۱۰۸۔ [2] وقائع عالمگیر ص ۱۱۸۔

"لین پول" ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :

"جنگ کی حالت نازک ہو گئی تھی، اور قریب تھا کہ اورنگ زیب کو ہزیمت ہو، کیونکہ اس کے چیدہ چیدہ رسالے پسپا ہو چکے تھے اور وہ تنہا کھڑا ہوا تھا، اور مشکل سے ایک ہزار آدمی اس کے گرد ہوں گے۔ اس سے زیادہ مستقل رستمانہ شجاعت کی کبھی جانچ نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن اورنگ زیب کے بدن میں پٹھوں کے بجائے فولاد کے تار تھے۔ صرف اورنگ زیب کی شجاعت تھی، جس نے ایک ہزار کو ایک لاکھ پر فتح دی"۔

عالمگیر کی اس حیرت انگیز شجاعت اور اس تعجب خیز عزم و ثبات کو کمزوری، مصائب سفر، تواتر حوادث کوئی چیز کم نہ کر سکی۔ سنہ ۱۱۱۱ھ (۱۶۶۹ء) میں جب بمقام ستارہ مرہٹوں نے ایک سرنگ اُڑا دی اور فوج میں بربادی پھیلی تو یہ بیاسی [82] برس کا بوڑھا شہنشاہ جھٹ گھوڑے پر چڑھ کر مقام حادثہ پر پہنچا۔ آدمیوں کی لاشوں کا ڈھیر لگوایا، اور چاہتا تھا کہ حملہ کی سرداری خود کرے لیکن بڑی دقت سے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا گیا۔ اب بھی وہ وہی "سامان گڈھ" کا جوان تھا جس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دی تھیں۔ یہ لین پول کے الفاظ ہیں۔ خافی خاں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتا ہے :

"چوں دانستند کہ مبارزان قلعہ کشا حوصلہ باختہ اند خود بدولت بہ اسپ سوار شدہ بر سرکار آمدہ فرمودند کہ لاش مردہا را فراہم آوردہ راسنبھارا سپر تیر بلا ساختہ قدم یورش پیش گذارند۔ چوں در مردم اثر صرف شنیدن مشاہدہ خود تیار ساختند خود بذات شریف پیش قدم بہادراں جان نثار گشتند۔ ارکانِ سلطنت بالحاح و تفرع ازیں جرات مانع آمدند"۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں عالمگیر کے واقعاتِ زندگی میں مل سکتی ہیں۔ ایامِ شاہزادگی میں ہاتھی سے لڑنا، جنگِ بلخ میں حالتِ جنگ میں نماز ظہر ادا کرنا اور شجاع کے مقابلہ کے وقت بے پناہ استقلال و ثبات کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔

فوج کے سب سے دلاور سپاہی بارہ کے سادات گنے جاتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ تیموریوں کے اکثر معرکے انہیں نے سر کئے ہیں۔ ایک موقعہ پر ان سب لوگوں نے درباریوں سے خانہ جنگی کی۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ قاضی کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہو۔ سادات نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔

عالمگیر نے آستین چڑھا کر کہا کہ جو لوگ میری تلوار کا مزہ چکھ چکے ہیں وہ حکمِ شریعت کے مقابلہ میں ایسے الفاظ نکالتے ہیں۔ کہہ دو، سب مل کر آئیں۔

یہ کہہ کر حکم دیا کہ پہرے وغیرہ پر جس قدر سادات بارہ ہیں، سب برطرف کر دیئے جائیں۔ سادات کا سارا غرور جاتا رہا۔

اصلاحات و انتظامات مسکرات کی بندش، خرابات خانوں وغیرہ کی ممانعت ان کے ٹیکسوں کی موقوفی، محکمہ احتساب، وکیل شرعی کا قیام، پرچہ نویسی کی توسیع، درباری تکلفات کی منسوخی، سلام مسنون کا اجراء وغیرہ۔

یہ اصلاحات مناسب عنوانات کے تحت میں سپردِ قلم ہو چکی ہیں۔ ذیل میں چند اہم اصلاحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) کابل سے اورنگ آباد تک آگرہ کے راستہ پر ہر ایک منزل پر سرائیں بنوائیں جن کے اخراجات خزانہ شاہی سے ملتے تھے۔ کھانا پکانے کے برتن سرکاری ہوتے تھے۔

(۲) قدیم سڑکوں اور سراؤں کی مرمّت کرائی۔ ان کے انتظامات کو ٹھیک کیا۔ چھوٹے دریاؤں پر پُل بندھوائے۔ بڑے دریاؤں کے ہر ایک گھاٹ پر عبور کرنے کے لئے کشتیاں تیار رکھنے کا انتظام کیا۔

(۳) سرکاری طور سے سڑک پر تین تین کوس کے فاصلہ سے ہرکاروں کی چوکیاں قائم کیں۔ ان کے ذریعہ سے ملک کے تمام حصّوں میں سہولت، اور عجلت کے ساتھ ڈاک پہنچ جاتی تھی۔

(۴) غریبوں اور لُولے لنگڑوں کے لئے جابجا سرکاری غریب خانے اور مطب

جاری کرائے۔

⑤ مساجد اور مندروں کے لئے اراضی وقف کیں۔

⑥ مگر تابوت اور تعزیوں کے جلوس کو بند کرا دیا۔ (تاریخ ہندوستان ج ۸ ص ۲۷۶)

⑦ رسمِ ستی کی قباحت آج اس رسم کے ماننے والے بھی تسلیم کر چکے ہیں انگریزی حکومت نے اس کو قانوناً ممنوع کر دیا ہے۔ مگر چونکہ مسلمان بادشاہ کے لئے مذہباً جائز نہیں کہ کسی قوم کو اپنے عقائد پر عمل کرنے سے روکے مسلمان بادشاہوں نے اس کو قانوناً نہیں روکا۔ البتہ سلطان عالمگیر نے یہ پابندی ضرور لگا دی کہ صوبہ دار (گورنر) کی اجازت کے بغیر کوئی ستی نہ ہو۔ پھر اس پر بھی صوبہ دار کو ہدایت تھی کہ وہ نرمی کے ساتھ باز رہنے کی فہمائش کرے اور وہ خود نہ سمجھا سکے تو اپنی مستورات کے ذریعہ سے اس پر اثر ڈالے۔

⑧ اکبر کے زمانہ سے یہ طریقہ جاری تھا کہ بادشاہ لوگوں کو مرید کیا کرتا تھا۔ عالمگیر بھی اپنے مکاتیب میں شاہجہاں کو پیر و مرشد لکھا کرتا تھا۔ لیکن عالمگیر نے اس سیاسی تصنّع کو قطعاً بند کر دیا۔

سنہ ۱۱۰۰ھ (۳۳ جلوس) میں بنگالہ سے ایک شخص مرید ہونے کے لئے آیا صلابت خاں میر توزک نے اس کو عالمگیر کے سامنے پیش کیا۔ عالمگیر نے کچھ سونے چاندی کے زیورات اور اور ایک سو روپیہ صلابت خاں کو دے کر کہا کہ اس شخص کو دے دو اور کہہ دو کہ ہم سے جس فیض کا تصور ہو سکتا ہے، وہ یہی ہے۔

جب خان نے اس کو یہ روپیہ دیا تو اُس نے اس کو دریا میں پھینک دیا اور خود بھی دریا میں گر گیا۔ صلابت خاں نے اس کو نکلوا کر ڈوبنے سے بچایا[2]۔

⑨ خدا کی پناہ! انسان اپنی ذات کے لئے غریب انسانوں پر کس طرح ظلم کا

---

[1] سود یا ماں بیٹے سے نکاح کرنے کی رسم اگر کسی قوم میں ہو تو فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس کو قانوناً روک دیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں رسمِ ستی بھی اسی قسم کی قبیح رسم ہے۔ مگر نہیں معلوم اس کو قانوناً کیوں نہیں روکا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [2] تاریخ ہندوستان ص ۳۹۵ جلد ۸۔

خوگر ہے۔ کسی مرد کو خصی کرنا شرعاً حرام ہے۔ مگر بادشاہوں نے اس کو جاری رکھا تاکہ محلسرا میں ذات شاہانہ کی حفاظت کر سکیں۔ عالمگیر نے اس ملعون طریقہ کو ممنوع قرار دیا۔

(۱۰) درشن کی ممانعت شاہجہاں نے دربار میں سجدہ اور پھر زمین بوس کا طریقہ بند کر دیا تھا۔ مگر درشن کے طریقہ میں غالباً اس کو کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ فرقہ درشنیوں کا پیدا ہو گیا تھا۔ جو صبح کو بطور عبادت بادشاہ کا جمالِ مبارک دیکھنے آتے تھے اور جبتک زیارت نہیں کرتے تھے، کچھ کھاتے پیتے نہ تھے۔

اس عقیدہ کے بموجب بادشاہ ایک معبود بن جاتا ہے۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں بلکہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ معبودیت کے کسی درجہ میں بھی اپنے آپ کو پیش کرے۔ عالمگیر کی دقیقہ رس نظر نے اس شرعی قباحت کو محسوس کیا اور ۱۰۷۹ھ میں اس کو بند کر دیا۔

(۱۱) درباری شعراء اسی طرح درباری شعراء زیبِ دربار ہوا کرتے تھے، جو بادشاہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور بڑے بڑے وظیفے اور انعامات پاتے تھے۔ ان کا ایک افسر ملک الشعراء ہوتا تھا۔ شاہجہاں نے اس مسرفانہ رسم پر متعدد بار دریادلی کے جوہر دکھائے ہیں۔ حتٰی کہ شعراء کو سونے چاندی سے تُلوا دیا۔ مگر عالمگیر جیسے متقشف کے لئے یہ کب ممکن تھا۔ اس نے ۱۰۷۹ھ میں اس سلسلہ کو بھی ختم کر دیا۔

(۱۲) گانا بجانا اگرچہ عالمگیر خود جیسا کہ مآثر عالمگیری میں بالتصریح لکھا ہے فنِ موسیقی کا ماہر تھا۔ لیکن مزامیر کے ساتھ گانا چونکہ شرعاً ممنوع ہے نیز دربار شاہی کی شان کے خلاف ہے لہٰذا عالمگیر نے اس صیغہ کو بھی تبدیل کر دیا۔ لوگوں نے اس پر ایک مصنوعی جنازہ نکالا عالمگیر نے دیکھ کر کہا کہ ہاں مگر ایسا دفن کرنا کہ پھر زندہ نہ ہو۔

(۱۳) تبدیلِ سنہ سنہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا، قمری سے بدل دیا۔ اگرچہ بظاہر معمولی سی بات ہے مگر اس قسم کی معمولی تبدیلیوں سے دنیا میں سینکڑوں قومیں بنیں اور فنا ہو گئیں۔

نوروز ایران کے آتش پرستوں کا قدیم تہوار تھا۔ عجمی بادشاہوں نے اسلام قبول کیا

مگر تفریحات میں زمانۂ جاہلیت کی تقلید کی۔ عالمگیر کی پابندِ شرع طبیعت نے جشنِ نوروز کو جشنِ عید الفطر سے بدل دیا۔[1]

(۱۴) **سکّہ** سکہ کے ایک طرف کلمہ طیبہ ہوتا تھا۔ سکّہ زمین پر پھینکا جاتا تھا۔ پَیروں کے تلے آجاتا تھا۔ عدالتوں میں حاکم اُونچی جگہ پر بیٹھتا تھا اور روپیہ وغیرہ جو جمع ہوتا تھا، وُہ کارندوں کے پاس نیچے رہتا تھا۔ غرض مختلف صورتوں سے کلمہ طیبہ کی بے ادبی ہوتی تھی لہٰذا عالمگیر نے کلمہ طیبہ کے نقش کو سکوں سے محو کرا دیا اور اشرفی پر کندہ کرایا گیا:

سکہ زد در جہاں چوں بدر منیر   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

روپیہ پر نقش ہوا:

از سکہ اقبال شہ مہر نظیر   سیم و درم ستارہ شد نقش پذیر
از سکہ او غلغلہ در چرخ اوفتاد   گردید زر از سکّہ او عالمگیر[2]

عالمگیر اور ہندو عہدہ دار

شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں ہندو مسلم تعلّقات پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں سلطان عالمگیر کے حالات کی تقریب میں چند امور درجِ ذیل ہیں:

پہلے تفصیل سے بیان کیا گیا کہ جنوبی ہند میں جس قدر سلطنتیں تھیں، ان کے فرمانروا مسلمان تھے جو ہمیشہ شاہانِ دہلی سے معاندانہ اور مخالفانہ سلوک کرتے رہے چنانچہ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ سے جنوبی ہند کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عالمگیر کا قصور صرف یہ ہے کہ اُس نے جنوبی ہند کے الحاق کے قدیمی نظریہ کو درجہ اختتام و تکمیل پر پہنچا دیا۔ ان لڑائیوں کو ہندو مسلم جنگ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ البتہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کی کش مکش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ ان لڑائیوں کے دونوں حریفوں کے ساتھ ہندو بھی اسی طرح شریک رہتے تھے جیسے مسلمان۔

---

[1] تاریخ ہندوستان صفحہ ۸۴ جلد ۸ ۔ [2] تاریخ ہندوستان صفحہ ۸۵

پہلے گذر چکا ہے کہ مرہٹوں کی طاقت عادل شاہ کا خود کاشت پودا تھا جس کو صرف شمالی ہند کے مقابلہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت وہاں کے فرمانرواؤں کے ساتھ تھی، تو شمالی ہند میں راجپوتوں سے شاہانِ دہلی رشتہ ناطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ خود عالمگیر نے سال چہارم جلوس ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۱ء) شاہزادہ محمد معظم کا نکاح راجہ روپ سنگھ کی بیٹی سے کیا۔ ایک لاکھ روپیہ کا زیور دلہن کو دیا اور کلاوتوں کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

یہ ضرور ہوا کہ جب مسلم فرمانروا ختم ہوگئے تو پھر تنہا مرہٹے میدان میں رہ گئے جن کو عالمگیر نے عمر کے آخری دَور میں مفتوح کیا۔ مگر کیا اس جنگ کا سبب مرہٹوں کا ہندو ہونا تھا؟

ہم رقعاتِ عالمگیری کے سب سے پہلے رقعہ میں پڑھتے ہیں کہ شہزادہ کلاں سلطان محمد معظم شاہ کو بلخ و بدخشاں، خراسان اور ہرات کی فتوحات کی طرف پوری تاکید کے ساتھ توجہ دلا رہا ہے۔

خود دکن میں فوج کشی کر رہے ہیں، یلغار میں شریک ہیں۔ مگر ممالکِ مذکورۂ بالا کی فتوحات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"نظر بایں توجیہ کہ (مصرع) "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔ ایں فانی را آرزو باقی ست"۔

کیا اس تمنّا کے بعد بھی دکن کی لڑائیوں کو مذہبی جنگ و جدال کا رنگ دیا جا سکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے احکام صادر کئے تھے کہ ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ مگر ہم جب امراء ہنود کی فہرست دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اعظم کے دَور سے بھی تقریباً چہار چند ہنود حکومت عالمگیر کے ارکان ہیں۔ امراء ہنود اور وقائع عالمگیری میں تفصیل کے ساتھ ان کی فہرستیں موجود ہیں۔ ہم صرف منصبوں کی

تفصیل کے ساتھ ان کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں ۔

ہفت ہزاری امراء ، ۳- جن میں ساہو پسر مہاراجہ سیتاجی بھونسلہ بھی شامل ہے

شش ہزاری ، ۳ -

پنج ہزاری ، ۹- جن میں سیواجی کا داماد ارجندجی اور مالوجی بھونسلہ بھی شامل ہے ۔

چہار ہزاری ، ۱۳- جن میں دلپت رام بنداجی کا چچازاد بھائی اور نتھوسیواجی کا داماد بھی شامل ہے ۔

دو ہزار و پانصدی ، ۹- دو ہزاری ، ۵ -

ہزار پانصدی ، ۴ - ایک ہزاری ، ۸ -

ہفت صدی ، ایک - پانصدی ، ایک - ایک صدی ، ایک -

ان کے علاوہ ۱۴ امراء ہنود کے نام اور تاریخ میں آئے ہیں ۔ جن کو مذکورہ بالا فہرستوں میں شامل کیا گیا مگر ان کے منصب نہیں معلوم ہو سکے ۔ کُل ایک سو ایک ۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ ان امراء کی حُسن خدمات پر حوصلہ افزائی نہ ہوتی تھی ۔ کتب تاریخ سینکڑوں واقعات سے لبریز ہیں جن میں انعام کے طور پر امراء ہنود کو خلعتیں اور خطابات دیئے گئے ۔ ایک معمولی سا واقعہ تھا کہ پہاڑ سنگھ نے سرکشی کی ۔ اس کی تنبیہ کے لئے دستہ فوج بھیجا گیا ۔ شہزادہ محمد معظم کے پیش کار دیوان "تلوک چند" نے مقابلہ کے وقت اس کو قتل کرا دیا ۔ شاہزادہ محمد معظم کے نام شاہی فرمان صادر ہوا ۔

"اورا بمنصب پانصدی ذات و صد سوار و خطاب رائے و عطاء خلعت و شمشیر و اسپ سربلندی بخشیدیم"۔

پھر اسی پر قناعت نہیں بلکہ شاہزادہ سے سفارش کی جاتی ہے کہ :

"آں فرزند ہم رعایتے درخود کہ موجب امتیاز او در اقران و امثال تواند بود البتہ مع نشان تحسین و آفرین و استقلال نیابت صوبہ بفرستند"۔[1]

[1] رقعات عالمگیری مٹ

مسٹر ارنلڈ، عالمگیر کو بدنام کرنے میں کسی یورپین مؤرخ سے کم نہیں۔ مگر وہ تحریر کرتا ہے:

"اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔ مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ ضروری ہے۔ جس واقعہ کے متعلّق یہ اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرّر تھے، اس علّت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّکُمْ اَوْلِیَاءَ (اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ)۔ عالمگیر نے عرضی پر لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصّب کو جگہ مل سکتی ہے۔ اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن (تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین) بادشاہ نے لکھا کہ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیئے تھا کہ اس ملک کے راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے۔ مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی، اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں[1]۔

کوئی ضلع ہندوستان بھر میں ایسا نہ ہوگا جس کی حدود میں کسی مندر کے نام

[1] دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام مصنفہ ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ ص ۲۷۸

شاہی زمانہ کی جاگیر نہ ہو۔ تحقیق کی جائے تو ان میں سے بیشتر جائدادیں وہ ہیں جن کو عالمگیر نے عطا فرمایا۔ بنارس اور متھرا کے ہندوؤں کے ساتھ ابتدا حکومت میں کچھ مقابلہ رہا۔ بنارس میں دارا ایک عرصہ تک رہا تھا اور اُس نے وہاں کے پنڈتوں سے تعلیم پائی تھی۔ متھرا میں بھی دارا کے اثرات تھے۔ ان دونوں شہروں کے ہندوؤں نے عالمگیر کے اقتدار کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بغاوت کی۔ مساجد کو منہدم کر کے مندر بنائے۔ جس کے نتیجہ میں عالمگیری افواج نے سختی سے شورش کو دبایا۔ ان تمام وجوہات کو کتب تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان ہندوؤں کے ساتھ عالمگیر کے الطاف وعنایات کا اندازہ اس کے حسبِ ذیل فرمان سے ہوتا ہے جو وقائع عالمگیر کے حوالہ سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"لائق العنایۃ[1] والرحمۃ ابوالحسن بالتفات شاہانہ امیدوار بودہ بداند کہ چون بمقتضاء مراحم ذاتی ومکارم جبلی ہمگی ہمت والانہمت۔ وتمامی نیت حق طویت ما برفاہیت جمہور انام وانتظام احوال طبقات خواص و عوام مصروف ست واز روئے شرع شریف وملت منیف مقرر چنیں ست کہ دیرہاء دیرین برانداختہ نہ شود وبتکدہاء تازہ بنا نیابد ودریں ایام معدلت انتظام بعرض وشرف اقدس ارفع واعلےٰ رسید کہ بعض مردم از راہ عنف وتعدّی بہنود سکنہ قصبہ بنارس وبرخے امکنہ دیگر کہ بنواحی آں واقع است وجماعت برہمنان آں محال کہ سدانت

---

[1] لائق عنایت ورحمۃ ابوالحسن توجہات شاہانہ سے امیدوار رہ کر مطلع ہوں کہ مراسم ذاتی اور فطری مکارم کے بموجب چونکہ ہماری تمام توجہ اور نیت تمام مخلوقات کی خوش حالی اور خواص وعوام کے احوال کے انتظام میں مصروف ہے اور شرع شریف کی رو سے یہ ثابت ہے کہ قدیم بت کدوں کو منہدم نہ کیا جائے۔ اور نئے بت خانے نہ بنائے جائیں اور اس انصاف پرور زمانے میں بارگاہِ اشرف واقدس وارفع واعلیٰ کی پیشی میں یہ بات پہنچی، کچھ آدمی قصبہ بنارس اور اس کے قرب وجوار کے چند مقامات کے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

بت خانہا، قدیم آنجا بانہا تعلّق دارد و مزاحم و معترض مے شوند و مے خواہند کہ اینہارا از سد انت آں کہ از مدّت مدید باینہا متعلق ست باز دارند و ایں معنی باعثِ پریشانی و تفرقہ حال ایں گروہ مے گیرد، و لہٰذا الحکم والا صادر مے شود کہ بعد از ورود ایں منشور لامع النور مقرر کند کہ من بعد احدے بوجوہ بحساب تعرض و تشویش باحوال برہمناں و دیگر ہنود متوطنہ آں محال نرساند۔ تا اینہا بدستور ایام پیشین بجا و مقام خود بودہ بجمعیت خاطر بدعاہائے دولتِ خداداد ابد مُدّت و ازل بنیاد قیام نمایند۔ دریں باب تاکید دانند۔ بتاریخ ۱۵ شہر جمادی الثانیہ ۱۰۹۹ھ نوشتہ شدہ۔

بنگال کے مشہور فاضل سر سی۔ پی۔ رائے نے ۱۹۳۷ء میں بنگال کے مسلم فیڈریشن کے جلسہ میں جدید وزارت کا استقبال کرتے ہوئے بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں، اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا۔ گورنر جنرل بنایا۔ وائسرائے بنایا۔ یہانتک کہ اُس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہندوؤں اور مندروں کے پجاریوں کو (جو قدیم زمانہ سے وہاں موجود ہیں) از راہِ ظلم و تعدی تنگ کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان مندروں کی خدمت سے جو عرصہ سے انہی لوگوں سے متعلق ہے، ہٹا دیں اور یہ صورتِ حال ان لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ لہٰذا الحکم والا صدور پذیر ہوتا ہے کہ اس فرمانِ عالی اور اس منشور لامع النور کے صادر ہونے کے بعد کوئی شخص کسی صورت سے بھی اس اطراف کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کو پریشان اور تنگ نہ کرے تاکہ یہ لوگ بدستور سابق اپنے مقام اور اپنے منصب پر اطمینان کے ساتھ رہتے ہوئے "دولتِ خداداد ابد مدت و ازل بنیاد" کے لئے دُعا کرتے رہیں۔ اس باب میں پوری تاکید ملحوظ رہے۔ ۵ / جمادی الثانی ۱۰۹۹ھ۔

ہندو راجپوت ہی تھا"۔

ہندوستان کے مشہور ہندو مصنف پنڈت سندر لال مصنف " بھارت میں انگریزی راج" نے اپنے ایک مضمون میں جو اخبار استقلال دیوبند مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا، تحریر فرمایا تھا۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب اور اس کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی، اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔

جزیہ اس میں شک نہیں کہ عالمگیر کی خواہش اور تمام تر جدّ و جُہد یہی تھی کہ اسلامی تعلیمات کے بموجب حکومت ہو۔ اُس نے سب سے پہلے اپنی ذات کو اس نظریہ کا پابند بنایا۔ تمام شاہی تکلفات کو برطرف کر کے تختِ شاہی پر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس نے جب محصولات کو اسلامی طرز پر لانے کیلئے اس سے زیادہ غیر شرعی ٹیکسوں کو یک قلم منسوخ کر دیا، جن کی آمدنی کروڑوں روپیہ تھی، تو ان کی تلافی کے لئے ضرور تھا کہ اسلامی تعلیم کے بموجب عُشر، خراج، زکوٰۃ اور جزیہ کے احکام نافذ کرے۔

عُشر اور زکوٰۃ کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے، خراج اور جزیہ غیر مسلموں سے۔ عُشر آمدنی کا دسواں حصہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ زر و نقد کا چالیسواں حصہ۔ عُشر کے مقابلہ پر غیر مسلموں سے خراج ہوتا ہے جس کے تعین کے وقت ادا کنندگان کی رضامندی ضروری ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر یا اُن کی طاقت سے زیادہ خراج لگانا خلافتِ راشدہ کے دستور العمل

کے مخالف ہے۔

جزیہ کی ایک تعداد شریعت نے مقرر کی ہے۔ یعنی اُمراء اور اربابِ دولت سے تقریباً بارہ [12] روپیہ سال۔ متوسط درجہ کے لوگوں سے چھ [6] روپیہ سال اور عام برسرِ روزگار لوگوں سے تین روپیہ سال۔ تہ بازاری، برگدی، برشماری، سرشماری نذرانہ رحمت ہے مگر افسوس ہندوؤں نے اس کو اپنے لئے سخت وبال سمجھا اور شکرانہ وغیرہ انتی ٹیکسوں کے بعد یہ معمولی ٹیکس نہایت ہی آسان اور عوام کے لئے سراسر تربیت اور پھر مسلم حکومتوں کو برباد کرنے کے لئے حریفانِ چابک دست نے جزیہ کو ایسی بھیانک چیز بتایا کہ اس سے بچنے کیلئے ہندوؤں کے بڑے بڑے گھرانوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔

آج بھی قسم قسم کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ عام باشندگانِ ملک کا افلاس اُس زمانے سے کہیں زیادہ ہے مگر کیا کسی کو سنا گیا ہے کہ اُس نے ٹیکسوں سے بچنے کی خاطر اپنے مذہب کے متعلق کبھی کسی قسم کی کوئی سُستی بھی کی ہو۔

فی زمانہ مشنریوں کی بلا جا بجا ہے۔ کروڑوں روپیہ سالانہ مشنریوں پر خرچ کیا جاتا ہے جدید عیسائیوں کو خاص خاص رعائتیں بھی ملتی ہیں۔ مگر کوئی شریف ہندو یا مسلمان کبھی بھی ان کی طرف روپیہ پیسہ کے لالچ میں متوجہ نہیں ہوتا۔

شاہانِ اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی کسی مشنری کا تو درکنار، کسی تبلیغی ادارہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اگر بالفرض جزیہ سے بچنے کے لئے لاکھوں کروڑوں ہندو مسلمان ہو گئے، تو اُن کی بزدلی، پست ہمتی واقعی اپنے قدیم مذہب کے لئے لعنت تھی، اور ایسے بزدلوں پر اسلام بھی کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کے اسلام ہی کو درست قرار نہیں دیتا، جو صداقت کی بنا پر نہیں صرف لالچ یا کسی معمولی خوف کی بنا پر مذہب تبدیل کر دیں۔

بہرحال یہ الزام تو کسی سنجیدہ انسان کے لئے بھی قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں نے جزیہ اور زکوٰۃ کی تقسیم کو اس مساوات اور یکسانیت کے خلاف سمجھا جس کے وہ اکبر کے زمانہ سے عادی ہو چکے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو ہمارا خیال

ہے کہ اورنگ زیب نے اجتہادی غلطی کی۔

بنو تغلب عرب کا ایک قبیلہ تھا۔ وہ عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ جب یہ قبیلہ عہدِ فاروقی میں محروسہ خلافت میں داخل ہوا، اور اس سے جزیہ اور خراج کا مطالبہ کیا گیا تو چونکہ وہ خلیفہ کا ہم نسل تھا، اُس نے صاف صاف کہا کہ ہم مسلمانوں سے دو چند محصول ادا کر سکتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ گوارا نہیں کہ ہم سے جزیہ لیا جائے اور ہمارے ہم نسل قبائل سے زکوٰۃ لی جائے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کے اس مطالبہ کو منظور فرمایا اور یہی حکم نافذ ہوا کہ اُن کے تسلیم و اقرار کے بموجب اُن سے دو چند عُشر اور زکوٰۃ ہی لی جائے۔ اگر واقعی ہندوؤں کو لفظ جزیہ اور خراج سے ناگواری تھی، تو عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو سُنّتِ فاروقی پر عمل کرنا چاہیئے تھا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ جزیہ کا اجراء ہوا ہی نہیں، یا یہ کہا جائے کہ جس کو جزیہ کہا جاتا ہے وہ جزیہ ہی نہ تھا۔

مثلاً جودھ پور کے راجہ نے سرکشی کی۔ اس کو تنبیہ کی گئی۔ اُس نے سرِ اطاعت خم کیا۔ اور مؤرخ کے الفاظ میں:

"جزیہ دینا قبول کیا۔ زرِ جزیہ کے عوض میں اپنے ملک کے تین[۳] پرگنے دینے اور فرزندانِ جسونت کی اعانت نہ کرنے کا وعدہ کیا[۱] الخ"

اسی طرح اُودے پور کے رانا سے:

"ان شرائط پر صلح کر لی کہ رانا جزیہ کے عوض میں کچھ مُلک دے دے[۲]"۔

اسلامی تعلیمات سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی اس کو جزیہ نہیں کہہ سکتا۔ اس قسم کی شرطیں عام طور پر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اسی کا نام جزیہ ہے تو اس میں عالمگیر کو بدنام کرنا سراسر ظلم ہے۔ ہر ایک حکومت اسی قسم کے وصول کرتی رہی۔ اصطلاحِ شریعت میں اس کا نام خراج ہے اس کو جزیہ نہیں کہا جاتا۔

---

[۱] تاریخ ہندوستان ص ۳۰۹۔ [۲] ایضاً ص ۳۱۸

حقیقت یہ ہے کہ رانا اور راجہ ہر سال شاہی جشن کے موقعہ پر لاکھوں روپے کے نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ یہ نذرانے بادشاہ کا ذاتی حق مانے جاتے تھے اور اس بنا پر وہ بڑی حد تک رشوت کا کام بھی کرتے تھے۔

پھر نذرانے کے بہانے سے اِن راجاؤں کو اپنے ماتحتوں سے بے جا وصول کرنے کا بھی موقعہ ملتا تھا۔ نیز ہر سال خود بھی نذرانے وصول کیا کرتے تھے۔

عالمگیر نے نذرانے کی رسم منسوخ کر کے اس ہمہ گیر ظلم کی جڑ ہی کاٹ ڈالی۔ یہ راجاؤں اور رانوں کے ذاتی مفاد کے لئے سخت مضر تھا۔

پھر بہبودیٔ عوام کے پردہ میں اصل واقع کو چھپا کر اپنی اغراض کے لئے غلط پراپیگنڈے کرنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔

بد قسمتی سے عالمگیر کو مؤرخ شیعہ ملے اور پھر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ایران سے تعلّق کے انقطاع نے شیعوں کی رگِ حمیت میں فطرتاً اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ عالمگیر کے بعد شیعوں کا اقتدار ہی ملک میں کمزور پڑ گیا۔

فنِ تاریخ کے متعلّق آپ کی رائے کچھ بھی ہو مگر ہر ایک حقیقت پسند منصف مزاج یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ کسی شخصیت کے متعلّق جب اس طرح کے عوارض اور سانحات پیش آ جائیں تو تاریخ کی صاف گوئی بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات واقعہ کی اصل فسخ ہو جاتی ہے۔

ان حالات میں مؤرخین نے غلط تعبیر کرتے ہوئے اس کو بھی جزیہ سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اصطلاحِ شریعت میں اس کو جزیہ نہیں کہا جاتا، اس کا نام "عشر" ہے۔

اس میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز ضرور ہوتا ہے مگر مجموعی دولت کے تناسب سے اگر دیکھا جائے تو مسلمان پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جزیہ جو مذکورۃ الصدر شرح کے ساتھ ہر غیر مسلم سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر مسلم سے مالِ تجارت پر بھی کُل مال کا بیسواں حصّہ (۵ فیصد) سال بھر میں ایک مرتبہ لیا جاتا ہے۔ اس

بیسویں حصّہ کو اصطلاحاً "عشر" کہتے ہیں۔

یہاں یہ امتیاز ضرور ہوا کہ مسلمان سے اس کا نصف چالیسواں حصّہ (ڈھائی فی صد) لیا جاتا ہے۔

اس طرح مسلمان کے حق میں تخفیف معلوم ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی دوسرا پہلو بھی پیش نظر رہے تو یہ تخفیف فریب نظر ثابت ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بیسواں حصّہ غیر مسلم سے صرف مالِ تجارت پر لیا جاتا ہے۔ مالِ تجارت کے علاوہ اس کے پاس لاکھوں کروڑوں روپیہ نقد یا زیورات وغیرہ کی شکل میں ہو، اس پر کچھ نہیں لیا جاتا۔

اس کے برعکس مسلمان کی پوری دولت پر جو اس کے پاس نقد ہو یا دوسروں کے ذمّہ قرض ہو، زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

مثلاً کسی مسلم اور کسی غیر مسلم کا سرمایہ اگر ایک ایک لاکھ روپیہ ہو، اس طرح کہ بیس ہزار روپیہ تجارت میں لگا ہوا ہے۔ پچاس ہزار روپیہ نقد جمع ہے اور تیس ہزار دوسروں کے ذمہ قرض ہے۔ تو غیر مسلم سے صرف بیس ہزار کا بیسواں حصّہ یعنی ایک ہزار لیا جائے گا اور مسلمان سے اس کے کل سرمایہ کا، جس میں وہ تیس ہزار روپے بھی شامل ہیں جو دوسروں کے ذمّہ قرض ہیں، ایک چالیسواں لیا جائے گا جو ڈھائی ہزار روپے ہوتے ہیں زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے ذمّہ جو دوسرے مالی واجبات ہیں، اُن پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

① جنگ کے تمام مصارف بھی مسلمانوں کے ذمّہ ہوتے ہیں کیونکہ جہاں وہ حکمران ہوں، اس ملک اور باشندگانِ ملک کا تحفظ مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے اور اس کیلئے اقدامی یا دفاعی جو جدّ وجُہد بھی کی جائے اصطلاحِ شریعت میں وہ جہاد کہلاتی ہے۔ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ بس جس طرح نماز، زکوٰۃ یا حج وغیرہ کی تمام ذمہ داریاں مسلمانوں پر ہیں۔ ایسے ہی سلسلۂ جہاد کی تمام ذمہ داریاں بھی مسلمانوں پر ہیں۔ غیر مسلموں پر جنگ کے مصارف ایک فریضہ کے طور پر نہیں، تعاون اور امدادِ باہمی کے طور پر عائد ہوسکتے

ہیں۔ اگر وہ ان کی ادائیگی سے انکار کر دیں تو اسلامی حکومت کے غدّار یا باغی نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

(۲) مسلمانوں کے پاس اگر مویشی یعنی گائے بیل بکریاں دُمبے بھیڑ اُونٹ اور گھوڑے ہوں تو اُن پر بھی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔ جس کی خاص خاص صورتیں کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ یہ زکوٰۃ غیر مسلموں پر واجب نہیں ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ہر نفر پر (بشرط نصاب) رمضان شریف گذرنے پر صدقہ فطر اور بقر عید کے موقع پر قربانی بھی واجب ہوتی ہے۔

(۴) خاص خاص صورتوں میں مثلاً روزہ رمضان توڑ دینے پر یا قسم کھا کر اس کی خلاف ورزی کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ یہ ہی عموماً ایک مالی فریضہ کی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

(۵) مسلمان شراب اور سور کی تجارت نہیں کر سکتا۔ سونے چاندی کی خرید و فروخت کے لئے خاص خاص شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں۔ غیر مسلم ان تمام تجارتوں میں آزاد ہیں۔

(۶) صاحبِ استطاعت مسلمانوں پر حج بھی فرض ہوتا ہے۔ جس کی ادائیگی میں ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں۔

کیا ان تمام بندشوں، ان تمام مذہبی تاوانوں اور مالی فرائض کے باوجود یہ ممکن ہے کہ کوئی غیر مسلم "جزیہ" سے بچنے کے لئے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرے۔

سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

(مولانا) سیّد محمد میاں (صاحب)

جمعیۃ العلماء ہند۔ دہلی